وائے بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نہ رسد

خامۂ گُل ریز

• افکار • خیالات • شذرات • مضامین

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

جمع وترتیب

محمد شکیب قاسمی

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دار العلوم وقف دیوبند

وائے بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نہ رسد

خامۂ گل ریز

• افکار • خیالات • شذرات • مضامین

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

جمع و ترتیب

محمد شکیب قاسمی

نائب مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

ناشر

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دار العلوم وقف دیوبند

خامۂ گل ریز

افکار • خیالات • شذرات • مضامین

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

جمع و ترتیب

محمد شکیب قاسمی

نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

باہتمام: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند، سہارنپور، یوپی، الہند

جملہ حقوق بحق ناشر: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند محفوظ ہیں۔

Composed By: Noor Graphics, Deoband
Copyright © Hujjat al-Islam Academy
Darul Uloom Waqf Deoband
All rights reserved.

Hujjat al-Islam Academy
Al Jamia Al-Islamia Darul Uloom Waqf Deoband
Eidgah Road, P.O.247554 Deoband
Distt. Saharanpur U.P. INDIA
Tel: +91-1336-222752. Mob: +91-9897076726
Email: hujjatulislamacademy2013@gmail.com
hujjatulislamacademy@dud.edu.in
Website: www.dud.edu.in
Printed at: Markazi Publications Delhi

9789384775230

فہرست

- پیش گفتار ۸

مقامِ عبدیت

- حج وعمرہ: شرفِ عبدیت ۱۳
- عبادتِ حج معراجِ عشق ۱۷
- رضائے رب جلیل کا نظامِ حق ۲۳
- حج ایک مجموعۂ عبادات ۲۸

سیرت رسول ﷺ

- طلعتِ صبحِ درخشاں کے خدّ وخال ہیں یہ ۳۳
- جو یقین کی راہ پہ چل پڑے انہیں منزلوں نے پناہ دی ۴۰

ذکر وفکر

- کارہائے دعوت کا معیارِ قبول ۴۷
- متاعِ وقت ۵۰
- تعصب اور حقیقت ۵۴
- سچ اور سچائی ۵۷
- کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، سماں دیکھ ۶۵
- پھر ہمارے کارواں کو دے حُدی خوان حجاز ۷۰
- ماہ محرم- چند ملاحظات ۸۰
- جوہر خودشناس ۸۸
- میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے ۹۳

- جہاں باز وسمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے ۹۶
- وقت ایک فلسفہ علم وآگہی، ایک گنج گراں مایہ ۱۰۴
- فتنۂ عالم آشوب اور محاسبۂ عمل ۱۱۱
- جائزے کے دو رُخ ۱۱۸
- اللہ تعالیٰ کا قانونِ فضیلت ۱۲۰
- بزمِ عالم میں فنا کا دور ہے ۱۲۳
- رحمت ترے ذرّوں کی جبیں چوم رہی ہے ۱۲۹
- خطبۂ استقبالیہ خطیب الاسلام سیمینار ۱۳۸

تعلیم وتربیت

- علم تفسیر ایک دقیق ترین موضوع ۱۴۷
- علم وآگہی: مخلوقات عالم پر بنی نوع انسانی کی علتِ تفوق ۱۵۳
- آگہی کے دم سے ہے روشن جبینِ کائنات ۱۶۴
- جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ ۱۶۸
- مطالعہ کی میز سے ۱۷۳
- دِیے سے دِیا یوں ہی جلتا رہے گا ۱۷۶
- یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا ۱۸۱
- ہم نوا وہم سخن اسلاف بن ۱۹۲
- اساسِ بشریت میں مطالعہ کی اہمیت ۱۹۴

تذکرے

- اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے ۲۰۳
(خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ)

- عرفان وآگہی کا مرقعِ آبدار — ۲۱۰
(خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ)
- حسن عمل کا گوہر یکتا علم ونظر کا جلوۂ کامل — ۲۱۹
(خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ)
- اکابرین دارالعلوم دیوبند کے درخشندہ چہرے — ۲۲۹
- زاہدِ مُرتاض شب زندہ دار — ۲۳۴
(حضرت مولانا محمد یوسف متالا صاحبؒ)
- شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے — ۲۳۹
(مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ اسماعیل پٹیل صاحبؒ)
- ایک مرد خوش خصال وخوش خو — ۲۵۰
(حضرت مولانا غلام نبی صاحبؒ)
- ایک معتدل مزاج شخصیت — ۲۵۵
(حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانیؒ)
- عصر حاضر کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت — ۲۶۴
(حضرت مولانا علامہ خالد محمود صاحبؒ)
- دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث کا ایک گوہر نایاب — ۲۷۴
(امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ)
- اپنی مثال آپ تھے اور بے مثال تھے — ۲۹۳
(حکیم ڈاکٹر شمیم احمد سعیدیؒ)
- ذوقِ علم وعمل کی لذت شناس شخصیت — ۲۹۷
(حضرت مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحبؒ)

- زورِ بیاں میں سحر نگارش ۳۰۷

(بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)

- بانٹا ہے جس نے بادۂ عرفانِ مصطفیٰ ۳۲۳

(حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ)

- کہکشانِ علم وعرفان کی نابغہ روزگار شخصیت ۳۲۸

(بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)

- مہر واخلاص کا پرتوِ دل آویز ۳۳۴

(حضرت مولانا قاری محمد قاسم انصاریؒ)

- آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے ۳۳۸

(جناب مولانا حسیب صدیقی صاحبؒ)

گرد وپیش

- سخن در سخن ۳۴۵
- یہودی سازشیں اور مسلم قیادت کی ذمہ داریاں ۳۴۹
- ایں خیال است ومحال است وجنوں ۳۷۸
- امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے ۳۸۳
- ہے سلسلہ احوال کا ہر لحظہ دگرگوں ۳۹۰
- انتخابات، ذمہ داریاں اور ووٹ کی شرعی حیثیت ۳۹۵
- ہیں کواکب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ ۴۰۵
- انقلابِ شام خوں آشامی سے تشکیل نو کا آغاز ۴۱۰
- مومن ہے تو دامانِ محمد میں پناہ لے ۴۱۸

حکمت وفلسفہ

- فتنۂ ہم رنگ زمیں کتنی حقیقت - کتنا فسانہ؟ ۴۲۷
- شانِ تقدیس کے رموز ہائے سربستہ ۴۳۶
- رہنما جادۂ تسلیم ورضا چھوڑ گئے ۴۶۲
- اسلام اور سائنس کے مناہج ۴۷۰
- اسلام کی ناموس پہ جاں ہے مری قربان ۵۰۴
- اور پردۂ ظلمت چاک ہوا ۵۱۳
- تسخیر کائنات کی تفسیر دل آویز ۵۳۲
- فقہ اسلامی کے ارتقائی نقوش ۵۴۱

علم وآگہی

- نورٌ علیٰ نور ۵۹۱
- وہ صاحب امانت لیل ونہار تھے ۵۹۵
- مصائب کی علتِ اصل عمل کی کمیابی ہے ۵۹۷
- عہد رفتہ کا نقش جمیل ۵۹۹
- سخنِ ولی ۶۰۱
- اسلامی تمدن کے گوہر آبدار ۶۰۳
- دھاک ہر دل پر بٹھانی ہے رسول اللہ ﷺ کی ۶۰۵
- امام ابو یوسف اور ان کی حدیثی خدمات ۶۰۷
- حجۃ الاسلام کا شعری سرمایہ ۶۱۱

پیش گفتار

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی خانقاہ امدادیہ بین الانسانیت درستگیٔ معاملات اور حقوق العباد کی تربیت کے حوالے سے سالکین کے لیے ایک ایسی مثالی اور عملی درسگاہ تھی کہ کامرانیٔ دنیا و آخرت کے جس طلبگار سالک نے صدق و صفا کے ساتھ صبر و ضبط اور تحمل و برداشت کی اس دشوار گزار راہ مستقیم کو عبور کرلیا تاریخ نے اس کے اوصاف و کمالات اور معنوی شخصیت کے خدوخال کو اپنے صفحات میں جذب کر کے سند دوام کی ایسی سرفرازی سے نوازا کہ وہ خود اپنے آپ میں ایک مستقل تاریخ کا عنوان بن گئے، امور خانقاہی کے اصول وضوابط کی خشت اساس حقوق العباد کی درستگی کے ہمہ وقت عملی ارتکاز پر قائم تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اگر اوراد و وظائف میں غفلت وکوتاہی ہوجاتی تو حضرت حکیم الامت ؒ فرماتے کہ کوئی بات نہیں دوبارہ شروع کردو اللہ رحیم و کریم ہے، لیکن اس کے برخلاف حقوق العباد میں ادنی سی کمی بیشی اور غفلت وکوتاہی پر کبیدہ خاطر ہوجاتے تھے اور غلطی پر خاطر خواہ گرفت و باز پرسی کے بعد اصلاح کی جاتی تھی، درس عمل و تربیت کے اس پہلو کو کوتاہ فہم اور سطحی لوگ اصلاح احوال کے بجائے ان کی سخت گیر طبیعت سے تعبیر کر کے ان کی ذات کو ہدف و تنقید اور نکتہ چینی کا موضوع بنایا کرتے تھے، ایسے ہی کسی موقعہ پر کچھ سخن طراز لوگ اسی طرح کی غیب جوئی میں مصروف تھے کہ ”حضرت جی مزاج کے کڑوے اور اصول کے بہت سخت ہیں حالانکہ ہمیں بھی بہت سے بزرگوں کی مجالس میں بیٹھنے اور شریک ہونے کا اتفاق ہوتا ہے ایسی سخت گیری اور بات بات پر پکڑ تو ہم نے کہیں بھی نہیں دیکھی کہ معمولی معمولی باتوں پر سرزنش ہوتی ہے“، محاورہ مشہور ہیکہ ”بات ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی“، اسی کے مصداق یہ عیب جویانہ تنقیدی کلمات حضرت حکیم الامت ؒ کی سماعت تک بھی جا پہونچے، مجلس میں کسی کو

بالخاص مخاطب بنائے بغیر فرمایا کہ جسے معلوم ہے سو معلوم ہے اور جسے معلوم نہیں وہ بگوش التفات ذہن نشین کر لے کہ کہن سالہ طبعی بزرگی تو اختیار سے باہر ہے البتہ اس کے علاوہ نہ ہی تو میں بزرگ ہوں، نہ ہی بزرگی کا دعویدار ہوں اور نہ ہی طلبگار ہوں اور نہ ہی میری خانقاہ بزرگ بنانے کی ٹکسال ہے لہذا جس کسی کو بزرگ بننا ہو ولی بننا ہو غوث یا قطب بننا ہو وہ جہاں چاہے جا سکتا ہے البتہ جس کسی میں آدمی بننے کی طلب ہو وہ میرے پاس آ سکتا ہے کیونکہ ولی و بزرگ بننا بہت آسان ہے مگر آدمی بننا ہی سب سے زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ اس کا تعلق بین الخلائق حقوق و معاملات سے ہے حقوق و فرائض اور مختلف اساسات پر قائم رشتوں میں توازن قائم رکھنا ہی دراصل کمال انسانیت اور شرف آدمیت ہے۔

عجیب تذبذب و مخمصہ ہے اپنے ہی مضامین کے بارے میں بطور مقدمہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ بجز اس مبنی بر واقعہ اعتراف کے کہ مضمون نگاری کے فنی تقاضوں سے لاعلمی کے سبب برملا کہا جا سکتا ہے میں اس حقیقت سے قرار واقعی واقفیت نہیں رکھتا کہ اس مقبول صنف کی نزاکتیں کیا ہیں، فنی لحاظ سے اس کے اجزائے ترکیبی سے تربیت پانا کسے کہتے ہیں، زبان و بیان اور تأثرات کے وہ کون سے مراحل و عوامل ہیں جس سے گذر کر قاری کے دریچۂ فکر و نظر پر دستک دی جا سکتی ہے، غرض کہ حقیقت کے پیرائے میں جاں بخشی اسی اقرار و اعتراف میں مضمر ہے کہ واقعتاً نہ تو میں مضمون نگار ہونے کا مدعی ہوں، نہ قلم کار ہوں، نہ ہی قلم کاری کا دعویدار ہوں البتہ علمی کم مائیگی کے باوجود زیبائی و رعنائی سے مرصع اس صفت جمیل کا بعون اللہ بایں طور طلبگار اور متلاشی ضرور رہتا ہوں جیسے خواجہ الطاف حسین حالی رحمہ اللہ نے تو علم کے بارے میں کہا تھا کہ یہ صفت عالی جہاں ملے جس سے ملے جس قدر ملے بلا تاخیر فوراً لے لینی چاہیے، لیکن میں اس خصوص کا عموم پر اطلاق کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ خامہ فرسائی کی یہ صفت جمیل جہاں ملے جس سے ملے جس قدر ملے بقدر ظرف ضرور لے لینی چاہئے، تجزیاتی سطح پر بالفاظ مختصر یہ ہے کہ بزرگوں کے فیض

عرفانی اور توجہات روحانی سے نوشتۂ فکر وخیال کو مختلف زاویوں سے آراستہ کرنے کی ایک کوشش ہے، گلستان علم وادب کے قوس وقزح کا مآل اندیشانہ مطالعہ فکری رونقوں کو مرصع ومجلیٰ اور مزکی کرنے کے ساتھ اس کی آبیاری میں اساسی حیثیت رکھتی ہے، گھر کے علمی ماحول اور والدین کی تربیت کے نتیجہ میں راقم کو عمر طفلانہ سے اسی ذہنی اور فکری ورزش کا عادی بنادیا تھا، اور اس پر مستزاد کہ گذشتہ ایک طویل وقت سے ماہ بہ ماہ دارالعلوم وقف دیوبند کے اردو ترجمان ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم وقف دیوبند'' کے اداریہ مرتب کرنے کی ذمہ داری بھی راقم السطور سے متعلق ہے، زیر نظر کتاب دراصل انہی اداریہ نویسیوں کی ایک مجموعی شکل ہے جس کو بالفاظ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بتقاضائے وقت کیفیات ذہنی اور واردات قلبی کی صورت میں فکر انسانی پر مرتب ہونے والے بہمہ لحظہ تغیر پذیر احوال وآثار افکار وخیالات اور احساسات ومدرکات اور شذرات کی خامہ کشی ہے، عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی سلّمہٗ نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند و ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی نے عرق ریز جہود کے ساتھ ترتیب وتدوین کے ساتھ جملہ مضامین کو بغائر نظر ثانی سے گذار ''خامۂ گل ریز'' کے دلآویز عنوان سے معنون کیا ہے۔ جس کا بصورت مجموعۂ مضامین منصۂ شہود پر ظہور دل کو اطمینان دلاتا ہے کہ ان شاء اللہ کسی نہ کسی مرحلے پر یہ کوشش وکاوش راقم سطور سمیت ان کے لیے اور بہمہ نوع جملہ شرکائے کار کے لیے دعائے مستجاب کا وسیلہ ثابت ہوسکتی ہے۔ یہی حاصل محنت بھی اور یہی وہ گوشۂ فکر ہے جو خامۂ گل ریز کی اشاعت کی قرار واقعی علت اصل ہے، ترتیب مضامین میں جو فکر صحیح زیر قلم آیا وہ محض فضل حق جل مجدہ کی عطا ہے اور خطا ونسیان سراسر میری کم مائیگی علم پر دلیل ہے اس جانب راہنمائی موجب تشکر ہوگی۔

محمد سفیان قاسمی

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

۲۵ رصفر المظفر ۱۴۴۴ھ

مقامِ عبدیت

حج وعمرہ: شرفِ عبدیت

ماہ ذی الحجہ! یعنی حج کا مہینہ، اپنے خالق ومالک سے برہنہ پا وبرہنہ سر والہانہ عشق کے اظہار کا مہینہ، لاریب کہ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو بارگاہِ الٰہی میں اپنے عشق کے والہانہ اظہار کا موقع نصیب ہوا اور خوش قسمت ترین ہیں وہ حضرات جن کے حج کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمایا جائے گا، وہ کون ہے؟ اس کا علم صرف باری تعالیٰ ہی کو ہے، البتہ کبھی کبھی اپنے مقربین کو بشارت سے بھی سرفراز فرمادیا جاتا ہے۔

فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نوراللہ مرقدہ نے ایک موقع پر بڑا عجیب وغریب واقعہ تحریر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ان کی رہائش گاہ پر زیارت کے لئے حاضر ہوا، حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ مولوی رشید احمد میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا، رات خواب میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت نصیب ہوئی، آپ نے فرمایا کہ امداد اللہ اس سال تین لاکھ لوگوں میں ایک شخص کا حج قبول ہوا اور اس کی طفیل میں حق تعالیٰ نے تمام حجاج کے مجمع کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمادیا ہے، پوچھا کہ اے اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام وہ کون خوش نصیب ہے جس کی بدولت حق تعالیٰ نے تمام حجاج پہ اپنی رحمتوں کی بارش کردی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نشاندہی فرمائی، یہ خواب سننے کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ رشید احمد ہم تو ہندوستان نہیں جاسکتے تم فلاں صاحب سے ملنا اور ان سے ہمارا

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ مطابق اکتوبر ۲۰۱۶ء، جلد: ۷، شمارہ: ۷۸)

سلام اور دعاء کی درخواست پیش کرنا، لیکن خیال رہے کہ ان کے نام کا چرچا نہ ہو۔

واپسی پر حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اس شخص سے ملاقات فرماتے ہیں، حال واحوال کے بعد حج کا ذکر ہوتا ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت میری ایک عرصہ سے تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے حج کی سعادت سے سرفراز فرمادیں آپ دعاء فرمادیں، حضرتؒ کو تعجب ہوا پوچھا کہ کیا تم نے حج نہیں کیا؟ کہا کہ حضرت میں گذشتہ کئی برسوں سے حج کے لئے پیسے جمع کر رہا تھا اور اس سال زادِ سفر بھی مکمل کر لیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حکم نہیں ہوا بلاوا نہیں آیا ہے، اور واقعہ یہ پیش آیا کہ حج سے چند ماہ قبل میری اہلیہ حمل سے تھی کہ ناگہاں ایک رات اس نے بھنے ہوئے گوشت کی فرمائش کی اور ایسی ضد پکڑی کہ ابھی اور اسی وقت چاہئے، بہت سمجھایا کہ اس وقت رات کے دو پہر گزر چکے ہیں، کہاں سے اور کیسے تیری فرمائش پوری کروں، نوبت بایں جا رسید کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اسکی طبیعت کا یہ تأثر اس کے بطن میں پل رہے بچے کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو جائے، بادل ناخواستہ محض اس دل جوئی کی خاطر باہر نکلا، پڑوس کے ایک گھر سے گوشت کے بھننے کی خوشبو آرہی تھی، اس ناوقت تیاری طعام پر حیرت کے ساتھ میری جان میں جان آئی، پڑوسی کو صورتحال بتائی اور گوشت کے طلب کرنے کی درخواست کی، لیکن پڑوسی باصرار تمام بھی ایک بوٹی گوشت دینے کو تیار نہ ہوا، اور اصرار وانکار کی اس طوالت سے اس پر گریہ طاری ہو گیا، گریہ وزاری کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اس کے گھر میں گذشتہ تین روز سے فاقہ ہے، تا آں کہ بچوں کی بھوک اور صبر جب بے برداشت ہو گئی، تو حالات سے مجبور اس شخص نے رات کے اندھیرے میں ایک کتا مارا اور یہ اسکا گوشت بن رہا ہے، میرے دل میں خیال آیا کہ لعنت ہے تیری غفلت ولا پرواہی پر کہ تیرا پڑوسی تین روز سے بھوکا ہے تو حج کرنے جا رہا ہے، کیا خاک قبول ہوگا، اس خیال کے آتے ہی میں نے پڑوسی سے تمام ناجائز اشیائے خوردنی تلف کروائے اور میرے پاس جتنی رقم حج کے لئے جمع تھی اس کے حوالے کر دی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر ایک طرف اس شخص کے اخلاص اور دوسری طرف حق تعالیٰ کے نزدیک اس کی عظمت ومقبولیت جس کی گواہی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں مجھ پر ایک رعب وسکتہ سا طاری ہوگیا۔

گزارہ جس نے اپنی زندگی کو دین فطرت پر
نگاہ رب العزت میں وہی بندہ مظفر ہے

نیت پر قبولیت ونزول رحمت کا یہ ایک شاندار اور عجیب وغریب واقعہ ہے کہ اگر نیت میں اخلاص اور طبیعت میں ایثار ہو تو حق تعالیٰ گھر بیٹھے ہی حج جیسی عظیم عبادت کے نتائج سے سرفراز فرمادیتے ہیں، جبکہ غرض آلود نیت سے اگر یہ مبارک سفر کیا جائے تو یہ بھی محض ایک عام تفریحی سفر بن جاتا ہے، کیونکہ جہاں ایک طرف حکم ہے ''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰه'' (۱) وہیں دوسری جانب بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بھی فرمادیا ''وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ'' (۲) اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت وجلال، رحمت وشفقت سے انسان کا دل ودماغ اور فکر وسوچ متأثر ہو اور اسی کے زیر اثر اپنے اعمال کو انجام دے، اسی کا نام تقویٰ ہے جس کے نتیجہ میں انسان کی روح حق تعالیٰ کے خوف وخشیت سے معمور رہتی ہے اور اس کیفیت کا لازمی ومنطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ایک طرف اس کی عبادت وریاضت میں سرگرمی پیدا ہوجاتی ہے دوسری طرف اس کی فکر اسی سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے، نیز اسی خوف وخشیت کے سبب اس کا اظہار انسان کے افعال واعمال اور عبادت وریاضت میں نیازمندی وفنائیت کی شکل میں ہونے لگتا ہے، کیونکہ تقویٰ سے ہی نفس کی اصلاح اور روح کی تربیت ہوتی ہے۔لہٰذا جوں جوں نفس کی پاکیزگی بڑھتی ہے اس میں اخلاص پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں تقویٰ

(۱) ترجمہ: اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا پورا ادا کرو۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۹۶)
(۲) ترجمہ: لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ (سورۃ الحج: ۳۷)

کا اطلاق کبھی خوف وخشیت پر، کبھی بندگی ونیاز مندی پر اور کبھی پاکیزگی قلب وروح پر ہوا ہے، چنانچہ وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ (١) سے مراد خوف ہے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (٢) سے مراد عبادت وبندگی اور ''وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ''(٣) میں تقویٰ سے مراد پاکیزگیٔ نفس اور طہارت قلب ہے، اسی لئے قرآن کریم نے انسانوں کی قدر منزلت ناپنے کا معیار اور امتیاز تقویٰ کو قرار دیا ہے گویا کہ اسلام میں کسی شخصیت کے لئے معیار فضیلت وافتخار اگر کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ ہے، اسی لئے آیت حج میں ''وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى'' (٤) کو بہترین زادراہ اور توشہ قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اس سے ایک معنوی مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے اور وہ یہ کہ مادی توشۂ سفر کے علاوہ ایک معنوی زادراہ کی بھی بہت ضرورت ہے، جسے مہیا کئے بغیر حج کی عبادت مکمل نہیں ہوتی ہے اور وہ پرہیزگاری وتقویٰ ہے، جو کہ حج بیت اللہ کی قبولیت کی ضامن بنتی ہے۔

وباللّٰہ التوفیق

---

(١) ترجمہ: اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دل میں رکھو۔ (سورۃ البقرۃ:٤١)

(٢) ترجمہ: دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے۔ (سورۃ آل عمران:١٠٢)

(٣) ترجمہ: اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کریں، اللہ سے ڈریں، اور اس کی نافرمانی سے بچیں تو وہی لوگ کامیاب ہیں۔ (سورۃ النور:٥٢)

(٤) ترجمہ: اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیوں کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ (سورۃ البقرۃ:١٩٧)

عبادتِ حج معراجِ عشق

حج کی حقیقت پر اگر اجمالی نظر ڈالی جائے تو اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی روحانی قوتوں کی ابتدائی شگفتگی کے زمانے سے لے کر دنیا کی آج تک کی مذہبی و روحانی کیفیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اقوام عالم میں ہمیں عبودیت اور بارگاہ حق جل مجدہٗ میں جذبات نیاز پیش کرنے کے رنگارنگ اور مختلف النوع طریقے ملیں گے جو کہ عبد و معبود کے درمیان اس ذات اعلیٰ کے ساتھ بندے کی وابستگی نیاز و عقیدت مندی اور والہانہ پن کا عکاس ہوتے ہیں جس کو انسان کے اعضاء و جوارح کی مختلف حرکات و سکنات کے آئینے میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے اور احکامات الٰہیہ کے تناظر میں حق و باطل کی حقیقت تک بشرط ہدایت پہنچا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ نیازمندی کے دو طریقے اور دو رویے ہمارے سامنے آتے ہیں ایک کی حیثیت خادمانہ ہوتی ہے جب کہ دوسرے کی کیفیت عاشقانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ اول الذکر نیازمندی کے لئے لازمی ہے کہ بندہ درباری لباس پہن کر ادب و وقار کے تمام ظاہری و باطنی مستلزمات کے ساتھ مالک حقیقی کے دربار عالیہ میں حاضر ہو کر اس کے عطاء کردہ احکام و اوامر کی اطاعت کا ظاہراً و باطناً تصدیق باللسان اور تصدیق بالقلب کے واجب تقاضوں کے ساتھ اقرار کرے اور غلامانہ ہیئت اختیار کرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر حکم شاہی کا منتظر رہے، جھک کر تعظیم بجالائے اور زمین پر اپنے انتہائی تذلل کے اظہار کے لئے اپنے سب سے محترم و مکرم

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ مطابق اگست ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۱۴)

حصۂ جسم سر اور ماتھا رکھ دے یہی مجملاً نماز کی حقیقت ہے جب کہ نیاز عاشقانہ میں ضروری ہے کہ جس جگہ کی نسبت احکام الٰہیہ کے طفیل ایمان وایقان کی روشنی میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ مقام اقدس میرے مالک ومحبوب کی لطف وعنایات اور توجہات وتجلیات کا مرکز ومحور ہے اس کی جانب دوڑتا، لپکتا، سر کے عمامے اور ٹوپی سے بے خبر، لباس و پوشاک کی وضع معروف سے بے نیاز، زیب وزینت سے بے پرواہ **لبيك اللّٰهم لبيك لا شريك لك لبيك إن الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك**[1] کے نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا دیوانہ وار چلا جائے، نہ دل میں اہل وعیال کا خیال ہے اور نہ مال ومنال کا تصور، بس ایک دھن ہے، وارفتگی ہے، دیوانگی ہے کہ مجھے کسی بھی طرح اپنے محبوب ومالک کی تجلیات وتوجہات کی پناہ گاہ حاصل ہو جائے اور یہی کیفیت مجملاً حج کی حقیقت ہے۔

حج کے مناسک، احکام اور ہدایات دراصل ایک مومن کی طبیعت میں صبر، استقامت، حوصلہ، تواضع، تعاون، شفقت، راست فکری وراست گوئی اور سادگی ومتانت جیسی صفات پیدا کرنے کے لئے ایک روحانی وجسمانی تربیت اور اصطلاحی مشق وتمرین ہے، یوں تو سفرِ حج کی پُرشوق تیاری کا آغاز ماہِ رمضان المبارک سے ہی ہو جاتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حج پر جانے والے عملاً تیاری تو اس سے پہلے ہی شروع کرتے ہیں، گویا رمضان سے لے کر محرم الحرام کے آخر تک، تقریباً پانچ مہینے پوری دنیا میں حج کے لئے جانے والوں کی ہماہمی رہتی ہے اور تمام عالم اسلامی میں عملاً ایک طرح کی دینی حرکت جاری رہتی ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حکم کہ ''حجاج کی مشایعت اور استقبال کیا جائے'' اور اس کی قرینِ قیاس حکمت ومصلحت بھی یہی ہے کہ انہیں بھی حاجیوں کو رخصت کرنے، واپسی پر ان کا استقبال کرنے اور حج کے حالات سننے سنانے سے اس کیفیت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مل جاتا ہے، جس سے کہ ان کی سوئی ہوئی روحیں بیدار ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح تمام روئے زمین پر حج کی وجہ سے مسلمانوں کی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الحج، باب التلبية، ج۱،ص:۲۱۰،رقم:۱۵۴۹

بیداری کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ دراصل اسلام کے نظام عبادات میں حج اسلامی وحدت کا ذریعہ ہے۔اس موقع پر اطراف عالم سے سینکڑوں قوموں اور ملکوں کے لاکھوں افراد ایک ہی مرکز میں جمع ہوتے ہیں، ان کی شکلیں مختلف، رنگ مختلف، زبان ولباس جدا جدا، لیکن یہاں پہنچتے ہی سب اپنا اپنا قومی یا علاقائی لباس اتار کر ایک ہی طرز کا سادہ اور کفن بردوش لباس پہن لیتے ہیں اور سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ جاری رہتا ہے **لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریك لك لبیك.** ہر کوئی ایک ہی مرکز کے گرد گھوم رہا ہوتا ہے، سب ایک ساتھ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے نظر آتے ہیں، منیٰ میں ساتھ، میدانِ عرفات میں شانہ بشانہ، مزدلفہ میں اکٹھے، گویا ہر عمل میں، ہر فعل میں، ہر قول میں ایسی یک دلی، یک جہتی اور ہم آہنگی کا دل آویز منظر ہوتا ہے جو اک مومن کے قلب وفکر پر بہت گہرا نقش قائم کر دیتا ہے اور بشکل عبادت امت مسلمہ کا یہ اظہار وحدت دنیا کی دیگر اقوام وملل میں اسلام کی شان عظمت کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ایک مومن کی تمام اطاعت وعبادت کا محور ومرکز، نقطہ ہائے ارتکاز ذات حق جل مجدہٗ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے ماسوا اور کچھ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ہونا چاہئے۔ خلوت گاہ کے پُرشوق رکوع وسجود اور مضطرب دعاؤں سے لے کر اجتماعیت کے مظہر کمال مناسک حج تک مومن کی تمام تر عبادات کی مقصدیت، محور فکر ونظر اور حاصل جہد وعمل خوشنودی رب کے حصول کے گرد ہی رہتا ہے اور اسی جذبۂ روحانی کے دوام واستمرار کا دوسرا عنوان اخلاص فی الدین ہے۔ فرد کے لحاظ سے اگر خلوت گاہی عبادات سے قلب مضطرب کو سامان سکون اور سکینۂ قلب بہم پہنچتی ہے تو مظہر اجتماعیت حج کے ذریعہ امت کی معنوی قوت کو جلا ملتی ہے۔ بعض اہل علم نے آیت کریمہ **وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا**[1] کے ذیل میں لکھا ہے کہ عبادت حج اس آیت کی شانِ عظمت کا عملی اظہار ہے اور اس کے فوائد کے دوام کا راز استمرار عمل میں مضمر ہے گویا اگر اسی جذبۂ

ترجمہ: اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ (سورۃ آل عمران: ۱۰۳)

وحدت کے ساتھ امت اجتماعی قوت اور امکانی طاقت کے ساتھ اللہ کی رسی کو تھام لیں تو آج بھی دنیا عہد رفتہ کے مثل امت مسلمہ کی اخلاقی قدروں کے سامنے پامال ہوسکتی ہے، آج بھی اگر روشن ماضی جیسا جذب دروں اور سوز قلب پیدا ہوجائے تو دنیا کی کوئی باطل اور طاغوتی طاقت اپنی تمام تر ظاہری وجاہت اور وسائل کے باوجود کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔ امت مسلمہ میں اس جذبۂ وحدت کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھنے میں ایک سے دوسرے کو جلا ملتی ہے، شاید اسی حکمت و مصلحت کے سبب ذات حق جل مجدہٗ نے بہ شرط استطاعت اسلام کے اس مظہر اجتماعیت میں شرکت کو اسلام کا رکن اساسی قرار دے کر زندگی میں ایک مرتبہ فریضۂ حج کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے اور سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ الخ (۱) کے بین السطور کی تفصیلات و تشریحات میں مرادات ربانی بھی اس جانب مشیر ہیں۔

یوں تو اسلام کا تمام ہی عباداتی نظام خوشنودی حق اور رضائے رب کے حصول سے مربوط ہے، تاہم عبادتِ حج اس بنیادی اور اساسی مقصد عبودیت میں ظاہری و معنوی اشتراک کے سوا اپنی شان عظمت و اجتماعیت سے حاصل ہونے والی قوت و شوکت اس بندگی و اطاعت کی اختصاصی شان ہے، جس کو محض ایام حج تک محدود کر کے ہی نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ حق تعالیٰ کی رضا و مشیت کے مطابق حج کی قرار واقعی مقصدیت کو اپنے اندر زندگی کے آخری سانس تک بایں طور مستمر کرے کہ اپنے ارادوں سے لے کر افعال و اعمال اور اقوال تک میں بتمام و کمال عبادت حج کے حقیقی مقاصد ذہن میں ہمہ وقت تروتازہ رہیں۔ اس جہد مسلسل کا اثر یہ مرتب ہوگا جہاں ایک طرف انسان کی انفرادی زندگی میں صبر و استقامت، تواضع، فروتنی جیسی صفات پیدا ہوں گی وہیں دوسری جانب اس شانِ اجتماعیت سے حاصل ہونے والی بلند حوصلگی کی بدولت بحیثیت امت اجتماعی اور قومی زندگی کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوں گی اور امت کے نا قابل اختلال ہونے کی

(۱) سورۃ البقرۃ:۱۹۷

سبیل پیدا ہوگی۔ زاویۂ فکر و نظر میں وسعت و تعمق رکھنے والے اہل علم حضرات کے بقول حج کی مصالح اور حکمت کے راز دورانِ حج محض انفرادی وارفتگی حال اور عاشقانہ اور دیوانہ وار اظہار محبت میں ہی نہیں بلکہ حج کے بعد کی زندگی میں اسلام کی اجتماعی قوت و شوکت کے بہ تسلسل برقراری میں بھی مضمر ہے، تاکہ امت مسلمہ کی بکھری ہوئی اور منتشر قوتیں ایک محور و مقصد کے گرد ہمیشہ مجتمع رہیں۔

مقاصد حج کے تعلق سے عمومی سطح پر قلت معلومات یا عدم معلومات کی وجہ سے اس عظیم ترین عبادت کے ذریعہ نام و نمود یا اپنی امارت کے اظہار جیسے مذموم اور کمترین مقاصد تک محدود کر دینے کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں اگرچہ یہ اک الگ اور مستقل بحث طلب موضوع ہے، تاہم اجمالاً اس موقع پر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ حج پر جانے والے خالی الذہن حجاج کے لئے مقاصد حج کے تعلق سے ورک شاپ منعقد کئے جائیں اور کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ کے زرّیں اصول کے تحت مقاصد حج کی قرار واقعی عظمت ان کے قلوب و اذہان میں بٹھائی جائے تاکہ حج کے مطلوب نتائج و اثرات عمومی سطح پر عام ہوسکیں۔

آج دنیا میں امت مسلمہ کے تعلق سے منتشر و مضطرب احوال میں بحیثیت امت جس اجتماعی کردار کے اظہار کی ضرورت ہے اس پر سنجیدہ غور و فکر کے ساتھ اپنے زوال پذیر احوال کے اسباب و علل کو انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح تک احتسابی نقطہ نظر سے اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لے کر سمت متعین کرنا آج کی ناگزیر ضرورت ہوچکی ہے اور عبادت حج کے مناسک و مقاصد اس سنجیدہ موضوع پر غور و فکر کی ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں جس کی روشنی میں اجتماعی اہداف کا تعین آسان ہوجاتا ہے۔

ذات حق جل مجدہٗ کی شان رحمت و کرم کہ ہر سال اس ماہ ذی الحجہ میں امت مسلمہ پر شان رفعت کے اصول کا راز آشکارا کیا جاتا ہے۔ صد حیف کہ ہم اپنی ایمانی کمزوری اور یقین کی کمی کے باعث اس اہم ترین موقعہ فکر کو ضائع کرتے ہوئے حج کے مطلوب

تقاضوں اور مقاصد پر غور و فکر کیئے بغیر اس طور گذر جاتے ہیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ حق تعالیٰ ہمیں کس قدر عظیم ترین نعمت سے سال بہ سال بہرہ ور ہونے اور فیض رسانی کا نادر ترین مواقع عطا فرماتے ہیں اور ہم کتنی آسانی کے ساتھ اس موقع کو ضائع کرتے ہیں۔

بہر حال اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہے کہ حج جیسی عظیم ترین سعادت سے بہرہ ور ہونے والے خوش قسمت لوگ بایں طور بھی رشک آمیز مبارکباد کے مستحق ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی شان رحمت و کرم کے طفیل اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (۱) جیسے مقام عظمت و کرامت کی زیارت کے شرف عظیم سے سرفراز فرمایا ہے جس کے لئے قرآن کریم کی گواہی ہے لَکُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ. (۲)

وباللہ التوفیق

(۱) ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا۔ (سورۃ آل عمران:۹۶)

(۲) ترجمہ: تمہیں ایک معین وقت تک ان (جانوروں سے) فوائد حاصل کرنے کا حق ہے، پھر ان کے حلال ہونے کی منزل اسی قدیم گھر (یعنی خانۂ کعبہ) کے آس پاس ہے۔ (سورۃ الحج:۳۳)

رضائے رب جلیل کا نظامِ حق

حج کے مناسک، احکام اور ہدایات دراصل ایک مومن کی طبیعت میں صبر، استقامت، حوصلہ، تواضع، تعاون، شفقت اور سادگی جیسی صفات پیدا کرنے کے لئے ایک روحانی وجسمانی تربیت اور اصلاحی مشق وتمرین ہے، یوں تو سفرحج کی پُرشوق تیاری کا آغاز ماہِ رمضان المبارک سے ہی ہوجاتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حج پر جانے والے عملاً تیاری تو اس سے پہلے ہی شروع کرتے ہیں، گویا رمضان سے لے کر محرم الحرام کے آخر تک، تقریباً پانچ مہینے پوری دنیا میں حج کے لئے جانے والوں کی ہماہمی رہتی ہے اور تمام عالم اسلامی میں عملاً ایک طرح کی دینی حرکت جاری رہتی ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حکم کہ حجاج کی مشایعت اور استقبال کیا جائے اور اس کی قرینِ قیاس حکمت و مصلحت بھی یہی ہے کہ انہیں بھی حاجیوں کو رخصت کرنے، واپسی پر ان کا استقبال کرنے اور حج کے حالات سننے سنانے سے اس کیفیت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مل جاتا ہے، جس سے کہ ان کی سوئی ہوئی روحیں بیدار ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح تمام روئے زمین پر حج کی وجہ سے مسلمانوں کی بیداری کے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں۔ دراصل اسلام کے نظام عبادات میں حج اسلامی وحدت کا ذریعہ ہے۔ اس موقع پر اطراف عالم سے سینکڑوں قوموں اور ملکوں کے لاکھوں افراد ایک ہی مرکز میں جمع ہوتے ہیں، ان کی شکلیں مختلف، رنگ مختلف، زبان ولباس مختلف، لیکن یہاں پہنچتے ہی سب اپنا

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۷ء، جلد: ۸، شمارہ: ۹۰)

اپنا قومی یا علاقائی لباس اتار کر ایک ہی طرز کا سادہ لباس پہن لیتے ہیں اور سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ جاری رہتا ہے **لبیك اللّٰهم لبیك، لبیك لاشریك لك لبیك.** ہر کوئی ایک ہی مرکز کے گرد گھوم رہا ہوتا ہے، سب ایک ساتھ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے نظر آتے ہیں ہیں، منیٰ میں ساتھ، میدانِ عرفات میں شانہ بشانہ، مزدلفہ میں اکٹھے، گویا ہر عمل میں، ہر فعل میں، ہر قول میں ایسی یک دلی، یک جہتی اور ہم آہنگی کا دل آویز منظر ہوتا ہے جو اک مومن کے قلب وفکر پر بہت گہرا نقش قائم کر دیتا ہے اور بشکل عبادت امت مسلمہ کا یہ اظہار وحدت دنیا کی دیگر اقوام وملل میں اسلام کی شان عظمت کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ایک مومن کی تمام اطاعت وعبادت کا محور ومرکز، نقطہ ہائے ارتکاز ذات حق جل مجدہٗ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے ماسوا اور کچھ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ہونا چاہئے۔ خلوت گاہ کے پُرشوق رکوع وسجود اور مضطرب دعاؤں سے لے کر اجتماعیت کے مظہر کمال مناسک حج تک مومن کی تمام تر عبادات کی مقصدیت، محور فکر ونظر اور حاصل جہد وعمل خوشنودی رب کے حصول کے گرد ہی رہتا ہے اور اسی جذبۂ روحانی کے دوام واستمرار کا دوسرا عنوان اخلاص فی الدین ہے۔ فرد کے لحاظ سے اگر خلوت گاہی عبادات سے قلب مضطرب کو سامان سکون اور سکینۂ قلب بہم پہنچتی ہے تو مظہر اجتماعیت حج کے ذریعہ امت کی معنوی قوت کو جلا ملتی ہے۔ بعض اہل علم نے آیت کریمہ **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا**[1] کے ذیل میں لکھا ہے کہ عبادت حج اس آیت کی شانِ عظمت کا عملی اظہار ہے اور اس کے فوائد کے دوام کا راز استمرار عمل میں مضمر ہے گویا اگر اسی جذبۂ وحدت کے ساتھ امت اجتماعی قوت اور امکانی طاقت کے ساتھ اللہ کی رسی کو تھام لیں تو آج بھی دنیا عہد رفتہ کے مثل امت مسلمہ کی اخلاقی قدروں کے سامنے پامال ہوسکتی ہے، آج بھی اگر روشن ماضی جیسا جذب دروں اور سوز قلب پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی باطل اور طاغوتی

(۱) ترجمہ: اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور ٹکڑیوں میں مت بٹو۔ (سورۃ آل عمران: ۱۰۳)

طاقت اپنی تمام تر ظاہری وجاہت اور وسائل کے باوجود کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔ امت مسلمہ میں اس جذبۂ وحدت کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھنے میں ایک سے دوسرے کو جلا ملتی ہے، شاید اسی حکمت و مصلحت کے سبب ذات حق جل مجدہٗ نے بہ شرط استطاعت اسلام کے اس مظہر اجتماعیت میں شرکت کو اسلام کا رکن اساسی قرار دے کر زندگی میں ایک مرتبہ فریضۂ حج کو فرض قرار دیا ہے اور اَلْحَجُّ اَشْہُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (۱) کے بین السطور مرادات ربانی بھی اس جانب مشیر ہیں۔

یوں تو اسلام کا تمام ہی عباداتی نظام خوشنودی حق اور رضائے رب کے حصول سے مربوط ہے، تاہم عبادتِ حج اس بنیادی اور اساسی مقصد عبادت میں اشتراک کے سوا اپنی شان عظمت و اجتماعیت سے حاصل ہونے والی قوت و شوکت اس عبادت کی اختصاص شان ہے، جس کو محض ایام حج تک محدود کر کے چھوڑا جائے بلکہ حق تعالیٰ کی رضا و مشیت کے مطابق حج کی قرار واقعی مقصدیت کو اپنے اندر زندگی کے آخری سانس تک بایں طور مستمر کرے کہ اپنے ارادوں سے لے کر افعال و اعمال اور اقوال تک میں بتمام وکمال عبادت حج کے حقیقی مقاصد کے ساتھ ذہن میں ہمہ وقت تر و تازہ رہیں۔ اس جہد مسلسل کا اثر یہ مرتب ہوگا جہاں ایک طرف انسان کی انفرادی زندگی میں صبر و استقامت، تواضع، فروتنی جیسی صفات پیدا ہوں گی وہیں دوسری جانب اس شانِ اجتماعیت سے حاصل ہونے والی بلند حوصلگی کی بدولت بحیثیت امت اجتماعی اور قومی زندگی کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوں گی اور امت کے ناقابل اختلال ہونے کی سبیل پیدا ہوگی۔ زاویۂ فکر و نظر میں وسعت و تعمق رکھنے والے اہل علم حضرات کے بقول حج کی مصالح اور حکمت کے راز دورانِ حج محض انفرادی وارفتگی حال اور عاشقانہ اور دیوانہ وار اظہار محبت میں ہی نہیں بلکہ حج کے بعد کی زندگی میں اسلام کی اجتماعی قوت و شوکت کے بہ تسلسل برقراری میں بھی مضمر ہے تاکہ امت مسلمہ کی بکھری ہوئی اور منتشر قوتیں ایک محور و مقصد کے گرد

(۱) ترجمہ: حج کے چند مہینے متعین ہیں۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۹۷)

ہمیشہ مجتمع رہیں۔

مقاصد حج کے تعلق سے عمومی سطح پر قلت معلومات یا عدم معلومات کی وجہ سے اس عظیم ترین عبادت کے ذریعہ نام ونمو یا اپنی امارت کے اظہار جیسے مذموم اور کمترین مقاصد تک محدود کر دینے کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں اگرچہ یہ اک الگ اور مستقل بحث طلب موضوع ہے تاہم اجمالاً اس موقع پر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ حج پر جانے والے خالی الذہن حجاج کے لئے مقاصد حج کے تعلق سے ورک شاپ کئے جائیں اور **کلموا الناس علی قدر عقولھم** کے تحت مقاصد حج کی قرار واقعی عظمت ان کے قلوب و اذہان میں بٹھائی جائے تاکہ حج کے مطلوب نتائج واثرات عمومی سطح پر عام ہوسکیں۔

آج دنیا میں امت مسلمہ کے تعلق سے منتشر و مضطرب احوال میں بحیثیت امت جس اجتماعی کردار کے اظہار کی ضرورت ہے اس پر سنجیدہ غور وفکر کے ساتھ اپنے زوال پذیر احوال کے اسباب وعلل کو انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح تک احتسابی نقطہ نظر سے اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لے کر سمت متعین کرنا آج کی ناگزیر ضرورت ہوچکی ہے اور عبادت حج کے مناسک و مقاصد اس سنجیدہ موضوع پر غور وفکر کی ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں جس کی روشنی میں اجتماعی اہداف کا تعین آسان ہوجاتا ہے۔

ذات حق جل مجدہٗ کی شان رحمت وکرم کہ ہر سال اس ماہ ذی الحجہ میں امت مسلمہ پر شان رفعت کے اصول کا راز آشکارا کیا جاتا ہے۔صد حیف کہ ہم اپنی ایمانی کمزوری اور یقین کی کمی کے باعث اس اہم ترین مقام فکر کو ضائع کرتے ہوئے حج کے مطلوب تقاضوں اور مقاصد پر غور وفکر کئے بغیر اس طور گذر جاتے ہیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ حق تعالیٰ نے کس قدر عظیم ترین نعمت سے ہمیں بہرہ ور ہونے کا نادر ترین موقع عطا فرمایا تھا اور ہم نے کتنی آسانی کے ساتھ اس موقع کو ضائع کر دیا ہے۔

بہرحال اس میں بھی کوئی دورائے نہیں ہے کہ حج جیسی عظیم ترین سعادت سے بہرہ ور

ہونے والے خوش قسمت لوگ بایں طور بھی رشک آمیز مبارکباد کے مستحق ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی شان رحمت وکرم کے طفیل اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ جیسے مقام عظمت و کرامت کی زیارت کے شرف عظیم سے سرفراز فرمایا ہے جس کے لئے قرآن کریم کی گواہی ہے: لَکُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ. (۱)

و باللّٰہ التوفیق

(۱) ترجمہ: تمہیں ایک معین وقت تک ان (جانوروں سے) فوائد حاصل کرنے کا حق ہے، پھر ان کے حلال ہونے کی منزل اسی قدیم گھر (یعنی خانۂ کعبہ) کے آس پاس ہے۔ (سورۃ الحج: ۳۳)

حج ایک مجموعۂ عبادات

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّأْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ. (سورہ حج، آیت:۲۷)

ترجمہ: اور لوگوں میں حج کی منادی کر دیں، لوگ آپ کے پاس پیادہ پا بھی آئیں گے اور دبلے پتلے اونٹوں پر بھی اور دور دراز کی تمام راہوں سے آئیں گے۔

اس آیت کریمہ کے ذیل میں مفسرین نے لکھا ہے کہ جب ذات حق جل مجدہٗ نے اپنے خلیل خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کعبۃ اللہ کی تعمیر کے بعد حکم دیا کہ کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ کر آواز لگاؤ اور لوگوں کو حج کے لئے دعوت دو تو انہیں حیرت و تعجب ہوا کہ اس بے آب و گیاہ وادی میں جہاں میل ہا میل تک بظاہر کسی بھی آدم زاد کا وجود دکھائی نہیں دے رہا ہے کس کو آواز دی جائے اور کس طرح حج کی دعوت دی جائے؟ مقلب القلوب کی طرف سے ندا آئی کہ بحکم خداوندی آواز دینا تمہارا کام ہے اور اس صدا کو بنی نوع انسان کی سماعتوں تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی چھت پر کھڑے ہوکر بحکم خداوندی اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ آواز لگائی کہ اے بنی نوع انسان! حج کے لئے آؤ۔ بیان فرمایا مفسرین نے حق تعالیٰ جل مجدہٗ کے حکم سے خلیل اللہ کی یہ صدا نہ صرف اس دور میں موجود افراد کے کانوں تک پہنچائی گئی بلکہ عالم ارواح میں موجود قیامت تک آنے

❁ تقریظ: ''مسائل حج'' از جناب محمود عالم صاحب

والے تمام انسانوں کی سماعتوں تک اس صدا کو پہنچا دیا گیا جس کے جواب میں خوش بخت و باسعادت نفوس نے جواب میں لبیك اللّٰهم لبیك کی صدائیں بلند کیں۔ کسی نے ایک مرتبہ، کسی نے دس مرتبہ، کسی نے بیس مرتبہ، کسی نے پچاس دفعہ؛ غرض کہ عالمِ ارواح سے جس روح نے بحکم خداوندی جتنی مرتبہ اس صدا پر جواب دیا اس کے لئے اس کے حق میں اتنی ہی مرتبہ حاضری کی سعادت مقدر کردی گئی ہے۔ غرض کہ از آدم تا ایں دم از ایں دم تا آخر دم قیام قیامت تک حق تعالیٰ کی جانب سے مقدر کردہ خوش بختی وسعادت کے زیر اثر مغرب ومشرق سے، شمال وجنوب سے کشاں کشاں پاپیادہ بھی اور برسرِ سواری بھی، فضاؤں کے ذریعہ بھی، ہواؤں کے ذریعہ بھی اور بحر وبر کے ذریعہ بھی، غرض ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں بحکم خداوندی جواب دہندہ روحیں اس مقام کریم پر پہنچ رہی ہیں اور قیامت تک آخری نفس انسانی تک پہنچتی رہیں گی۔

چنانچہ اسلام کے اہم ترین رکن حج کے تعلق سے عامۃ المسلمین کو ضروری اور بنیادی معلومات اور تعلیم فراہم کرنا بلاشک وشبہ ایک صدقہ جاریہ ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر صدقۂ جاریہ کی حصہ داری بہت سے خوش بخت و باسعادت لوگوں کے حصے میں آئی اور مزاج وذوق اور ضرورت کے مطابق مختصر اور مطول کتب دستیاب ہیں، تاہم ضرورت تھی کہ نہ ہی تو کتاب اتنی مفصل ہو کہ لوگوں کے لئے اس کو یادداشت میں محفوظ رکھنا مشکل ہوجائے اور نہ ہی اتنی مختصر ہو کہ عام آدمی کی ذہنی تشنگی خلجان باقی رہ جائے۔ اور اس کے علاوہ زبان وبیان اس قدر سہل اور سلیس ہو جو کہ ہر کس وناکس کے لئے قابل استفادہ ہو۔ مؤلف محترم جناب محمود عالم صاحب نے زیرِ نظر کتاب میں ان امور کو پیش نظر رکھا ہے۔

دعاء ہے کہ حق تعالیٰ اس تالیف اور کوشش وکاوش کو موصوف کے حق ذخیرۂ آخرت بنادیں اور قبولیت ومقبولیت کی سرفرازی کے ساتھ اس کے افادہ کو عام فرمائیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰه.

سیرتِ رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

طلعتِ صبحِ درخشاں کے خدّ وخال ہیں یہ

اسلام دین فطرت ہے، یہ ایک ایسی بدیہی اور مدلل حقیقت ہے جس کو دورِ قدیم سے لے کر دورِ جدید کے حکماء، عقلاء، فلاسفہ نے عقل و دانش، دلائل و براہین، منطقی موشگافیوں اور مطالعۂ فطرتِ انسانی کی روشنی میں خواہ توصیفی زاویئے سے، خواہ تنقیدی نقطۂ نظر سے جب جب کسوٹی پر جانچا پرکھا، اس حقیقت کی ابدی صداقت کے سامنے عاجز ہی نظر آئے، یہ الگ بات ہے کہ عقل وخرد پر تعصّبات وعناد کے دبیز پردے یا بربنائے مختلف تحفظات اس حقیقت کی صداقت کو جاننے کے باوجود اظہار میں حائل نظر آتے ہیں۔ تاریخ و سیر کے بے شمار احوال و واقعات اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔ ابوجہل و ابولہب یا اسی قبیل کے ان کے ہمنوا دشمنانِ اسلام بھی اپنی خلوت گاہوں کی مجالس میں اسلام کی حقانیت اور اس کی اثر پذیری کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ مکی دور میں ظلم وتعدی کے واقعات بذاتِ خود اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ تمام دلائل و براہین حق تعالیٰ کی جانب سے ودیعت شدہ انسان کی فطرت سلیمہ کے سامنے دم توڑ دیتے ہیں اور اپنی انا کی یہ شکست ظلم وتعدی کی صورت اختیار کر جاتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سابق ولاحق اور دورِ حاضر کے قرون میں پیامِ امن وسلامتی اور ارتقائے انسانیت کے راز اگر مضمر ہیں تو وہ صرف دین فطرت، دین اسلام میں ہی ہیں

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق مارچ ۲۰۱۶ء، جلد: ۷، شمارہ: ۱۷)

جو کہ تا قیامِ قیامت بلاتفریقِ علاقہ واقوام اور تمام زمانوں پر احسان بن کر آیا ہے اور اسلام نے ہی انسان کی فطرت میں پوشیدہ معنوی و باطنی خوبیاں یعنی باطن انسانیت میں مستور اوصاف میں تبدیلی لا کر ارتقائی راہ کو انسانیت کے لئے ہموار کیا۔ اس حقیقت انسانی پر قرآن کریم نے ان الفاظ میں مہر صداقت ثبت کی ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم. ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ. اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُون. (۱)

دین اسلام کی اس رفعتِ شان کو ذاتِ حق جل مجدہٗ نے دین و دنیا کی تمام تر اور بتمام وکمال عظمتوں وعزتوں سے مربوط کر کے انسانیت پر اپنی رحمتوں کے دروازے وا کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی عظمت میں کیسے کلام ہوسکتا ہے؟ محسن کونین، احمد مجتبیٰ محمد رسول اللہ ﷺ فداہ امی وابی کے جاں گسل مجاہدات، صداقتیں، زمانے کی کروٹیں، حوادث وآلام کی لاتعداد موجوں کا مقابلہ، فروغ دین حق کی تمنائیں اور کلمۂ حق کی وسعتوں، رفعتوں اور گہرائیوں کی طرف فطرتِ سلیمہ کی حامل انسانیت کی اجتماعیت کا جذبۂ صادق اور شیرازہ بندی جیسے عوامل ہی اس ارتقائے انسانیت کی اساس ہیں۔ تاریخ بنی نوع انسانی کی اس عظیم الشان کامیاب انقلابی تحریک کی خشتِ اول اور مرکزی و بنیادی اکائی علم اور اخلاق کو ہی بطور محرکِ انقلاب تسلیم کرنے پر مجبور نظر آتی ہے، جس سے ذاتِ حق جل مجدہٗ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کو بتمام وکمال متصف فرما کر جہاں ایک طرف سلسلۂ نبوت کا اختتام فرما کر اعلان کر دیا کہ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ. (۲) وہیں

---

(۱) ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔ پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، تو ان کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (سورۃ التین: ۴-۶)

(۲) ترجمہ: (مسلمانو!) محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں، اور تمام نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں۔ (سورۃ الاحزاب: ۴۰)

دوسری طرف تا قیام قیامت بنی نوع انسان کی نجاح وفلاح اور ظاہری ومعنوی ارتقاء سے مربوط بحیثیت آخری اور اکمل ترین دین کی حیثیت سے دینِ فطرت کو اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۱) سے اکملیت وکاملیت کی سندِ عظمت سے سرفرازی ملی، جہاں اہل ایمان کی مختصر سی جماعت ایک لاکھ چوبیس ہزار تک پہنچی، یہ اسی ذاتِ برحق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فیض جاوداں ہے جن کے شب وروز المزمل والمدثر کے ترجمان تھے، جنھوں نے یہودیوں کی افترا پردازیوں، نصاریٰ کی گمراہیوں اور کفر کی یلغار کا علم واخلاق، حکمت وفراست، شجاعت و قدرت اور جود وسخا کے ہتھیاروں سے مقابلہ کیا اور ایک ایسا نظام، ایک ایسا ضابطۂ حیات انسانیت کو عطا فرمایا جو کہ اقوامِ عالم کی تا ابد کامیابیوں کا ضامن ہے، جن کی حیات مبارکہ کا ایک ایک پل توحید باری تعالیٰ کی تبلیغ وتذکیر کو عام کرنے اور مخلوق خدا کی محبت و فکر میں گذرا اور رحمت عام بن کر قلوب میں، اذہان میں، روح میں اور مومن کے رگ و ریشہ میں ان کی جان سے زیادہ عزیز ترین بن کر ان کا نگراں بنا، حیاتِ مبارکہ کا ایک ایک لمحہ از پیدائش تا وصال ایک ایسی اکائی ہے جس کو فصلوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ گویا کہ اسلام کے نقطۂ آغاز سے لے کر عروج تک بنیاد واساس جس پر اسلام کی پوری عمارت تعمیر ہوئی وہ علم اور اخلاق نبوی ہی ہیں جو ذاتِ حق جل مجدہٗ نے بتمام وکمال نہ اس سے قبل کسی کو عطا فرمائے اور نہ مابعد ان سے بہتر یا ان کے مساوی کسی کے ہو سکتے ہیں کیوں کہ آپ ﷺ کے ذریعہ جس عظیم دین کی تکمیل ہونی تھی وہ آپ ﷺ کے لئے ہی مقرر تھی، کیوں کہ آپ ﷺ کو بحیثیت خاتم النبیین مبعوث فرمایا گیا، اس لئے ذاتِ حق جل مجدہٗ نے آپ کی ذات اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام میں علم، اخلاق، حیا، سخاوت، شجاعت، عفو ودرگذر اور رحمت جیسے بے شمار اوصافِ حمیدہ کو بتمام وکمال جمع فرما کر جامع الصفات وجامع الکلمات اور دنیا وآخرت کے لئے نمونۂ انسانیت بنا دیا۔ قرآن کریم

(۱) ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کر لیا۔ (سورۃ المائدۃ: ۳)

نے اپنے الفاظ معجز میں تمام صفاتِ عالیہ کو إنّك لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ (۱) جیسے رفیع الشان الفاظ میں سند عظمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ وہیں دوسری جانب حضرات شیخین رحمہ اللہ کی یہ روایت نبی کریم علیہ الصلوۃ کے مجسم قرآن ہونے کی دلیل ہے۔

عن سعد بن هشام، قال: أتيت عائشة، فقلت: يا أم المؤمنين، أخبريني بخلق رسول الله صلى الله عليه وسلم، قالت: كان خلقه القرآن (۲) یا ایسے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ فو الله انی لأعلمهم بالله و أشدّهم لهٗ خشية. نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خُلقی و خَلقی عظمتوں کے دلائل ہیں، جس کو قرآن کریم نے انّك لعلٰى خلق عظيم کے ذریعہ آپ ﷺ کے مقام عظمت و رفعت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے امت کے سامنے اپنا تعارف إنّما بُعثتُ معلّماً (۳) اور إنما بُعثتُ لأتمّم مكارم الاخلاق (۴) جیسے عظیم ترین دعاوی کے ساتھ پیش فرمایا۔ اسوۂ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ وہ پہلو ہے کہ اگر تعمق فکر و نظر کے ساتھ دلائل و براہین اور مدت العمر تعامل کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو جہاں ایک امت اجابت کے لئے ہزار ہا ہزار ہدایات اور فوز و فلاح اور نوید وعید کی راہیں روشن و تابندہ نظر آتی ہیں وہیں دوسری جانب آپ ﷺ کے سخت گیر معاندین و مستشرقین بھی یہاں آکر گھٹنے ٹیکتے نظر آتے ہیں اور ایسا ہونا ذاتِ حق جل مجدہٗ کی عطائے عام کے طفیل بنی نوع انسانی کو ودیعت شدہ اُس فطرت کا تقاضہ ہے، جس کے بارے میں الصادق المصدوق نے خبر دی کلُّ مولودٍ

(۱) ترجمہ: اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔ (سورۃ القلم:۴)

(۲) ترجمہ: بیشک آپ کے اخلاق قرآن کریم ہیں۔ (مسند أحمد، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضي الله عنها، رقم:۲۴۶۰۱)

(۳) سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحديث على طلب العلم، ج:۱،ص:۱۲، رقم: ۹۲۲

(۴) كنز العمال، الفصل الأوّل في الغرائب، ج:۳،ص:۱۶، رقم:۵۲۱۷

يُولَدُ على الفطرة فأبواه يُهوِّدانه، و يُنصِّرانه و يُمجِّسانه. [۱] دورِ مکہ کے انتہائی نامساعد اور اذیت ناک رویے جاں گسل احوال کے باوجود الصادق الامین کی معاملہ فہمی، راست گوئی و پاک بازی کا بزبانِ معاندین اعتراف و اقرار، کعبۃ اللہ میں نصب حجر اسود کے موقع پر دور جاہلیت کی قبائلی خونی روایات کے بموجب تلواریں کھنچ جانے کے باوجود آپ ﷺ کے فیصلۂ انصاف پر تمام قبائل کا متفق ہو جانا جیسے صدہا واقعات آپ ﷺ کی مابہ الامتیاز صفتِ علم و اخلاق کے ہی مظاہر ہیں۔

ذات حق جل مجدہ نے بنی نوع انسان کے سب سے برگزیدہ بندے اپنے محبوب حبیب کی ذات اقدس کو قیامت تک کے لئے نمونۂ ہدایت بنا کر بھیجا ہے جو ہمیشہ کے لئے اور سب کے لئے آئے ہیں جس سے ہر عالم و عامی، امیر و غریب، شاہ و گدا، حاکم و محکوم، راعی و رعایہ، مرد و عورت رہنمائی پا سکتے ہیں، ظاہر ہے ایسی ذات اقدس کو گونا گوں اور جامع الصفات فضائل و حسنات کا ایسا ہی اسوہ و نمونہ ہونا تھا جس کی خوبی و محبوبی و خیرخواہی اور رشد و ہدایت کا نہ کوئی مثل ہو نہ مثیل، نہ مقابل ہو نہ نظیر ہو، وہ جملہ محامد و محاسن کے اس ذروۂ کمال اور مقام رفیع پر فائز ہو جس سے ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق کسب فیض و استفادہ کر سکے، جس کو قرآن کریم نے اپنے جامع ترین الفاظ میں اس طرح فرمایا: **يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا** [۲] جس میں کسی قوم، خطہ، ملک و علاقہ اور زمان و مکان کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ تا قیام قیامت آپ ﷺ کا مرتبۂ عظمت و جلالت اور حیثیت عالی کو معیّن فرما دیا گیا ہے۔ چناں چہ بہ ہدایت ذات حق جل مجدہٗ اس نور السمٰوٰت

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، ج:۱،ص:۱۸۵، رقم:۱۳۸۵

(۲) اے نبی! بیشک ہم نے تمہیں ایسا بنا کر بھیجا ہے کہ تم گواہی دینے والے، خوشخبری سنانے والے اور خبردار کرنے والے ہو اور اللہ کے حکم سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے، اور روشنی پھیلانے والے چراغ ہو۔ (سورۃ الاحزاب:۴۶-۴۵)

والارض کے نور مبین سے ہے جس نے اپنے وجود کو جتنا منور کرلیا وہ اتنا ہی لازوال نورانیت کا ضامن بن گیا۔کوئی ذرۂ خاک سے رشک آفتاب بن کر مرتبۂ عظمت پر فائز ہوا تو کوئی نجوم و ماہتاب قرار پایا، گویا اس حلقۂ نور و نورانیت میں آکر تہی دامن کوئی نہیں رہا۔

بہرحال حکایت لذیذ بود دراز تر گفتم ،شئون اقدس اس قدر ہمہ جہت و ہمہ گیر ہیں کہ ایک ایک شان محمدیؐ میں ہزارہا ہزار تصانیف بھی تشریحی و توضیحی نقطۂ نظر سے تشنہ محسوس ہوتی ہیں۔

سورج نے ضیاء اس چشم سے لی اس نطق سے غنچے پھول بنے
اٹھا تو ستارے فرش پہ تھے بیٹھا تو زمین کو عرش کیا

قصہ مختصر یہ کہ ہم رحمت عالم سے خوشہ چینی پر قانع نہ ہوں بلکہ اس رحمت اور رحمت عظمیٰ کی فراخی وکشادگی اور اس کی مقصدیت کو اپنا نصب العین اور اپنے لئے حرزِ جاں بنائیں اور رحمت عالم کے دامن رحمت سے بذریعہ علم واخلاق وابستگی کے انداز سیکھیں جو کبھی صبر سے تو کبھی شکر سے، کبھی نور ایماں سے تو کبھی نور عرفاں سے، کبھی قدرت سے تو کبھی حکمت وفراست سے، بہرحال سعی پیہم، علم وعمل اور اخلاق و اخلاص وہ ذرائع وابستگی ہیں جن کو اختیار کرنے کے بعد ہی ذاتِ حق جل مجدہٗ کا وعدہ ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱)

دور حاضر کا مزاج ہی اختلاف وافتراق اور انتشار بنتا جارہا ہے۔ ہمارے لئے ازحد ضروری اور لازمی ہے کہ ہم اپنے اقوال، اعمال وافعال سے اپنے علم اور عمل میں یک رنگی پیدا کریں اور یہ نہ بھولیں کہ علم درحقیقت ایک نور ہے اور ذاتِ حق جل مجدہٗ کا فضل عظیم ہے: وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ

(۱) ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورۃ العنکبوت: ۶۹)

عَظِيمًا (۱) اور یہ بداہۃً ثابت شدہ کلیہ ہے کہ علم ہی عمل کے لئے وسیلۂ نورانیت ہے، جس کا اولین فرض عدل اور حلم وفہم، جس کا ظہور شجاعت وقدرت اور جس کی شان جمال جمال ہے۔ لہٰذا اپنے علم محسوسات کو اس معرفت علم اور نور علم سے جدا نہ ہونے دیں، تا کہ ہماری فکر فضائے ایمانی کی ان بلندیوں اور رفعتوں سے آشنا رہے جہاں کفر کی رسائی نہیں، جہاں حکمت ہی مآل قدرت ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا. (۲) دراصل اسی حکمت کی جانب مشیر ہے جسے قرآن کریم نے خیر کثیر سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بات محض چند عبادات واقدار پر زور دینے سے یا چند جماعتی پابندیوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ہمہ وقت اپنے علم وعمل کے ذریعہ رسالت مآب ﷺ کے اعمال، افعال، اقوال، اندازِ رحمت، اپنوں کے ساتھ غیروں کے ساتھ پیش نظر رکھیں، تا کہ ہماری نئی نسل اور دورِ حاضر کے مسلمانوں کے ساتھ، اغیار بھی اس چشمۂ فیض وکرم سے بہرہ مند ہوں، فہم رسالت، مقصد بعثت سے آشنا اور روشناس ہوسکیں جو کہ جملہ دینی، دنیوی، ذہنی اور روحانی بالیدگی کی روح ہے اور اس کا مکمل انحصار و ذمہ داری اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ (۳) کے تحت علمائے کرام کے علم وعمل میں کامل مطابقت سے ہی ثمر آور ہوسکتی ہے اور اسی مطابقت کا دوسرا عنوان دینِ فطرت ہے۔ وباللہ التوفیق.

---

(۱) ترجمہ: اور تم کو اُن باتوں کا علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے تھے، اور تم پر اللہ کا فضل ہمیشہ بہت زیادہ رہا ہے۔ (سورۃ النساء:۱۱۳)

(۲) ترجمہ: اور جسے دانائی عطا ہوگئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ (سورۃ البقرۃ:۲۶۹)

(۳) جامع الترمذي، أبواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، ج:۲،ص:۹۷، رقم:۲۶۸۲

جو یقین کی راہ پہ چل پڑے انہیں منزلوں نے پناہ دی

ذات حق جل مجدہٗ نے اپنی تخلیق کردہ تمام اشیاء خواہ وہ مشاہداتی ہوں یا حسّی ہوں اس کے حسب حال کسی نہ کسی مابہ الامتیاز خصوصیت سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی بھی تخلیق کی کوئی بھی صفت ایسی نہیں ہے جس کا مقصود فلاح انسانیت سے مربوط نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جگہ بہ جگہ اہل عقل کے لئے غور وفکر، تدبر وتفکر کی دعوت مختلف اسالیب میں دی ہے۔ چنانچہ تخلیقات ربانی کی اسی سلسلۂ خصوصیات میں گردش دوراں ماہ وسال، شہور وایام بھی شامل ہیں اور جس طرح تمام تخلیقات میں افضل ومفضول نیز فرق مراتب اور اس کے اثرات ومؤثرات ہوتے ہیں، ٹھیک اسی نہج پر گردش ایام میں بھی افضل ومفضول اور فرق مراتب کے اثرات پائے جاتے ہیں اور جس طرح ایام و شہور میں جمعہ کی فضیلت ازروئے سورۃ الجمعہ یا رمضان المبارک کی افضلیت مختلف اسالیب میں دلالۃ النص یا احادیث نبویؐ سے ثابت ہے، اسی طرح احادیث میں ماہِ رجب کے فضائل کا بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر ملتا ہے اور اس میں غور وفکر اور عمل کرنے والوں پر اس کے سربستہ راز بھی کبھی کبھی حسب مشیت خداوندی منکشف ہوجاتے ہیں۔ ماہِ رجب کا آغاز ہے لہٰذا خیال ہوا کہ عامۃ الناس کے فوائد کے نقطۂ نظر سے ماہِ رواں کے اداریہ کا موضوع یہی قرار دیا جائے۔

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (رجب ۱۴۳۹ھ مطابق اپریل ۲۰۱۸ء، جلد: ۹، شمارہ: ۹۷)

ماہِ رجب بعض تکوینی وشرعی واقعات کی بنا پر کچھ مخصوص دروس و حکم کا حامل مہینہ ہے۔ ماہِ رجب کا اہم ترین واقعہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ایک عظیم الشان معجزہ اور آپ ﷺ کی عظمتِ شان، رفعتِ بالائے وہم وگمان اور عنداللہ محبوبیت و مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔ سفرِ معراج کا اجمالی ذکر تو قرآن کریم کی اس آیت میں ہے: سُبۡحَانَ الَّذِیۡ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلاً مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَی الَّذِیۡ بَارَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ.[1]

کتب صحاح میں سفر معراج کی تفصیلات آئی ہیں اور اُن تفصیلات کے ضمن میں نماز جیسی جامع اور عظیم الشان عبادت کی فرضیت، جلیل القدر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات، آسمانوں کے اسرار و رموز اور جنت و دوزخ کی سیر اور بے شمار عجائبات قدرت کا ذکر ہوا ہے۔ اب ان تفصیلات کو قرآن کریم کی اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح سمیٹ دیا ہے انسانی کلمات میں اس اعجاز، ایجاز، بلاغت اور جامعیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ادنیٰ تامل کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت کریمہ بھی قرآن کریم کی ان آیتوں میں سے ہے جن کو قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

سفر معراج حقیقت میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ مذکورہ آیت میں سب سے پہلا لفظ 'سبحان' آیا ہے جو عربی زبان میں 'اللہ' کی جانب اضافت کے بعد تعجب تحیر اور خارقِ عادت چیز کے ظہور پذیر ہونے پر استعمال ہوتا ہے۔ خود اردو زبان میں بھی جب ہم کسی استعجابی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں تو بے اختیار زبان سے 'سبحان اللہ' ہی نکلتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا اطلاق کسی مسرت انگیز استعجابی کیفیت کے ظہور پر زیادہ ہوتا ہے تاہم یہ صیغہ تعجب ہی کے لئے ہے۔ خدا تعالیٰ علیم و خبیر ہے، از ازل تا ابد

(۱) ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے۔ (سورۃ الاسراء:۱)

ہر شیئ اس کے احاطۂ علم میں ہے، اسی وجہ سے اس کا کلام کامل بھی ہے اور مکمل بھی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ پراگندہ دماغ اور کج فہم و کج عقل انسان واقعۂ معراج کے امکان اور امتناع پر فلسفیانہ موشگافیوں اور سائنسی و منطقی دلیلوں کے سہارے بحث و تنقید کا دروازہ ہی نہیں کھولیں گے بلکہ اس کو مذہب اسلام پر رد و تنقید کا میدان جنگ بنا ڈالیں گے، اس لئے اس ایک جملہ سے تمام اعتراضات، شکوک و شبہات کا یکسر دروازہ ہی بند کر دیا کہ اس مادی دنیا میں اگر کوئی حیرت انگیز روحانی واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اس عظیم ہستی کی قدرت و اختیار کا ایک ادنیٰ نمونہ ہوتا ہے جو پلک جھپکنے میں اپنے مخصوص بندے کو ارض و سماء کی سیر کرا دیتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ واقعۂ معراج ایک معجزہ ہے اور معجزہ کہتے ہی اسے ہیں جس کو انجام دینے سے انسان عاجز ہو اور خود انسانی عادت اور طاقت سے بھی بلکہ اس کے تصور و گمان سے بھی ماوراء ہو۔ ایسے لفظ 'سبحان' کی تعبیر کس قدر برمحل ہے، یعنی اسی واقعہ کو اگر انسان انجام دینے لگے خواہ وہ پیغمبر بلکہ پیغمبروں کے سردار اور سلسلہ پیغمبری کی آخری کڑی ہی کیوں نہ ہو ہرگز انجام نہیں دے سکتے، اس لئے خارق عادت مافوق الفطرت اور انسانی قدرت سے مافوق ہونے کی وجہ سے تعجب خیز ضرور ہے مگر ان کے لئے جو اس قادر مطلق کی قدرت کاملہ کے سامنے پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ عظیم القدرت ذات جب خود اس کا ارادہ کرے تو اس کے وقوع میں امتناع کا سوال ہی کیا؟ اسی سے آیت کریمہ میں ''اَسْرٰی'' لفظ اختیار فرمایا گیا کہ اس قادر مطلق نے سیر کرائی نہ کہ خود سیر کی۔ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ لَيْلًا پر تنوین تقلیل کے لئے ہے یعنی یہ سفر پوری رات پر محیط نہیں تھا بلکہ رات کے ایک قلیل جزء میں مکمل ہو گیا جس کو لمحوں کے بجائے لمحہ سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا، جیسا کہ مسلم شریف کی طویل حدیث میں صراحتً اس کا ذکر ہے۔ حدیث اور سیرت کی بعض کتابوں میں تو یہاں تک ہے کہ بستر ابھی گرم تھا۔ دروازہ کھولنے سے کنڈی کو جو حرکت ہوئی تھی وہ بھی بدستور باقی تھی، اسی

لئے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی حیرت ہوئی کہ اتنی دیر میں ارض وسماء کا سفر، آیات بینات کا مشاہدہ اور بے شمار حیرت انگیز واقعات کا ظہور کیسے ہوا؟ لیکن خیال رہے کہ حیرت اور عدم یقین میں بعد المشرقین کا فرق ہے۔ آیت کریمہ میں سفر معراج کا اجمالی ذکر ہے اور وہ بھی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا، اس سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ سفر معراج کے جتنے حصہ کا ذکر آیت کریمہ میں ہے اس کا انکار کفر ہے اور بقیہ تفصیلات جو احادیث میں ہیں ان کا انکار کفر تو نہیں فسق اور انکارِ حدیث ضرور ہے۔ جس شب میں سفر معراج کا واقعہ پیش آیا رسول اللہ ﷺ حضرت ام ہانی کے گھر میں محو استراحت تھے۔ آپ ﷺ نیند اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جسم کو حرکت دے کر جگانے کے بجائے آپ ﷺ کے مبارک قدموں میں گدگداہٹ پیدا کی جس سے کہ آپ ﷺ کی آنکھ کھل گئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ بعض حضرات نے براق کو برق سے تشبیہ دی ہے کہ برق (بجلی) کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ معراج کی پہلی منزل مسجد اقصیٰ سے تھی، یہاں پہنچ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک پتھر میں اپنی انگلی سے سوراخ کیا اور پھر اس کے ساتھ براق کو باندھا۔

ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ کی امامت میں نماز ادا فرمائی۔ اس کے بعد آسمانی سفر شروع ہوتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ کے لئے ایک بہشتی سیڑھی کا انتظام کیا گیا، گویا خدائی لفٹ یا خودکار زینہ۔ ظاہر ہے کہ یہ پورا سفر معجزہ تھا اور معجزہ کا ہر جزء معجزہ ہی ہوتا ہے۔ اس سفر میں سب سے پہلے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ دوسرے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے، تیسرے پر حضرت یوسف علیہ السلام سے، چوتھے پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان پر حضرت

ابراہیم علیہ السلام سے، گویا انبیاء علیہم السلام آپ ﷺ کے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔ ساتویں آسمان سے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور خالق کائنات و محبوب کائنات اتنے قریب تھے کہ دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ جب ایوانِ قدرت سے رخصت ہوئے تو آپ ﷺ کی امت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم تحفہ نماز کی صورت میں عطا فرمایا۔ اس کے بعد حدیث میں تفصیل سے ذکر ہے کہ پچاس نمازوں کو حضرت موسیٰ کے بار بار واپس بھیجنے پر کم کراتے رہے یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں مگر ان کا ثواب پچاس ہی نمازوں کے برابر رہا، چناں چہ واقعۂ معراج کے سبب ماہ رجب بہ ہمہ دیگر وجوہ اپنے آپ میں بہت سی فضیلتوں کا مخزن ہے۔

جو یقین کی راہ پہ چل پڑے انہیں منزلوں نے پناہ دی
جنہیں وسوسوں نے ڈرا دیا وہ قدم قدم پہ بہک گئے

ذکر و فکر

کارہائے دعوت کا معیارِ قبول

دینی مدارس کے نصاب کا منتہائے مقصد طریق نبویؐ کے مطابق دعوت الی الحق ہے، سنجیدہ فکر علمائے امت کا چودہ سو سالہ تعامل اور اس کے مثبت و مؤثر نتائج اس کلیہ کی حقانیت پر گواہ ہیں کہ منحرف افکار و نظریات کی راہ میں داعیان حق کا علمی و عملی تعامل ہی سدِ راہ اور حق کے اظہار کا ذریعہ قرار پایا ہے۔ گذشتہ چودہ صدیوں میں اسلام کے برخلاف برپا کی جانے والی علمی، عملی اور نظریاتی تحریکوں کے بالمقابل صف آراء اصحاب علم و فضل کی جہود کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کی قبولیت سے کسی درجہ میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دعوت اور ابلاغ حق کی تاثیری کامیابی میں ان کی بلند کرداری کو عامل حقیقی کی حیثیت سے بڑا دخل رہا ہے کیوں کہ دعوت اور ابلاغ حق کا ذریعہ کتنا ہی سحر انگیز اور مؤثر کیوں نہ ہو لیکن اس وقت تک لاحاصل و بے سود اور اثر پذیری سے عاری ہوگا جب تک مبلغ و داعی الی الحق کی مساعی کو بلند کرداری، عالی ظرفی اور اخلاقی قوتوں کا تحفظ حاصل نہ ہو کیوں کہ داعی کی دعوت میں ان ملکات کو اساس و کلید کا درجہ حاصل ہے۔ ان ملکات سے جداگانہ حیثیت میں تحریک دعوت اشتباہ و شکوک کے دائروں میں مقید رہ کر مدعو کے قلوب و اذہان تک کبھی بھی رسائی حاصل نہیں کرسکتی ہے کیوں کہ عقل و فکر کی بنیاد پر انسانی فطرت کا اولین تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ مدعو سب سے پہلے اپنے داعی کے کردار

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (شعبان رمضان ۱۴۴۰ھ مطابق اپریل رمئی رجون ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۱۰، ۱۱۱)

اور اس کی شخصیت کا جائزہ لیتا ہے اور مشاہدہ کرتا ہے اگر داعی کی شخصیت کو ان اخلاقی ملکات و خوبیوں کا تحفظ حاصل ہے تو مدعو کا ذہن خود بخود اگر فی الفور آمادۂ قبول نہیں بھی ہے تو کم از کم سنجیدہ غور و فکر کی جانب مائل ضرور ہو جاتا ہے کیوں کہ داعی کی شخصیت عقل انسانی کے نزدیک اوصافِ حمیدہ کی حامل رہ کر ہی لائق اعتناء اور پاکیزگی کا پیکر بنتی ہے جس کا نتیجہ قبول دعوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور دعوت میں خود بخود تاثیر اور مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جب کہ اس کے برخلاف داعی کی شخصیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے کتنی ہی وجیہ کیوں نہ ہو، حسب و نسب، شکل و وجاہت طلاقت لسانی جیسی خوبیوں سے کیسی ہی آراستہ کیوں نہ ہو، بلند کرداری، عالی ظرفی اور اخلاقیات کی قوت سے اگر عاری ہے تو ایسا داعی ناپائیدار اور وقتی طور پر تملق آمیز منافقانہ اور مفاد پرستانہ تحسین تو حاصل کرنے میں کسی درجہ کامیاب ہو سکتا ہے لیکن مدعو کے قلوب و اذہان اور افکار و نظریات کے مؤثر اور دور رس انداز میں تبدیل کرنے پر کبھی قادر نہیں ہو سکتا اور نہ ان سرحدوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی پا سکتا ہے جہاں سے افکار و نظریات میں تبدیلی کے امکانات روشن ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مخاطب کی تعمیر سیرت کے لئے سب سے اعلیٰ ترین نمونہ خود داعی حق کے ذاتی کردار و اخلاق سے مربوط ہے کیوں کہ جس راہ مستقیم اور افکار و نظریات کی وہ دعوت دے رہا ہے تو کیا وہ خود بھی اس پر عمل پیرا ہے؟ کیا اس کے اقوال، اعمال اور افعال میں مطلوب تاثیری توازن بھی پایا جا رہا ہے کوئی تضاد تو نہیں ہے؟ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۱) کے پیمانۂ حق و باطل میں وہ کس مقام پر کھڑا ہوا ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جس کا مدعو و مخاطب سب سے پہلے تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ داعی کی سیرت، پاکیزہ و مصفیٰ اور جاذب قلب و نظر ہو، تا کہ داعی کی عمل سے مزین اور مطلوبہ

(۱) ترجمہ: (اے مسلمانو! کہہ دو کہ) ہم پر تو اللہ نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہے اور کون ہے جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے؟ (سورۃ البقرۃ: ۱۳۸)

اوصاف سے متصف مقناطیسی قوت زبان و بیان سے مخاطب کے قلب میں مد و جزر پیدا کر سکے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت و اسوہ اور آپ کے خلقی و کسبی ملکات منتہائے عظمت و رفعت سے مربوط ہیں جس کو قرآن کریم اپنے معجز نما لفظ ''خلق عظیم'' سے تعبیر کر کے متبعین کے لئے عمل کی راہ کو آسان کر دینے کے لئے کافی ہے اور نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں کلام اللہ کی یہ گواہی کارِ دعوت کا مؤثر لائحہ عمل بنانے کے لئے کافی ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ.(۱)

ترجمہ: اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بناء پر (اے پیغمبر) تم نے ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا، اگر تم سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔ لہٰذا ان کو معاف کر دو، ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔

داعیٔ حق کے لئے یہ ایک ایسا روشن و بین لائحہ عمل ہے جس کے بعد مزید کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اصحابِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اکمل و کامیاب ترین دعوتی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعوتی سرگرمیوں اور کامیابیوں کے پیچھے ان کی عظیم تر شخصیات، بلند کرداری اور اخلاقِ کریمانہ کی غیر متزلزل مضبوط و مستحکم فصیل کھڑی ہوئی ہے، تعامل امت کے نقطۂ نظر سے داعیانِ حق کا یہی معیار قبولیت و کامیابی کی کسوٹی قرار پاتا ہے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ.

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۵۹

متاعِ وقت

بے حد تیزی کے ساتھ گذرنے والا زمانہ جس کو قرآن کریم نے ''العصر'' سے تعبیر کیا ہے جس کی جمع اعصار ہے، گویا ہواؤں کے جھکڑ جس سے مراد تیز رفتاری ہے، اسی طرح ماہ وسال گذر جاتے ہیں، وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، جس نے اپنے وقت سے فائدہ اٹھالیا اس کے لئے عالم ناسوت سے عالم لاہوت تک کامیابیاں وکامرانیاں، صلاح وفلاح مقدر ہوگئی اور جس نے وقت کو ضائع کردیا وقت اس کو ضائع کردیتا ہے، گویا کہ وقت ایک دودھاری تلوار ہے، زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک پل کی اصل قیمت کا اگر انسان کو ادراک ہوجائے تو حقیقت واقعہ ہے کہ کھانے پینے اور دیگر لازمی ضروریات زندگی میں صرف ہونے والے وقت کو بھی وہ ضیاع وقت سے تعبیر کرنے لگتا ہے، ایک ایک سیکنڈ کو حیات اصلیہ کی کامیابی وکامرانی کے لئے بچا کر رکھتا ہے، جس کی حقیقت قرآن کریم نے وَاِنَّ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱) کے ذریعہ اہل ہوش وخرد پر ظاہر کی ہے۔

بقول شاعر:

نہ سوچو زندگی میں کتنے پل باقی بچے ہیں
یہ دیکھو ایک پل میں زندگی کتنی بچی ہے

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (ذی قعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۶ء، جلد: ۷، شمارہ: ۷۷)

(۱) ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ دار آخرت ہی اصل زندگی ہے، اگر یہ لوگ جانتے ہوتے۔ (سورۃ العنکبوت: ۶۴)

ایسا لگتا ہے کہ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے ۱۴۳۷ھ کا آغاز ہوا تھا، معلوم ہوتا ہے، پلک جھپکی نہیں اور سال پورا ہوا نہیں اور ماہ شوال المکرّم اپنے جلو میں داخلوں کی ہنگامہ خیزیاں لے کر آ بھی گیا اور گذر بھی گیا۔ نئی امنگوں، نئی تمناؤں، جواں سال حوصلوں اور مستقبل کے تعلق سے اپنی اپنی فکری پرواز کے مطابق دل و دماغ میں خواب سجائے ازمغرب تا مشرق، ازشمال تا جنوب ملک کے مختلف صوبوں و مختلف علاقوں سے ہزار ہا ہزار طلباء نے دیوبند رُخ کیا اور امتحانِ داخلہ میں شرکت کر کے اپنی اپنی قسمتوں کو آزمایا اور منجانب اللہ جن کا انتخاب مشیت حق کے مطابق مقدر تھا، وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں و فرحاں اور جو رہ گئے وہ شکستہ دل تو ہوئے، مگر اپنے حوصلوں کو جواں رکھتے ہوئے، نئے عزم اور نئے حوصلوں کے ساتھ پا مردئ مومن کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنے والے سال کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کر لی اور قرب و جوار یا اپنے علاقائی مدارس سے اپنی تعلیمی وابستگی قائم کر لی ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ نہ صرف برصغیر بلکہ انحائے عالم میں قائم شدہ تمام مدارس جو کہ مسلک صحیح کے مطابق مصروف عمل ہیں وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے اخلاص کامل اور للّٰہیت خالص کا سرچشمۂ فیض ہیں، گویا کہ دارالعلوم وقف دیوبند میں داخلوں سے رہ جانے والے طلبا محروم نہیں ہوئے بلکہ بصورت دیگر اُسی سرچشمۂ فیض سے اکتساب کر رہے ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ صدر المدرسین اول دارالعلوم دیوبند نے جن پر اکثر جذب کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی ''مکتوبات یعقوبی'' میں لکھا ہے کہ یہ ادارہ الہامی ہے، یہاں کے تمام فیصلے خواہ انتظامی ہوں یا تعلیمی، انفرادی ہوں یا اجتماعی، بصورت کامیابی یا ناکامی، حال سے تعلق رکھیں یا مستقبل سے تمام کے تمام الہام نانوتویؒ سے مربوط ہیں۔

ذات حق جل مجدہ کی بارگاہ میں بہ ہزار سجدۂ شکر کہ اس کے بیکراں فضل و کرم، صلحائے امت کی مقبول و مستجاب دعوات صالحہ، ملک کے مقتدر ترین علماء، صلحاء اور اتقیاء

پر مشتمل دارالعلوم وقف دیوبند کی مجلس مشاورت کے اراکین کی ظاہری ومعنوی توجہات اور جلوت وخلوت کی دعوات نیم شب اور بزرگانہ سرپرستی کا ہی ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دارالعلوم وقف دیوبند کو قبولیت عامہ اور رجوع کثیر سے سرفراز فرمایا ہے اور اس بے حد گراں قدر مقبولیت کا ہی طفیل ہے کہ بحمداللہ ادارہ ظاہری ومعنوی ترقیات کی راہ پر مرحلہ بہ مرحلہ گامزن ہے، لہٰذا ان تمام قابل صد شکر اور لائق ذکر واستحصان ترقیات پر بارگاہ خداوندی میں بعد حمد وثناء وسجدۂ شکر بلاشبہ تمام مخلصین ومحبین ومعاونین دل کی گہرائیوں سے موجب تشکر اور بے شمار مخلصانہ دعاؤں کے مستحق ہیں جن کو منجانب اللہ بطور وسیلۂ ظاہری بنائے جانے کے سبب دارالعلوم وقف دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانئ دارالعلوم دیوبند کی عالمی وآفاقی ،فکری وتعلیمی تحریک کو ان کے بنیادی اور اساسی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بحمداللہ سال بہ سال ایک ہزار پر مشتمل بلند فکر علماء تیار کرکے دینی آبیاری کا فریضہ انجام دے رہا ہے، جس کو بجا طور پر نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح تک تمام سنجیدہ وعلمی طبقوں کی جانب سے سند قبولیت کے ساتھ دفاع دین وعقائد اور اسلامی روایات کے تحفظ کے ذیل میں بحمد اللہ دارالعلوم وقف دیوبند قائدانہ کردار ادا کررہا ہے اور بہ طور تحدیث نعمت اور بارگاہ حق جل مجدہٗ میں اظہار تشکر کے بطور یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ دفاع دین واسلام اور تحفظ روایات اسلام کے حوالے سے حضرت نانوتویؒ کی اس عظیم الشان فکری وتعلیمی تحریک کے ذریعہ انجام دی جانے والی خدمات پر گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی تاریخ اور بانئ دارالعلوم کے خانوادہ کی جانفشاں اور عنداللہ مقبول محنتیں شاہد عدل ہیں، دارالعلوم دیوبند کی نشأۃ ثانیہ بنام دارالعلوم وقف دیوبند کے بانی عارف باللہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بقول کسی بھی ادارہ کی ظاہری ومعنوی ترقیات کا انحصار لوجہ اللہ نیت کے اخلاص ،خوف خدا اور للّٰہیت ہی پر قائم ہیں ۔ اگر ارباب ادارہ بہترین صفات سے من جانب حق نواز دیے جاتے ہیں تو بالہام خداوندی

ادارہ کے لئے مخلصانہ جذبۂ تعاون رکھنے والے افراد اللہ کی توفیق سے ادارہ کی جانب متوجہ رہتے ہیں جو نہ صرف ادارہ اور مخلصین ادارہ دونوں کے لئے عنداللہ مقبولیت کی ہی دلیل ہے بلکہ یہ کلیدی عناصر جانبین کے لئے دینی و دنیوی نقطۂ نظر سے کامیابی کی بھی ضمانت ہیں۔

سال رواں ۳۸-۱۴۳۷ھ میں ۱۰۰۰۰ر (دس ہزار) طلباء نے امتحان داخلہ میں شرکت کی ہے حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ ادارہ کو درپیش وسائل ومسائل کی مجبوریاں حائل نہ ہوتیں تو جی تو یہی چاہتا تھا کہ کوئی بھی طالب علم یہاں سے بے نیل ومرام نہ لوٹے، لیکن بہرکیف مجبوریاں تو مجبوریاں ہی ہیں، لہٰذا سابق ولاحق جدید وقدیم طلباء کی داخل شدہ تعداد کو تقریباً ۳۰۰۰ر (تین ہزار) میں سمیٹنا پڑا، کیوں کہ طلباء کے انتخاب میں عدد کی کثرت سے کمیت تو قابل ذکر قرار پاسکتی ہے، مگر اصل مطلوب کیفیت مجروح ہوجاتی ہے، لہٰذا اہل علم اور اہل فکر ونظر کی ہمیشہ کیفیت پر ہی نظر ہوتی ہے اور اسی مابہ الامتیاز صفت کے سبب دارالعلوم وقف دیوبند کو عنداللہ سند قبول حاصل ہے اور منجانب حق یہ کثرت رجوع قبولیت کی دلیل اور کامیابی کی ضمانت ہے۔

و باللّٰہ التوفیق

تعصب اور حقیقت

برطانیہ کے سفر کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ یہاں کے باشندے جن کی بے تکلف مجالس میں مجھے اکثر شرکت کا موقع حاصل رہتا ہے مسلمانوں کے خلاف اظہار غضب ازراہ لہجۂ دوستانہ مہذب انداز میں اس طرح کرتے ہیں کہ مسلمان بہت متعصب قوم ہے، جب کہ آپ یہاں پر دیکھتے ہیں کہ ہم لوگوں میں تعصب نام کی کوئی شئے نہیں پائی جاتی۔ جب میں نے اپنے روشن خیال دوست سے وضاحت چاہی کہ تعصب سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تو جواب آیا کہ تم لوگوں میں اپنے مذہب کے تعلق سے تحمل اور برداشت کا فقدان ہے جب کہ نقد و تبصرہ کو اس کے حقیقی معنی میں تحمل و برداشت کا مظاہرہ اور تہذیب جدید کی شناخت اور بلند کرداری تصور کیا جاتا ہے۔ ازراہِ گفتگو یہ واقعہ سنا کر وہ مستفسرانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے، میں نے کہا کہ مجھے آپ کے شناسا کی گفتگو سے اتفاق نہیں ہے، میں ہی کیا بلکہ کوئی بھی مہذب اور پڑھا لکھا شخص اس نظریہ کو تہمت ہی قرار دے گا۔ کیوں کہ یہ موضوع آج کوئی نیا نہیں ہے، یہ تہمت تو مسلمانوں پر برسوں پرانی ہے اور اس موضوع پر ہمارے اکابرین دیوبند سمیت علماء عرب نے بھی سیر حاصل مباحث اپنی مصنفات میں درج کئے ہیں، تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ کی ایک مجلسی گفتگو کا اقتباس نفس مسئلہ کی حقیقت اور اس کے مختصر کافی وشافی جواب کو سمجھنے میں بڑا معاون ثابت ہوسکتا ہے کیوں کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے یورپ کے دورانِ قیام جس

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (محرم الحرام ۱۴۳۸ھ مطابق نومبر ۲۰۱۶ء جلد: ۷، شمارہ: ۷۹)

بصیرت و گہرائی کے ساتھ یورپین فکر کا مطالعہ کیا ہے اسی نے ان کو مفکر مشرق کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ اور ان کے اس مصرع میں ''یورپ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے'' اسی بصیرت افروز تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کا تسلسل صدیوں پر محیط ہے اور منجملہ دیگرے اسلام اور اس کے متبعین پر از راہ عناد و حسد یہود کی طرف سے عائد کردہ بہت سی تہمتوں میں سے ایک تہمت تعصب و عصبیت کی بھی ہے۔ لہٰذا ہم بہت زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے نفس تہمت اور اس کے مدلل الزامی جواب کو علامہ اقبال کی گفتگو سے ہی سمجھ لیں تو کافی ہو جائے گا۔ فرمایا کہ:

غیر قومیں ہم پر تعصب کی تہمت باندھتی ہیں، میں اس تہمت پر ہرگز ہرگز نادم و شرمندہ نہیں ہوں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ تعصب کی لو سے ہی حق و صداقت کی قندیلیں روشن ہیں، اگر علم حیاتیات کی زبان میں بات کی جائے تو یہ تعصب دراصل ایک گروہ کی اپنی شناخت اور منفرد ہستی کو مشخص کرنے کی کوشش کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو دنیا کے تمام نظام ہائے حیات کی بنیاد و اساس ہی تعصّبات پر قائم ہے اور ان کی انفرادی بقاء کے لئے یہ تعصّبات ناگزیر بھی ہیں اور دنیا کی کوئی قوم تعصب سے خالی نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اساسات و ترجیحات ایک دوسرے سے مختلف اور احوال و مزاج کے مطابق ہیں، مثلاً آپ کسی انگریز کے مذہب پر نقد و نظر کے نشتر چلائیں، اس کے جذبات میں کبھی کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوگا مگر جوں ہی آپ اس کے وطن، اس کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کو زیر بحث لائیں گے اس کے نہاں خانۂ دماغ میں پوشیدہ تعصب کا دیو بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا، پہلی حالت میں سکون و سکوت اور دوسری حالت میں اضطراب کا سبب یہ ہے کہ برطانوی قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ جغرافیائی حد بندیوں یعنی وطن پر ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنے ملک پر نقد و تبصرہ ہوتے ہوئے دیکھ کر چراغ پا ہو سکتا ہے تو اس میں حیرت و تعجب اور اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔

جب کہ ہماری کیفیت بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک ''قومیت'' محض اک تصور ہے جس کی مادی بنیادیں مفقود ہیں۔ از روئے اسلام ہمارا واحد نقطۂ اتحاد کسی بھی خطۂ ارض میں رہنے بسنے والے مختلف انسانوں کا ذہنی اشتراک کلمۂ توحید ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' سے مربوط ہے۔ اب اگر مذہب کو ہدف تنقید بنانے پر ہمارا تعصب ابھرتا ہے تو کون سی بری بات ہے بلکہ ہم اس رویہ میں بالکل اسی قدر حق بجانب ہیں جس قدر کہ وہ انگریز اپنی تہذیب و معاشرت کو نشانۂ تحقیر بنتے دیکھ کر تلملا اٹھتا ہے۔ دونوں صورتوں میں احساس ایک ہی کارفرما ہے، اگرچہ محرکات مختلف ہیں۔

یہ تو مدلل الزامی جواب ہوگیا، البتہ کسی کے غیض وغضب کو سرد کر کے اپنا طرف دار بنانے کے لئے تحمل و برداشت کے ساتھ اخلاق کا مظاہرہ اور اس کے موثر اثرات کی بے شمار مثالیں اسوۂ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہیں، جس کے لئے سیرت طیبہ کا مطالعہ نہایت ضروری اور لازمی ہے کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے **اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلاق** (۱) کے ذریعہ اخلاق کو اسلام کی خشت اساس قرار دے کر اپنی امت کے لئے دنیا سے عقبیٰ تک کی تمام راہوں کو روشن و منور فرما دیا ہے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ

(۱) کنز العمال، الفصل الأول في الغرائب، ج:۳،ص:۱۶،رقم:۵۲۱۷

سچ اور سچائی

اہلِ فکر ونظر کے ذہنوں میں ایک سوال بار بار آتا ہے کہ دورِ حاضر میں سچ کا دم کیوں گھٹتا جارہا ہے جب کہ ہر کوئی سچ کا حامی اور دعویدار ہے۔ منافقت، ظاہر داری اور ریاکاری کو طرزِ زندگی کے طور پر قبول کرنے والے اُس معاشرے میں وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ اور سچائی کی بنیادیں اور قدریں مفقود سی ہوکر رہ گئی ہیں اور وہ کیا عوامل ہیں جس کے سبب بلاتفریق مذہب وملت قوموں کے مزاج میں بڑی تبدیلی آتی ہے اور ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اس مزاجی تبدیلی نے موجودہ دور میں تمام اخلاقی قدروں کو تہہ و بالا اور پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ غالباً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے ایک قول نظر سے گذرا تھا کہ ایک دور آئے گا جب کہ سچ کو تلاش کرنا اندھیری رات میں کالے پتھر پر کالی چیونٹی کو تلاش کرنے کے مترادف ہوجائے گا، حال کے عمومی مزاج کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ ہم شاید اسی دور میں جی رہے ہیں جس کی نشان دہی حضرت عمرؓ سے منسوب اس قول میں ملتی ہے، باہمی اعتماد کی بنیادیں شکستہ ہوگئیں، شکوک وشبہات مزاجوں میں اس طور پر راہ پاچکے ہیں کہ بات کتنی ہی معقول، کتنی ہی مدلل کیوں نہ ہو اعتماد اور یقین بہرحال متزلزل رہتا ہے، اس کو

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (صفر/ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ مطابق اکتوبر/نومبر ۲۰۱۹ء، جلد ۷، شمارہ: ۸۰،۸۱،۸۲)

بالا اختصار بطور توضیح کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عمومی سطح پر قول و عمل کا تضاد اور ظاہر و باطن میں فرق کا پایا جانا اس نوعیت کی اساسی علت ہے، اہل علم حضرات نے مختلف پہلوؤں سے اس کیفیت کا تجزیہ کیا اور اپنے اپنے علمی و مطالعاتی ذوق و فکر کے مطابق مختلف نتائج اخذ کئے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کے اسباب و علل کو کسی ایک اکائی میں مقید کر کے کوئی ایک ٹھوس نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے بلکہ معاشی، معاشرتی، سماجی، ابلاغی مختلف اسباب و علل سے ہی یہ اجتماعی مزاج بنتا ہے اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں طبقاتی سطح پر کہیں شدت اور کہیں خفت کے ساتھ یہ مزاج تو موجود رہا ہے، لیکن اپنی اثر پذیری کے نقطۂ نظر سے اس کا دائرۂ اثر یا تو بہت محدود علاقائی سطح تک رہا یا ذرائع ابلاغ کے غیر ترقی یافتہ ہونے کے سبب عمومی سطح پر لوگ اس پہلو سے ناآشنا رہے ہیں اور دائرۂ کار علاقوں تک ہی محدود رہا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ عدم معلومات کا ایک ایجابی پہلو یہ بھی ہے کہ کم از کم آپس میں حسن ظن، ظاہر داری، وضع داری، میل جول اور باہمی اعتماد و محبت کے ساتھ ساتھ، طرزِ معاشرت میں سادگی اور باہمی تعلقات کی بنیادیں مضبوط رہیں اور معاشروں میں امن و سکون اور عافیت کی کیفیات فکر و نظر اور مزاجوں پر غالب رہیں۔

مزاجوں میں تغیر یا شدت کا آغاز اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد رونما ہوا اور اس میں کلیدی کردار ذرائع ابلاغ کی ترقیات نے ادا کیا ہے، جیسے جیسے ذرائع ابلاغ میں جدت و وسعت پیدا ہوتی گئی اور عام آدمی تک رسائی آسان ہوتی گئی، ایسے ایسے ہی مزاجوں میں تغیر پیدا ہوتا گیا، بچپن کی ابتدائی یادداشتوں میں آج بھی یہ بات محفوظ ہے کہ ۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے موقع پر ریڈیو پاکستان سے خبریں سننے پر پابندی لگائی گئی اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز پر حدود و قیود عائد کی جاتی ہیں اس میں جستجو اور بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ لوگ بڑے چھپتے چھپاتے چھوٹے چھوٹے ریڈیو کو سو پردوں میں رکھ کر نہایت دھیمی آواز میں خبریں سنا کرتے تھے، اخبارات و رسائل میں خبریں حکومت کی پالیسی کے مطابق چھنٹ چھنٹا کر سینسر ہو کر شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان حدود و قیود کا کم از کم

یہ فائدہ ضرور تھا کہ عمومی سطح پر نہ ہی تو بے باک و بے لاگ تبصروں کا مزاج تھا اور نہ ہی ذہنی انتشار اور طبیعت میں خلجان کی عصر حاضر جیسی کیفیات تھی۔ دوسرے تبصرہ نگاری، ذی شعور طبقے تک محدود تھی جب کہ آج کے قدآور، متنوع اور بہ ہزار رنگ اور وسیع تر اختیارات والے ذرائع ابلاغ میں اس تبصرہ آرائی کی تخصیص کو ناپید کر دیا ہے اور طبقاتی سطح پر بلا تخصیص حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ آرائی رفتہ رفتہ مزاجوں کا حصہ اور دلچسپیوں کا محور بنتا چلا گیا ہے، تا آں کہ انحطاط پذیر مزاجوں کے سبب نوبت بایں جا رسید کہ دروغ گوئی ایک فن اور آرٹ ہو گیا ہے، یہاں تک کہ خالص علمی مسائل جو کہ اہل علم حضرات کی مجالس کا ہی امتیاز سمجھا جاتا تھا جب کہ آج ہما شما کی دو کانوں پر بیٹھ کر عامی اور ناخواندہ افراد دنیا کے ہر ایک مسئلہ پر لا حاصل بحث و مباحثہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے سے اختلافِ رائے کی صورت میں فکری و معاشرتی سطح کے مطابق اظہار غیض و غضب کے عجیب عجیب مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اب سے چند سال قبل مستند اور جید عالم دین اور میرے نہایت قابل احترام بزرگ حضرت مولانا مفتی سعید پالن پوری صاحب دامت برکاتہم نے کسی موقع پر اہل علم حضرات کی مجلس میں حدیث جساسہ پر گفتگو فرمائی اور اس پر اپنے علمی نقطۂ نظر کا اظہار فرمایا، ایک صاحب علم کو حضرت موصوف مدظلہٗ کی رائے سے علمی بنیاد پر اختلاف ہوا، یہ علمی اختلاف زبانی مباحث سے بڑھ کر تحریرات اور جواب الجواب کی شکل اختیار کر گیا اور خصوص سے تنزل کرتے کرتے عموم کی سطح پر آ گیا اور اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہاء نہیں رہی جب کہ اس مسئلے پر شدید اور دلچسپ بحث کے دوران ایک فریق کا حسب فہم دفاع کرتے ہوئے ایک خوانچہ فروش کو اپنے مخالف پر آستین سونتے ہوئے دیکھا گیا، کیوں کہ جہلاء میں اختلاف کا صرف ایک ہی مطلب ہے سب و شتم، گالی گلوچ اور مار پٹائی، حالاں کہ اس واقعہ کا تعلق خالصتاً اہل علم و فکر سے ہے، تاہم اس سے قومی فکر و مزاج کے انحطاط کا پتہ چلتا ہے کیوں کہ جب اس قسم کے علمی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی

مسائل میڈیا یا اور ذرائع ابلاغ کا موضوع بنتے ہیں تو دروغ بر گردن راوی نہیں بلکہ ہر کس و ناکس اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیصلہ کن انداز میں اپنی اپنی رائے دینا اپنا قومی فریضہ سمجھتا ہے، جس کا لازمی نفسیاتی نتیجہ ذہنی انتشار، اختلافات و افتراق اور بسا اوقات دشمنیوں پر منتہی ہوتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کا خود ساختہ عدالت و حکومت کے مناصب سے فائق سمجھا جانے والا بے لگام اور آزاد میڈیا قوموں کی مزاج سازی میں سب سے اہم اور کلیدی کردار ادا کر رہا ہے، جس سے قوموں کے منفی اور تخریبی رجحانات کو ہی روز بروز تقویت مل رہی ہے، بلکہ نفرتوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر کی جا رہی ہے۔

دورِ قدیم کے صدر مقامات میں سلطان یا والی سلطنت کی طرف سے جو عہدیدار مقرر ہوتے تھے ان میں ایک بڑا اہم عہدہ ''صاحب الخبر'' کے نام سے معروف ہوا کرتا تھا۔ شعبہ کے مرکزی عہدے پر فائز کئے جانے والے شخص کو جہاں مختلف زاویوں سے جانچ کے عمل سے گذرا جاتا تھا، اس میں سب سے اہم ترین پہلو کا تعلق معیّن شخص کی دیانت و امانت کے امتحان اور اس کے کردار و گفتار سے مربوط ہوتا تھا جو اس کے چال چلن کے جائزے کی روشنی میں طے کئے جانے کے ساتھ ساتھ اردگرد کے مختلف طبقات کی گواہیوں کا اس عہدے کی تقرری پر بڑا گہرا دخل و اثر ہوا کرتا تھا اور مرکزی منصب سے لے کر نچلے درجے کے عہدے تک جانچ کے عمل کا پیمانہ ایک ہی ہوتا تھا۔ اس محکمہ کا فرض تھا کہ وہ والی سلطنت اور ارکانِ حکومت کو ہر دم پیش آنے والے واقعات اور اس کے اسباب و اثرات کی صحیح صحیح اور بروقت خبریں پہنچائے۔ اس زمانے میں مرکزی عہدیدار کی ہی نہیں بلکہ پورے محکمہ کے لوگوں کی تنخواہیں عام سرکاری شرح وظائف سے خاصی زائد ہوتی تھیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ غضب کا توازن برقرار رکھا جاتا تھا۔ اس سلسلے کے قوانین نہ صرف نہایت سخت گیر تھے بلکہ سریع النفاذ بھی تھے۔ اس سلسلے میں قانون کی سختی کا عالم یہ تھا کہ والی سلطنت کو پہنچائی جانے والی خبر اگر کسی بھی درجہ میں جھوٹی ثابت ہوئی یا غلط پائی گئی یا سازش والزام ثابت ہو گیا تو کم سے کم درجہ میں حبسِ دوام کی

سزا یا پھر سیدھے سیدھے سزائے موت تھی، کیوں کہ اسی محکمہ کی ہی فراہم کردہ خبروں پر حکومت کی پالیسیوں، فیصلوں، نیک نامیوں اور بدنامیوں کا انحصار ہوتا تھا، انہی خبروں پر سلطنت کے فیصلوں کا استوار واختلال منحصر ہوتا تھا، گویا کہ ایک غلط خبر کے نتیجے میں بسا اوقات بڑے بڑے طوفان برپا ہوجایا کرتے تھے۔ دوملکوں میں ہولناک جنگیں برپا ہوجایا کرتی تھیں، ماضی سے حال تک مختلف تاریخی وقائع اور شہادتیں موجود ہیں۔ خوارزم شاہ کے دربار میں چنگیزی سفیر کے تعلق سے محض ایک شخص کے ذاتی جذبۂ غضب وعناد کے زیر اثر جھوٹی اور بے بنیاد خبر کے نتیجہ میں بھرے دربار میں سفیر کو قتل کیئے جانے کے سنگین ترین جرم کے سبب ایک ایسا ہلاکت خیز طوفان آیا الامان والحفیظ!!! اپنے دور کی دوعظیم سلطنتیں ایسی تاخت وتاراج ہوئیں کہ آنے والے ہر دور میں نشان عبرت کے طور پر یاد کی جانے لگی، لاکھوں بے گناہ انسان تہہ تیغ کردیئے گئے اور لاکھوں لاکھ خانماں بردار ہوگئے۔صرف یہ ایک ہی مثال نہیں بلکہ ہر دور میں مختلف علاقوں اور مختلف اقوام وملل کے تاریخی وقائع ان حقائق پر شاہد عدل اور تاریخ کے صفحات پر قوموں کی آبادی وبربادی، عروج وزوال کی بے شمار دل خراش داستانیں رقم ہیں، بالفاظ مختصر ذرائع ابلاغ کو حدود وقیود اور سخت قسم کے قانون کی جکڑ بندیوں اور ضابطۂ اخلاق کے دوائر میں رکھنا بقائے امن کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ جیسے کسی خونخوار شیر کو پابہ زنجیر رکھنا، جب جب اس شعبہ کو آزاد چھوڑا گیا تب تب امن عامہ میں اختلال کی روز بروز نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں، جس سے ثابت ہوا کہ ابلاغ میں دروغ گوئی کے سبب انسانیت کو اکثر اوقات انتہائی سنگین نتائج بھگتنے پڑجاتے ہیں جونسلوں اور صدیوں پر محیط ہوتے ہیں اور لمحوں کی خطا کی سزا صدیوں کو جھیلنی پڑتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے تاریخ کا بغور مطالعہ اور اپنے ہی اردگرد ہر پل نت نئے پیش آنے والے واقعات کا بصیرت کے ساتھ مشاہدہ ہی کافی ہے۔اقوام وملل کی تاریخ میں واقعات شاہد عدل ہیں، نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر، لمحہ بہ لمحہ ’’پیش آنے والے‘‘ یا

''پیش کیئے جانے والے'' واقعات اصول شرافت و دیانت سے عاری ابلاغ وصحافت کی دروغ گوئیوں کا ایسا گورکھ دھندہ ہیں اور منظر نامہ کچھ یوں ہے ع ہیں کواکب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ

اس طویل ترین موضوع سخن کے مختصر ترین بالائی سطور کے اقتباسات کی روشنی میں دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ ہی دراصل مقصد تحریر کی کلید ہے۔ حیات بنی نوع انسانی کے اس بے انتہا اہم اور حساس موضوع پر دین اسلام میں بہت ہی روشن اور واضح تعلیم و ہدایات موجود ہیں۔ اگر صحافت و ابلاغ میں ان زرّیں اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دیانت کے ساتھ اپنے فریضہ کو انجام دیا جائے تو آج اس دورِ انحطاط میں بھی دنیا کو امن وسکون کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے، اگر چہ یہ بات دیگر ہے کہ اخلاص و دیانت اور امن و امان کے دشمنوں کے تمام تر کاروبار کی بنیاد ہی انتشار و افتراق پر رکھی ہے اور خالص مفاد پرستانہ ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے بظاہر اسباب حقیقت کی دنیا میں اس خواب کی تعبیر کے معرض شہود پر آجانے کی آرزو اگر چہ دیوانے کے خواب کے ہی مترادف ہے لیکن ''ایک پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' کوئی بھی ہوش مند انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ صحافت کسی قوم کی تعمیر و ترقی، تخریب و تنزلی، بلندیٔ فکر و شعور، پستی و بدامنی اور اک روشن و تابناک خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مؤثر کردار اور قوم کی اجتماعی محنتوں کے نتیجے میں روشن منصوبوں کو لمحوں میں تیرہ و تاریک کردینا، غرضیکہ صحافت و ابلاغ میں تعمیر و تخریب دونوں کی بھرپور صلاحیت اور اس کی اثر انگیزیوں کے رموز پوشیدہ ہیں اور آج کے گلوبلائزیشن کے دور میں اصول دیانت و امانت کے تمام مذہبی و اخلاقی، معاشرتی و سماجی اصولوں سے آزاد خالص تاجرانہ بنیادوں بر سر عمل میڈیا سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کی ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گیا جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحافت کا بنیادی نقطہ اور محور عمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، بالفاظ دیگر اچھائی کے فروغ اور برائی کی روک تھام کے لئے علمی و عملی، قلمی و فکری صلاحیتوں کے ذریعہ مثبت سوچ کے فروغ

اور اس کے لئے ذرائع ابلاغ کے استعمال کی جدو جہد کرنا ہی صحافت کا بنیادی فریضہ ہے اور واقعتاً یہ اس قدر عظیم الشان اور رفیع المرتبت فریضہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بجا آوری ہی تمام انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہوتی ہے۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابلاغ اور خبر رسانی کس قدر مقدس میدان عمل ہے اور چوں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی اسلامی پیغام بری کا بنیادی مقصد ہے اس لئے اک داعی حق کی جو صفات قرآن وسنت سے معلوم ہوتی ہیں وہ تمام صفات ایک مسلم صحافی میں پائی جانی چاہئیں۔ بنیادی طور پر یہاں ایک سوال کا پیدا ہونا ایک فطری تقاضہ ہے کہ صحافت کا بنیادی مقصد محض اچھائیوں کا فروغ اور برائی کی روک تھام نہیں ہے بلکہ بروقت صحیح معلومات فراہم کرنا اور تازہ ترین سچی خبریں مہیا کرنا بھی صحافت کا بنیادی رکن ہے۔ یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ صحیح معلومات اور خبروں سے قارئین وناظرین کو آگاہ وباخبر کرنا ہی صحافت کا بنیادی مقصد وفریضہ ہے لیکن بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہر خبر اگر چہ لفظوں کے اعتبار سے خبر ہو لیکن اس کا مقصد حقیقت میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی ترغیب ہوتا ہے۔علیٰ سبیل المثال اگر میڈیا آپ کو خبر دیتا ہے کہ آپ کے پڑوسی ملک نے فلاں فلاں اہم ترین ٹیکنالوجی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے تو یہ محض ایک خبر یا اطلاع نہیں بلکہ بنیادی طور پر آپ کے لئے پیغام ہے کہ آپ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس جیسی یا اس سے اعلیٰ ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ بصورت دیگر علاقائی طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور یہی فریضہ امر بالمعروف ہے کہ اس خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لئے آپ کو مناسب انتظام کر لینا چاہیئے۔لہٰذا سچی خبریں بروقت فراہم کرنے اور صحیح معلومات بہم پہنچانے سے بھی مآل کار امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔لہٰذا ایک مسلمان صحافی کو ان تمام اوصاف وکمالات کا نمونہ ہونا چاہیئے کہ قرآن وسنت میں داعیٔ حق کے لئے جو اوصاف

بیان کئے گئے ہیں ان میں بنیادی بات یہ ہے داعی حق کو ناسازگار حالات سے دل گیرو مایوس ہوکر اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ حق بات کو پھیلانے کی کوشش انتہائی مایوس کن ماحول میں بھی جاری رکھنی چاہیئے کیوں کہ اچھائی کے فروغ کے لئے کی جانے والی جدوجہد رائیگاں نہیں جاتی ہے، جلد یا بہ دیر اس کا اثر ہوکر رہتا ہے، بشرطیکہ اس عظیم ذمہ داری کی تمام نزاکتوں کا خیال رکھا جائے۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، سماں دیکھ

جامعہ اسلامیہ شانتاپورم کیرالہ کا ایک بڑا معروف ادارہ ہے اور بالخاص مختلف موضوعات پر مشتمل تخصصات کا نظام ہی اس کی انفرادیت شمار کی جاتی ہے۔ گذشتہ دنوں اس ادارہ نے اپنی قدیم و دیرینہ روایت کے مطابق سہ سالہ تقسیم اسناد بعنوان convocation کے ذیل میں سہ روزہ ہمہ رنگ ونوع پروگراموں کا انعقاد کیا۔ تمام ہی منعقدہ پروگرام مختلف نوعیّتوں کے لحاظ سے کچھ منفرد سے تھےاوراس کی انفرادیت ہی وجہ تحریر بھی ہوئی ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر من جملہ دیگر پروگرامز کے ''ہندوستان میں مذہبی اقلیتوں کا مستقبل'' کے عنوان پر مشتمل ملّی کانفرنس ریاست اور بیرونِ ریاست سے آئے مہمانوں کے لئے خاص دلچسپی کے ساتھ ساتھ تمام ہمہ نوع پروگراموں کے بمقابلہ شرکاء اجلاس کی بڑی تعداد اس پروگرام کی مرکزیت کی غماز تھی اور بھرپور توجہ، دلچسپی اور مرکزیت کی خاص وجہ کانفرنس کا موضوع تھا۔ اس میں کوئی دورائے بھی نہیں ہے کہ یہ موضوع دورِ حاضر کا ایک نہایت اہمیت کا حامل موضوع ہے بلکہ ''دورِ رواں'' کے تناظر میں مختلف اعتبارات سے خاصا حساس اور نازک بھی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کا ذی شعور، دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ اس تعلق سے خاص متفکر اور متوحش ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ گذشتہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں خاص طور پر کذب بیانیوں اور افتراء

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (جمادی الاخریٰ ۱۴۳۸ھ مطابق مارچ ۲۰۱۷ء، جلد: ۷، شمارہ: ۸۴)

پردازیوں کی آتش بازیوں سے پورے ملک کی فضا مسموم کی جارہی ہے۔ جھوٹ کے پلندے کے پلندے، نام نہاد سرویز اور سراب کو حقائق کے عناوین میں ملفوف کر کے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ''نقیب روسیاہ'' کے حکم پر ایک خاص منصوبے کے تحت فکرونظر سے عاری عوام الناس کے ذہنوں میں اتارا جارہا ہے اور اس کے ذریعے مختلف طریقوں سے اقلیتوں کو خوف وخدشات میں مبتلا کر کے اپنے مذموم سیاسی مقاصد اور ناپاک عزائم مسلط کرنے کی کوشش جاری ہے، ایسا بھی نہیں ہے کہ بلاتفریق مذہب وملت ملک کا ذی فکرونظر اور صاحب الرائے طبقہ ان مذموم مقاصد کو سمجھ نہیں رہا ہے!!! وہ سمجھ بھی رہا ہے اور اپنی اپنی سطح اور اپنے اپنے طریقوں پر صدائے احتجاج بھی بلند کر رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے ملک میں حالیہ مسلط شدہ ماحول میں ان کی آوازیں نقارخانے میں طوطی کی گونج سے زیادہ ثابت نہیں ہورہی ہیں۔

ہندوستان دنیا کا وہ واحد اور منفرد ملک ہے جہاں مختلف مذاہب ومعاشرت کے زیر اثر کثیر الفکر طبقات میں منقسم لوگ اپنی اپنی منفرد شناخت کے ساتھ جیتے بستے ہیں۔ چنانچہ تہذیب وتمدن، سماج ومعاشرت کی عددی کثرت ہی اس ملک کا مابہ الامتیاز ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں اگر ہم اکثریت واقلیت جیسے موضوع کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے مختلف پہلو آتے ہیں، مطلقاً عددی کثرت وقلت کے نقطۂ نظر سے اس موضوع کا نہ تو حق ادا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے متصل کچھ دیگر پہلو زیر تذکرہ لائے بغیر اس موضوع پر بحث کو مکمل قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ مذہبی نقطۂ نظر سے اکثریت واقلیت ایک مستقل بحث ہے، اس کے اپنے کچھ تقاضے ہیں، اپنی کچھ بنیادیں ہیں۔ سماجی و معاشرتی لحاظ سے کثرت وقلت کا پیمانہ جدا ہے، اس کے اپنے مستقل تقاضے ہیں۔ سیاسی ومعاشی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے پر تقاضے اور فکر کی سمت بدل جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ کی کسوٹی پر اکثریت واقلیت کے تعلق سے فکرونظر کا پیمانہ ان سب سے مختلف انداز میں سامنے آتا ہے۔ گویا کہ اپنی اپنی جگہ یہ مستقل مباحث کے عناوین ہیں اس کے

علاوہ یہ ایک الگ اور مستقل بحث ہے کہ برہمنی سامراج نے مختلف الفکر و خیال اور برنگ دگر رسوم وعقائد کے علی الرغم کمزور بنیادوں کو وجہ اشتراک قرار دے کر متفرق طبقات کو آئینی طور پر اپنے میں جذب وشامل کر کے اکثریت کا تمغہ اپنے نام کر رکھا ہے اور اسی طلسم کی کامیاب برقراری ہی اقتدار پر قابض رہنے کی ضمانت متصور کی جاتی ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق اس ہمہ جہت وہشت پہلو مسئلہ کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جانا جس پہ تمام اقلیتیں مطمئن ہوسکیں اگر ناممکن نہیں تو بہر حال دشوار گزار ضرور ہے، جب کہ ہر ایک کے حق و باطل کا معیار الگ ہے۔ خیر وشر کا پیمانہ ایک دوسرے سے جدا ہے، حلال وحرام، جائز وناجائز کے دلائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ترجیحات ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہیں، ایسے میں کسی ایسی راہ کا معین ہونا جو سب کے لئے قدرے مشترک قرار دی جاسکے ایک مشکل مرحلہ ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ ملک کے سیاسی احوال اور نظریات اور ایک خاص منصوبے کے تحت مذہب کی بنیاد پر تمام اقلیتوں کے ساتھ شدت وخفت کے فرق مراتب کے ساتھ ملک کے سیکولر یکساں آئینی حقوق کی پامالی کے سبب کچھ بنیادیں قدرے مشترک کے طور پر پائی جائیں اور اس کا حل بھی یکساں طور پر کسی درجہ میں بحالت مجبوری سب کے لئے قابل قبول بن سکے لیکن مذکورہ بالا نقطہ ہائے نظر سے وہ بہر حال ایک استثنا ہی شمار ہوگا اور اس میں بھی مرکزیت بہر حال بوجوہ مسلمانوں کو ہی حاصل رہے گی جو کہ اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت یا بالفاظ دیگر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا درجہ رکھتے ہیں اور بہ ہمہ رنگ ونوع پیش آمدہ مسائل کو مذہب اور عقیدے کی کسوٹی پر ہی کھرا کھوٹا اترنے والے نتیجہ کو آخری فیصلہ اور رد وقبول کا اس طور پر معیار قرار دیتی ہے کہ اس میں کسی قسم کی لچک یا سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہ ہوتی ہے اور نہ ہوسکتی ہے جب کہ ملک کی دوسری اقلیتیں مذہبی، سماجی یا معاشرتی مماثلت یا تشبہ کے سبب پیش آمدہ مسائل میں کافی قریب تک سمجھوتے کی گنجائش اور بنیادیں تلاش کر لینے میں کسی قسم کا کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتی ہیں، خواہ وہ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ہو، وندے ماترم یا

سوریہ نمسکار جیسے دیگر اختلافی مسائل کا سوال ہو، نشانے پر بہر کیف مسلمان کو ہی آنا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا دوسری اقلیتوں کے بمقابلہ طرز عمل، لائحہ عمل اور ردعمل کا مختلف ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے، البتہ قدرِ مشترک کے طور پر انتہا پسندانہ نظریات کے زیر اثر پرورش پا رہی اور پروان چڑھ رہی ذہنیت کے تحت ملک میں جاری عمل داری سے خوف وخدشات کے نقطۂ نظر سے ملک کی تمام اقلیتیں ایک ہی پلیٹ فارم پر سراسیماں کھڑی نظر آرہی ہیں اور بلاتفریق مذہب وملت یہی وہ نقطہ اتفاق ہے جہاں تمام اقلیتیں جمع ہیں اور اپنے اپنے احوال، فکرونظر اور ترجیحات کے زیر اثر مستقبل کے تعلق سے کسی قابل قبول نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش وکاوش میں سرگرداں ہیں۔ لہٰذا اسی نقطۂ اتفاق کو بنیاد بنا کر تمام اقلیتوں کو مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے اور اس تعلق سے فکرونظر میں وسعت کے ساتھ ساتھ ایک ایسے تال میل کی ضرورت ہے جس کی قیادت سنجیدہ مذہبی طبقات کے زیر اثر ہو۔

جہاں تک وطن عزیز میں بلاتفریق مسالک وعقائد ایک اللہ، ایک قرآن، ایک رسول اور ایک کلمہ کی بنیاد پر امت مسلمہ کا تعلق ہے وہاں اس میں کوئی دورائے یا فکرونظر میں کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ہے کہ ہماری انفرادی زندگی ہو یا حیاتِ اجتماعی، سیاسی احوال ہوں یا سماجی ومعاشرتی پیچیدگیاں، بہرحال وبہرکیف کسی نہ کسی درجہ میں ہی سہی ہماری اجتماعیت میں سب سے بالاترین شان اور اہمیت اور ناقابل تردید قدرو قیمت والی اگر کوئی شئے قابل صلاح وفلاح اور باعث نجات وسرخ روئی ہوسکتی ہے تو وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ اور اسوہ ہے جہاں سے مشکل ترین حالات اور آسان ترین انداز میں راہ نجات کے سراغ ملتے ہیں۔ امت کے لئے مشعل راہ بھی وہی ہے، معیار ہدایت بھی وہی ہے، قیامت تک پیش آنے والے مسائل کا اگر اطمینان بخش حل تلاش کرنا ہے تو کتاب اللہ وسنت رسول کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا اور اس کے لئے خارجی عوامل سے زیادہ داخلی عوامل کو اپنے غور وفکر اور عمل کا موضوع قرار دینا ناگزیر ہے۔ بصورت دیگر کمزور سے کمزور طبقہ بھی غالب اکثریت کو

مغلوب کردینے کے لئے کافی ہوگا۔

اپنے گردوپیش لے کر عالمی سطح تک پیش آمدہ احوال ونتائج اور خطرات وخدشات ارباب علم و دانش اور احباب فکرونظر سے پوشیدہ و مستور نہیں ہیں، ماضی پر تاریخی گواہیاں، حال پر غلط پالیسیاں اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں کہ جب جب اور جہاں جہاں بھی اس معیار ہدایت سے مسلمانوں نے انحراف کیا ہے تو اس نے نہ صرف اپنی قومی شناخت اور تہذیبی تشخص کو ہی کھویا ہے بلکہ صحیح معنی میں مقصد حیات سے بھی محروم ہوا ہے۔لہٰذا ملک کے موجودہ احوال کے تناظر میں مستقبل کے تعلق سے اگر سنجیدہ اور بامقصد لائحہ عمل تیار کرنا ہے تو لامحالہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور اسی کی روشن وبیّن رہنمائی میں ہی اپنی نسلوں کی زندگیوں کی سمت متعین کرنی ہوگی۔

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، سماں دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

پھر ہمارے کارواں کو دے حُدی خوان حجاز

جمال عبداللہ عثمان صاحب پاکستان کے ایک نامور صحافی اور کالم نگار ہیں اور اپنے دلچسپ اور شگفتہ انداز تحریر کی وجہ سے ذوق حسن ادب رکھنے والے ایک بڑے طبقے میں پسند کیئے جاتے ہیں، انہوں نے اپنے اک کالم ”تبدیلی کے لمحات“ کا آغاز ایک واقعہ سے کیا ہے، اگر چہ مذکورہ واقعہ کا انطباق انہوں نے اپنے موضوع کے مطابق مقامی احوال پر کیا ہے، البتہ نفس واقعہ وسیع تر تناظر میں ہمارے آج کے موضوع سے بڑی قریبی مطابقت رکھتا ہے، جس میں طلباء کے لئے بالخصوص اور عامۃ المسلمین کے لئے بالعموم غور وفکر اور تحریک وعمل کے بہت سے گوشے مضمر ہیں۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ”سقراط کے پاس اس کا ایک نوجوان شاگرد آیا اور اس سے سوال کیا کہ مجھے یہ بتائیں کامیابی کا راز کیا ہے؟ سقراط نے کہا تم کل صبح دریا کے کنارے آجاؤ وہیں پر تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا، حسب طے شدہ نوجوان اگلی صبح مقررہ جگہ پر پہنچ گیا، جہاں استاذ پہلے سے موجود تھا، سقراط نے کہا تمہیں اپنے سوال کا جواب پانے کے لئے میرے ساتھ پانی میں اترنا ہوگا، نوجوان پانی میں اتر گیا وہ دونوں جس وقت گہرے پانی میں پہنچے اچانک سقراط نے نوجوان کی گردن پکڑ کر پانی میں غوطہ

❁ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (شعبان/رمضان ۱۴۳۸ھ مطابق مئی/جون ۲۰۱۷ء، جلد: ۸، شمارہ: ۸۷،۸۶)

دیدیا، لاکھ کوششوں کے باوجود بھی نوجوان سقراط کی مضبوط گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکا، جب اس کی حالت انتہائی متغیر ہوگئی، سقراط نے اس کو چھوڑ دیا، نوجوان نے اپنا سر پانی سے باہر نکالا لمبے لمبے سانس لئے، جب پرسکون ہوگیا تو سقراط اس کی جانب متوجہ ہوا اور کہا کہ کل تم نے مجھ سے کامیابی کا راز معلوم کیا تھا، نوجوان نے اثبات میں سرہلا دیا، کہا کہ یہ اس کا عملی جواب تھا، جس وقت تم پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، اس وقت تمہاری سب سے بڑی خواہش اور تمنا کیا تھی؟ نوجوان نے کہا اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی بھی طریقے پر ایک مرتبہ اس مصیبت سے نکل کر گلوخلاصی حاصل ہوجائے اور مجھے کھلی فضاء میسر آجائے جس میں پرسکون طریقے پر سانس لے سکوں، سقراط نے کہا یہی تمہارے سوال کا جواب ہے، نوجوان کچھ نہ سمجھ سکا تو سقراط نے مزید کہا جس وقت تم پانی میں ڈوبے ہوئے تھے تمہارے اندر جینے کی شدید خواہش پیدا ہوئی، تم نے سوچا کاش! مجھے سانس لینے کے لئے کھلی فضا مل جائے تم نے اس کے لئے اس طور جدوجہد کی کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے، تم نے کسی سستی کسی کاہلی اور کسی غفلت کا مظاہرہ نہ کیا اور نہ یہ سوچا کہ چلو اس وقت حالات سے سمجھوتہ کرلیتا ہوں، قدرت جب خود بخود حالات کو سازگار کردے گی اس وقت کوشش اور جدوجہد کرونگا، بس! میرے عزیز یہی کامیابی کا راز ہے جب تمہارے دل میں کامیابی تک پہنچنے کے لئے شدید خواہش پیدا ہو اس وقت سمجھ لینا کامیابی مل گئی ہے۔

یقیناً تمام خواہشات پر کامیابی کا شدید غلبہ ہی انسان کو کامیاب بناتا ہے، سستی، کاہلی، غفلت، فکری جمود و تعطل صلاحیتوں کے لئے سمّ قاتل ہے، یا ایسے ہی نیم دلی یا مارے باندھے سے کی جانے والی کوششیں بھی کبھی بارآور ثابت نہیں ہوسکتی ہیں، ہوسکتا ہے کہ ایسی کوششوں کے جزوی اثرات کسی درجہ میں ظاہر ہوجائیں، لیکن اس کو کامیابی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، جب تک کہ کامیابی کے لئے جنون کی حد تک نہ جایا جائے، اس وقت تک دوررس نتائج کا ترتب ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

اس تمہیدی واقعہ کا منشاء اور حاصل یہ ہے کہ اس وقت فرد کی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک مسلمانوں کی گردن بحیثیت امت وقت کے سقراطوں کی مضبوط گرفت میں ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہ آپ کو کامیابی کے راز بتانے کے لئے غوطے نہیں دے رہے ہیں، بلکہ آپ کو قرآن کریم کی اٹل حقیقت یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِہِمْ وَاللّٰہُ یُتِمُّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (۱) کے خام خیال جذبے کے تحت اپنی پھونکوں سے اسلام کا چراغ گل کر کے آپ کو ڈبو دینا چاہتے ہیں، ان کی گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بحیثیت امت مسلمہ رجوع الی القرآن اور سنن نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بنیادوں پر اپنی تمام علمی، عملی، فکری اور ملی قوتوں کو مجتمع کر کے اپنی تمام خواہشات پر کامیابی سے ہمکناری اور حصول کے جذبہ کو غالب رکھنا ہوگا، اس کے لئے فکر و نظر میں جس وسعت و دقت نظر کی ضرورت ہے، اس کی بنیادی کلید وہی ہے جو کہ اسلام اور مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی کا بنیادی عنصر ہے الحکمة ضالّة المؤمن، فحيث وجدها فهو أحقّ بها (۲) حکمت کی ہر بات مومن کی گم شدہ متاع ہے جہاں ملے وہاں سے لے لے، وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (۳) آج ہمارے گرداگرد سے، لیکر عالم اسلام تک جو مسائل درپیش ہیں وہ کوئی نئے نہیں ہیں، بلکہ کوہ صفا پر اعلان اسلام کے آغاز سے لے کر آج تک دشمنان اسلام کی نیتوں اور اپنے اپنے دور کے مطابق اس سمت کی جانے والی جہد مسلسل اشتراک عمل کے لحاظ سے اس دعویٰ کی صریح اور بین دلیل ہے، احوال، افراد، ظروف، وقت اور نوعیت تبدیل ہوتے رہے، مسائل اور تحدّیات کل بھی اسی قسم کے تھے، آج بھی اسی نوعیت کے ہیں، البتہ فرق

(۱) ترجمہ: اور یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں۔

(۲) جامع الترمذي، أبواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، رقم: ۲۶۸۷

(۳) ترجمہ: اور جس کو دین کا فہم کامل مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۶۹)

اگر واقع ہوتا ہے تو وہ وقت کے تقاضوں اور اس کے بالمقابل اختیار کی جانے والی تدابیر کا واقع ہوتا ہے، لہٰذا اس ناحیہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارادوں اور نیتوں کے فرق کے ساتھ آج کے سقراطوں کی گرفت ماضی کے سقراطوں کے مقابلے میں زیادہ اشد نوعیت کی ہے، عالمی سطح پر امت کے موجودہ احوال اور بالخصوص عالم اسلام کے انتہائی ناگفتہ بہ اور خونچکاں حالات کے حوالے سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب رحمہ اللہ سابق صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی اک شاہکار تحریر کے اقتباس کا حوالہ زیر موضوع تحریر کو مزید واضح اور منقی اور اقرب الی الفہم کر دینے میں معاون و ممد ثابت ہوگا۔

مرحوم و مغفور جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحبؒ کا اسم گرامی دنیا کی تعلیم یافتہ سوسائٹی میں غیر معروف نہیں ہے، بلکہ اپنے علمی تعمق، وسعت معلومات اور ہمہ جہت موضوعات پر ناقدانہ اور تجزیاتی نقطۂ نظر سے وسیع تر مطالعہ کے سبب نہ صرف برصغیر میں ہی ان کو مقام عظمت و فضیلت حاصل تھا، بلکہ دانشوران یورپ میں بھی اک بڑی باعظمت اور مقتدر مقام کی حامل شخصیت متصور کی جاتی تھی، ان کا ایک بڑا ہی فکر انگیز مضمون بعنوان ''مغرب کا فکری و تہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں'' ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالا، پاکستان میں شائع ہوا تھا، یوں تو مکمل مضمون ہی بالاستیعاب بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے، البتہ اس کا ایک اقتباس سنجیدہ فکر و نظر کی مضبوط اساس و بنیاد فراہم کرتا ہے۔

''اس وقت دنیائے اسلام جس دور سے گذر رہی ہے یہ دور اسلام کی تاریخ کا انتہائی مشکل ترین دور ہے، امت مسلمہ کو جو مشکلات آج درپیش ہیں شاید ماضی میں اتنی ہمہ جہت انداز کی مشکلات کبھی درپیش نہیں ہوئی ہیں، ایک اعتبار سے امت مسلمہ کی تاریخ بحرانوں کی تاریخ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے آغاز سے لے کر آپ ﷺ جب دار ارقم میں قیام فرما تھے اور اسلام کو مختلف نوعیّتوں کے شدائد اور چیلنجز کے سامنا کیے جانے کا آغاز ہو چکا تھا اس وقت سے لے کر آج تک کوئی صدی

اور صدی کا کوئی حصہ یا عشرہ ایسا نہیں گذرا جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے اس میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی ،لیکن ماضی کی ان ساری مشکلات میں اور آج کی مشکل میں اک بڑا بنیادی فرق ہے ، ماضی کی جتنی مشکلات اور پریشانیاں تھیں وہ عموماً زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود ہوتی تھیں ،مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا ، پیچھے ہٹنا پڑا اور پسپائی اختیار کرنی پڑی ، یہ اک شکست وہزیمت کا معاملہ تھا یا مسلمانوں کی کوئی حکومت کمزور ہوئی اور غیر ملکی قوتیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمان سیاسی طور پر پس ماندگی کا شکار ہوئے یہ سیاسی میدان میں کمزوری تھی ،اس طرح کی کمزوریاں جو عموماً سیاسی ، مالی ، عسکری یا مادی ہوتی ہیں وہ تھیں ،اور وہ تقریباً ہر دور میں پیش آتی رہی ہیں ،لیکن ان سارے ادوار میں مسلمانوں کا نظام خاندان ، نظام تعلیم وتربیت ، معاشرتی نظام اور مسلمانوں کی جو اندرونی ساخت اور تشکیل (Internal Fabric) تھی وہ اکثر وبیشتر بیرونی خطرات اور حملوں سے محفوظ رہی ،تاتاریوں کے حملے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیائے اسلام پر اس سے زیادہ برا اور سخت وقت کبھی نہیں آیا اور یقیناً وہ بہت ہی برا وقت تھا کہ افغانستان کے مشرقی علاقوں سے لے کر مصر کی حدود تک اور ترکی کے جنوبی علاقوں سے لیکر جزیرۃ العرب کے وسط تک ، یہ سارا علاقہ تاتاریوں کی تاخت وتاج کی آماجگاہ تھا ، انہوں نے ہزارہا ہزار علمائے کرام کو شہید کیا ، بڑے بڑے جید ترین اکابرین اسلام ان کی تلوار کا نشانہ بنے ،خواجہ فریدالدین عطّار جیسی عظیم شخصیت جن کی پیروی پر حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ جیسی عبقری شخصیت نے فخر کا اظہار کیا ، ایسے ایسے اونچے اور باعظمت لوگ تاتاریوں کی تلوار کا شکار ہوئے ،نہایت قیمتی اور گراں قدر کتب خانے انہوں نے نذرِ آتش کئے ،شہر اور بستیاں انہوں نے برباد کیں ، بلاتفریق جنس وعمر قتل عام انہوں نے کیا ،کھوپڑیوں کے مینار انہوں نے بنائے ، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب البدایۃ والنہایۃ میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی شکست خوردگی ، اور پست ہمتی کا یہ عالم تھا کہ یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی کہ اذا

قيل لك ان التتار انهزموا فلا تصدق یعنی اگر تمہیں خبر دی جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی ہے تو کبھی اس پر یقین نہ کرنا، گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور سمجھی جاتی تھی......لیکن اس تمام تر ہولناک تباہی و بربادی کے باوجود تاتاریوں کی جانب سے شکست وریخت کا سارا کا سارا زور مسلمانوں کو سیاسی و عسکری طور پر کمزور کردینے پر مرکوز تھا، انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی نقصان پہنچایا، عسکری نقصان پہنچایا، مالی نقصان پہنچایا، لیکن ان کے پاس کیونکہ کوئی دین نہیں تھا کوئی مذہب نہیں تھا، کوئی پیغام نہیں تھا، کوئی تہذیب نہیں تھی، کوئی فکری ایجنڈا نہیں تھا، اس لئے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، نظام تعلیم، نظام تربیت اور خاندانی ومعاشرتی نظام ان کے حملوں سے محفوظ رہا، اور ان میں سے کوئی چیز یا کوئی بھی گوشہ متاثر نہیں ہوا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی اندرونی قوت نے ان کا ساتھ دیا اور وہ بہت جلد تاتاریوں کی شکست کے نتائج بد اور مضر ثمرات سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے، یہی کیفیت بقیہ دوسرے معاملات کی بھی رہی۔

لیکن آج جو صورتحال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہر آنے والا دن ہر روز نکلنے والا سورج خطرے یا پریشانی کی اک نئی جہت لیکر آتا ہے، آج اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خطرات سے دوچار نہ ہو، خواہ وہ فرد کے ذاتی کردار اور تربیت کا معاملہ یا پھر یا درون خانہ والدین اور اولاد یا میاں اور بیوی کے تعلقات کا معاملہ ہو، گھر کی خواتین کے رویے کی بات ہو یا تعلیم وتربیت کی، مساجد کے اندر کی عباداتی سرگرمیاں ہوں یا اور معمولات مساجد کی بات ہو، مسلمانوں کی معاشرتی مسائل ہوں، یا سماجی پریشانیاں گویا اسلامی قوانین سے لے کر بود وباش اور خوراک وپوشاک تک ان میں سے آج ہر چیز براہ راست مغربی حملے کی زد میں ہے، تاتاریوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا ہوگا کہ جامعہ ازہر میں کیا پڑھایا جارہا ہے، مسلمانوں کی نصابی کتب میں کیا لکھا جارہا ہے، یا فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے، انہوں نے یہ چیز کبھی زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی اسی طرح جب شروع میں انگریز یہاں آئے تو انہوں نے بھی ان معاملات میں زیادہ توجہ نہیں دی، اس کا نتیجہ

یہ نکلا کہ انگریزوں کے ابتدائی ڈیڑھ دوسو سال یہاں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اندرونی ساخت بڑی حد تک مغرب کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہی اور ایسے ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگ تھے، جن کی زندگی کا کوئی ایک گوشہ بھی بیرونی اثرات سے متاثر نہیں ہوا۔“

لیکن آج جب کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اور دیگر انتہائی ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کے سبب دنیا گلوبلائزیشن کے اس دور میں داخل ہوچکی ہے کہ جہاں بقول شخصے کہ دنیا کے ایک گوشے یا خطے میں غنچہ چٹکتا ہے تو دوسرے انتہائی خطے کے لوگوں کے سر میں دمک محسوس ہوتی ہے“ اور اس پر مستزاد کہ اس موثر ہتھیار کی تمام کی تمام باگیں دشمنوں کے ہاتھ میں ہیں، تو دفاع اسلام کے منہج کے حوالے سے اسی معیار ومستویٰ کو اپنانا آج کے دور کی ناگزیر ضرورت ہے، آج بھی سقراط کی مضبوط گرفت میں ڈھیلا پن پیدا کرنے کے لئے علاقائی مصالح کو ملحوظ رکھتے ہوئے تشدد کی نہیں بلکہ معقول دلائل وبراہین کے ساتھ آج کے معروف اسلوب افہام وتفہیم کے ساتھ نئی نسل اور جدید فکر کے حامل لوگوں تک پہنچنے کی ضرورت ہے، اور کلام اللہ اس کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے ”اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰىۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى“ (۱) کو بنیاد واساس بنانا ہوگا۔

لہٰذا اسی تعلق سے اپنی جدوجہد کے آغاز کے لئے جن ابتدائی کاوشوں کو بروئے عمل لانے کی ضرورت ہے، اس کا بالاجمال خاکہ میرے فکر وخیال میں کچھ یوں بنتا ہے جیسا کہ... ابھی چند ماہ قبل ہم سب کے مخدوم گرامی نمونۂ سلف حضرت مولانا عبداللہ اسماعیل پٹیل صاحب کاپودروی دامت برکاتہم رکن مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند جو اپنی شیریں بیانی، جذب دروں علم وآگہی کی گہرائی وگیرائی کے حوالے سے اصحاب علم ودانش

(۱) ترجمہ: دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے آگے نکل چکا ہے۔ جاکر دونوں اس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے، یا (اللہ سے) ڈر جائے۔ (سورۃ طٰہٰ: ۴۴-۴۳)

کے حلقوں اور علم و معرفت کی دنیا میں منفرد اور ممتاز مقام کی حامل ایسی شخصیت متصور کیے جاتے ہیں، ثقاہت علم و فکر کی حامل اس عظیم شخصیت کی دعوت پر جامعہ قاسمیہ کھروڈ میں گجرات کے نوجوان علماء و طلباء جمع ہوئے، مجلس کا موضوع سخن موجودہ دور میں اکابرین دیوبند کی حیات و خدمات، ان کو پیش آمدہ احوال اور ناقابل تصور مشکل ترین حالات میں ان کی جہود و کاوشوں کا منہج اور اس کے نتائج، ثمرات، نیز اس کے تاریخی تسلسل کا بالاستیعاب و بالالتزام مطالعہ و عمل کی ترغیب تھی۔ اس مبارک مجلس میں حضرت والا کے پرسوز و پرمغز خطاب کا خلاصہ جو میرے طالب علمانہ گرفت ادراک میں آسکا اس کا حاصل یہ نکلتا ہے اور یہی اس تحریر کا منشاء و مقصود اور حاصل ہے۔

"مکمل طور پر جذبۂ خود احتسابی کے ساتھ بہ نیت اخلاص اپنے علم اور عمل میں مکمل مطابقت پیدا کرنا جو کہ سب سے بڑی بنیادی ضرورت ہے، یہ فریق مخاطب پر تاثیری نقطۂ نظر سے اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ شخصیت سازی کے لئے بھی یہی خشت اساس ہے اور اس تعلق سے اپنے اندر تحریک عمل پیدا کرنے کے لئے اپنے اکابر واسلاف کی سوانح، احوال وواقعات، منہج عمل اور نہایت حوصلہ شکن ماحول میں استقامت وعزیمت کے ہنر کیسے پیدا کئے جائیں، اس پہلو سے بالاستیعاب مطالعہ نئی نسل کے علماء کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور ان شاء اللہ اسی جگہ سے آپ کو وہ کلید بھی حاصل ہوسکتی، جس کے ذریعہ آپ کو آج کے سقراطوں کی آہنی گرفت سے اپنی گردنوں کو چھڑانے کے لئے جن شدید خواہشات کے غلبہ کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں دینی واسلامی فہم کے لئے ایک خاص علمی تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، افسوس کہ دور حاضر میں علماء کی نئی نسل اس ہنر سے نا آشنا ہے، اگر نئی نسل کے علماء اس نہج پر اپنے بافکر اکابر علماء کی سرپرستی وراہنمائی میں اس سمت توجہ کریں تو زوال سے کمال کی طرف بازیافت اگرچہ مشکل اور انتہائی محنت طلب ضرور ہے، لیکن ناممکن ہرگز نہیں ہے۔

محسوس ہوا کہ نوجوان علماء میں طلب کا جذبہ تو موجود ہے، البتہ تسلسل کے ساتھ اسی

نہج پر صحیح رہنمائی کی بھی اشد ضرورت ہے، چنانچہ دل یہ گواہی دیتا ہے کہ ان شرائط اخلاص وللّٰہیت سے مشروط محنت وجہود کے نتائج آج بھی اسی انداز سے ظاہر ہو سکتے ہیں، جیسا کہ ماضی میں ہمارے اکابر واسلاف کے ہاتھوں ہو چکے ہیں۔

راقم السطور کی سعادت کہ اس بابرکت مجلس سے بہرہ ور ہونے کا محض اتفاقاً موقع حاصل ہوا اور حضرت والا کی خورد نواز طبیعت کے طفیل راقم کو طالب علمانہ انداز میں کچھ معروضات بھی پیش کرنے کا موقع حاصل رہا، آج ماہنامہ ''ندائے دار العلوم'' کے سال نامے کا یہ ادارتی پیغام اسی مذکورہ پس منظر کے حوالے سے سپرد قلم وقرطاس کیا ہے، جس کے مخاطب بالخاص نوجوان علماء اور طلباء ہیں۔ اسی تسلسل میں پیغام کا دوسرا ناصحانہ جزو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کے لئے اپنی رحمتوں اور سعادتوں کے دروازے وا کئے ہیں تبھی تو آپ کو علم دین کی ابدی سعادت سے سرفراز فرمایا ہے، اس میں کوئی شک نہیں یہ ایک ناقابل تردید اور مشاہد حقیقت ہے کہ علم وعمل میں مطابقت کی لازمی شرط کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو اس میں سیر چشمی، بلند نظری اور خودداری جیسے وہ اوصاف ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے جو کہ اسلامی سیرت کے لئے مابہ الامتیاز ہیں، اس لئے لازم ہے کہ آپ اس آئینۂ حقیقت میں اپنے محاسن کو جانچیں، پرکھیں اور ضرورت کے مطابق وقت کے تقاضوں سے مناسبت رکھتے ہوئے نئے محاسن اپنے اندر پیدا کریں۔ بقول شخصے کہ کسی بھی قوم کی بقاء کا دارومدار محاسن کی مسلسل اور غیر مختتم تولید پر منحصر ہوتا ہے اور قوم کے علماء پر یہ ذمہ داری بدرجۂ اولیٰ عائد ہوتی ہے، مزید براں یہ کہ اس صفت حمید کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے کچھ مدت بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار و برکات حاصل کرنا نسخۂ کیمیا کے حاصل ہو جانے کے مترادف ہے کیوں کہ ہزار کتب خانوں سے استفادہ ایک طرف لیکن کسی صاحب علم ونسبت بزرگ کی نگاہ ملتفت ایک طرف ہے اور اسی ایک نگاہِ ملتفت سے انسان کو دینی وعلمی صلاحیتوں کی تخلیقی قوت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو کیوں کہ حق تعالیٰ نے اپنی ابدی

صفات کا پرتو اور عکس عطا فرما کر دنیا میں بھیجا ہے جس کو وسیع تر تناظر میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر انسان کو حق تعالیٰ نے چھوٹے پیمانے پر اپنی صفت خلق کے طفیل خود ایک خالق بنایا ہے اور ذات حق جلّ مجدہٗ کی جانب سے عطاء کردہ ان عظیم ترین تخلیقی قوتوں کو ضائع کر دینے کا نام ہی گناہ ہے۔

(وما علینا الاّ البلاغ)

ماہ محرم- چند ملاحظات

محرم اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے، یہ اپنی عظمت وتقدیس کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس ماہ کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھنے کے سلسلہ میں بڑی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، چناں چہ ایک روایت ہے:

”عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”أفضل الصيام، بعد رمضان، صيام شهر الله المحرم.“(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان المبارک کے بعد روزوں میں سب سے افضل روزہ اللہ کے مہینے محرم کا ہے۔ واضح ہو کہ یہاں محرم کے روزے سے مراد اس مہینے کی دسویں تاریخ کا روزہ ہے، اس روایت کے علاوہ بھی متعدد روایات ہیں جن کے اندر یوم عاشورہ کے روزہ کی اہمیت وافضلیت بیان کی گئی ہے، غور کیجیے یوں تو سارے ہی مہینے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت بنائے ہیں لیکن مذکورہ بالا روایت میں ماہ محرم کو خاص طور پر اللہ کا مہینہ قرار دیا گیا ہے، جس سے اس مہینے کی عظمت وبزرگی ظاہر ہوتی ہے اور اس چیز سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ اس مہینے کا اکرام واحترام کیا جانا چاہیے، گویا جب اس مبارک مہینے سے ہم اسلامی سال کا آغاز کریں تو یہ آغاز عبادت وریاضت توجہ وانابت، خشوع و

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (محرم الحرام ۱۴۳۶ھ مطابق نومبر ۲۰۱۴ء، جلد: ۵، شمارہ: ۵۵)

(۱) الصحیح لمسلم، كتاب الصيام، باب فضل صوم المحرم، ج ا ص: ۳۶۸، رقم: ۱۱۶۳

خضوع اور تقویٰ وخوف الٰہی کے احساس کے ساتھ خداترسی اور سچے مومنانہ و عاشقانہ جذبات سے ہم آہنگ ہوکر خالص مذہبی رنگ میں ڈوب کر ہو، تاکہ سال کے آنے والے بقیہ ایام پر اس حقیقی خداپرستی کی چھاپ نمایاں طور پر محسوس کی جاسکے، کیوں کہ جب آغاز بہتر ہوتو ظاہر ہے انجام کے بھی بہتر اور خوش آئند ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہمارے دینی اداروں اور جدید علوم وفنون کی دانش گاہوں میں جب نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے تو یہ آغاز محض رسمی قسم کا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ایک نئے جوشِ عمل اور بھرپور ولولے کے ساتھ تیاری کی جاتی ہے، چناں چہ نہایت تزک واحتشام کے ساتھ تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، یہ جوش وخروش اور اس کے صالح ومفید اثرات تادیر باقی رہتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں ایک خوش گوار فضا قائم ہوتی ہے جس سے سال کے بارہ مہینوں میں ہر کام کا بہتر سے بہتر لائحۂ عمل تیار کرنے اور اپنے مفوضہ امور کی کامل توجہ کیساتھ انجام دہی میں خاصی مدد فراہم ہوتی ہے۔

غرض محرم کا مہینہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس کے اندر خصوصی توجہ کے ساتھ دین پر عمل پیرا ہوں، تاکہ آنے والے ایام بھی ہر پہلو سے اپنے اندر یہی دینی واسلامی رنگ لئے ہوئے ہوں اور اس کی برکت سے سال کا ہر مہینہ اور اس کے جملہ شب وروز دین کی حیات بخش خوشبو سے معطر ہوں، نیز ہماری حیات کا ہر لمحہ اور ہر گوشہ یاد الٰہی اور ذکر حق سے معمور ہوجائے، کیوں کہ شریعت کا بنیادی منشاء یہی ہے کہ بندگان خدا کو زندگی کے ہر موڑ اور حیات انسانی کے ہر نشیب وفراز پر خالق کائنات کا استحضار رہے اور انسانیت کے ذہن ودماغ پر اللہ کے پاکیزہ وجود، اس کی کبریائی اور اس کی فوقیت وبرتری کا یقین غالب رہے، شاید اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے اکبرالہ آبادی نے کہا تھا کہ ؎

دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد

اگر انسانی زندگی اس حقیقت سے آشنا ہوجائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے قدم راہ

اعتدال یا پھر یہ کہئے کہ سواء السبیل سے بھٹک جائیں، مختصر یہ کہ جب ہم اس مہینے کا آغاز نماز وروزہ اور دینی جذبات وخیالات کو اپنے اوپر غالب کر کے نیز بدعات وخرافات سے بیزاری کا اظہار کر کے صرف اس طریقہ پر کریں کہ شریعت جس کا تقاضہ کرتی ہے تو بہت ممکن ہے وہ چیزیں جو محرم کا حصہ بنادی گئی ہیں حالاں کہ ان کی حیثیت محض بدعتوں کی ہے ہمیں ان کی مخالفت کے نتیجے میں کچھ صبر آزما حالات کا سامنے کرنا پڑے، ایسے وقت میں ضروری ہے کہ ہم حالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور درپیش مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کریں، یہ اس لیے تاکہ ہم عوام کے سامنے ایک ایسا شائستہ اور مہذب ردعمل پیش کرسکیں جو نہ صرف اثر انگریز ہو بلکہ قابل غور بھی ہو۔

غلو اور مبالغہ آرائی کی کرشمہ سازی

مبالغہ ایک مفید صنعت ہے جس سے بڑا کام لیا جاتا ہے مثلاً گفتگو کا وہ حصہ جسے بالا رادہ اہمیت دینا مقصود ہو، وہاں اس صنعت کو کام میں لاکر مطلوبہ فوائد حاصل کئے جاتے ہیں، جب کہ شعر وسخن کے میدان میں اس کی حیثیت روح حیات کی سی ہے، گویا صنعت مبالغہ کو اگر شاعری سے خارج کر دیا جائے تو اس فن لطیف کی حیثیت محض قالب بے جان کی رہ جاتی ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شعر وسخن کی اثر انگیزی میں اضافہ اور زبان وبیان کی اثر آفرینی کو دو چند کرنے کے لئے مبالغہ آمیزی کو کتنا بڑا دخل ہے، غرض اس کی مثال ایسی ہے جیسے خوردبین (Microscope) یا دوربین (Telescope) کی ہے کہ اول الذکر سے باریک سے باریک ترین چیزوں کا حجم بڑا کر کے دیکھا جاسکتا ہے یا اسی طرح غیر معمولی فاصلے پر موجود مادے دوربین کے ذریعہ قریب کر کے دیکھے لئے جاتے ہیں، مبالغہ کے ذریعہ بھی کچھ ایسا ہی کام لیا جاتا ہے کہ آدمی کی نگاہیں جن چیزوں کا مطالعہ ومشاہدہ محض سرسری طور پر کرتی ہیں، شاعر یا ادیب اپنی کمال ہنرمندی کے ساتھ ان چیزوں کو مبالغہ کی آمیزش سے نہایت دلکش اور پرکشش پیرائے میں بڑی اہمیت دے کر پیش کر دیتا ہے، مثلاً اقبال کہتے ہیں کہ ۔

صبح کو باغ میں پڑتی ہے شبنم اس لئے
تا کہ پتہ پتہ کرے یاد باوضو تیری

اس ترکیب سے اذہان ان چیزوں کے بارے میں غور کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جنہیں ہم محض سرسری طور پر دیکھتے یا نظر انداز کر دیتے ہیں، مثال کے طور پر دیوبند کے ایک شاعر وحشی دیوبندی کے اس شعر میں آپ غیر معمولی مبالغہ محسوس کر سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ

رونے پہ چشم تر مری باندھے اگر کمر
کس کی زمین؟ فلک پہ بھی ہو پانی کمر کمر

بہر حال عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ اگرچہ زبان و بیان اور شعر و سخن میں غلو اور مبالغہ آرائی پسندیدہ ہے لیکن خدانخواستہ اگر دین و شریعت کو اس کی جولان گاہ بنا دیا جائے تو یقیناً دین و شریعت اپنی حقیقی شکل و صورت پر باقی نہیں رہ سکتے، اسی لیے قرآن حکیم میں اہل کتاب کو غلو سے اجتناب کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ.(۱)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق کا غلو مت کرو اور اس میں ان لوگوں کے خیالات پر مت چلو جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور بہتوں کی غلطی میں ڈال چکے ہیں اور وہ لوگ راہ راست سے دور ہو گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی معاملات میں غلو پسندی اور مبالغہ آرائی کی وجہ سے پچھلی بہت سی قومیں گمراہ ہو چکی ہیں چناں چہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین ہند کو اس بارے میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، اس لئے ماہ محرم میں رواج پا چکی رسومات اور بدعات و خرافات سے عوام کو آگاہ کرنے کے لیے علماء و صلحاء اور اصحاب قلم کو اس جانب خصوصی توجہ کرنی چاہیئے کہ وہ عوام الناس کو ان چیزوں کے چھوڑنے کی ترغیب دیں اور چاہیئے

(۱) سورۃ المائدہ: ۷۷

کہ اس سلسلہ میں صحیح اسلامی تصور پیش کر کے عوام کو باشعور بنانے کی سعی کی جائے، یہ اس لئے ضروری ہے کہ جب ہماری ملت کے کچھ بھولے بھالے افراد اپنی نادانی کی وجہ سے دین کی حقیقی شکل وصورت کو مسخ کرنے کی کوشش کرنے لگیں، مزید یہ کہ اپنی اس ناپسندیدہ کاروائی کو دین کی حقیقی خدمت تصور کر بیٹھیں تو ظاہر ہے کہ ایسے افسوس ناک حالات میں اہل علم حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔

ماہ محرم چند غور طلب باتیں

ماہ محرم کا آغاز ہوتے ہی عام طور پر لوگوں کے ذہن و دماغ میں ایک خاص قسم کا تصور ابھرتا ہے مثلاً یہی کہ یہ غم کا مہینہ ہے لہٰذا اس میں شادی بیاہ کی تقریبات منعقد نہیں کی جاسکتیں یا اسی طرح شادی کے رشتوں کے سلسلہ میں دو خاندان ابتداءً جو باہمی کارروائیاں انجام دیتے ہیں، ان کو اس عرصہ میں موقوف کر دیا جاتا ہے، اسی طرح باجے گاجے کا اہتمام، نوحہ خوانی، سینہ کوبی، تعزیہ داری، علم برداری، سیاہ لباس و پوشاک کا استعمال وغیرہ ایسی بہت ساری چیزیں ہیں جو اس مہینے کا حصہ بنادی گئی ہیں لیکن حقیقت میں شریعت اسلامیہ سے ان کا کوئی ثبوت نہیں، اس واسطے ان ساری چیزوں کی حیثیت محض بدعات وخرافات اور بیجا رسومات کی ہے جن سے اجتناب ضروری ہے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس مہینے میں چوں کہ نواسۂ رسولؐ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا تھا اس لیے وہ اس مہینے کو غم کا مہینہ تصور کرتے ہوئے ماتمی لباس پہنتے اور برہنہ پا رہتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ بہت سے شرعی طور پر جائز و مباح امور کی انجام دہی سے بھی احتراماً باز رہتے ہیں، حالاں کہ شرعی طور پر اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ اگر اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو سال کا کوئی بھی مہینہ ایسا نہ ملے گا کہ جس میں کسی صحابی یا کسی اور محترم شخصیت کی شہادت یا وفات کا واقعہ پیش نہ آیا ہو، لہٰذا اگر ان چیزوں کی رعایت کی جانے لگے تو ملی زندگی ٹھپ ہو کر رہ جائے گی جو عقلی طور پر نا قابل قبول ہے، مزید یہ کہ وہ

یہ بھی باور کراتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے یہ مہینہ مقدس قرار دیا گیا ہے حالاں کہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ اور اس کی فضیلت کا تصور رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ سے ہی چلا آرہا ہے جب کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ آپ کی وفات کے تقریباً ساٹھ برس بعد پیش آیا ہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی غلط فہمیاں ہیں جو لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے باوجود بہت سے لوگ حقیقی علم کی روشنی سے اب تک محروم ہیں، لہٰذا ہمیں اس بارے میں مؤثر اور پائدار تدابیر پر غور وخوض کرنا ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ ان بدعات وخرافات سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھتے ہیں ان کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اہل بیت سے محبت وعقیدت کے جذبات نہیں رکھتے، یہ تصور بھی سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور غیر معقول ہے کیوں کہ امت محمدیہ کا ہر فرد رسول اللہ ﷺ اور آلِ رسول سے محبت رکھتا ہے، دنیا کے تمام رشتے ناطے اور تعلقات بہ شمول والدین اور اولاد کی محبت کے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا برتر اور تفوق کے ساتھ قلب میں جاگزیں رہنا ہی ایمان کے قوت واستحکام کی دلیل ہے، نیز متعدد روایات اس جانب ہماری توجہ مبذول کرتی ہیں، مثلاً یہ روایت ہی ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي اسامة بن زيد قال طرقت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ذات ليلة في بعض الحاجة فخرج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم و هو مشتمل على شيء لا أدري ما هو، فلما فرغت من حاجتي. قتلت: ما هذا الذي أنت مشتمل عليه؟ فكشفه فإذا حسن و حسين على و ركيه، فقال: "هذان ابناي و ابنا ابنتي، اللهم إني أحبهما فأحبهما و أحب من يحبهما. [1]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں ایک رات کسی کام کے لئے

---

(۱)جامع الترمذي، تحقيق و تعليق: أحمد محمد شاكر، و محمد فؤاد عبد الباقی، (مصر: مكتبة مصطفى البابي الحلبي: ط۲، ۱۳۹۵ھ، ۱۹۷۵م) ج۲، ص۶۵۶، رقم: ۳۶۹.

نبی ﷺ کے پاس آیا، نبی ﷺ باہر تشریف لائے جب کہ آپ ﷺ ایک چیز کو لپیٹے ہوئے تھے میں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے، جب میں اپنے کام سے فارغ ہوا، میں نے کہا یہ کیا ہے جو آپ لپیٹے ہوئے ہیں؟ آپ ﷺ نے وہ چیز کھولی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ آپ کی زانوں پر بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں، اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت فرما اور اس شخص سے محبت فرما جو ان سے محبت کرتا ہے۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن زيد بن أرقمؓ أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال لعلي وفاطمة والحسن والحسين: "أنا حرب لمن حاربتم، و سلم لمن سالمتم". (۱)

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، فاطمہ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ میں اس شخص سے لڑوں گا جس سے تم لڑائی کرو اور اس شخص سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کرو۔

غرض یہ اور ان کے علاوہ متعدد روایات کے ذریعہ اہل بیت کی شان فضیلت معلوم ہوتی ہے اور ان کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار کی ترغیب ملتی ہے، ظاہر ہے اس قسم کی روایات کے ہوتے ہوئے کون ہے جو اہل بیت رسول کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار کرنے سے گریز کرے؛ لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ اور اس کے علاوہ نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو عوام میں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں لوگوں نے محض اس مہینے کے تقدس کے خیال سے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، یہ دراصل وہی غلطی ہے جو پچھلی قومیں کرتی آ رہی ہیں، مثلاً

---

(۱) جامع الترمذي، تحقيق و تعليق: أحمد محمد شاكر، و محمد فؤاد عبد الباقي، (مصر: مكتبة مصطفى البابي الحلبي، ط۲، ۱۳۹۵ھ، ۱۹۷۵م) ج۵، ص۶۹۹، رقم: ۳۸۷۰.

انہوں نے اللہ کے برگزیدہ بندوں کی عقیدت میں اس درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ انہیں خدا سے جا ملایا۔ حد تو یہ ہے کہ بسا اوقات انھوں نے پیغمبران برحق کو کبھی خدا کا بیٹا خیال کرلیا تو کبھی خدا ہی قرار دے دیا، جس کے نتیجے وہ قومیں راہ ہدایت سے بھٹک گئیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئیں، غرض برصغیر میں جو لوگ ماہ محرم اور اس کے علاوہ دیگر مہینوں میں مختلف بدعات انجام دیتے ہیں ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ وہ حضرت حسینؓ اور دیگر اہل بیت وشہدائے کربلا کی محبت میں بہت سے ایسے اعمال وافعال انجام دیتے ہیں جن کو دیکھ کر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض عقیدت ومحبت میں غلو کرنے سے ظہور پذیر ہوئے ہیں، اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ دینی امور میں غلو اور مبالغہ آرائی کی قباحت کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ اس سلسلہ کو مزید دراز ہونے سے روکا جاسکے اور امت مسلمہ اپنا رخ درست کرکے اس سمت کی طرف گامزن ہو سکے جس کی نشاندہی اللہ اور اس کے آخری پیغمبر نے فرمائی ہے ؎

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

جوہر خود شناس

فن تاریخ سے قوموں کے احوال، وقائع اور اپنے عہد کی تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی واقعات وحوادث کی معلومات کے علاوہ کسی خاص عہد میں کسی خاص علاقے اور قوم کے مزاج، بود و باش، طرز معیشت وتجارت، انداز فکر ونظر، علم وآگہی کے معیارات اور اپنے عہد کے مروجہ علوم وفنون اور اقدار کی معلومات فن تاریخ کا ہی حصہ ہے اور عہد گذشتہ کے نقوش مستقبل کے خطوط کی اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں، دنیا کے عظیم مؤرخ علامہ ابن خلدونؒ (جن کو مغرب ومشرق کے منصف مزاج اصحاب قلم اور مؤرخین نے امام المؤرخین کے خطاب سے مخاطب کیا ہے) کے بعد تیسری صدی میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اخلاف سے تعلق رکھنے والے اپنے عہد کے نامور مؤرخ ابوالحسن بن حسین بن علی المسعودی اپنے تعمق علم، وسیع ترین تاریخی معلومات اور اس دور میں دستیاب تاریخی مصادر پر بسیط نظر کی بنا پر عالمی شہرت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں، ان کی عظمت وبزرگی کی بنیاد محض یہی نہیں تھی کہ انھوں نے اطراف واکناف عالم میں سیر وسیاحت کے نتیجہ میں ایک نہایت قیمتی اور بیش بہا معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے بلکہ ان کے علمی کمالات اور مختلف علوم وفنون پر ان کی دسترس اور ایک مؤرخ کی حیثیت سے ان کی معلومات اور وسعت مطالعہ کے علی الرغم بہت سے علوم وفنون پر ان کی ضخیم

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (جمادی الاخریٰ ۱۴۳۹ھ مطابق مارچ ۲۰۱۸ء جلد: ۹، شمارہ: ۹۶)

تصنیفات وتالیفات کی بنا پر ان کے اخلاف نے ان کو جامع العلوم کے قرار واقعی خطاب ولقب سے یاد کیا ہے کیوں کہ بلاد عالم میں ان کی لاثانی سیر وسیاحت خصوصاً ایشیا اور مشرقی افریقہ میں ان کی مفید ترین سیاحت اور اس سلسلہ میں انہوں نے بطور آثار جو ذخیرۂ معلومات چھوڑا ہے وہی ان کی عظمت اور قدر ومنزلت کا پتہ دینے کے لئے کافی ہے۔

برصغیر کے ایک صاحب قلم نے مؤرخ مذکور کی نادر ونایاب اور مشہور عالم کتاب ''مروّج الذہب ومعادن الجواہر'' کے حوالے سے دور قبل مسیح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، بُعد عہد کے سبب واقعہ مذکورہ کی استنادی حیثیت پر بحث وتحمیص اور نقد وتبصرہ سے قطع نظر اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ نفس واقعہ خود اپنے آپ میں فکر وآگہی کے بے شمار گوشوں اور زاویوں سے ذوق فکر کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔اس سے قطع نظر کہ یہ روایت ہے یا حکایت یا اس کی تاریخی سند کس درجے کی ہے واقعاتی نقطۂ نظر سے بھی اگر اس روایت یا حکایت کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ اپنے آپ میں سبق آموزی کے بہت سے پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے،اس روایت یا حکایت کی واقعاتی نوعیت کچھ اس طرح سے ہے کہ ایران کے قالین باف ایک زمانے سے دنیا بھر میں اپنے فن کی ندرت کے حوالے سے مشہور ہیں،روایت کے مطابق یہ لوگ ہزاروں برس سے اس فن سے وابستہ ہیں اور کمال فن کے محیر العقول نمونے اور کارنامے ایران کی تاریخ کا روشن باب شمار ہوتے ہیں،تاریخی وقائع کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ایران میں ایسے ایسے باکمال قالین باف حضرات کا سراغ ملتا ہے جو اپنی انگلیوں سے دھاگوں کی مدد سے برف بادل بارش اور دریا ایسے بنا دیتے تھے کہ اصل کا گمان ہوتا تھا مثلاً اگر کسی قالین باف نے دریا بنایا تو وہ اپنے آپ میں اتنا مکمل ہوتا تھا کہ بسا اوقات اصل دریا کا گمان کرتے ہوئے لوگ قالین پر پاؤں رکھنے سے قبل بے اختیار اپنے لباس کو بھیگ جانے کے خوف سے گھٹنوں تک اٹھا لیتے تھے یا ایسے ہی بعض قالین باف اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفید دھاگوں سے ایسی برف بنا دیتے تھے کہ

لوگوں کو اس قالین پر بیٹھ کر با قاعدہ سردی و خنکی کا احساس ہوتا تھا۔

یہ قالین اپنی محنت اور اپنی ندرت فن کے اعتبار سے اس قدر بیش قیمت ہوتے تھے کہ عام آدمی تو ایسے بیش قیمت قالین کے خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، عموماً ان گراں بہار قالینوں کے خریدار شہنشاہ امراء ملکائیں شہزادے و شہزادیاں ہی ہوتے تھے اور یہ قالین بنتے ہی تھے ان کے لئے اور یہ قالین باف اپنے کمال فن کی قیمت ہزاروں سونے کی اشرفیوں کی صورت میں پاتے تھے، لیکن حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو اور خصوصاً کسی کمال کے درجے پر پہنچے ہوئے ہنر مند کو ہزار ہا ہزار سونے کی اشرفیاں وہ قلبی طمانیت فراہم نہیں کر سکتی جتنا کہ عمومی سطح پر اس کے فن کے تعلق سے ادا کئے جانے والے تعریفی و توصیفی کلمات اور وہ بھی خصوصاً تعجب و استعجاب سے بھرپور قابل رشک کلمات اس کی صلاحیتوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں، چنانچہ اسی قلبی سکون و طمانیت کو حاصل کرنے کے لئے یہ قالین باف دنوں اور ہفتوں تک اس کو فروخت کرنے سے قبل شہر کے مرکزی مقام پر لٹکا کر بیٹھ جایا کرتے تھے، لوگ جوق در جوق آتے اور فن کار کے کمال فن کا مظاہرہ دیکھتے اور انگشت بدنداں حیرت زدہ نظروں سے اپنے اپنے ذوق نظر کے مطابق حیرت و استعجاب میں فن کار کی فن کاری کے تعلق سے رطب اللسان ہوتے جس سے کہ ایک درجہ کا فخر و غرور فن کار اپنے دل میں محسوس کرتا تھا، مزید برآں فن کار کا یہ دعویٰ بھی ہوتا تھا کہ اس کے فن میں نقص بتانے والے کو انعام سے نوازا جائے گا، چنانچہ اس پہلو سے بھی لوگ نہایت گہری اور تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیا کرتے تھے، اور جب بہزار دقت نظر بھی کوئی قابل ذکر عیب اس میں نہ پاتے تو انعام پانے کا ارمان دل میں مسوس کر رہ جاتے، تا آں کہ جب پورا شہر اس قالین کی تعریف کر چکا ہوتا اور فن کار کو اس کا مقصد تسکین حاصل ہو جاتا تھا تو اس قالین کی فروختگی سے قبل یہ قالین باف جو کہ عموماً اپنے مذہب کے پابند اور عقائد کے پختہ ہوتے تھے، عمومی سطح پر ایک نا قابل فہم حرکت کرتے تھے اور وہ یہ کہ کوئی تیز نوکیلا اوزار لے کر قالین کا کوئی کونہ کوئی صورت یا کوئی منظر کاٹ کر کسی درجہ میں قالین کو تھوڑا سا عیب دار یا معمولی سا بدصورت بنا دیا کرتے تھے، دراصل

قالین بافوں کی اس عجیب و غریب اور نا قابل فہم حرکت کے پس پردہ ان کا ایک اصلاحی عقیدہ کارفرما تھا جس کی حفاظت ان کے لئے دنیا کی ہر شے سے عزیز تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ اس کائنات میں صرف اور صرف حق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات ہی اکمل و کامل اور مکمل ہے جو کہ ہر قسم کے شائبۂ نقص و عیب سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے، انسان کی صناعی میں اگر کاملیت کا شائبہ بھی شامل ہو گیا تو یہ اللہ کی ذات وصفات میں شرک کے مترادف ہو جائے گا اور یہ گناہ خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ ایسا نا قابل معافی جرم ہے کہ اس کی کوئی تلافی ہی ممکن نہیں ہے، چنانچہ یہ لوگ ہمیشہ شرک کے گناہ عظیم سے بچنے کے لئے اپنے مکمل اور خوبصورت ترین قالین کو کسی درجہ میں نامکمل اور عیب دار بنا دیا کرتے تھے۔

اسی طرح دنیا کے ہر انسان میں خواہ امیر ہو کہ غریب، غنی ہو کہ فقیر، عالم ہو کہ جاہل ہو غرضیکہ کسی بھی طبقۂ انسانی سے تعلق رکھتا ہو کوئی نہ کوئی نقص و عیب اور کوتاہی و ادھورا پن اس کی ذات کا حصہ ہوتا ہے اور فکر و شعور اور احساس جوابدہی کا خوف رکھنے والے لوگوں کی نگاہ ہمیشہ اپنے عیوب پر ہوتی ہے جس نے اس کی اصلاح کی فکر کر لی سو وہ کامیاب و بامراد ہو گیا اور جس نے اس پہلو سے صرف نظر کر لیا تو یہی عیب بعد ازاں اس شخص کے زوال و تنزل اور خاتمے کا باعث بن جاتا ہے، دنیا میں وہی شخص عقلمند اور سمجھدار ہوتا ہے جو کہ نہ صرف اپنے عیوب کو ہی سمجھ لے بلکہ اس کے نقصان سے بچنے کے لئے ہر وقت جد و جہد میں مصروف رہے جو شخص بتوفیق خداوندی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو دنیا کی کامرانی بھی اس کا مقدر بن گئی اور آخرت کی فلاح و نجاح بھی اس کی منتظر ہے، یہی حقیقت از روئے قرآن بایں طور بیان فرمائی گئی ہے:"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ"۔ (۱)

(۱) ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے، پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے، اور انہوں نے نیک عمل کیے، تو ان کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (سورۃ التین: ۴-۶)

حاصل تحریر یہ ہے کہ علمی فکری فنی یا کسی بھی قبیل کی صلاحیت رکھنے والے کسی بھی شخص میں جس لمحہ احساس کاملیت وسوسے یا اس سے اوپر کسی بھی درجہ میں یقین کی سرحدوں کو چھوکر ایسا ذہنی اختلال پیدا کردیتی ہے جس سے کہ انسان کی انانیت غلبہ پانے لگتی ہے بس وہی لمحہ اس انسان کے زوال کا آغاز اور بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے، انسان کے مقابلے میں یہی وہ احساس کاملیت تھا جس نے ابلیس ملعون کو یہ کہنے پر مجبور کیا" خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ " (۱) وہی لمحہ اس کی مردودیت کا مقدر بن گیا۔ واقعۂ مذکور پر تاریخی شواہد کی جستجو سے قطع نظر غور وفکر اور تدبر کرنے والوں کے لئے نفس واقعہ میں اصلاح احوال وہدایت اور سبق آموزی کے کئی پہلو مضمر ہیں۔

(۱) ترجمہ: تونے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو گارے سے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ ص:۷۶)

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

گئے دنوں کی بات ہے کہ ۱۲/۱۳/اگست ۲۰۱۸ء کو دارالعلوم وقف دیوبند میں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب رحمہ اللہ کی ستر سالہ جگ روشن علمی و تعلیمی اور عملی خدمات کے قرار واقعی اعتراف کے طور پر ایک سہ لسانی دوروزہ سیمینار منعقد ہوا، جس میں ملک کے طول وعرض سے مقتدر اصحاب علم وفضل کی فقید المثال وتاریخ ساز شرکت اور اربابِ علم وکمال کے وقیع تر مثبت تاثرات و بیانات اور دور حاضر کے اصول تحقیق وتنقید کے مسلّمہ اصولوں کے معیارات پر بلند پایہ ورفیع الشان قرار دیئے جانے والے مقالات ومضامین، اخلاص وایثار کے جوہر شناس جملہ محبین ومخلصین اور الحب فی اللہ کی مضبوط پائیدار اور مستحکم بنیادوں پر ادارہ سے باعزت وباوقار انتساب رکھنے والے تمام اہل مہر وکرم کے لئے مژدۂ جانفزا ثابت ہوا اور انھوں نے اپنے پرخلوص جذبات و عزائم اور مسرت وشادمانی کے اظہار میں ادنیٰ درجے کے بھی بخل واخفاء سے کام نہیں لیا جس کے لئے ہم بجاطور پر اظہار تشکر وممنونیت کے پابند ہیں، سیمینار کی ظاہری ومعنوی اور مقصدی اعتبار سے بہر طور و بہر نوع کامیابی کے تذکروں کی گونج تبریک وتہنیت اور اظہار مسرت وشادمانی کے پیرائے میں ہفتوں پر محیط مدت تک نہ صرف ملک کے طول و عرض سے ہی سنائی دے رہی تھی بلکہ ملکی سرحدوں کی حدود وقیود سے ماوراء مختلف ممالک سمیت ارض مقدس مکۃ المکرّمہ، مدینہ منورہ اور منیٰ وعرفات میں بھی تذکروں اور دعاؤں

۞ اداریہ: ماہنامہ ندائے دارالعلوم وقف (محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق اکتوبر ۲۰۱۸ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۰۳)

کا سلسلہ جاری تھا جہاں پر ذات حق جل مجدہٗ کے لا انتہا فضل و احسان کے طفیل سیمینار کے اختتام کے معاً بعد ہی اگلے روز یعنی ۱۴؍ اگست ۲۰۱۸ء کو خادم الحرمین الشریفین الملک سلمان بن عبدالعزیز آل سعود حفظہ اللہ ورعاہ اللہ کی خصوصی دعوت وضیافت کے پروگرام کے تحت برادر مکرم جناب حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب مدظلہٗ شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند کی پُر خلوص و باغ و بہار معیت اور ہندوستان کے مختلف موقر اداروں و جماعتوں سے تعلق رکھنے والے چالیس خوش نصیب وخوش بخت اراکین وفد کے ہمراہ اس عاصی کو بھی بارگاہ مقدس میں حاضری کا شرف اور ادائیگی حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی جہاں برصغیر ایشیا، افریقہ اور یورپ و آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے متسبین ومحبین ادارہ نے مقصدیت اور پیغام اتحاد کے اعتبار سے سیمینار کے کامیاب انعقاد اور حسنِ انتظام و اہتمام پر والہانہ انداز میں کلمات تبریک وتہنیت پیش کرتے ہوئے اپنی دلی مسرت اور ادارے سے اپنے محبانہ ومخلصانہ تعلق کا بار بار اعادہ کیا۔ مقامات مقدسہ پر کئے جانے والے ان تذکروں وتبصروں کو راقم نے جملہ اراکین ادارہ اور بالخصوص حجۃ الاسلام اکیڈمی کی فعّال و جفاکش و جواں سال ٹیم کی اس تعلق سے مخلصانہ جہود و کاوش اور شبانہ روز محنتوں کو بارگاہ رب العزت میں قبولیت کے غیبی اشارات پر محمول کیا۔ **فللہ الحمد والشکر**، اصحاب فکر ونظر نے اپنے اپنے زاویہ فکر سے مختلف پہلوؤں کا مختلف انداز سے جائزہ لیا اور قدر مشترک کے طور پر معتد بہ اکثریت نے حتمی اور آخری نتیجہ کے طور پر بہر طور و بہر نوع سیمینار کے کامیاب انعقاد کی رائے پر اتفاق کیا اور اس نقطۂ ارتکاز پر بلا استثناء متفق الخیال پایا کہ ایک لاحاصل سی بحث جس میں کہیں لفظ سیمینار کے معانی ومطالب، موضوع تحقیق ہیں تو کہیں اس کے متعلقات ومترادفات کو نت نئے مفاہیم وتشریحات کو وقت کا اہم ترین موضوع قرار دیا جا رہا ہے، لیکن بہمہ نوع مباحث کا خوش آئند اختتام پیغام اتحاد فکر وعمل پر منتہی ہوا **عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ**

يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. [۱] (ترجمہ) اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی شئے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی شئے کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لئے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

راقم السطور اس سارے منظر نامے اور مباحث کو اس پیرائے میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ مسبب الاسباب نے سیمینار کی کامیاب نتیجہ خیزی میں بایں طور اسی کو کامیابی کا سبب بنا دیا ہے کہ دارالعلوم وقف دیوبند جو کہ فکری، علمی، عملی اور جماعتی سطح پر اتحاد بین المسلمین کا نقیب و منّاد ہے اس کے اخلاصِ نیت اور اس سمت میں کی جانے والی جہود و کاوش کے نتیجہ میں ذات حق جل مجدہ نے اپنے بے کراں فضل و احسان سے اسی سیمینار کے عنوان پر ہندوستان کی امت مسلمہ کے سوادِ اعظم کو جمع فرما کر دراصل وطن عزیز کے موجودہ اشد تر احوال میں ملت کی شیرازہ بندی کی ناگزیر ضرورت و اہمیت اور بتقضائے وقت پیش بندی کے غیبی اشارات کے ذریعہ حسّاس قلوب و اذہان میں پائی جانے والی بے نام سی خلش سے نجات پانے کی راہ اتحاد بین المسلمین کی طرف رہنمائی فرمائی جس کے فقدان سے نقصان کے اندیشے اب محض اندیشے نہیں رہے ہیں بلکہ خوف و ہراس کے گھرے آتشیں سائے، تیز رفتاری کے ساتھ ہماری جانب بڑھ رہے ہیں اور احساس و شعور پر بایں طور ضرب کاری کر رہے ہیں کہ روز نت نئے انداز میں ایک خاص اور منظّم سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عبرت انگیز و سبق آموز حادثات حقائق و واقعات کی صورت میں پے در پے سامنے آرہے ہیں۔ لہٰذا اس صورتِ حال سے نبرد آزمائی کے لئے ہماری صفوں میں شعوری اتحاد کی ضرورت و اہمیت سے خردمندان قوم خوب واقف ہیں، عناوین کے مفاہیم و تشریحات کی تعیین اور لاحاصل و لاطائل مباحث میں لائق قدر علمی قوتیں صرف کرنے کے بجائے مقصدیت کو بروئے عمل لانے کی ضرورت ناگزیر ہے۔

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۱۶

جہاں باز و سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ہماری عمومی مجالس ہوں یا اقارب و احباب کی محافل، مختلف نوعیّتوں کی تقریبات کا اجتماع ہو یا معمول کی ملاقاتوں کا روزمرہ سلسلہ، ایسے مواقع پر جب بھی موضوع سخن اور آپسی دلچسپی کی گفتگو کا محور و مرکز قوم کے سیاسی و اجتماعی احوال ہوں یا ملک کی موجودہ یا سابقہ سیاسی فضاء میں حالیہ یا سابقہ حکومتوں کے عہد حکمرانی میں ظلم و جور اور زیادتی اور تعدی کے واقعات کا ذکر ہو یا بایں طور تاریخ کے تناظر میں قصص پارینہ زیر سخن ہوں یا ملکی و بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے حادثات و واقعات زیر بحث ہوں، ایسے مواقع پر بالعموم دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ پوری بحث میں خود احتسابی کا عمل اور پیش آمدہ واقعات و حادثات کے محرکات و عوامل کے ذکر کا پہلو یا تو بالکلیہ مفقود ہوتا ہے یا اگر ہوتا بھی ہے تو نہایت ہی غیر اہم اور سرسری انداز سے ہو کر گذر جاتا ہے، جب کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ بات خواہ افراد کی ہو یا اقوام و ملل کی اہل ہوش و خرد کے نزدیک انسان کی معنوی زندگی کا رازِ دروں ہمیشہ محاسبۂ خویش میں ہی مضمر ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق دین کے معاملات سے ہو یا امورِ دنیا سے ہو، اس ناقابل تردید حقیقت پر ماضی بعید سے لے کر ماضی قریب اور حال تک بے شمار تاریخی واقعات، تجربات، حقائق شاہد عدل ہیں کہ افراد سے لے کر

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق فروری ر مارچ ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۰۸)

اقوام و ملل تک جب جب جس قوم نے احتساب عمل کی روشنی میں اپنے قدم آگے بڑھائے ہیں تو قدرت الٰہیہ نے تب تب اس کو عروج و عظمت کی سرفرازیاں بخشی ہیں جب کہ اس کے بالعکس احتساب عمل سے غفلت و بے اعتنائی کے نتائج اس طرح ظاہر ہوئے کہ ذلت و نکبت کی ظلمتیں اس طرح گھیر لیتی ہیں کہ افراد و اقوام کی فکر و سوچ سے احساس زیاں کا تصور تک زائل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی پستی و ذلت کو اپنا مقدر جان کر اسی پر مطمئن ہو بیٹھتے ہیں جس کے نتیجے میں غالب اقوام اس کے گلے میں طوق غلامی ڈال کر اپنی چراگاہوں میں چھوڑ دیتی ہیں اور اس پر یہ راز پنہاں کبھی بھی افشا و آشکارا نہیں ہوتا کہ ہمارے زوال و پستی کے اسباب کیا تھے یا کیا ہیں اور ہماری موجودہ پستی و ذلت عذاب ہے، عتاب ہے یا آزمائش و ابتلاء ہے امتحان ہے کہ انتقام ہے اور اندر ہی اندر وہ کون سی بلاخیزیاں ہیں جو گھن کی طرح ہمیں لمحہ بہ لمحہ کھوکھلا اور کمزور کر کے ہماری صفوں میں ایک انتشار برپا کیے ہوئے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ایک قول نظر سے گذرا تھا، سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ ہم پر جو مختلف نوعتیوں کی آفات اور مصائب آتے ہیں ہمیں کیسے پتہ چلے کہ یہ اللہ کا عذاب و عتاب ہے یا آزمائش و امتحان ہیں؟ فرمایا کہ نازل شدہ آفات و مصائب کے نتیجہ میں اگر قلب اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے تو وہ آزمائش و امتحان ہے اور اگر جمود و تعطل اسی طرح برقرار رہتا ہے اور قومی و اجتماعی مزاج میں کسی طرح کا کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ اللہ کا عذاب و عتاب ہے، قول کی سند کے صحت و سقم کی بحث سے قطع نظر یہ ایک اصولی بات ہے۔ اسی طرح سے یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور ہر ذی شعور نیز معنوی اعتبار سے زندہ شخص اس کلیہ پر متفق نظر آئے گا کہ اگر کوئی فرد، جماعت یا قوم محاسبۂ نفس و خویش کی طرف سے آنکھیں بند کر لے یا صرف نظر کر لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنے آپ کو کبھی بھی خطرات سے محفوظ نہیں رکھ پائے گا۔

بے حد تلخ سہی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم نے مدتوں سے محاسبۂ خویش اور

احتساب عمل کی طرف سے منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے آنکھیں بند رکھی ہوئی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی نیا حادثہ ہم پر گذرتا ہے تو بجائے اس کے ہم یہ سوچیں کہ ہماری ایسی کون سی کمزوریاں ہیں جو اس حادثے میں بطور عوامل کارفرما ہیں اور وہ کون سی ناعاقبت اندیشیاں ہیں جو اسباب کے درجے میں اس حادثے کے رونما ہونے کا سبب بنی ہیں، وہ کون سے مکافات عمل ہیں جس کے سبب آج ہماری زندگی مسائل، مشاکل، مصائب و آفات کی آماجگاہ بن کر اپنے گہرے اور دوررس اثرات کے لحاظ سے ہماری سابق ولاحق نہ جانے کتنی نسلوں کو محیط ہیں، اس کے برعکس منفی اندازِ فکر کے زیر اثر دربست فریق ثانی کو احوال وواقعات کے رونما ہونے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے کر یہ سمجھ لینا کہ ہم اپنی انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے فارغ ہوگئے ہماری یہ کج فکری ایک ایسی سنگین غلطی ہے، جس کے نتائج بہت دور تک اور دیر تک اثر انداز ہوئے ہیں۔

مسلمان مورخین اس حقیقت پر متفق الرائے ہیں کہ تاتاریوں کے تباہ کن اور خوں آشام فطرت کے سبب سقوط بغداد ہماری تاریخ کا سب سے بڑا وحشت انگیز المیہ تھا اور اس کی صداقت میں کوئی دورائے بھی نہیں ہے لیکن شومئی قسمت کہ وہاں بھی اسباب وعوامل یا مکافاتِ عمل کے پہلو پر گفتگو کا دائرہ اختصار کی حدبندیوں میں محصور ہوتا ہے تاتاریوں کی ہلاکت آفریں تہذیب وتمدن اپنی جگہ، ان کا ظلم و بربریت اور وحشت خیزی مسلّم، اس کے نتیجہ میں پیش آمدہ صدیوں پر محیط اثرات درست و بجا سہی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے صدیوں تک مہلت فکر وعمل دیے جانے کے بعد یہ قومی سطح پر مکافات عمل تھا۔ انفرادی حساب وکتاب بروز محشر ہوگا لیکن اجتماعی حساب مکافات عمل کی صورت میں اسی دنیا میں وقوع پذیر ہوتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی ازلی سنت ہے جس کے نظائر وشواہد مختلف ادوار واقوام کی تاریخ بھری پڑی ہے، چنانچہ جب ہم وسیع تر تناظر میں محاسبۂ اعمال وافعال کے نقطۂ نظر سے بنوعباس کے آخری ادوار کا مطالعہ کرتے ہیں تو جہاں ایک طرف حکمراں طبقے کے ظلم واستحصال کی خونچکاں

داستان أعمالکم عمّالکم [۱] کے زیر اثر نظر آتی ہے، وہیں دوسری جانب علماء کے درمیان بزعم خود شخصی تفوق کے خیال مہمل اور عُجب وغرور کی بنیاد پر آپسی اختلافات اور مناظروں کی مجلسیں، ہر فریق کا اپنے کو برحق ثابت کرتے ہوئے نہ صرف فریق مخالف کو باطل ہی قرار دینا بلکہ اسلام سے خروج کے فرامین جاری کر کے اجتماعیت کو شدید نقصانات پہنچانا روزمرہ کے معمولات کا حصہ نظر آتا ہے، مرکز علم بغداد کے ہر چوراہے پر مناظروں، مذاکروں اور بحث وتکرار کی مجلسیں سجی ہیں جس میں ہر فریق اپنے مخالف فریق کو دائرۂ اسلام سے باہر کا راستہ دکھانے پر اپنی پوری فکری وعملی قوتیں صرف کرنے پر مصروف ہے، گویا بالفاظِ دیگر جس طرح دل کی بیماریوں کا آغاز ہمیشہ ذات حق جل مجدہ کی نافرمانیوں، سرکشیوں اوراس کے احکام سے روگردانیوں سے ہوتا ہے جس کے نتیجے میں نفس امارہ کا غلبہ قلب کو مستقل بیمار و مضمحل کر دیتا ہے یا جس طرح ایک تنگ وتاریک اور غلیظ مکان میں رہنے والا اپنے اردگرد کے کثیف ومتعفن ماحول میں رہنے کے سبب علالت واضمحلال کا ایک استعارہ بن کر رہ جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ فکری اضمحلال کو معنوی گندگی کا ذریعہ بنا دیتا ہے اوراس کیفیت و بیماری کی نوعیت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی ہوتی ہے اور جب اس اضمحلال اور غفلت احوال کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی نافرمانیاں حدود سے متجاوز ہوجاتی ہیں، یہی وہ موقع ومحل ہے جب کہ ذات حق جل مجدہٗ کی صفت قہر وغضب حرکت میں آتی ہے اور مکافات کا عمل شروع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ غالب کو مغلوب اور مغلوب کو قوت و طاقت عطا فرما دیتے ہیں کیوں کہ غلبہ اور مغلوبیت کے جو اسباب ہیں ان کا تعلق قانونِ قدرت سے ہوتا ہے، قانون ہدایت سے نہیں اور یہ حق تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام قدرت ہے جس میں ایمان کی شرط لازم نہیں بلکہ اگر کافر، فاسق، فاجر، کاذب اور حق تعالیٰ کا شدید نافرمان بندہ بھی نظام قدرت کے قوانین کو اپنائے گا تو غالب ہوجائے گا جب کہ اس کے بالعکس ایک مومن، نیک سچا اور

(۱) مرقاۃ المفاتیح، کتاب الإمارۃ و القضاء، ج:۶،ص:۲۴۱۸، رقم:۳۷۱۷

فرماں بردار بندہ بھی اگر اس نظام قدرت کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ مغلوب کر دیا جائے گا۔

برسبیل مثال اکثر لوگوں کے ذہن و زبان پر آتا ہے کہ مغربی دنیا اگر چہ کلیۃً باطل کی پرستش کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کون سے اسباب و عوامل کارفرما ہیں کہ اس کو عالمگیر غلبہ حاصل ہے؟ آخر اس عالمگیر غلبے کی وجوہات کیا ہیں؟ چنانچہ جب جب اس کے اسباب و وجوہات اور محرکات کو قوانین نظام ہدایت کے زیر اثر تلاش کریں گے کبھی بھی ہماری رسائی صحیح نتائج تک نہیں ہو سکے گی کیوں کہ اس سوال کا جواب نظام قدرت کے قوانین کے اتباع اور عدم اتباع میں پوشیدہ و مضمر ہے، دوا اور پرہیز کا بروقت استعمال بلاامتیاز قوم و مذہب فائدہ ہو جائے گا اور ایسے ہی زہر کے اثرات و نتائج میں کوئی دوئی نہیں ہوگی، بلکہ بلاتفریق یکساں انداز میں مرتب ہوں کیوں کہ ان کا تعلق قوانین قدرت سے ہے نہ کہ قوانین ہدایت سے، علیٰ ہذا القیاس بے شمار چیزیں ہیں چناں چہ اس کلیہ کے تناظر میں اور عمیق علم و مطالعہ اور وسیع تر فکری پرواز کے حامل اہل علم اس کی دو بنیادی توجیہات بیان کرتے ہیں کہ فکر و نظر اور رائے میں اختلافات کی گنجائش کے ساتھ مغرب کے عالمی غلبے کی دو بنیادی وجوہات قرار پائی ہیں: ایک معاصر دنیا کا علم ہونا، دوسرے اس علم کی روشنی میں طاقت کے ذرائع کا حصول، علم معاصر، اقوام و ملل پر فکری و معنوی غلبے کی علّت ہے جب کہ طاقت جو کہ اس کے تابع ہے اور مادی غلبے کی مظہر ہے، گویا اس قوم کو کبھی بھی غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کے پاس معاصر علوم نہ ہوں، اس پر مکمل دسترس اور گہرائی و گیرائی اور بلا انقطاع جذبۂ تحقیق و جستجو اور ایجاد و اجتہاد کے عوامل استمرار کے ساتھ اس میں کارفرما نہ ہوں، اسی طرح غلبہ اس کو بھی حاصل نہیں ہوتا جس کے پاس غلبے کی برقراری کے مطلوبہ تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت و طاقت نہ ہو، کیوں کہ یہ دنیا اسباب میں مقید ہے اس لئے اسباب اختیار کئے بغیر کبھی بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسباب کی اس دنیا میں عروج و زوال کا معیار بھی یہی ہے جب

کہ تیسرا ایک معیار اخلاقی و قانونی ہے کہ کسی بھی قوم کا کوئی بھی معاشرہ ہو اس کو اپنی طاقت کو مربوط اور منظّم رکھنے کے لئے یہ تیسرا معیار اپنانا بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنے آپ کو قومی سطح پر ایک نظام میں ڈھالنے کے لائق ہو، یہ تینوں ضرورتیں آج مغرب نے پوری کر دیں تو غلبہ اس کو حاصل ہو گیا، اس سے قبل جب امت مسلمہ نے ان ضرورتوں کے تقاضوں کو پورا کیا وہ اقوام عالم پر غالب رہے۔ لہٰذا یہ تینوں اسباب و علل جب تک کسی بھی قوم کی دسترس میں رہیں گے اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آئے گا خواہ وہ مومن ہو یا کافر ہو اور نظام قدرت کا یہ قانون افراد سے لے کر اقوام تک نافذ ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ نظام قدرت میں قوانین کی اتباع کے حاصل شدہ نتائج بالا دستی کو اگر نظام ہدایت سے مربوط کر دیا جائے تو اس کے اندر حسن اور عدل و قسط اور مساوات کی شانوں کا غلبہ رہے گا جس کو قرآن نے استخلاف فی الارض کے عنوان سے بیان فرمایا ہے جب کہ اس کے برعکس قوت و غلبے کو نظام ہدایت سے آزاد رکھے جانے کی صورت میں ظلم و جور، تعدی و استحصال، جبر و اکراہ اور غیض و غضب کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا ہے، تاریخ عالم سے لے کر تاریخ اسلام تک عہد بہ عہد مطالعہ کیا جائے یا ماضی سے لے کر حال کے پیش آمدہ حالات و واقعات کے اسباب و علل کی روشنی میں تحلیل اور تجزیہ کیا جائے یہی اسباب و محرکات کارفرما نظر آئیں گے:

افراد کے ہاتھوں میں اقوام کی تقدیر

چنانچہ زندگی کے کسی بھی میدانِ عمل میں خواہ اس کا تعلق صحت سے ہو، معاشرت سے ہو، مدنیت سے ہو یا ریاست سے ہو، بالا دستی کے نظام کو قائم کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کا آغاز ہمیشہ احتساب نفس اور اصلاح نفس سے ہی ہو گا، اس کے بغیر کمزوریوں، خامیوں، غلطیوں اور گمراہیوں کا ادراک کبھی بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ صحت کے قوانین سے غفلت برتی جائے تو جسم بیمار ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں جسم پر صحت کا غلبہ مغلوبیت کا شکار ہو جائے گا، اجتماعیت کے قوانین سے لاپرواہی معاشرے کو مضمحل کر دے گی، علیٰ ہذا

القیاس میدانِ عمل کوئی بھی ہو خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے ہو، احتساب نفس کے راستے سے ہی اصلاحِ احوال کی منزل کو پایا جاسکتا ہے اس کا تعلق فرد سے ہو یا اجتماعیت سے ہو ایک ہی اصول کارفرما ہے، صحت زائل ہو جانے کی علت کو مورد الزام ٹھہرا کر علاج سے غفلت کا نتیجہ جس طرح فرد کی موت پر منتہی ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اجتماعی اور قومی سطح پر پیش آنے والے حادثات و واقعات سے سبق آموزی سے لاپرواہی بھی قومی سطح پر وہی نتائج پیدا کر دیتی ہے جس میں ہم مختلف نوعیّتوں سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ جب تاریخ کی بات آتی ہے تو بغداد کی تباہی ہماری تاریخ کا المیہ تھا اور اس سے آگے یہ کہہ کر بڑھ جاتے ہیں کہ ہلاکو خان بڑا ظالم، وحشی اور خونخوار تھا، گویا اس تباہی میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا، جرم سارا ہلاکو کا تھا یا مثلاً جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی انقلاب انگیز تباہی کا ذکر ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم اپنا سارا زورِ بیان اجتماعی احتسابی عمل سے پرے یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں کہ ہم تو ناگہانی طور پر انگریز کی عیاری اور غیروں کی غداری کا شکار ہو گئے، یہ حقیقت سو فیصد درست اور بجا ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم ان اسباب وعلل پر یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم میں آخر وہ کون سی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں جن کا تسلسل اور استمرار ماضی میں کافی دور تک پایا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے ہم ان کی عیاری اور غداری کا شکار ہو گئے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جس کے اپنے اندر زندہ رہنے کی قوت ہے اسے باہر کا دشمن کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتا، دشمن صرف فریق مخالف کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ گدھ ہمیشہ جانوروں کی لاش پر امنڈ کے آتا ہے جب کہ زندہ جانور اس کی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا ہے وہ اس پر جھپٹنے کی کبھی جرأت نہیں کرتا ہے، موت خود ہمارے اندر سے ابھرتی ہے باہر سے تو صرف اس کے محسوس اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ قدرت بار بار مختلف سطح پر مختلف مواقع عطاء کرتی ہے کہ ہم اپنے احوال کی اصلاح کر سکیں۔ چنانچہ آنے والے انتخابات پھر ایک موقع، پھر ایک مہلت لے کر ہمارے سامنے ہے۔ گذشتہ حالات و واقعات سے حادثات کا مثبت انداز فکر کے ساتھ

تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے جس کا آغاز فریق ثانی سے نہیں بلکہ اپنی ذات اور اپنے اردگرد کے ماحول کے سنجیدہ احتساب سے کرنے کی ضرورت ہے ورنہ خاکم بہ دہن کہ:

ہماری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قرآن کریم اپنے معجز نما پیرائے میں بار بار مختلف انداز میں ہمیں متوجہ کر رہا ہے کہیں اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱) یہ حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کر لے تو کہیں وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۲) اور تم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا غور و فکر اور اپنے اعمال، افعال اور احوال کا سنجیدہ احتساب ناگزیر ہے۔ وما توفیقی إلا باللّٰہ

---

(۱) ترجمہ: یقین جانو کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات میں تبدیلی نہ لے آئے۔ (سورۃ الرعد: ۱۱)

(۲) ترجمہ: اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ (سورۃ الشوریٰ: ۳۰)

وقت

ایک فلسفہ علم و آگہی، ایک گنج گراں مایہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے اقرب ترین اجل خلفاء میں ایک بہت مؤثر اور نمایاں ترین شخصیت حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جن کی ذات کو حق جلّ مجدہٗ نے اپنے خزانۂ زبان و بیان سے بڑے مؤثر و دلنشین انداز میں زندگی کی حقیقت بیان کرنے کا سلیقہ عطاء فرمایا تھا، قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے اپنے عہد کی بڑی مقبول شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا، انہوں نے زندگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی مراقبۂ موت اور درس عبرت نامی نظموں میں کی ہے۔ زیر نظر مضمون اور اس کے اقتباسات کا محرک ان ہی نظموں کے اشعار ہیں، حضرت مجذوبؒ کی درس عبرت نامی نظم کا ایک قطعہ ہے:

تجھے پہلے بچپن نے برسوں کھلایا ☆ جوانی نے پھر تجھ کو مجنوں بنایا
بڑھاپے نے پھر آ کے کیا کیا ستایا ☆ اجل تیرا کر دے گی بالکل صفایا
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے ☆ یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

انسان کے وقت حیات کا اس سے زیادہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ نہ وقت کے کنارے کسی کے ہاتھ میں ہیں اور نہ اسکے دھارے کسی کے بس میں، اسکی ابتداء انسان کی پیدائش کہلاتی ہے جبکہ اس کی انتہاء انسان کی موت کا عنوان

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (محرم الحرام ۱۴۴۱ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱۱۵)

ہے، گویا انسان کا نہ پیدا ہونا اس کے اختیار میں اور نہ مرنا اس کے بس میں، چنانچہ یہ دو طرفہ بے بسی و لاچاری اس حقیقت کی بین و روشن عقلی دلیل ہے کہ موت وحیات کا یہ درمیانی وقفہ بھی ایک لحاظ سے ہمارا نہیں ہے، اگر اس درمیانی وقت ''حیات'' پر انسان کو قدرت حاصل ہوتی تو خواہش وخدشات، مسائل ومصائب کا رخ ہر انسان اپنے احوال کے مطابق متعین ومقرر کیا کرتا جبکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے، یہ درمیانی وقت، حیات نو بھی بخش سکتا ہے اور زندگی کو موت سے بدتر بھی بنا سکتا ہے، موت وحیات کے شکنجوں میں جکڑی بندھی یہ حیات مستعار ہمیں مختلف مراحل سے گذارتی ہے، خواہ ہمیں احساس ہو کہ نہ ہو، ہم چاہیں یا نہ چاہیں، زندگی کے یہ ادوار گذرتے جائیں گے، ہمارا مستقبل حال میں تبدیل ہوتا رہے گا اور ہمارا حال ماضی بنتا چلا جائے گا، بچپن پلک جھپکتے پچپن کی سرحد کو عبور کر کے بڑھاپے کی منزل پر لاکھڑا کر دیتا ہے اور یہ برق رفتار سیل رواں عدم سے وجود میں آ کر معدوم ہو جاتا ہے اور ہمارے ذہنوں پر واقعات کا خوشگوار وگراں بار ہلکا اور گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے اور زندگی انسان کو فراموش کر کے اس طرح لوٹ جاتی ہے کہ اب اس کا مقام و مرتبہ اسکے اختیارات کے عناوین اس کا تکبر سماج و معاشرے میں اس کی ناگزیریت اور اس کی شخصیت کا مکمل تعارف محض دو فٹ کے کتبے میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کریم اپنے بلیغ ومعجز انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا [1] (اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہر اس شخص کے لئے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے) یا دوسری جگہ فرمایا کہ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا، [2] وہ (دنیا میں) صرف ایک شام یا صبح رہے، لہٰذا درس عبرت یہ ہے کہ حرکت وسکون کا مزاج رکھنے والی اس دنیا میں اگر بیش قیمت کوئی چیز قرار دی

(۱) سورۃ الفرقان:۶۲ (۲) سورۃ النازعات:۴۶

جا سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف وقت ہی ہے اسی کا صحیح یا غلط استعمال دنیا سے لے کر آخرت تک کی منزل کا تعین کر سکتا ہے اور انسان کی محنتیں و کاوشیں نیز انکے بلند و بالا یا پست و مذموم نتائج و ثمرات کا انحصار صرف وقت کے صحیح یا غلط استعمال پر ہی موقوف ہے کیونکہ وقت ایک متحرک شئے ہے محنت اور حرکت کا ایک فطری اور کائناتی تعلق ایک دوسرے سے جزو لا ینفک کے طور پر باہم مربوط ہے اور اسی محنت پر دنیا کی ترقیات کا مدار ہے اور بشرط ایمان و اخلاص نیت کے اضافے کے ساتھ اسی محنت میں دنیا سے آخرت تک کی تمام کامیابیوں کے راز ہائے سربستہ بھی اسی حقیقت میں پوشیدہ و پنہاں ہیں، گویا کامل اخلاص نیت کے ساتھ لوجہ اللہ کی جانے والی حرکت اور محنت میں ہی برکت و فیروزمندی کے جملہ راز ہائے سربستہ مکنون و مستور ہیں اور یہی حرکت وقت کا صحیح اور مطلوب استعمال بھی ہے۔

وقت کی اہمیت اور اس کی گراں قدری کی اگر تحلیل کی جائے اور تعمق فکر و نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ ماضی حال اور مستقبل، وقت کے اس تکون میں ہمارے پاس کیا ہے؟ کیونکہ کل جو گذشتہ ہے وہ تو خواب ہو گیا، آج بے ہوشی و غفلت کی نذر ہو کر ماضی کے قبرستان میں دفن ہو گیا، اب رہا آنے والا کل اس کی مثال تو ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی سیاہ رات میں گمشدہ منزل سے مختلف نہیں ہے، پتہ نہیں ہاتھ آئے کہ نہ آئے اور اسی مرحلے پر نہ جانے کتنے لوگ دھوکے کا شکار ہو کر ڈوب گئے، جنہوں نے آج کی وسعت کو تنگ پایا اور سارا زور آنے والے کل پر ڈال کر محنتوں اور امیدوں کی کشتی کو آئندہ کل کے بحر ناپیدا کنار میں ڈال دیا۔ کسی کی قسمت نے یاوری کی تو کچھ ہاتھ لگ گیا، ورنہ نہ جانے کتنے اس خیال خام کے سہارے گمنامیوں کے اندھیروں میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئے، کیونکہ جو وقت گذر گیا تو وہ قیامت تک بھی لوٹ کر نہیں آئے گا اور نہ ہی زندگی ایک لمحہ و لحظہ کے لاکھویں حصے کے بقدر پیچھے لوٹے گی چنانچہ وقت نے جو کچھ ہمیں دیدیا وہی ہمارا سرمایہ ہے اور جو کچھ ہم سے لوٹ لیا وہ ملنے والا نہیں ہے کیونکہ یہ وہ دروازہ ہے جس سے ایک دفعہ گذر گئے تو اس سے واپس جانا ممکن نہیں ہے، اس

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس صحرائے کل میں جو قافلہ گم ہو گیا وہ منزل سے رہ گیا... سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟ ماضی گذر گیا، آئندہ کل ہماری دسترس سے باہر ہے۔ لہٰذا سوائے آج کے ہماری کوئی متاع نہیں، چنانچہ ہمیں جو کچھ بھی محنت کرنی ہے وہ اسی آج میں کرنی ہے، گذشتہ کل میں جو نقصان ہو گیا تھا اس کی توبہ و تلافی کا وقت ہمارے پاس یہی آج ہے اور یہی محنت کا بروقت اور صحیح استعمال ہے جس کی بارگاہ اقدس جلّ مجدہ میں قدردانی بھی ہے اور برکات ربانی کے ورود کی علّت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ و مضمر ہے، اصحاب علم و حکم کامیابی کا نسخۂ کیمیا یہ بیان کرتے ہیں کہ گذشتہ کل کی ناکامیوں و نامرادیوں کو آج کے عمل کی تحریک بنا دی جائے اور آج کے مل جانے کو بشکر و سجود عطیہ خداوندی سمجھا جائے، جب کہ آئندہ کل ایک فکر کا فریب ہے، اس کل کے بھنور میں نہ جانے کتنے ڈوبے اور ایسے ڈوبے کہ پھر ابھرنا نصیب نہ ہو سکا، وقت کا قافلہ رخت سفر باندھ کر برق رفتار تیزی کے ساتھ سرگرم سفر ہے اس لئے آج کی جو مہلت وقت ہے اسی کو اپنی قیمتی متاع سمجھ کر وقت کے قافلے کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے رہو، نہیں تو یہ کاروان علم و عمل یہ زندگی کا قافلہ غبار راہ کی طرح پیچھے چھوڑ جائے گا اور آفات و حوادث اور آلام و مصائب کی تند و تیز ہوائیں اور اسکی بلا خیزیاں حسرتوں اور نامرادیوں کی نہ جانے کن نامعلوم اور انجان وادیوں میں جا پٹخیں گی جس میں راہ حیات کے آثار و نشانات بھی مٹ جائیں گے۔

وقت ماضی حال اور مستقبل کے تین خانوں میں تقسیم ہے، چنانچہ اس اعتبار سے مہلت عمل کا نام ہی وقت ہے جس میں ذاتی اعتبار سے نہ اس سیل حیات میں کوئی خیر ہے اور نہ کوئی شر ہے بلکہ اسکے خیر و شر کا تعین اس میں ادا کئے جانے والے اعمال سے تعبیر ہے، جس کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا ہے، خیرُ القُرُونِ قَرنی ثم الَّذین یَلُونَهم ثم الَّذین یلُونَهم [1]، زمانوں میں سب سے خیر کا زمانہ میرا ہے پھر اس سے متصل زمانہ پھر اس سے متصل، گویا مجموعی اعتبار

(۱) التفسیر المظهري، ج ۷، ص: ۲۷

سے ان تینوں زمانوں پر خیر کا غلبہ ہے، اسکے بعد قیام قیامت تک کبھی خیر غالب و فائق رہے گی تو کبھی شر کی حکمرانی کا غلبہ رہے گا۔

کسی سائل نے اہل فکر و نظر سے سوال کیا کہ متاع دنیا میں وہ کون سی شئے ہے جو سب سے زیادہ طویل بھی اور سب زیادہ مختصر بھی، سب سے زیادہ تیز رفتار بھی ہے اور سب سے زیادہ سست گام بھی، سب سے زیادہ کھینچی جانے والی شئے بھی ہے اور سب زیادہ نظر انداز کی جانے والی بھی اور ضائع ہو جانے پر سب زیادہ افسوس کی جانے والی بھی اور ایسی چیز بھی جو معمولی سے معمولی چیزوں کو دوام بھی بخش سکتی ہے اور غیر معمولی چیزوں کو لمحوں کے ہزارویں حصے میں فناء کے گھاٹ اتار دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے؟ اربابِ علم و دانش نے جواب دیا کہ ایسی متاع بے بدل کا نام ہی وقت ہے، اس لیے کہ وقت سے زیادہ طویل ترین کوئی چیز نہیں کیونکہ یہ ابدیت کا پیمانہ ہے اور وقت سے زیادہ مختصر اور کوئی شئے نہیں کیونکہ یہ ہمارے منصوبوں، آرزوؤں، تمناؤں، امنگوں اور خواہشات کے لیے ہمیشہ مختصر اور ناکافی ثابت ہوتا ہے اور جو کسی امید وانتظار میں ہو اسکے لئے وقت سے زیادہ سست رفتار کوئی چیز نہیں اور جو خوشی و مسرت کے لمحات سے گذر رہا ہو اسکے لئے وقت سے زیادہ تیز گام اور کوئی شئے نہیں ہے، طول میں اگر یہی وقت ابدیت تک پہنچ سکتا ہے تو اسکے برعکس اگر اختصار کی بات کی جائے تو یہی وقت ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں تو کیا بلکہ کروڑوں اور اربوں حصہ میں تقسیم کئے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس دنیا میں انسانوں کی اکثریت وہ ہے جو اس کو بے دریغ نظر انداز کرتی ہے اور سب ہی اس کے ضائع ہو جانے پر کف افسوس ملتے ہیں، وقت ہی ہے جو معمولی یا غیر معمولی کسی بھی واقعہ کو اگلی نسل تک منتقل ہونے سے پہلے ہی طاق نسیاں کے حوالے کر دیتا ہے اور ہر ایسے عمل کو لافانی ولازوال بنا دیتا ہے جو واقعی عظیم ہو۔

اصحاب علم و آگہی نے وقت کی ماہیت و حقیقت کو اپنے اپنے فکر و نظر کے مطابق تولا اور جانچا ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنی مشہور زمانہ مکتوباتی تصنیف ”غبار خاطر“ کے مکتوب

نمبر ۲۳ میں رقم طراز ہیں کہ: عرب کے مشہور فلسفی شاعر ابوالعلاء معری نے زمانے کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا ہے جس کی عکاسی درج ذیل اشعار میں کی ہے۔

ثلاثة ايّام هى الدهر كله ☆ وماهن الا الامس واليوم والغد

وما القمر الا واحد غير انه ☆ يغيب ويأتى بالضيا المجدد

(یہ سارے کا سارا زمانہ تین ہی دن تو ہے جو گذشتہ کل، آج کا دن، اور آئندہ کل ہی تو ہیں، اور چاند اگرچہ ایک ہی ہے مگر وہ غائب ہونے بعد اگلے دن نئی روشنی کے ساتھ طلوع ہوتا ہے)

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں یہ نقص تھا کہ جسے ہم حال کہتے ہیں وہ فی الحقیقت اپنا وجود کہاں رکھتا ہے؟ یہاں وقت کا جو احساس ہمیں میسر ہے وہ یا تو ماضی کی نوعیت کا ہے یا مستقبل کی، اور ان ہی زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم حال کے نام سے پکارنے لگتے ہیں، یہ سچ ہے کہ ماضی اور مستقبل کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے، لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ بھی نہیں سکتے، ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا اور ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی، اب وہ ہمارے سامنے ماضی ہے جو جاچکا ہے یا مستقبل ہے جو ابھی آیا ہی نہیں ہے، لیکن خود حال کا کوئی نام ونشان دکھائی نہیں دیتا ہے، جس وقت ہم نے پیچھا کرنا چاہا وہ حال تھا اور جو ہماری پکڑ میں آیا وہ ماضی ہے۔ گویا حقیقت حال کو بصیرت کے ساتھ قریب ہوکر دیکھیں تو واقعہ یہ ہے انسانی زندگی کی پوری مدت ایک صبح اور ایک شام سے زیادہ نہیں ہے، صبح آنکھیں کھلیں، دن امید وبیم میں گذرا، رات آئی تو پھر آنکھیں بند ہوگئیں **لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا**(۱) یہی وقت کی حقیقت اور ماہیت ہے۔

ازروئے کلام اللہ واحادیث رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز محشر ایک ایک چیز

(۱) ترجمہ: وہ (دنیا میں یا قبر میں) ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں رہے۔ (سورۃ النازعات: ۴۶)

کی حساب دہی دین اسلام کے مسلمات کا ایک لازمی حصہ ہے، ایک ایک چیز کا حساب ہوگا ایک ایک بات کے بارے میں باز پرس ہوگی، اعمال، افعال، اقوال، حرکات وسکنات غرض کہ حیات دنیوی کا کوئی گوشہ و جزیہ بھی اس دائرہ حقیقت سے باہر نہیں ہوگا، کراماً کاتبین انسان کی ایک ایک حرکات وسکنات، جنبش اعمال اور گردشِ رفتار میں ظہور پذیر ہونے والی کارروائیوں کو محفوظ کرنے پر مامور ہیں۔

امتحان و آزمائش کی اس دنیا میں غفلتوں کے اسباب جا بجا بکھرے ہوئے ہیں، عقل و نگاہ کو خیرہ کر دینے والے مناظر قدم قدم پر قدم روکتے ہیں، نفس کی خواہشات جگہ جگہ پر جی لگانے اور لبھانے کو تیار ہیں، اس کارگہِ عالم کے جلوں کی چمک دمک دامن دل کو کھینچتی ہیں، حقیقت واقعہ یہ ہے اس پُر خار وادی کے باقسمت مسافر پر اگر رحمت حق جلّ مجدہ سایہ فگن نہ ہو تو ہدایت کے بغیر مجرد عقل کی راہنمائی میں منزل کا پتہ پالینا ممکن ہی نہیں ہے، چنانچہ ایسے میں اس مقصد حیات **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** (۱) اور اسکے ہمہ جہت مقتضیات و مطالبات کو ہر دم ولحظہ اور قدم بہ قدم فکر و خیال میں تازگی پہنچاتے رہنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ گردشِ لیل ونہار کا کوئی لمحہ ولحظہ ایسا نہیں جو یا تو کام کو سنوارنے والا ہو یا کام بگاڑنے والا ہو، کسی بھی لمحے میں جو بھی اہم یا غیر اہم، معمولی یا غیر معمولی کام کیا جائے گا خواہ وہ خیر کا ہو یا شر کا ہو وہی وقت کا استعمال ہے اور بروز محشر اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ لہٰذا اخلاص نیت کے ساتھ فکر و خیال کی اصلاح کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ نہایت جامع دعا تیر بہ ہدف ہے۔

''اے مالک دو جہاں! ہم آپ سے اس مہلت حیات کی گھڑیوں میں بہتری اور عمر عزیز میں خیر و برکات کا سوال کرتے ہیں۔''

وما توفيقي إلا بالله

---

(۱) ترجمہ: اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ (سورۃ الذاریات: ۵۶)

فتنۂ عالم آشوب اور محاسبۂ عمل

فارسی کی ایک مثل مشہور ہے کہ پڑوس میں لگائی جانے والی آگ ایک نہ ایک روز اپنے گھر تک ضرور پہنچ کر رہتی ہے، اس سے متعلق تاریخ انسانی کے تجربہ کار تجزیہ کاروں نے مختلف اقوام و ملل کی واقعاتی شہادتوں کے حوالے سے بے شمار حقائق سے دنیا کو روشناس کرایا ہے جس سے کہ تاریخ بنی نوع انسانی کے صفحات ایسے لاتعداد حقائق کے مشہود ہیں، جس کا مختصر ترین اجمال یہ ہے کہ چند صدیوں قبل گذشتہ ادوار میں خونچکاں واقعات کا ظہور اور اسکی وجوہات و علل کا تعلق بالعموم علاقائی مسائل نزاع سے ہی مربوط ہوتا تھا اور اسکے نتیجہ میں اسی مخصوص علاقے میں یا زیادہ سے زیادہ اس کے قریب ترین خطے متأثر ہوتے تھے، نفرتیں، خوں ریزیاں اور عسکری تصادم اور اسکے بھیانک و عبرت انگیز نتائج مخصوص علاقے کے لوگوں پر اثر انداز ہوتے تھے اور اسکی بڑی وجہ ذرائع ابلاغ کا محدود نظام یا فقدان بھی تھا، مہینوں کیا بلکہ بسا اوقات تو سالوں تک بھی دور دراز کے علاقوں کے لوگ حقیقت واقعہ سے بے خبر رہتے تھے، شاید کہ ان کی ذہنی فراغت و بہتر صحت کے رموز بھی اسی بے خبری میں مضمر رہے ہوں، لیکن یورپ کے صنعتی انقلاب نے جہاں ایک طرف ہمہ جہت عالمی ارتقاء کی بنیاد رکھی اور دنیا کو یہ کہہ کر ایک نئے دور سے

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (جمادی الاخریٰ ۱۴۴۱ھ مطابق جنوری رفروری ۲۰۲۰ء، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱۲۰)

روشناس کرایا کہ عقل انسانی کو مبہوت کر دینے والی روشنیوں کی جانب انسان اور انسانیت کی ترقی کا یہ پہلا قدم ہے اور انسان دور وحشت سے مہذب دنیا کے لیے پابہ رکاب ہے اور واقعتاً روشنیوں کے اس تیز رفتار سفر ارتقاء نے انسان کی عقل و بصیرت کو مبہوت اور اسکی بصارت کو چندھیا کر رکھ دیا اور گذرتے وقت کا ہر آنے والا دن عقل کے لیے حیرانگیزیاں لیکر نمودار ہونے لگا، نوبت بایں جا رسید کہ اس برق رفتار ترقیات نے وحشت و تحیر کے تمام مراحل و کیفیات کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور انسان اس مرحلے پر پہنچ گیا کہ بڑی سے بڑی اور اہم سے اہم ایجاد بھی کسی کے لیے موجب استعجاب نہیں رہی اور مادی دنیا میں ناممکن کا لفظ بقول شخصے کہ لغت کی کتاب سے ہی نہیں بلکہ ذہن انسانی سے بھی محو ہونے لگا اور جب تک انسان اس قابل ہوا کہ وہ اس ارتقا کے خوشگوار و ناگوار نتائج کا تجزیہ کرنے کے لائق ہو بہت دیر ہو چکی تھی اور وہ اس طلسماتی مرحلے میں قدم رکھ چکا تھا جہاں سے واپسی کا خیال اس کو سیدھا ایسے دور میں پہنچا سکتا ہے جہاں آج کا انسان سانس بھی لینے کا تصور تک نہیں کر سکتا اور ادھر انسانیت نوازی کے سنجیدہ تجزیہ کاروں کے حلقوں میں گونج سنائی دینے لگی تھی کہ انسان کے ارتقا کی اساس انسانیت کے زوال و تباہی پر رکھی گئی ہے اور بنی نوع انسانی نے اس ترقی کی جو قیمت ادا کی ہے یا کر رہی ہے یا مستقبل کی متوقع ادائیگی ہے وہ اس ترقی سے سیکڑوں گنا زیادہ ہے جسکے نتیجے میں بلا تخصیص و تفریق ملک و قوم اجتماعی سطح سے لیکر انفرادی سطح تک متاع بیش بہا اور قیمتی ترین اثاثۂ سکون قلب و ذہن سے آج کا انسان محروم ہو گیا اور ظلمت کدہ کے سوداگروں کے ہاتھوں سسکتی بلکتی انسانیت رہن رکھی جا چکی تھی، اس پر بہمہ اقسام کے خوف مسلط کر دیئے گئے تھے، ایک انسان خواہ وہ دائرۂ اجتماعیت میں ہو کہ عزلت کدہ میں، اُن انجان آنکھوں کے خوف اور اس کے احساس سے نجات نہیں حاصل کر سکتا ہے بلکہ ان کے دیئے ہوئے آلۂ بینائی و شنوائی کو حرز جاں بنا کر اپنے سینے سے ہر وقت لگائے رکھنے پر مجبور کر دیا گیا، گویا کہ حکم حاکم مرگ مفاجاۃ والا معاملہ ہے جو ہم دکھائیں

وہ دیکھو، جو ہم سنائیں وہ سنو اور اگر تم ہمارے جاری کردہ احکام کی تابعداری نہیں کر سکتے تو جاؤ اور جا کر اٹھارویں صدی میں جی سکتے ہو تو جی لو، اور یوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور افراط زر، خواہشات و ضروریات اور انسان و انسانیت کے درمیان کا توازن افراط و تفریط کے زیر اثر غیر متوازن ہوتا چلا گیا، دنیا کی معیشت پر قبضہ اور ایجاداتی مسابقت کی اس دوڑ سے دنیا کے اندر سرد جنگ اور تہذیبی غلبے کے رجحان کو تشدد آمیز فروغ حاصل ہوتا چلا گیا اور عالمی قوتوں کے غلبۂ تہذیب کے ان تشدد آمیز نظریات نے دنیا کو پہلی اور دوسری عالمی خوں آشام جنگوں کی صورت میں ایسی بھیانک اور ہولناک تباہی و بربادی سے دوچار کیا جس کا شاید دور وحشت و بربریت میں بھی تصور کرنا محال تھا اور ان جنگوں میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل ہو کر موت کی وادیوں میں دفن ہو گئے، لاکھوں لاکھ مجبور و لاچار انسانوں نے خانماں برباد ہو کر نسلوں تک اس کا کفارہ ادا کیا بلکہ آج تک ان کی نسلیں اور علاقے اسی کفارے کی قسطیں ادا کر رہی ہیں۔

جنوبی ایشیا کے ممالک میں جاپان جو کہ کبھی جدید ہتھیاروں کی ایجادات کے بل پر عالمی غلبے کی اس دوڑ میں شامل سمجھا جاتا تھا، عالمی طاقتوں نے اسکے دو علاقوں ہیروشیما اور ناگاساکی کو نشان عبرت بنا کر دنیا پر اپنی قوت اور متکبرانہ عظمت کے زیر اثر انسانیت سوز وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنیا پر اپنا جابرانہ تسلط قائم کیا، انسانیت کے نام نہاد محافظوں نیز اعلیٰ جمہوری اور تہذیبی اقدار کے دعویداروں اور ڈنکا پیٹنے والوں کے عزائم کا دنیا نے مشاہدہ کیا، عالمی غلبے کے اس خونچکاں رجحان اور جنگی جنون کا وسط ایشیا کے مسلم ممالک کو سب سے بڑا اخراج ادا کرنا پڑا جو کہ خلافت عثمانیہ کی شکست و ریخت اور اس کے خاتمے جیسے عظیم ترین سانحہ پر منتج ہوا، جس کے مختلف الجہت گہرے اثرات سے دنیا کے کسی بھی خطے میں بسنے والا مسلمان کسی نہ کسی درجے میں کم یا زیادہ متأثر ضرور ہوا اور اسی کے نتیجے میں استبدادی قوتوں کے ہاتھوں پورا عالم اسلام حصے بخرے ہو کر شاہانہ غلامی کی جکڑ بندیوں میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا گیا، ع:

جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے

اس تباہی و بربادی میں یاران دغا باز اور اغیار مکر ساز کے کردار کی داستان ایک الگ مستقل بحث کا موضوع ہے، قصہ مختصر یہ کہ پس پردہ متحرک صیہونی قوتوں کے بل پر صلیبی عالمی طاقتوں نے بال فور معاہدے کی آڑ میں اسرائیل کو جنم دیا اور یہاں سے اہل اسلام کے لئے ایک نئی داستانِ الم رقم کی جانے لگی اور کلمۂ توحید کے متبعین کے لیے آزمائشوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، معاندین اسلام کے خاکستر میں صدیوں سے پوشیدہ حسد وانتقام کے ناپاک عزائم کو ایک مرتبہ پھر پنپنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ لگا اور عظیم تر اسرائیل کے پس تخیل عالمی غلبے کی خواہش کو معرضِ وجود پر لانے کے مختلف منصوبے بروئے عمل لائے جانے لگے، جسکی شاہ کلید عالمی معیشت پر مکمل قبضہ اور تسلط تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ عالم اسلام اور مسلمانوں کے برخلاف خطۂ عرب میں دہکائی جانے والی اس آگ کی تپش وطن عزیز میں بھی محسوس کی جانے لگی ہے اور اس تہذیبی تصادم اور غلبۂ تہذیب کی جنوں خیزیوں نے ہندوستان کی سیکولر تہذیبی و تمدنی، صدیوں پرانی خوبصورت روایات کو بھی خطرے میں ڈال دیا جس کے نتیجے میں ملک کی رشک انگیز گنگا جمنی تہذیب آج مختلف خطرات و خدشات سے دوچار ہے، اگرچہ عہد رواں کے ان خوں آشام ارادوں اور فاسد عزائم رکھنے والوں کے بالمقابل بلا تفریق مذہب وملت تعلیم یافتہ اور باشعور وسیکولر نظریات رکھنے والے ان برادران وطن کی تعداد آج بھی بہت زیادہ ہے جو ملک کی مشترکہ تہذیبی روایات کی بقا اور آئین ہند کے تحفظ پر یقین رکھتے ہیں اور دستور ہند میں اقلیتوں کو دیئے گئے تحفظات کے دفاع و بقاء کی جدوجہد میں شانہ بہ شانہ ہم صف و ہم رکاب ہیں، جس کو ہم یقین کی کسوٹی پر ذات حق جل مجدہ کے تکوینی فیصلوں کے زیر اثر نصرت خداوندی کا استعارہ اور امید کی روشنی تصور کرتے ہیں، جسکے مظاہر شہریت ترمیمی ایکٹ کی مخالفت اور ملک و آئین کی حفاظت کے تناظر میں اہل وطن کی مشترکہ جدوجہد اللہ تعالی کے تکوینی فیصلوں میں ان شاء اللہ خیر کے ظہور پر منتج ہوگی،

اس حقیقت واقعہ میں کسی بھی قسم کے شک وکلام کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس وقت پورا ملک بالعموم اور ملت اسلامیہ ہندیہ بالخصوص ایک انتہائی آزمائشی دور سے گذر رہی ہے جس میں اس کی جان ومال، عزت وآبرو اور دینی وملی تشخص پر ہمہ جہت خطرات و خدشات کے بادو باراں چھائے ہوئے ہیں، ہر شخص اندیشہ فردا سے ایک خوف ودہشت میں مبتلا ہے، راست فکر اہل وطن کے ساتھ مل کر نونہالان امت، بلا لحاظ عمر عامۃ المسلمین اور ملی قائدین ازالۂ ابتلا کی جو کوششیں اور تدابیر بروئے عمل لارہے ہیں جان ومال ایثار اور قربانیوں کے جو نذرانے پیش کر تاریخ رقم کر رہے ہیں ان کی اہمیت، افادیت اور ضرورت اپنی جگہ پر مسلّم، درست اور بجا سہی نیز تاریخی اعتبار سے بھی حقیقت کے اس پہلو کو مسترد یا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایسے ہیجان انگیز ماحول میں مختلف فکر و نظریات کے زیر اثر ان کی تعریف تنقید اور تنقیص کا کیا جانا یہ سب بھی ایسے نازک ترین مواقع پر اجتماعیات کی خاصیات ونفسیات کا حصہ ہوا کرتی ہیں، تاہم اس کا دوسرا پہلو جس کا تعلق ایمان وایقان اور انابت الی اللہ اور رجوع الی القرآن سے ہے، بشرط عمل جہاں سے نصرت وظفر مندی کا وعدہ غیبی ہے اس جانب توجہات کا ارتکاز عہد رواں کی سب سے زیادہ اور اہم ترین ضرورت ہے۔

ذات حق جل مجدہ نے اس دنیا کو اسباب ومسببات سے مربوط کیا ہے، ہر شے کا ظہور وعدم، اثرات ومؤثرات علل واسباب کے تابع ہے، صحت، تندرستی، بشاشت، لذت، انبساط، عزت، وجاہت، کشائش، دلجمعی، دکھ، درد، بیماریاں، وبائیں، بلائیں، ذلتیں، غم والم، گھٹن، پراگندگی، انسانی ظلم وستم؛ غرض کہ دنیا کی کوئی شئے اور کوئی کیفیت اس امر تکوینی سے خارج نہیں ہے، جس کو کلام اللہ نے بہت واضح اور دوٹوک انداز میں فرمادیا ہے، وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (۱) جو کچھ سختیاں جو کچھ مصیبتیں انسان پر آتی ہیں وہ تمہارے اپنے اعمال کی بنیاد پر

(۱) سورۃ الشوریٰ: ۳۰

ہے، یہ ایک کسوٹی اور آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنے فکروعمل کے نقص وکجی کے تناظر میں نازل ہونے والے مصائب کا جائزہ لے سکتا ہے کہ وہ کون سے فرائض و واجبات اور اعمال وافعال ہیں جو ہمیں کرنے چاہئیں تھے مگر نہیں کئے یا اسکی جانب التفات کرنا چھوڑ دیا یا اس سے غفلت اور بے اعتنائی برتی جس کے نتیجہ میں یہ مصیبت ہم پر مسلط ہوگئی ہے، جس کی ایک صورت أعمالکم عُمّالکم سے بھی عبارت ہے کہ تمہارے اوپر جوعمال وحاکم مسلط ہوتے ہیں وہ دراصل تمہارے اعمال کی ہی ایک حسی صورت ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے مسلط شدہ مصیبت کسی نقص وغفلت کا ہی نتیجہ ہو، بلکہ اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ جب انسان کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اصول ہے کہ دنیا اس سے اس دعوے کی دلیل طلب کرتی ہے تاکہ دعویٰ ثابت ہوسکے، جب ہم نے کلمۂ توحید لا الٰہ إلا اللّٰہ محمد رسول اللہ کہہ کر حق تعالیٰ جل مجدہ کی وحدانیت اوران کے رسول حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت پر تسلیم ورضا کا دعویٰ کیا ہے تو اس کو مختلف مراحل سے گذار کر اس سے دلیل طلب کی جاتی ہے کہ یہ دعویٰ محض زبانی کلامی ہے یا اس کی بنیاد صدق مقال پر ہے، جسکو قران کریم نے کہا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱)

(یقیناً ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور فاقے سے اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنادیجئے جنکی یہ عادت ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں ہم مع مال واولاد حقیقتاً اللہ کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں)

چنانچہ مصائب کی نوعیت خواہ آزمائشی ہو یا تعذیبی ہو، اسکا تعلق انسان کے

(۱) سورۃ البقرۃ:۱۵۶-۱۵۵

غیر معتدل شعوری ولاشعوری افعال سے ہی مربوط ہوتا ہے اور جب جب ان افعال میں قانون الٰہی کی خلاف ورزی شامل ہوگی تو یہ محض عیوب نہیں رہیں گے بلکہ ذنوب بن جائیں گے، اور اس کا ایک بڑا خوبصورت پیمانہ یہ قول بھی جو کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منسوب ہے کہ ایک موقعہ پر مجلس میں ایک سائل نے سوال کیا کہ ہم پر یہ جو انفسی و آفاقی اور داخلی وخارجی مختلف قسم کے مصائب آتے ہیں تو ازروئے قرآن واحادیث وہ ہمارے اپنے خود کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جن کی نوعیت آزمائشی بھی ہوسکتی ہے اور تعذیبی بھی ہوسکتی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہ کیسے پتہ چلے کہ نازل شدہ اس مصیبت سے ذات حق جل مجدہ کا مقصد بندوں کی آزمائش ہے یا یہ آفات ومصائب کا نزول اور وقوع ان کی صفت جلال وقہاریت کا مظہر ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسے مواقع پر اپنی طبیعتوں پر غور کرو اگر ان مصائب کے نتیجے میں تمہاری طبیعتوں میں رجوع الی اللہ انابت الی اللہ اور توبہ واستغفار پر ارتکاز کے جذبات موجزن ہوتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، لیکن اگر ان تمام مصائب کے باوجود تمہارے درون قلب کوئی انفعالی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے اور وہی جمود وہی تعطل وہی غفلت وکوتاہی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی جانب سے وہی بے اعتنائی کا معاملہ رہتا ہے تو سمجھ لو کہ یہ آزمائش نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی جانب سے یقیناً ایک عذاب اور قہر خداوندی ہے۔ چنانچہ اس کسوٹی پر بھی درپیش مصائب کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔

جائزے کے دورُخ

اس دنیا کی زندگی کے مختلف ادوار میں انسان کو ہزارہا قسم کے غموں کا سامنا ہوتا ہے، مگران تمام غم وآلام کی ایک ہی بنیادی وجہ ہوتی ہے، وہ یہ کہ سارے غم اس فانی دنیا کی عارضی آسائشوں سے محرومی یامحرومی کے اندیشوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان تمام غموں کے پیش آنے پر انسانی ردعمل کو ہم دو بنیادی اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

ایک ردعمل وہ ہے جوصبر، حوصلے، برداشت، توکل، قناعت اور مادی و معاشرتی مصائب وآلام کے باوجود راہ حق پر قائم رہنے سے عبارت ہوتا ہے، یہ ردعمل رب تعالیٰ کی صحیح معرفت کے حصول کے لیے ایک ذریعہ اوروسیلہ کا کام سرانجام دیتا ہے، یہ مثبت و راست رویہ ہمیں اپنے خالق ومالک اوراپنے رب کریم سے ذہنی اورفکری طور پر قریب سے قریب ترکرتا چلاجاتا ہے، اس رویے کے ساتھ ہرنئی مشکل ومحرومی ایک مومن اور ذات حق جل مجدہ کے تعلق میں تکوینی اعتبار سے بے مثال خوبصورتی اور پختگی کے احساس کوتازہ کرتی چلی جاتی ہےاورہمارے باطن کی پاکیزگی کا موجب بن جاتی ہے۔

جبکہ اس کے برخلاف دوسرا ردعمل وہ ہے جوشکوہ وشکایت، ناشکری و ناامیدی بداخلاقی اورلاحاصل قسم کے مباحث میں وقت ضائع کرنے کی شکل میں ظاہرہوتا ہے،

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ مطابق نومبر/دسمبر ۲۰۲۰ء، جنوری ۲۰۲۱ء، جلد: ۱۲، شمارہ: ۱۳۱، ۱۳۰)

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ مصائب و مسائل اس دنیا کی محرومی پر ہی منتج ہوتے ہیں بلکہ مایوسی و غفلت کے سوا ہمیں کچھ نہیں دے پاتے، اور دین و دنیا میں توان کی وجہ سے پے در پے نقصان اٹھانا ہی ہمارا مقدر بن جاتا ہے جس کے نقصان دہ اثرات فرد سے خاندان اور سماج و معاشرے کے بگاڑ کا سبب بن جاتے ہیں اور اس آخر الذکر ردعمل کے نتیجہ میں فرد کی دنیاوی زندگی پر جو تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ تو ہوتے ہی ہیں لیکن اس کے علاوہ جن دائمی نقصان دہ نتائج کا سامنا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اخروی زندگی کے نتائج و ثمرات، اجر و ثواب سے محروم رہ جانے کے ساتھ رب کریم کی عطائے رحم و کرم سے بھی محروم رہ جاتا ہے، ان دونوں ردعمل کے تناظر میں ضروری ہے کہ نجی اور ذاتی احوال و اعمال کے ہمہ جہت مواخذہ کے ساتھ عہد رواں کے پیش آمدہ مسائل اور اس کے نتیجہ میں مزاجی تغیرات کا سنجیدگی سے جائزہ لیکر اپنے رویے پر غور کیا جائے کہ ہماری طبیعت و شخصیت کا رجحان کیا ہے، دینی اور لادینی تصور حیات میں یہی بنیادی فرق ہے کہ دینی تصور مسبب الاسباب اور توکل و یقین کے تسلسل اور اس کے نتائج کے گرد گھومتا ہے جبکہ لادینی تصور ظاہری اسباب پر بھروسہ کے نتیجہ میں مایوسی و ناامیدی پر منتج ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے عہد کے مسائل و آلام کا اپنے ردعمل کی روشنی میں ہمہ جہت جائزہ لیکر فیصلہ کریں اور اگر پہلے ایسا نہیں کیا تو اب یہ کوشش کرنی ہے کہ اب سے ان غموں میں پوشیدہ نعمت کے دائمی ثمرات کو پہچان سکیں اور انھیں رب کریم سے قربت کے حصول اور باطن کی پاکیزگی کے حصول کا ذریعہ بنائیں، ایسی پاکیزگی جو انشاءاللہ ہمیشہ کی زندگی میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی قربت کے قابل بنادے گی۔

وما علینا إلا البلاغ المبین

اللہ تعالیٰ کا قانونِ فضیلت

ذات حق جل مجدہ کے قانون فضیلت میں کمال کا توازن اور حکمت کارفرما ہے کہ کسی کی فضیلت دوسرے کی مفضولیت کو لازم نہیں ہے، علیٰ سبیل المثال ایک شخص کو اگر علم دین میں فضیلت حاصل ہے تو ضروری نہیں کہ اس کو علم طب میں بھی وہی افضلیت حاصل ہو، کسی کو اگر فن تعمیر میں مہارت کے سبب فضیلت حاصل ہے تو قطعاً اسکا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا ہے کہ وہ فلکیات کا بھی ماہر ہو، اب اسی پیرائے میں علوم شرعیہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہی نتائج یہاں بھی برآمد ہونگے کہ ایک محدث وقت کو علم حدیث میں فضیلت حاصل ہے تو اس صفت فضیلت سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس کو فن تفسیر پر بھی اسی درجہ فضیلت حاصل ہے، ایک فقیہ وقت کے میدان عمل کے فضائل ایک متکلم کی مفضولیت کی دلیل قرار نہیں دی جاسکتی ہے، جسکے معنی یہ ہوئے کہ کارزار عمل کی تبدیلی سے دونوں کو ایک ہی وقت میں فضیلت بھی حاصل ہے اور ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کے حق میں مفضول بھی ہیں، بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ایک ہی انسان بیک وقت عالم و فاضل بھی اور ٹھیک اسی وقت میں محض جاہل ہی نہیں بلکہ اجہل بھی ہے، مثلاً ہمیں ذات حق جلّ مجدہ نے علم دین کی تھوڑی بہت سمجھ عطا فرمادی تو ہم پر عالم دین کی تہمت چسپاں ہوگئی ہے، لیکن اسی وقت علم طب، علم قانون اور دیگر دنیا بھر کے

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (محرم تا ربیع الاوّل ۱۴۴۲ھ مطابق ستمبر تا نومبر ۲۰۲۰ء، جلد:۱۲، شمارہ:۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷)

بے شمار ولا تعداد علوم دنیا میں ہی نہیں بلکہ علوم دینیہ کے بھی نا قابل شمار جہات میں ہم پر جاہل ہی کا نہیں بلکہ اجہل کا عنوان ہمارے تعارف کا سرنامہ قرار پاتا ہے، اور یہی وَمَآ أُوْتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيلًا (۱) کی تشریح بھی ہے، اور ہمارے حق میں علم کے عطائی ہونے کی دلیل بھی، گویا انسان کی عقل وشعور کی دسترس سے ماوراء اقسام اور انواع علوم و معارف سے جو ذات حق جلّ مجدہ نے ہمیں اقلّ ترین علم نہ صرف ہمیں از راہ شفقت و محبت عطاء ہی فرمایا ہے بلکہ اپنے فضل بیکراں سے بین الناس عالم و فاضل بھی کہلایا ہے وہ سب محض حق تعالیٰ کا کرم واکرام ہے، کہ حق تعالیٰ نے استعداد صلاحیت عقل وفہم اور شعور جیسی نعمتوں سے مشت استخواں انسان کو جو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا تھا اسکو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً جیسے عظیم منصب سے سرفراز فرمایا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جب ایک بچہ الفاظ قرآنی حفظ کر لیتا ہے تو از راہ شفقت اسکو بین الناس حافظ صاحب کا لقب مل جاتا ہے، حالانکہ مشت خاک اور حافظ ومحافظ میں بعد معنوی کے تناظر میں دور دور تک بھی تو کوئی نسبت نہیں کیونکہ حقیقت الامر میں اصل حافظ ومحافظ تو صرف حق تعالیٰ جلّ مجدہ کی ہی ذات ہے، یا ایسے ہی کتاب اللہ کی قرأت کرنے والا قاری کے لقب سے مشہور ومعروف ہو جاتا ہے حالانکہ اصل قاری تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے تو فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲) کہ حق تعالیٰ نے بعض کو بعض پر تفضیل وفضیلت عطاء فرمائی ہے، اس آیت کریمہ کی تفسیر وتشریح پر غور کیا جائے تو دور سے یا بعید سے فضیلت کے بالمقابل مفضولیت متبادر نہیں ہوتی ہے، گویا کہ تمام ہی ظاہری ومعنوی، نورانی وظلماتی، مادی و روحانی، مرئی وغیر مرئی تمام ہی اشیاء وانواع کائنات کو باہم دگر کمال توازن کے ساتھ مربوط رکھا گیا ہے اور یہی باہمی ارتباط بہ ہمہ اقسام کار جہاں کے ارتقا کی کلید واساس قرار پاتا ہے، چنانچہ یہی قانون خداوندی میدان علم وعمل اور فنون ومعارف میں برسر عمل

(۱) ترجمہ: اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بس تھوڑا ہی سا علم ہے۔ (سورۃ الاسراء: ۸۵)

(۲) ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ (سورۃ النساء: ۳۲)

ہے اور من وعن اسی طرح سے ارتقائے علوم و معارف کی اساس قرار پاتی ہے اور اس ارتقائی آثار و نفاذ کے لئے شخصیات اور ان کے ذریعہ انجام دلائے جانے والے فرائض کی تعیین بھی منجانب حق جل مجدہ کی جاتی ہے، معلوم ہوا کہ اوصاف ہوں، اعمال ہوں، اشکال ہوں، عبادات ہوں کہ معاملات ہوں، اجناس ہوں کہ انواع ہوں، یا کائنات کی کوئی شے ہو اللہ تعالیٰ کا قانون فضیلت اپنے مکمل کمال توازن کے ساتھ کائنات کی تمام اشیاء واجناس میں یکساں انداز میں جاری نظر آئے گا، جس کا حاصل یہ ہے کہ انواع واجناس اور اشیاء میں فضیلت کا پایا جانا حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا ایک اہم ترین جزء ہے۔ یہ نتیجہ کہ افضلیت کسی کی مفضولیت کو لازم نہیں ہے، بلکہ عقل وفہم اور مشاہدہ کے برخلاف ہے۔

و باللہ التوفیق

بزمِ عالم میں فنا کا دور ہے

روایت ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کسی صاحب نسبت عارف و بزرگ نے حضرت الامامؒ کو خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت ہی مزین و مکلّف کمرہ ہے اور امام صاحب حسب معمول دنیا و مافیہا سے بے خبر مکمل انہماک کے ساتھ مصروف تحریر ہیں۔ سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ موت کے بعد آپ پر کیا گذری؟ فرمایا کہ خواہ مخواہ لوگوں نے موت کے تعلق سے خوف زدہ کیا ہوا تھا اور موت کی شدید ترین ظاہری و معنوی کیفیات کے تعلق سے وارد شدہ روایات پڑھ کر خوف زدہ ہونا اور خوف زدہ رہنا اک طبعی اور فطری امر بھی تھا لیکن ہمارے ساتھ تو بفضل حق جل مجدہٗ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ واقعہ صرف یہ پیش آیا کہ میں اپنے حجرے میں حسب معمول ایک اہم فقہی بحث تحریر کرنے میں منہمک تھا، نہ جانے کب اور کس نے مجھے میرے سادہ سے حجرے سے اٹھا کر نہایت عالی شان اور مکلّف و مزین، آراستہ و پیراستہ کمرے میں منتقل کر دیا۔ مجھے اس تبدیلی کا اس وقت علم ہوا جب زیر تحریر بحث اختتام پذیر ہوئی اور میرے انہماک کا تسلسل ختم ہوا۔ تو ششدر و حیران کہ خدارا یہ تبدیلی عالم کا واقعہ کب کیسے رونما ہوا؟

حقیقت واقعہ یہی ہے کہ صاحبان علم و عمل کے لئے انتقالِ جہاں کی حقیقت اس

۞ برائے سیمینار ”حضرت مولانا شیخ محمد یونس صاحب جونپوریؒ: حیات وخدمات، منعقدہ جامعہ قاسمیہ کھروڈ، گجرات

سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ پیچھے رہ جانے والوں، محبت کرنے والوں، عقیدت و ارادت کا تعلق رکھنے والوں، ان سے فیض حاصل کرنے اور استفادہ کرنے والوں پر گویا کہ قیامت گذر جاتی ہے مگر اس ذات غنی حمید کی مشیت و منشاء حکمت و مصلحت بھی یہی ہے اور سنت اللہ بھی یہی ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۱). گویا کہ بالفاظ دیگر اس حقیقت کو یہ سمجھئے کہ موت نہ ہوتی تو زندگی کا آغاز نہ ہوتا اور زندگی نہ ہوتی تو موت کا وجود لا حاصل تھا۔ کیوں کہ موت و حیات، سلسلۂ آمد و رفت اس عالم کون و مکان کی بدیہی خاصیات کا بنیادی حصہ ہے، انسان بلندیوں، رفعتوں اور مرتبوں کی معراج انتہاء کو کیوں نہ پہنچ جائے، کرۂ ارضی سے لے کر آفتاب و ماہتاب پر ہی کمندیں کیوں نہ ڈال لے، بحر و بر کی گہرائیوں اور پنہائیوں میں حتی الامکان اتر ہی کیوں نہ جائے، ارض و سما کے طول و عرض کی حقیقتوں ہی کو کیوں نہ پالے مگر موت سے مفر ناممکن ہے کیوں کہ خالق کائنات نے تمام معلوم و نامعلوم کائناتوں کی تخلیق سے پہلے ہی اپنی مشیت اور حکمت کے تحت انہیں موت کے وسیلے نے ایک عالم نے دوسرے عالم اور دوسرے نے تیسرے میں منتقل کر دینے کا فیصلہ اور وقت مقرر فرما دیا تھا اور موت و حیات کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھ کر اس آمد و رفت کو بالخصوص سنت بنی آدم کا حکم تکوینی قرار دیا۔

بو علی سینا و افلاطون کجا غائب شدند
انبیاء را ہم ز دنیا انتقالے دیدہ ام
مالدار انش چرا بر مال خود فخرے کنند
مالدار نش چو ما اندر سوالے دیدہ ایم

شمس و قمر کی ہزار نورانیوں و تابنا کیوں سے زیادہ روشن یہ حقیقت ہے، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۲) حق تعالیٰ نے کوئی بھی شئے بے سبب نہیں پیدا فرمائی بلکہ

(۱) ترجمہ: اور تم اللہ کے معمول میں کوئی تبدیلی ہرگز نہیں پاؤ گے۔ (سورۃ الاحزاب: ۶۲)
(۲) ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ (سورۃ آل عمران: ۱۹۱)

مقصدیت کے تابع فرما کر حکمت کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس سلسلۂ موت وحیات کی مقصدیت کو قرآن کریم نے اپنے الفاظ معجز نما کے پیرائے میں منشائے ربانی بایں طور واضح فرمادیا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً۔(۱) قرآن کریم کے ان الفاظ سے امر واقعہ کے طور پر یہ بھی حکمت ربانی واضح ہوجاتی ہے کہ موت وحیات دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں اور اس حقیقت کے باطن میں پوشیدہ گہرائی کے حِکم ومصالح اور اسرار ورموز سے ناواقفین موت وحیات کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ زندگی کا اطلاق روح اور جسم کے اتصال پر ہے اور موت کا انطباق بہر دو عناصر کے انفصال کا نام ہے اور اس کے علاوہ دیگر کوئی حقیقت نہیں ہے جب کہ حقیقت الامر میں از روئے قرآن موت وحیات مذکورہ مقصدیت کے تناظر میں ایک ہی حقیقت کی دو حالتیں قرار پائی ہیں۔ جس طرح پانی کی تین کیفیات برف، مائع اور بخارات اگرچہ ظاہری طور پر تینوں حالتوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے لیکن حقیقت الامر میں تینوں بہر کیف پانی ہی ہیں۔ لہٰذا اصحاب علم وعمل کے سلسلۂ فیض رسانی میں معنوی تبدیلی کا واقع ہوجانا بھی دراصل حقیقت الامر میں اسی تمثیل کے مثل ہے، گویا کیفیت میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اکتسابِ فیض جو کہ پہلے بذریعہ چشم وگوش منبع فیض تھا، اب تبدیلی ماہیت کے بعد بذریعہ آثار علم وعمل جاری ہے، خواہ تحریراً ہو یا تقریراً ہو یا تلمذاً ہو۔ بہر کیف فیض رسانی کا سلسلہ معنوی اتصال کی صورت میں بدستور جاری اور باقی رہتا ہے، جسم واشکال بدل جاتے ہیں۔ علیٰ سبیل المثال امام غزالی کو اس عالم فنا سے رخصت ہوئے صدیاں گذر گئی ہیں مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا علمی فیض موقوف ہوگیا۔ طالبانِ ہدایت اور تشنگانِ علم وعمل کے لئے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جب ہم اکابرین کو دیکھتے ہیں جو کہ اپنے اپنے عہد اور وقت میں علم و

(۱) ترجمہ: جس نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون سے عمل میں زیادہ بہتر ہے۔ (سورۃ الملک:۲)

عمل کے آفتاب و ماہتاب تھے اور اپنے علمی تبحر، تعمق فکر و نظر اور تعامل بالعلم کی وجہ سے اپنی حیات دنیوی میں مرجع خلائق تھے۔ آج حالاں کہ جسم و جان کی شکل میں ہمارے درمیان بوجہ تبدیلی جہاں جسم و روح کے پیرائے میں موجود نہیں ہیں اور نہ برچشم و برگوش ہمارے لئے موجود لوگوں کے مثل اُن سے افادہ و استفادہ کا سلسلہ باقی ہے لیکن ان اکابرین کی اس دنیا سے رخصت پر دہائیاں اور صدیاں گذر جانے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان کی معنوی فیض رسانی کا سلسلہ بدستور جاری ہے بلکہ ان کی ذوات، علم و عمل کے ارتقاء کی ایسی اساس متصور کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر آج کا علمی ارتقاء تشنہ کام شمار کیا جائے گا، چنانچہ ثابت ہوا کہ علمی ارتقاء کے لئے متقدمین سے تاریخی و اسانیدی ربط و تسلسل ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں علمی و تاریخی تسلسل کا جائزہ لیتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ علم و عمل کا وہ فیض باعظمت جس کا نقطۂ آغاز محسن کائنات امی و لقبی مصطفیٰ و مجتبیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ہوتا ہوا صحابہ کرامؓ، تابعین و تبع تابعین کی علمی رفعتوں سے گذرتا ہوا امام بخاری، امام مسلم و دیگر ائمہ احادیث نیز ائمہ فقہاء سے علم و عمل کی روح کشید کرتا ہوا عہد بہ عہد رازی ہوں کہ غزالی ہوں، امام ربانی شیخ احمد سرہندی ہوں کہ محدث دہلوی شاہ ولی اللہ ہوں، بانی دارالعلوم دیوبند امام محمد قاسم نانوتوی ہوں کہ محدث کشمیری سیّد انور شاہ ہوں، حکیم الامت حضرت تھانوی ہوں، شیخ الاسلام مولانا مدنی ہوں کہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب ہوں یا حضرت شیخ محمد زکریا رحمہم اللہ علیہم اجمعین یا دیگر بیشمار علوم کے حاملین اکابر امت ہوں، از بس کہ علیٰ سبیل المثال اس بسیط، علمی کہکشانی کے سلسلے سے علم و عمل کی بالیدگیاں سمیٹتا ہوا اپنے تدریجی ارتقائی رفتار کے ساتھ ہمارے عہد کی نابغۂ روزگار شخصیت حضرت العلاّم مولانا شیخ محمد یونس صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور، تلمیذ خاص و خلیفۂ اجل شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے، جن کی ذات زیر نظر مضمون کا سبب تحریر ہے جو کہ اپنی اجلی سیرت، حسن کردار، عمل صالح، رسوخ فی العلم جیسی اور

بہت سی صفات حمیدہ کے سبب آج بھی ہمارے اذہان میں ہمارے قلوب میں اور ہماری مجالس میں زندہ ہیں اور مستقبل میں بھی مثل اکابرین سابقین قلوب میں پائندہ وتابندہ رہیں گے، البتہ موت ایک ایسی بدیہی حقیقت اور ابدی صداقت ہے جس سے کسی کو بھی رستگاری نہیں ہے، جس کا وجدانی وطبعی ادراک بلا تخصیص عالم وجاہل سب کو یکساں طور پر ہے، گویا کہ بقول شخصے کہ ایک جہان یہ ہے اور ایک جہان وہ ہے اور دونوں جہانوں کے درمیان محض ایک سانس کا فاصلہ ہے، چل رہی ہے تو یہ جہان، رک گئی تو وہ جہان اور درک وادراک کی حقیقت سے قطع نظر انسان ہی کیا بلا تخصیص تمام ہی مخلوقات عالم کوئی بزبان حال اور کوئی بزبان قال بہر لحظۂ و پل یہ اعلان کر رہا ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام. (۱) دوام اور بقاء تو صرف اور صرف خدائے بزرگ وبرتر کے لئے ہی ہے ورنہ تو ایک ایک ذرۂ کائنات بہر لمحہ سوئے عدم رواں دواں ہے اور ہر شئے ہر مخلوق کو بہر کیف کسی نہ کسی دن فنا ہو جانا ہے ۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم ☆ چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بہ دم
سانس ہے اک رہرو ملک عدم! ☆ دفعتاً اک روز یہ جائے گا تھم

لیکن اس سلسلۂ بقا اور فنا میں کامیاب و بامراد وہی انسان ہے جو اپنے علم وعمل، اخلاق واخلاص، تقویٰ وورع، حسن عمل، حسن خلق اور باعلم وعمل تلامذہ کے حوالے سے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں ہمارے درمیان میں قلوب واذہان میں مدۃ العمر موجود رہتے ہیں، خواہ علمی مصنفات کی صورت میں، خواہ افکار ونظریات کی صورت میں، خواہ باعمل تلامذہ کی شکل میں یا ایسی علمی وعملی تاریخ ساز خدمات کی صورت میں جس سے کہ ایک زمانہ مستفید ہو رہا ہو۔ بایں طور حضرت العلّام شیخ محمد یونس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت مذکورہ بالا علمی کہکشانی سلسلے کے آفتاب و

---

(۱) ترجمہ: اس زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے اور (صرف) تمہارے پروردگار جلال والی فضل وکرم والی ذات باقی رہے گی۔ (سورۃ الرحمٰن: ۲۷،۲۶)

ماہتاب سے ہی مربوط ہے اور ذات حق جل مجدہٗ نے قیامت تک کے لئے دین مبین کی حفاظت کا اسی طرح سے انتظام فرمایا ہے۔ لہٰذا اس پس منظر میں ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ اپنے علمی آثار اور تلامذہ کی صورت میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ قاعدہ ہے کہ دنیا ہر دعویٰ کی دلیل طلب کرتی ہے جس میں وہ حق بجانب بھی ہے۔ حضرت شیخ سے محبت وعقیدت کا محض زبانی کلامی دعویٰ بغیر دلیل کے دفع الوقت اور لا حاصل اور بے معانی ہے تا وقتے کہ علم وعمل، سیرت وکردار اور اخلاق واخلاص کی جو وراثت حضرت شیخ رحمہ اللہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں وہ علماً وعملاً ہمارے تعاملات زندگی کا قابل ذکر وعمل حصہ نہ بن جائیں، اس کے علاوہ دنیا کی طلب کردہ جواب کی اور کوئی صورت ممکن نہیں ہے اور یہی اپنے اکابرین سے ربط معنوی کے برقراری کا ذریعہ ہے۔

جامعہ قاسمیہ کھروڈ، گجرات کے شیخ الحدیث مخدوم محترم جناب حضرت مولانا محمد حنیف صالح صاحب لوہاروی دامت برکاتہم جن کو حق تعالیٰ نے حضرت شیخ رحمہ اللہ کی عنایات خاص کے طفیل علم وعمل سے بڑا وافر حصہ عطا فرما کر مابعد کی نسلوں کے لئے حضرت شیخ رحمہ اللہ کے تعارف کا ذریعہ بنا دیا ہے، ان کے ذریعہ حضرت شیخ رحمہ اللہ کی عظیم الشان علمی ومحدثانہ خدمات پر مشتمل جامعہ قاسمیہ میں منعقد ہونے والا یہ سیمینار لائق تبریک وتہنیت ہے۔ دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ اس عظیم خدمت کے دوررس اور نفع بخش اثرات سے نسل نو سے تعلق رکھنے والے نوجوان علماء کو بالخصوص اور تمام علمی واجتماعی دوائر سے تعلق رکھنے والے اصحابِ علم کو بالعموم مستفید فرمائیں۔

وما علينا إلا البلاغ

رحمت ترے ذرّوں کی جبیں چوم رہی ہے

امت مرحومہ کے چودہ سوسالہ دورانیۂ علم وعمل کے تاریخی حقائق کے تناظر میں اگر منصفانہ جائزہ لیا جائے تو ایک حقیقت نمایاں وآشکارا ہوکر سامنے آتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ اسلامی کا کوئی عہد وقرن اورکوئی علاقہ علمائے ربانیین اورحق وصداقت کے علمبردار رجال علم وعمل اورافراد کی مختلف النوع خدمات واجتہادات سے بالکلیہ خالی نظر نہیں آئے گا، البتہ یہ الگ بات ہے کہ منظرنامے پرنوعیتیں تبدیل ہوتی رہی ہیں کبھی ایک ہی علاقے میں مخلص رجال کار کی کثرت نظرآتی ہےتو کبھی کسی عہد میں اسی علاقے میں یہ تعداد مائل بہ زوال وتخفیف کا نظارہ پیش کرتی ہے، کبھی کسی دور میں کوئی ایک علم وفن بایں طور مائل بہ عروج نظرآتا ہے کہ ایسا لگتا ہے اہل علم وعمل کا سیل رواں ایک ہی سمت میں رواں دواں ہےاورعلم وفن کے کسی مخصوص میدان میں نت نئی مطول ومختصر تحقیقات منظرعام پرآرہی ہیں تو کبھی کسی عہد میں مختلف اصحاب علم وآگہی مختلف علمی میدانوں میں مصروف عمل ہیں اوراپنے اپنے علمی تبحر وتفردات سے ایک زمانے کوسیراب بھی کررہے ہیں اورپیش آمدہ مسائل کے حل بھی پیش کررہے ہیں اورعلوم ومعارف کی نت نئی گرہیں کھل رہی ہیں اورعلم اپنے مزاج فطرت کے مطابق عروج وارتقاء کی راہ پرگامزن ہے۔

۞ مقدمہ: مجموعہ مقالات ''خطیب الاسلام سیمینار'' منعقدہ ۱۲/۱۳/ اگست ۲۱۰۸ء، دارالعلوم وقف دیوبند، مطبوعہ حجۃ الاسلام اکیڈمی

گویا عمارات علم وفن کی تعمیر کو پیش رو نسل نے جس جگہ چھوڑا تھا اگلی نسل نے اس تعمیر پر مزید ارتقاء کی منزلیں تعمیر کر دیں، یوں ہر دور کے اندر علوم وفنون کو ترقی کی راہیں ملتی رہیں جس میں ہر دور کے زاویہ فکر ونظر اور مزاج ردو قبول کو بڑا دخل رہا ہے اور علم وفن کے ارتقاء کی تاریخ میں عبقری فکر ونظر کے حاملین اصحاب فضل وکمال نے اپنی وسیع النظری اور وسیع الفکری سے اس حقیقت ارتقاء کی اساسی حیثیت کی اہمیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور اس کے برخلاف دیگر اقوام وملل عالم کا تاریخی وقائع سے لیکر ان کا مذہبی، سماجی، معاشرتی اور معاشی منظر نامہ ان مخصوص زاویہ ہائے فکر ونظر سے اسلامی تاریخ کے بمقابلہ ویران و تہی دست نظر آئے گا اور اگر کہیں کسی بھی سطح پر خواہ علمی ہو کہ اخلاقی ہو، فنی ہو کہ سماجی ہو، معاشرتی ہو کہ معاشی ہو، سرسبزی وشادابی نظر آئے گی تو اس کی تہہ میں اسلام کے مستعارات کی جھلک ضرور ملے گی اور کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی مرحلے پر اسلامی علوم و فنون کے مرہون منت نظر آئیں گے۔ گویا کہ اسلام کے ارتقائی خصائص کے مستعارات کو جائے خشت اساس قرار دیئے بغیر ان کے لئے بھی ترقی کی راہیں مسدود تھیں۔

ذات حق جل مجدہ نے بقائے کائنات اور ارتقائے بنی نوع انسانی کی حکمت تکوین کی خشت اساس اپنی خاص صفت علم سے بنی نوع انسان کو سرفراز فرما رکھی ہے اور انسان کو یہ صلاحیت واستعداد عطاء فرمائی کہ علوم وفنون کے رموز ہائے سربستہ کو کھولتا جائے اور ترقی کرتا جائے، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ. (۱) چنانچہ اس کلیۂ ثابتہ کی روشنی میں اگر غور وفکر کریں تو بادنیٰ تأمل یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ذات حق جل مجدہ نے بقائے کائنات اور ارتقائے کائنات کے لئے اس عالم فنا میں دو نظام قائم فرمائے ہیں، بقائے کائنات کا تعلق نظام ہدایت سے ہے جب کہ ارتقائے کائنات کا تعلق نظام قدرت سے ہے اور دونوں

(۱) ترجمہ: پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے، اور انہوں نے نیک عمل کیے، تو ان کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (سورۃ التین: ۵-۶)

نظاموں کے اپنے اپنے اصول و قوانین ہیں، جب تک قدرت کے متعین کردہ اصول و قوانین حیات انسانی میں روبہ عمل رہیں گے اس وقت تک اس کے صالح اور مثبت نتائج بقاء و ارتقاء کے ضامن رہیں گے اور جہاں ان اصول و قوانین سے انحراف کیا گیا تو ان کے نتائج و اثرات انسان کے حق میں مہلک بن جائیں گے اور یہ کلیہ بہر دو نظاموں پر منطبق ہوتا ہے، علیٰ سبیل المثال اقوام عالم کا ایک دوسرے پر غلبہ و مغلوبیت کا تعلق اس دنیا میں قائم نظام قدرت سے مربوط ہے جس کی آسان تفہیم یہ ہے کہ اگرچہ دور حاضر میں مغرب کی باطل پرستی مغربی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ مشرق اقصیٰ اور وسط ایشیا سمیت مشرق بعید تک اس کے قبیح و مہلک اثرات کا غلبہ ہے تو مغرب کے بہمہ نوع اس عالمگیر غلبے اور مشرق کی مظلومانہ مغلوبیت کے آثار و نتائج کا اگر تجزیہ کریں تو اس کا بالفاظ مختصر خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے تین ہی اسباب ہیں: ایک طاقت، دوسرے علم، تیسرے اخلاق، کیونکہ غلبہ و مغلوبیت کا تعلق نظام قدرت سے مربوط ہے اسی لئے یہاں علم سے مراد معاصر دنیا کے علوم و فنون ہیں، چنانچہ نظام قدرت کے قوانین کا اصول یہ ہے کہ اگر باطل پرست بھی اس کے مطابق ہو جائے تو وہ بھی دنیا پر غلبہ حاصل کر لے گا اور اگر مومن بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ بھی مغلوب ہو جائے، یا مثلاً زہر ایک جان لیوا شے ہے مومن کھائے گا وہ بھی مر جائے گا کافر کھائے گا وہ بھی مر جائے گا کیونکہ اس کی ماہیت اور اس ماہیت کے آثار و نتائج کا تعلق نظام قدرت سے مربوط ہے، مومن و کافر کے لئے زہر کے نتائج مختلف نہیں ہو سکتے ہیں چنانچہ طاقت، علم اور اخلاق یہ مغرب کے عالمگیر مادی و فکری غلبے کے اجزائے ترکیبی ہیں جو کہ ذات حق جل مجدہ کے متعین کردہ اصول و قوانین قدرت سے بہمہ نوع مربوط ہیں، چنانچہ امت مسلمہ سمیت تمام اقوام عالم کی تاریخ غلبہ و مغلوبیت انہی اجزائے ترکیبی کی مرہون منت نظر آئے گی، عروج امت اور زوال امت کی بنیاد میں انہی اصولوں کے اتفاق و انحراف کے نتائج و آثار نظر آئیں گے۔

اب اسی ضمن میں ذات حق جل مجدہ کے قائم فرمودہ نظام ہدایت کی بات کرتے ہیں

جس کو بقائے کائنات میں حکمت تکوین کے مطابق خشت اساس کی حیثیت حاصل ہے، اس نظام کا تعلق عالم امر سے لیکر عالم خلق تک بایں طور منسلک ووابستہ ہے کہ اس کے آثارو نتائج عالم روحانیات سے لیکر عالم مادیات تک مرتب ہوتے ہیں، حق تعالیٰ نے اس کے اپنے اصول وقوانین مرتب فرمائے ہیں، نظام قدرت اور نظام ہدایت میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہاں بھی صالح اور مثبت نتائج حاصل کرنے کے لئے ذات حق جل مجدہ کے متعین فرمودہ اصول وقوانین کی پابندی لازمی تھی اور یہاں بھی اصول وقوانین کی پابندی ضروری ہے، وہاں بھی اصول وقوانین سے انحراف مہلک تھا یہاں بھی انحراف تباہ کن ثابت ہوگا، اس نظام کے بھی تاریخی وقائع بنی نوع انسانی کے عروج وزوال کے گواہ ہیں تو اس نظام کے بھی عروج وارتقاء اور قبولیت ومقبولیت کے علی الرغم ذلت ومسکنت اور تباہ حالی کے بے شمار واقعات کی شہادتیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، جس طرح نظام قدرت سے کامیاب نتائج حاصل کرنے کی بنیاد واساس طاقت، علم اور اخلاق ہیں، یہاں بھی فرق مرادات کے ساتھ علم واخلاق اور طاقت اجزائے ترکیبی ہیں، وہاں طاقت سے مادی و افرادی قوت مراد ہے، یہاں علم سے مراد نوع بہ نوع معاصر دنیا کے علوم ہیں اور اخلاق سے مطلب اصول جہانبانی کا ادراک وعمل ہے، بعینہٖ یہی نظام ہدایت کی بھی بنیاد واساس طاقت علم اور اخلاق ہیں، فرق یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد کلام اللہ کے ضیا پاش حقائق کی روشنی میں بہمہ نوع الٰہیات کے علوم ومعارف ہیں، طاقت سے مراد ان علوم ومعارف سے حاصل شدہ مثبت اور صالح آثارونتائج اور اعمال کے ذریعہ حاصل کی جانے والی قوت ہے اور اخلاق سے مراد حسب تصریح احادیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام عمل پیرا ہونے اور رہنے کا عنوان ہے، ادھر بھی اتفاق وانحراف کی صورت میں حسب حال غلبہ یا مغلوبیت پر نتائج وآثار منتج ہوں گے تو ادھر بھی کارفرما عوامل کے حسب حال نتائج نظر آئیں گے، گویا کہ بہردو نظام میں آثارونتائج کی صالحیت وہلاکت کا انحصار ذات حق جل مجدہ کے دونوں نظام کے لئے متعین فرمودہ اصول وقوانین کی قرار واقعی پاسداری اور استمرار عمل پر ہے۔

علم واخلاق اور قوت کے اس مثلث میں بہر دو جانب مرکزیت علم واخلاق کو حاصل ہے اور قوت ظاہری اور قوت معنوی اول الذکر بہر دو صفات کا حاصل نتیجہ ہیں، تاہم تفصیل سے قطع نظر اس کی صدہا امثال سیرت طیبہ میں جا بجا موجود ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے مقصد رسالت کا حصر علم واخلاق میں فرمایا ہے، **إنّما بُعثتُ معلّماً** (۱) اور **بُعثتُ لأُتمّم مكارمَ الأَخْلاق.** (۲) انہیں دو کلیدی مقاصد کے گرد اگرد ذات حق جل مجدہ نے اس کے لازمی آثارِ قوت کو روحانی وافرادی شکل میں خود بخود جمع فرمادیا اور یہی روحانی وافرادی قوت ہے جس کی ایک جماعت نے حسب مشیت رب جل مجدہ علوم وفنون کے ارتقائی مزاج کو اپنے تبحر علم اور فکر رسا سے عظمت کی محیر العقول بلندیوں تک پہنچایا، اور تنوعات علم سے ایک دنیا کو بہرہ ور فرمایا، چنانچہ خیر القرون سے لیکر تا حال اس کہکشانی سلسلۂ علم وعمل کا اس زاویۂ فکر ونظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو ادوار وقرون کی زمانی اصطلاحات کے علی الرغم علمی خدمات کا دائرہ خواہ من حیث الجماعت ہو یا من حیث الفرد ہو بالکل بالائی سطح پر جا کر مختلف النوع علوم ومعارف میں ایک خاص قسم کا ارتباط پایا جاتا ہے جس نے چودہ صدیوں پر محیط علوم ومعارف کے اس سلسلۂ ذھب کو ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔ علم وعمل کے اسی کہکشانی سلسلے کی درخشاں وتابندہ ایک شاخ ہے جو کہ علمائے دیوبند کے نام سے موسوم ہے جس کی ہمہ نوع وہمہ جہت شہرۂ آفاق علمی وعملی، ملی وسیاسی، فکری ونظریاتی، دینی وروحانی رفیع القدر خدمات کا دورانیہ ڈیڑھ صدی کی غیر منقطع طوالت کو تا حال محیط اور ناقابل فراموش ہے، اسلاف کا علم وعمل اخلاف کے لئے نمونۂ عمل اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور نظام ہدایت میں رجال سازی اور شخصیت سازی مقصدی اعتبار سے جس اہمیت کی حامل ہے وہ اہل علم وفکر ونظر سے مستور نہیں ہے،

---

(۱) سنن ابن ماجة، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج:۱، ص:۲۱، رقم: ۲۲۹

(۲) كنز العمال، الفصل الأول في الغرائب، ج:۳، ص:۱۶، رقم: ۵۲۱۷

بانی دارالعلوم دیو بند حجۃ الاسلام الامام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی دور رس نتائج کی حامل تحریک مدارس کی بنیاد میں رجال سازی اور شخصیت سازی کی مقصدیت کے ہی عناصر کار فرما ہیں، دارالعلوم دیو بند کا قیام اسی رفیع القدر مقصدیت کا مشاہداتی شاہکار ہے اور اس کے ڈیڑھ سو سالہ آثار و نتائج اور شواہد اس کے انہیں ما بہ الامتیازات کے ثبوت بھی ہیں۔

بانیٔ دارالعلوم دیو بند حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہما اللہ سے لیکر ما بعد تک کے ہمارے تمام اکابر و اسلاف کی تابندہ و پائندہ جگ روشن آشکارا وسیع الفکر علمی، عملی، دینی، اسلامی، تعلیمی، تعمیری، ملی، سیاسی، انتظامی بہمہ انواع و جہات جہود و کاوش میں قدر مشترک کے طور پر اہداف و مقاصد کے لحاظ سے ایک تاریخی تسلسل واستمرار سے بایں طور مربوط ہے کہ درمیان سے کسی ایک شخصیت کو حذف کرنا تو دور کی بات ہے ان کی قرار واقعی خدمات میں استخفاف سے بھی کام لیا جائے تو میری نظر میں وہ پوری عمارت کو متزلزل کر دینے کے مترادف ہے، کیونکہ عموماً اہل علم اور اصحاب فکر و دانش اس حقیقت واقعہ کے اثبات پر متفق الخیال پائے جاتے ہیں، اپنے اسلاف سے مضبوط رشتہ ہی ان کے اخلاف کی سر بلندی کا ضامن اور ان کی سعادت کا استعارہ ہے، تاریخ کے اوراق میں جا بجا اس کے شواہد موجود ہیں کہ نظام ہدایت میں اسلاف و اخلاف کے درمیان اس باہمی ارتباط کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، جب کہ اس کے برخلاف یہ بھی ایک مشاہد حقیقت ہے کہ جس جماعت یا وسیع تر تناظر میں جس قوم کا رشتہ اپنے اکابر و اسلاف کی رفیع القدر خدمات سے کٹ جائے یا کاٹ دیا جائے یا کمزور پڑ جائے تو اس کا وجود بحیثیت جماعت کے یا بحیثیت قوم کے رفتہ رفتہ صفحۂ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے صفحات میں اس طرح گم ہو کر داستان پارینہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ آنے والی نسلیں نظائر عبرت کے ذیل میں اس کا تذکرہ کرتی ہیں کیونکہ اسلاف کے علمی و عملی اوصاف و امتیازات، ان کی خصوصیات، ان کے کمالات،

غیرت وخودداری کے جذبات اور عظمت وشرافت اور شجاعت کے واقعات ان کے علمی و عملی کارنامے غیرت منداور خوددار اخلاف کے لئے سرچشمۂ حیات اور محرک عمل کے مثل ہوتے ہیں، اگر ان سے ہی رشتہ کمزور پڑ گیا تو ان کی رگوں میں وہ گرم خون کہاں سے آئے گا جو کہ معنوی زندگی کا سرچشمہ اور تحریک عمل کی بنیاد و اساس بن سکتا تھا، گویا کہ اپنے اسلاف سے علمی و عملی ارتباط کو باقی اور قائم رکھنا اپنے لئے ارتقاء کی مضبوط بنیاد و اساس کی فراہمی کے لئے بھی ناگزیر ہے، نیز اپنے اکابر و اسلاف کی قرار واقعی تاریخی اہمیت کی حامل عظیم تر خدمات کو افراط وتفریط کے غیر ضروری اور لاحاصل ملمع سازیوں کے عمومی طورطریقوں سے محفوظ رکھتے ہوئے رخصت پذیر شخصیات کے احوال وکوائف، واقعات ومشاہدات، نظائر وتجربات کا علمی انداز و بیان میں بحث و تحقیق اور تنقیح وتنقید کے مسلمہ اصولوں اور کسوٹی پر پرکھ کر آنے والی نسلوں کی حیات معنوی کو بنیاد واساس فراہم کی جاسکے کیونکہ یہی علمی و عملی اور تاریخی ارتباط دنیا میں ہمارے معنوی وجود و بقاء کی ضمانت ہے، چنانچہ رخصت پذیر شخصیات کی سوانح اپنی مقصدیت کے اعتبار سے شخصیت کو زندہ رکھنے کو نہیں بلکہ ان کے علمی و عملی، ملی وتاریخی کارناموں، نیز ان کے ذریعہ ارتقاء پذیر علوم وفنون کو ضبط تحریر کے وسیلے سے آنے والی نسلوں میں تحریک عمل کو فروغ دینے جیسے عظیم تر مقاصد کو محیط ہوتی ہیں۔

مؤرخہ ۱۲/۱۳/اگست ۲۰۱۸ء کو دارالعلوم وقف دیوبند میں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند ونائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی ۷۵ سالہ جگ آشکارا عظیم تر علمی و عملی، فکری وتعلیمی، ملی و تاریخی، دینی واصلاحی حیات وخدمات کا جائزہ اور اتحاد بین المسلمین کے نقیب ومنّاد کی حیثیت سے ان کی مدۃ العمر عرق ریز جہود وکاوش اور جماعتی سطح سے لیکر ملکی وبین الاقوامی سطح تک خوشگوار انداز میں مرتب ہونے والے اس کے آثار ونتائج اور اس تعلق سے ان کے زاویۂ فکر ونظر، دلائل وبراہین اور اساس الجہود کے مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں و

جہتوں سے بحث وتحقیق اور تنقیحاتی اصولوں کی بنیاد پر عالمانہ وناقدانہ جائزہ ہی دراصل اس دوروزہ سہ لسانی سیمینار کے انعقاد کا بنیادی اور اساسی مقصد تھا، تاکہ آنے والی نسلوں کو کارگاہ حیات میں تحریک عمل کی اساس فراہم ہوسکے اور بالخاص دور حاضر کے پیش آمدہ پُرپیچ ومخدوش احوال میں اتحاد بین المسلمین کی مقصدیت واہمیت ان کے قلوب واذہان میں قرار واقعی جگہ پاکر تحریک عمل کے فروغ وحوصلۂ جہود کا ذریعہ بن سکیں، نیز ذاتی اغراض ومقاصد پر ملّی مفادات کے تحفظ کی بالادستی کو بایں طور بھی اہمیت حاصل ہوسکے کہ اگر ذاتی اور محدود تر مفادات پر اتحاد بین المسلمین کی خاطر ملت کے وسیع تر مفادات کو اخلاص وایثار اور للّٰہیت کے ساتھ ترجیحی بنیاد پر بروئے عمل لایا جائے تو ۲۳/سال کے بظاہر اسباب ناقابل حل پیچیدہ مسائل کو حل ہونے میں ۲۳/منٹ بھی نہیں لگتے، اس تاریخ ساز سیمینار کی مقصدیت میں یہی عوامل کارفرما تھے۔

بارگاہ رب العزت میں بلاشک وریب یہ حقیقت لائق صد شکر ہے کہ ملت کا سواد اعظم اس مقصدیت پر متفق الخیال ہے جس کی مثل شمس وقمر روشن دلیل اس عظیم الشان اور تاریخ ساز سیمینار میں اصحاب علم وفضل علمائے کرام وسیع الفکر اور وسیع العلم مفکرین و مشاہرین اور بلاتفریق دینی وعصری مقتدر ترین مختلف علمی وتعلیمی، ملی وفکری طبقات و دوائر واجتماعیات اور تنظیمات وشعبہ جات سے تعلق رکھنے والے اصحاب فضل وکمال اور مختلف علوم وفنون کے شہ سوار اصحاب قلم کی واجب التشکر شرکت ہے، جس میں ان کے وقیع ترین تأثراتی خطابات اور نہایت بلند پایہ مقالات ونگارشات نے اس سیمینار کو عنداللہ قبولیت اور عندالناس مقبولیت کی دلیل فراہم کی ہے جس کے لئے جماعت دارالعلوم وقف دیوبند کے جملہ اراکین بارگاہ رب العزت میں بہزار سجدۂ شکر از روئے حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام **من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ** (۱) کے بموجب تمام ہی شرکائے سیمینار کی خدمت میں باخلاص نیت اور بصمیم قلب ہدیۂ تشکر

(۱) مسند أحمد، مسند أبي هريرةؓ، ج۲، ص:۴۷۲، رقم:۷۵۰۴

پیش کرتے ہیں۔ **فجزاکم اللّٰہ احسن الجزاء.** ان ہی وقیع تر مقالات وتأثرات و پیغامات کا یہ بیش قیمت مجموعہ کتابی اور دستاویزاتی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

یقیناً ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر اس تاریخ ساز سیمینار کے کامیاب انعقاد اور اس کے جملہ مراحل کے عوامل سے وابستہ افرادکار کا تذکرہ نہ کیا جائے جن کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں اور اس کے مثبت و مستقبل آفریں نتائج کے اعتراف میں تمام ہی شرکائے سیمینار نے کسی بھی درجہ میں استخفاف سے کام نہیں لیا بلکہ نہایت بلند و بالا اور اپنے مقام علم وعظمت سے وقیع تر کلمات کے فراخ دلانہ اعتراف سے جواں سال افراد کار کے حوصلوں کو جلا بخشی ہے۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے نائب مہتمم اور ادارہ کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ڈائریکٹر و استاذ ادارہ جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب اور ان کے ساتھ مرحلہ بہ مرحلہ، لمحہ بہ لمحہ ان کی جہد و کاوشوں اور شبانہ روز محنتوں میں شانہ بشانہ جواں سال جملہ رفقائے کار کی بھرپور شرکت اور ادارے کے اساتذۂ کرام و اراکین کے مربیانہ فکری مشورے اور عملی جہد اور حسب ہدایت طلبائے عزیز کی مخلصانہ کوششیں اور بروقت تعمیل وحسن کارکردگی اس سیمینار کے کامیاب انعقاد کے بنیادی و اساسی عوامل کا قابل ذکر حصہ ہیں جو کہ یقیناً اظہار تشکر وحوصلہ افزائی کا استحقاق رکھتے ہیں، بارگاہ رب العزت میں تمام ہی شرکاء و بہمہ نوع رفقائے کار کے حق میں دست بہ دعاء ہوں۔ حق تعالیٰ ان کے مثبت اور آہنی عزائم وارادوں اور ان کی مخلصانہ جہد و کاوشوں کو ادارے کے حق میں نفع بخش بنائیں اور ادارے کو جملۂ شرور وفتن کے مضر اثرات سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھیں۔ آمین یارب العالمین

وما توفیقی إلا باللّٰہ العظیم وبہ نستعین

خطبۂ استقبالیہ

بموقعہ خطیب الاسلام سیمینار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی. اما بعد!

گرامی قدر صدر عالی مقام، صاحبان فضل وکمال، حضرات علمائے عظام، دانشوران ومفکرین امت، اساتذہ کرام وطلبائے عزیز اور معزز حضرات سامعین وحاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر انتظام خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہ کی ۷۵؍سالہ علمی وعملی حیات وخدمات کے مختلف پہلوؤں، متنوع گوشوں اور جہتوں سے بحث و تحقیق اور تنقیحی اصولوں کی بنیاد پر عالمانہ و ناقدانہ جائزہ اور موضوعات متعلقہ کی تنقیحات وتشریحات اور مختلف وجہات نظر ونظریات پیش کئے جانے پر مشتمل، منعقد ہونے والے اس عظیم الشان سہ لسانی دوروزہ سیمینار میں تشریف لانے والے اصحاب علم وفضل علمائے کرام، وسیع الفکر و وسیع العلم مفکرین ومشاہرین اور بعطائے حق جل مجدہ تعمق علم وآگہی رکھنے والے اصحاب قلم اور مختلف طبقات وشعبہ جات سے منسلک حضرات مہمانان ذی وقار،

۞ خطیب الاسلامؒ کی حیات وخدمات پر ایک بین الاقوامی سہ لسانی سیمینار مؤرخہ ۱۲/۱۳؍اگست ۲۰۱۸ء کو منعقد ہوا، یہ تحریر اس کے خطبہ استقبالیہ کے لیے لکھی گئی۔

اخلاص ومحبت کی بنیاد پر لائق صد شکر وممنونیت تعلق رکھنے والے اہل کرم ومنتسبین حضرات کی تشریف آوری جماعت دارالعلوم وقف دیوبند کے جملہ اراکین کے لئے انتہائی ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہے کہ آپ سب کرم فرما حضرات نے موسم کی شدت کو نظرانداز کیا اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے علاوہ اپنی بیحد قیمتی ترین مصروفیات و مشغولیات سے وقت نکال کر دارالعلوم وقف دیوبند کی دعوت پر تشریف لاکر ہمیں شرف میزبانی سے سرفراز فرمایا، جس کے لئے ہم جملہ خدام ادارہ آپ تمام حضرات کے بصمیم قلب شکرگزار اور دل کی گہرائیوں سے بارگاہ رب العزت میں آپ کی اس آمد وشرکت کی قبولیت کے لئے دست بہ دعا ہیں۔ **فجزاکم اللّٰہ احسن الجزاء.**

اس دوروزہ سیمینار کے انعقاد میں اہم اور بنیادی اہداف ومقاصد کے خدوخال جو کہ اس کی مقصدیت کو محیط ہیں، اس کی اجمالی تمہید یہ ہے کہ بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ اور فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے لیکر مابعد تک کے ہمارے تمام اکابر واسلاف کی روشن و آشکارا علمی، عملی، دینی، اسلامی، تعلیمی، تعمیری، ملّی، سیاسی، انتظامی بہمہ انواع جہود و کاوش میں قدر مشترک کے طور پر اہداف ومقاصد کے نقطہ نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو بہ ادنیٰ غوروفکر کے بعد جو حقیقت سامنے آتی ہے اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ زاویۂ فکر ونظر میں خواہ کتنا ہی تفاوت کیوں نہ ہو، میدان عمل خواہ ایک دوسرے سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ رہا ہو لیکن ان کے اہداف ومقاصد ایک تاریخی تسلسل واستمرار سے بایں طور مربوط ہیں کہ اگر درمیان سے کسی ایک شخصیت کی خدمات کو حذف کرنا تو دور کی بات قرار واقعیت میں استخفاف سے بھی کام لیا جائے تو میری نظر میں وہ پوری عمارت کو متزلزل کردینے کے مترادف ہے، کیونکہ جس جماعت یا جس قوم کا رشتہ اپنے اسلاف و اکابر کی جگ روشن خدمات سے کٹ جائے یا کاٹ دیا جائے یا کمزور پڑجائے تو اس کا وجود بحیثیت ایک جماعت کے یا بحیثیت ایک قوم کے صفحہ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے

صفحات میں اس طرح گم ہوکر داستان پارینہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ آنے والی نسلیں نظائر عبرت کے ذیل میں اسکا تذکرہ کرتی ہیں، کیونکہ اگر اسلاف کے علمی وعملی اوصاف وامتیازات انکی خصوصیات، ان کے کمالات غیرت وخودداری کے جذبات اور عظمت وشرافت کے واقعات، انکے علمی عملی کارنامے جوکہ غیرت مند وخوددار اخلاف و منتسبین کے لئے سرچشمہ حیات کے مثل ہوتے ہیں اگر ان سے ہی رشتہ کمزور پڑ گیا تو ان کی رگوں میں وہ گرم خون کہاں سے آئے گا جوکہ معنوی زندگی کا سرچشمہ اورتحریک عمل کی بنیاد واساس بن سکتا تھا، گویا کہ اپنے اسلاف سے علمی وعملی ارتباط کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اکابر واسلاف کی قرار واقعی تاریخی اہمیت کی حامل خدمات کوافراط وتفریط کے غیر ضروری ولایعنی ملمع سازیوں کے طور طریقوں سے محفوظ رکھتے ہوئے اوراس سے بھرپور اجتناب برتتے ہوئے رخصت پذیر شخصیت کے احوال وکوائف، واقعات ومشاہدات، نظائر وتجربات کا بحث وتحقیق، تنقیح وتنقید کے مسلمہ اصولوں وکسوٹی پر خوب جانچ کر پرکھ کر آنے والی نسلوں کی حیاتِ معنوی کوتحفظ فراہم کیا جائے، کیونکہ یہی علمی وتاریخی ارتباط علمی وعملی دنیا میں ہمارے معنوی وجود وبقا کی ضمانت ہے۔

جماعت کے تمام ہی اہل علم وفضل حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اگرچہ بہمہ رنگ وانواع ہمارے اسلاف کے طریق عمل کی جہات بہت سی ہیں لیکن اگر بنیادی اہداف ومقاصد کے نقطۂ نظر سے جہود بقائے اسلام کی تحریکات کے تناظر میں ہم ۱۷ویں صدی سے حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ احمد سرہندی سے لے کر محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہؒ اوراس سے آگے حجۃ الاسلام النانوتویؒ تک سرسری سا بھی جائزہ لیتے ہیں تو قریب زائد از دوصدیوں کے طویل ترین فاصلے کے باوجود اہداف ومقاصد کی مشترک اقدار میں ایک تاریخی اور فکری ارتباط بہت واضح طریقے پر محسوس ہوگا، اسی طرح یہی روح عمل محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہؒ سے منتقل ہوکر حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ

اسماعیل شہیدؒ سے گذرتی ہوئی حجۃ الاسلام النانوتویؒ تک پہونچتی ہے، گویا کہ اس کہکشانی سلسلے کا تاریخ کے تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو بہمہ رنگ وانواع یہی اقدار یہی اہداف نظر آئیں گے، خواہ ۱۷ رویں صدی میں دین الٰہی کے پیرائے میں قلعۂ اسلام پر نقب زنی کا سدباب ہو یا ۱۸ رویں صدی میں مسلمانوں کے سیاسی عدم استحکام کے پس منظر میں بدخواہان اسلام کی بیخ کنی کی تحریک وتدابیر، ۱۸۵۷ء کے خونچکاں احوال میں دارالعلوم دیوبند کے قیام اور تحریک مدارس کے ذریعہ دین وعقائد کے تحفظ کی بات ہو، یا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی جہود آزادی وطن کا ذکر، محدّثِ عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی جلیل القدر محدثانہ خدمات کا تذکرہ ہو یا حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ہزار سے زائد تصنیفات و تالیفات کی راہ سے دوررس نتائج کی حامل اصلاح امت کی تحریک، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی علمی خدمات کے علی الرغم اسارت مالٹا کی رقم شدہ تاریخ کی مثال ہو یا حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ہمہ جہت مساعی کا تذکرہ، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی بلند پایہ مختلف النوع خدمات کا تحقیقی مطالعہ ہو یا رئیس العلما حضرت مولانا عبداللہ اسماعیل پٹیل صاحبؒ کی تصنیفی کاوشوں کے ساتھ روح مدارس کے تعلق سے فکرمندانہ عمل۔ علیٰ ہذا القیاس:

چمن میں اختلاف رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہم ہی ہم ہیں تو کیا ہم ہیں، تم ہی تم ہو تو کیا تم ہو

غرض کہ ایک علمی اور تاریخی تسلسل سے آسمانِ علم وعمل کے یہ آفتاب و ماہتاب باہم دگر معنوی طور پر اس طرح سے مربوط ہیں کہ ہر ایک کی اپنی فردیت وانفرادیت کا تذکرہ کیئے بغیر بات مکمل ہی نہیں ہوسکتی ہے، گویا اگر کہا جائے کہ تمام اسلاف کے غیرت مند اخلاف کی مشترکہ جہود سے ہی جماعت کی یہ توانائیاں قائم ودائم ہیں جنہوں نے اپنے اکابر واسلاف کے کارناموں کو حرز جاں بنا کر اپنے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے تحریک عمل کی بنیادیں فراہم کرنے میں ہر ایک نے اپنی جگہ پر مرکزی کردار ادا کیا ہے، تو

میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اہل علم و دانش اس کو مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کریں گے، بالفاظ مختصر یہ کہ جماعت کے مابہ الامتیاز اوصاف جن سے کہ جماعت کی شیرازہ بندی باقی اور محفوظ و مامون ہے، وہ دو اجزاء پر محیط ہے۔ ایک متذکرہ علمی و تاریخی ارتباط، دوسرے فکر ونظر میں وسعت پذیری کے ایسے عناصر کا پایا جانا جس میں قریب و بعید کا رشتہ رکھنے والے افراد و جماعتیں بھی طمانیت کے احساس سے خالی نہ ہو اور جماعت کے عالی ظرف شارحین کو دوسرے اسٹیج پر جا کے بھی اپنی بات کہنے اور دوسرے کی بات سننے میں ادنیٰ درجہ کا تأمل نہ ہو اور اس نکتۂ فکر عالی کی تعبیر فکر قاسمی کے ترجمان حضرت خطیب الاسلام علیہ الرحمہ بایں طور فرمایا کرتے تھے کہ قابل تبلیغ صرف دین تھا اور صرف دین ہے، جیسا کہ اسلام کے قرنِ اوّل میں تھا، اسلام کے دائرۂ وسعت کے ساتھ ساتھ جب فکری انحطاط آیا تو لوگوں نے دین کو چھوڑ کر مذاہب کو قابل تبلیغ قرار دیا جب کہ مزید فکری زوال نے مسالک کو قابل تبلیغ بنا دیا، جو کہ قابل ترجیح تو ہو سکتا ہے قابل تبلیغ ہرگز نہیں بن سکتا، نوبت بایں جا رسید کہ پست فکر طبقات نے تبلیغ دین متین کو بالکل ہی پس پشت ڈال کر مشرب کی تبلیغ کو ہی صلاح وفلاح کا ضامن مان لیا جو کہ اتحاد بین صفوف المسلمین جس کو جماعت کے اکابر نے اپنی آفاقی فکر کے زیر اثر بنیاد و اساس کا اہم ترین جزو قرار دیا تھا اس تبلیغ مشرب کے فکر نے اس کو شدید نقصانات سے دوچار کیا ہے۔

اور امت میں انتشار و افتراق نے نئے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، مسلک دیوبند کے شارح حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تشریحات کے بقول: اسلام کے صدر اول سے مابعد کا بلا انقطاع ارتباط وتعامل ہی دراصل جماعت دیوبند کے اجزائے ترکیبی کی بنیاد و اساس کا مؤثر حصہ ہے، جس سے کہ جماعت کی شیرازہ بندی ہے، علی السبیل المثال جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ہر رنگ اور ہر طبقے کے افراد جمع تھے اور ایک دوسرے کی عظمت ومحبت اور ادب واحترام میں بھی اپنی رفعتِ شان کے مطابق عظمت کے انتہائی مقام پر فائز

تھے، اوراسی لئے امت کے اہل علم وفضل افراد میں افضل ترین اور مقبول ترین ذوات اور اعلیٰ ترین طبقات وہی سمجھے گئے جن میں تمام شعبہ ہائے دین کے اجتماع سے جامعیت کی شان پیدا ہوگئی اور وہ بیک وقت قرآن وحدیث، فقہ واصول، تصوف وکلام، روایت و درایت پھر راہِ عمل کے اخلاق میں فقر وامارت، زہد ومدنیت عبادت وخدمت، خلوت پسندی وجلوہ آرائی، بوریہ نشینی وحکمرانی کے ملے جلے احوال وکیفیات سے سرفراز ہوئے۔ جس طرح صحابہ کرام، تابعین وتبع تابعین وسلف صالحین کی جماعت میں جامعیت کی شان اختلاف زاویۂ فکر ونظر کے علی الرغم باہم دگرارتباط باہمی کے تسلسل میں مضمر تھی انہی کے نقوش راہ عمل کو جادۂ منزل تک پہنچنے کا ذریعہ بنانے والی اوران کے نقش قدم پر قدم بہ قدم چلنے والی ذوات سے امت کبھی بھی خالی نہیں رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی شخصیت پر غلبہ کسی خاص علم وفن یا کسی خاص شعبہ کا رہا ہواور وہ اسی شعبہ اورفن کے انتساب سے دنیا میں متعارف ہوا ہو جو کہ نہ جماعت کی جامعیت کے منافی ہے اور نہ ہی اہداف ومقاصد سے باہر کی کوئی شئے ہے، شرط ہے کہ وسعت فکر ونظر کے ساتھ اصل الاصول دین کی سربلندی ہی مقصود ہو، بالفاظ مختصر یہ کہ جس طرح یہ تمام شعبہ ہائے علم و عمل واجب الاعتبار قرار پائے ایسے ہی ان شعبوں سے وابستہ تمام شخصیات ناحیۂ علم وعمل کی کسوٹی کے بطور واجب العقیدت، واجب العظمت ہیں اوران کی محبت وعظمت ہی دراصل جماعت علمائے دیوبند کی اہم ترین اساس وبنیاد ہے کیوں کہ بحیثیت جماعت کے جامعیت کی یہی راہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی رہی، جس میں بیک وقت ان تمام سنن نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور تمام شعبہ ہائے دین کے ساتھ ذات کی عظمت وتوقیراورادب واحترام کو جمع کئے رکھا، یہی وہ جامع طریقۂ عمل ہے جو سلسلہ بہ سلسلہ چلتا ہوا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک پہنچا جس کا طرّہ ٔ امتیاز بھی احترامات و عظمتوں کا جمع کرنا تھا اوران سے گذرتا ہوا یہی طریقۂ عمل جماعت علمائے دیوبند تک پہنچا، جن کی یہی جامعیت اورارتباط وتسلسل وجہ امتیاز وتعارف بنا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آج کا یہ عظیم الشان سیمینار دراصل اسلاف و اکابر کی انہی مابہ الامتیازات جہود و کاوش میں کسی درجہ شمولیت و حصہ داری اور اس تعلق سے اپنے موجودہ اکابرین کی زیر سرپرستی اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کی کوشش و کاوش کے ساتھ متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں دارالعلوم وقف دیوبند کی زیر قیادت ایک نئے عہد کے آغاز کا ایک عنوان ہے جس کو رخصت پذیر سرخیل جماعت خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی حیات و خدمات سے معنون کیا گیا ہے، علاوہ ازیں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب علیہ الرحمہ اور مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عبداللہ اسماعیل پٹیل صاحب کاپودروی علیہ الرحمہ کی وسیع تر خدمات کے بالاختصار تعارف کے نقطۂ نظر سے دارالعلوم وقف دیوبند کے ترجمان ماہنامہ ندائے دارالعلوم نے اپنی خصوصی پیش کش کو ''خطیب الاسلام نمبر'' اور ''مفکر ملّت نمبر'' سے معنون کیا ہے جو کہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آچکے ہیں اور اسی نشست میں اکابرین امت کے مبارک ہاتھوں ان کا اجراء عمل میں آئے گا۔

اس سمع خراشی پر بصد ادب معذرت خواہی کے ساتھ اخیر میں پھر ایک مرتبہ تمام مہمانانِ ذی وقار کی اس سیمینار میں آمد و شرکت پر بصمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

وما علینا إلا البلاغ المبین

تعلیم و تربیت

علم تفسیر ایک دقیق ترین موضوع

علم تفسیر ایک قدیم فن ہے جس کو ہر دور کے مجتمع کے بیشتر حلقہ ہائے علم میں ہمیشہ ایک منفرد اور خاص مقام کے طور پر اہمیت حاصل رہی ہے، چنانچہ دور قدیم میں مشہور فلسفی ارسطو کی مصنفات کا عربی و یونانی زبانوں میں شروح وتوضیحات کے لیے باقاعدہ لفظ تفسیر کا استعمال اس علم کی قدامت پر دلیل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بیشتر مثالیں ابوالحسن علی بن یوسف المعروف ابن القفطی کی تاریخ الحکماء سے بآسانی پیش کی جاسکتی ہیں، اس کے علاوہ بھی یونانی علوم کی بہت سی مشہور کتابوں یا قدیم علوم عربی کی تشریحات وتوضیحات کو زاویۂ فن کے لحاظ سے تفسیر سے تعبیر کرنا بھی نفس فن اور اس کے اصولوں کی قدامت اور اس کے عرف وعمومیت کو ظاہر کرتا ہے، تاہم دنیائے اسلام میں لفظ تفسیر اپنے مکمل مفہوم کے ساتھ خاص ہے اور اس سے مراد بالخصوص کلام اللہ کی تفاسیر اور خود علم تفسیر ہے، علاوہ ازیں علم کی یہ شاخ جسے علم القرآن والتفسیر کہتے ہیں دراصل علم حدیث کی ایک خاص اور اہم ترین شاخ ہے، امت محمدیہ کے لیے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس بابرکت مفسر قرآن کے جزو لاینفک کی حیثیت سے اوّل الاولین واعلیٰ ترین آخر حجت ومرجع ہے، اگرچہ کلام اللہ کا احادیث وسنن سے تشریحاتی ربط کا بیان ایک طویل اور تشریح طلب موضوع ہے جس کی تفاصیل میں جانا اور اس موضوع کی وسعت کا احاطہ زیر نظر تحریر کے محدود صفحات میں ممکن نہیں ہے، البتہ مختصر ترین تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ

❁ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ مطابق جولائی / اگست ۲۰۲۰ء، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱۲۶)

احادیث نبوی کا تمام تقریری ذخیرہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بصری اعمال، افعال اور احوال کا ظہور بذات خود قرآن کریم کا بیانیہ اور اس کی تشریح وتفسیر سے ہی تعبیر ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق درون خانہ صبح ومساء کے معمولات کے بارے جب استفسار کیا گیا تو انہوں نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم (۱) نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی بھی اہم وغیر اہم، معمولی یا غیر معمولی عمل ایسا نہیں ہے جس میں قرآن کریم کے خلق کی واضح ترین صفت کا ظہور نہ ہو، گویا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جملہ اعمال افعال اور اقوال کے ایک ایک جزو کو کلام اللہ کی حسی ومشاہداتی تفسیر کا درجہ حاصل ہے، گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس متحرک اور مجسم اور مبصر سراپا تفسیر قرآن ہے، اگر تفسیر کی فنی حیثیت سے اسلام کے دور صدر اول کی بات کریں تو اسلام کے عہد آغاز سے علوم اسلامی میں تفسیر کی مستقل فن کی حیثیت سے شمولیت کا پتہ اس تفسیر سے بھی چلتا ہے جو کہ تفسیر ابن عباسؓ کے نام سے موسوم ہے، اگرچہ تفسیر ابن عباسؓ کے انتساب میں اہل علم کے درمیان آراء کا جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اپنی جگہ مستقل بحث کا موضوع ہے چنانچہ اس کی تفصیلات وتاویلات کی بحث سے قطع نظر فن تفسیر کے ارتقائی سفر پر بالاختصار بھی اگر نظر ڈال لی جائے فی الجملہ نفس مسئلہ کو کسی نہ کسی درجہ میں تفہیم کی غرض وغایت کے نقطۂ نظر سے یہ اختصار بھی معاون وممد ثابت ہوسکتا ہے، جس کے اجمال کا خلاصہ یہ ہے جس کے حوالے سے ابن خلدونؒ اپنے مقدمے میں تفسیر کے حوالے سے اپنی رائے کے طور پر یوں رقمطراز ہیں کہ ''قرآن کریم میں کیونکہ بلاغت کے تمام اسلوب بیان میں لائے گئے ہیں اس لیے (اہل لغت ہونے کے سبب) تمام عرب کلام اللہ کو سمجھتے تھے اور اس کے مفرادات ومرکبات کے مطالب ان پر واضح تھے۔'' اس قول میں کہ تمام عرب قرآن کریم کو سمجھتے تھے وسیع تعمیم کردی گئی ہے، کیونکہ خود متقدمین بھی اس بارے میں مطمئن نظر

(۱) ترجمہ: اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔ (سورۃ القلم: ۴)

نہیں آتے ہیں، علی سبیل المثال ابو محمد عبداللہ بن مسلم قتیبہؒ جو کہ ابن خلدونؒ سے چند صدی قبل کے عالم ہیں وہ اپنے رسالہ ''المسائل والاجوبۃ'' کے ص:۸ پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ ''اہل عرب قرآن مجید کے تمام غرائب ومتشابہات کو سمجھنے میں برابر نہیں تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فہم قرآن کے بارے میں بعض کو بعض پر تفوق حاصل تھا'' اور بہر حال یہ انسان کے فطرت خلق کی بدیہیات کے لوازمات و مقتضیات کا حصہ ہے، اگر چہ اللہ تعالی قادر مطلق ہونے کے سبب اس پر قادر تھے کہ تمام بنی نوع انسانی کے عقول میں بہ لحاظ فہم وقوت ادراک تساوی کی شان پیدا فرما سکتے تھے، لیکن اس میں منجملہ ان تمام حکمتوں کے جو اللہ تعالی کے علم بسیط میں ہیں اور ہمارے فہم وشعور سے وراء الوراء ہیں، ظاہری حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کے فہم وشعور اور عقول کے یہ تفاوت دنیا میں تمام ظاہری و باطنی علوم کو ارتقاء کی بنیاد و اساس فراہم کرنے میں کلید اصل کے طور پر عامل ہیں، اسی سلسلۂ کلام میں ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ ''نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے مواقع کو مجمل بیان فرما دیا کرتے تھے، ناسخ ومنسوخ کی تمیز بتا دیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے سے صحبت نشین سمجھ جایا کرتے تھے، اور اس طرح نزول آیات کے اسباب اور موقع کے لحاظ سے آیات کا مقتضی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ معلوم ہو جاتا تھا۔'' چنانچہ اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عملی زندگیوں میں احتیاجات کی محدودیت کے ساتھ اس بات کے شعور کا پایا جانا کہ قرآن کریم کی تفسیر کے معنی ہیں اس بات کی شہادت دینا کہ ذات حق جل مجدہ کی اس لفظ سے یہی مراد ہے، چنانچہ اس چیز نے ان حضرات کو مجبور کیا کہ تفسیر کے حوالے سے صرف توقیفی باتیں بیان کی جائیں، یعنی وہ باتیں جو انہیں بتائی گئی ہیں اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہو کر بذریعہ نقل ان تک پہنچی ہیں، چنانچہ پہلی چیز جو تفسیر میں ظاہر ہوئی وہ تفسیر مبنی بر روایت تھی جسے تفسیر ماثور یا تفسیر اثری سے موسوم کیا جاتا ہے، اسی لیے علمائے حدیث وروایت وہ پہلے حضرات ہیں جو تفسیر کے میدان میں نمایاں

نظر آتے ہیں، بنابریں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف علوم کی ابتداء کا پتہ لگانے والے جب اپنی طبع جستجو کے مطابق علم کا واضع کسی ایک خاص شخص کو قرار دیتے ہیں تو واضع تفسیر (جس سے مراد جامع تفسیر ہے مدون تفسیر نہیں) صاحب مؤطاء امام مدینہ حضرت امام مالک بن انس الاصبحی رحمہ اللہ کو قرار دیتے ہیں چنانچہ اس طرح فن تفسیر کا ارتقاء فن حدیث کی تدوین کی تاریخ سے قدم بہ قدم مرتبط ہوتا ہے، یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ امام مالکؒ مدونین حدیث کی صف اول سے تعلق رکھتے ہیں اوران کی معروف زمانہ موطأ امام مالک میں تفسیر سے متعلق تفسیر بالروایۃ کی مختلف مقداریں نظر آتی ہیں حتی کہ صحیح البخاری تک میں اس تعلق سے دو کتابیں دیکھتے ہیں، ایک کتاب تفسیر القرآن اور دوسری کتاب فضائل القرآن ہے، البتہ بعد کے ادوار میں جب کہ اسلام کا دائرہ جغرافیائی توسعات کے علی الرغم مختلف اقوام وملل افکار ونظریات کی شمولیت کے ساتھ وسعت پذیر ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ احتیاجات ومقتضیات اورضروریات کے پیمانوں میں تبدیلی کا آنا فطرت کا مطالبہ تھا، چنانچہ بعد کے ادوار میں علماء نے علم حدیث اور علم تفسیر قرآن کے باہم مرتبط ہونے کے سبب حفاظت حدیث کے ساتھ فن تفسیر کے گرد بھی شرائط قائم کیں اور دیگر مختلف علوم و فنون کو فن تفسیر کے لیے لازمی قرار دیتے ہوئے حصار قائم کیے، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ازروئے احادیث نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان فرمودہ مرادات ربانی کو حصر وتعمیم سے محفوظ کیا جاسکے، بایں ہمہ فن تفسیر اپنے فنی وسعت اور علمی پھیلاؤ کے سبب دیگر مختلف النوع ایسے علوم کو بایں طور محیط ہوئیں، جن کے بغیر اس فن کا حق ہی ادا نہیں کیا جاسکتا ہے، اسی لیے تفسیر قرآن کے موضوع پر قلم افشانی کے لیے اہل علم نے مختلف ایسے لازمی علوم کی مستقل طور پر دو اجزاء پر مشتمل نشاندہی فرمائی ہے جن کو اس فن میں بنیاد و اساس کی حیثیت حاصل ہے، جس میں پہلے جزو کا تعلق ان علوم سے ہے جن پر انسان کی قوت مدرکہ کو مکمل گرفت بایں طور حاصل ہو گویا کہ ہر شاخ علم اس کا اختصاص شمار ہو اور دوسرے جزو کا تعلق ایسے علوم وآگہی سے تعبیر ہے جن پر ایک مفسر کی حیثیت سے نہایت

بسیط اور باریک بین مطالعہ ناگزیر ہے، اگر چہ زیر بحث موضوع اپنے دامن میں ایسی وسعتوں کو سمیٹے ہوئے ہیں کہ بقول شخصے کہ ایک ایک جز و سلسلہ وار کئی کئی کتابوں کا ہمہ جہت علمی و تحقیقی موضوعات کا احاطہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ اگر ایسے لازمی علوم و فنون پر نظر ڈالی جائے جن پر ایک مفسر کی عمیق نظر بایں طور ضروری اور لازمی ہے کہ ان کے علوم میں مہارتِ تامہ کے بغیر اس موضوع پر قلم اٹھانا اہل علم کے نزدیک جسارت میں شمار ہوتا ہے۔ ماہِ اگست ۱۹۴۰ء میں ماہنامہ برہان دہلی میں مولانا محمد انوری لائل پوری کا ایک مضمون بعنوان ''عذابِ الٰہی اور قانونِ فطرت'' شائع ہوا تھا۔ مضمون مذکور میں اس حوالے سے بغلی سرخی ''اصولِ تفسیر'' کے ذیل میں فاضل مضمون نگار اختصار و جامعیت کے ساتھ اس مضمون کا احاطہ کرتے ہوئے اس اقتباس میں رقم طراز ہیں جس کو بعض جگہ پر جزوی لفظی ترمیم وتبدیلی کے ساتھ سپرد قلم کیا جا رہا ہے:

''پہلے ہم مختصراً اس امور کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن کا کامل علم مفسر کے لئے ضروری ہے (۱) علم لغت، مجاہدؒ کا قول ہے کہ جو شخص لغاتِ عرب کا عالم نہ ہو قرآن عزیز کی تفسیر اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ (۲) کلمات عرب کی معرفتِ تامہ بقول حسن بصریؒ کہ علم نحو کی ممارست کے بغیر یہ چیزیں حاصل ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ (۳) علم المعانی، بیان البدیع میں صفت کمال کا پایا جانا جس کو سلف صالحین نے اس موضوع کا رکن اعظم قرار دیا ہے (۴) تعیین مبہم اور تبیین مجمل، سبب نزول، ناسخ و منسوخ کا علم جس میں ہر عنوان کو ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہے اور اس مجموعے کو بایں طور علم حدیث کی اَساس فراہم کئے بغیر نامکمل مانا جاتا ہے کہ فن روایت و درایت پر بصیرت افروز نظر ہو۔ (۵) علم اصول الفقہ، جس کے ذریعہ سے مجمل مفصل کی راہ پاتا ہے اور تبیین عام اور خاص ہوتی ہے اور مطلق و مقید اور اوامر و نواہی کی دلالت پر معرفت حاصل ہوتی ہے۔ (۶) علم کلام میں ژرف نگاہی کے ساتھ مہارت تامہ جس کے بغیر مفسر کا جہالت میں گر جانے کا اندیشہ قوی سے قوی تر اندازمیں ہمہ وقت موجود ہوتا ہے۔ (۷) علم اشتقاق وتصریف اور علم قراءت

پر بصیرت مندانہ صلاحیت کا پایا جانا، جس کے لئے اس علم کے دیگر لازمی متعلقات پر بسیط نظر کو لازمی عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ (۸) اور ان تمام امور وعلوم کے علی الرغم توفیق رب کا حصول اور یہ چیز عمل صالح اور زہد واتقاء کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوسکتی ہے جس کو روح المعانی میں حدیث پاک کے ان الفاظ سے مستدل کیا گیا ہے: **من عمل بما علم أورثه الله علم مالم يعلم.** [۱]

وقت وصفحات کی تنگ دامنی کے پیش نظر مذکورہ نقاط کی مزید توضیح وتشریح سے صرف نظر کرتے ہوئے انھی اشارات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ **وما توفيقي الا بالله العلي العظيم.**

(۱) روح المعاني، ج۵، ص:۷۵

علم وآگہی

مخلوقات عالم پر بنی نوع انسانی کی علتِ تفوق

فطری وطبعی طور پر ۳۶۵ ردنوں پر محیط سالانہ گردش شام وسحر نے قوانین مستقلہ و مستمرہ کے تحت ہر سال کی طرح اس سال بھی ہمارے طلباء کی ایک جماعت کو عرفاً طالب علم کہلائے جانے والے دور سے نکال کر عالم دین کی ذمہ دارانہ حیثیت سے اس مقام پر پہنچادیا ہے جہاں روز افزوں نت نئے چیلنجز آپ کے تعمق علم، قوت عمل، وسعت فکر و نظر، اصابت رائے، استعداد وصلاحیتیں، قوت فیصلہ، صبر واستقامت اور دلائل و براہین کی پختگی جیسی صلاحیتوں کو آزمانے کے لئے تیار ہیں اور علم وآگہی کے نئے نئے گوشے آپ کو دعوت فکر وعمل دے رہے ہیں، بالفاظ مختصر اس مرحلے کو یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی حقانیت کے اثر ونفوذ کا مدار آپ کے حسن علم وعمل اور کردار وگفتار پر ہے، اور وہ اہم مقصد جس کے لئے طلبہ نے عمر عزیز کا سب سے بہترین حصہ حصولِ علم میں صرف کیا ہے۔ آج عملی فرائض کی ادائیگی کے لئے دعوت فکر وعمل دے رہا ہے۔ مشیت حق کے مطابق یہ دنیا اضداد پر قائم ہے، اس لئے مقدمۂ عمل کے طور پر جہاں ایک طرف آپ کو علم کی وسیع الجہت تعریف سے واقفیت ضروری ہے وہیں دوسری جانب اس کے بالمقابل جہل و جاہلیت کے مفاہیم کا استحضار بھی لازمی ہے، کیوں کہ علم کے بالمقابل بر بنائے

❁ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (رجب رشعبان ۱۴۳۷ھ مطابق مئی رجون ۲۰۱۶ء، جلد: ۷، شمارہ ۴، ۷، ۷۳)

اقسام جہل سوالات واعتراضات، شبہات والزامات کا سلسلہ قائم نہ ہوتا تو علم کے ہزارہا گوشے مخفی ومستور رہ جاتے، چنانچہ دوطرفہ واقفیت ہی سے حقیقت واقعہ منقیٰ ومصفیٰ ہوسکتی ہے۔لہٰذا اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت مشیر ہے: **بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ. وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ.** (۱)

جس سے یہ کلیہ ثابت ہوا کہ اس دنیا میں اضداد بھی ہے اور اضداد کا ٹکراؤ اور تصادم بھی ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم سے مراد ہماری کسی شئے سے واقفیت ہے، اگر چہ ہر علم واقفیت ہی ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر واقفیت علم ہو کسی کو اعضائے انسانی کے علم سے متعلق واقفیت ہو مگر اس کی یہ واقفیت علم الابدان کا درجہ نہیں رکھتی ہے۔کسی کو دین کے احکام سے واقفیت ہے وہ اس کو عالم دین کی حیثیت سے متعارف نہیں کرا سکتی ہے، ستاروں سے متعلق واقفیت علم النجوم نہیں کہلائی جائے گی، علی ہذا القیاس دیگر تمام علوم ہیں، جب کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نفس علم واقفیت پر ہی مبنی ہوتا ہے مگر بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ علم محض واقفیت کا نام نہیں ہے بلکہ علم نام ہے مربوط اور مکمل واقفیت کا، نامکمل واقفیت کبھی بھی اور کسی کے نزدیک بھی معاشرے میں علم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی ہے۔از ابتداء تا انتہاء حصولِ علم میں ایک خاص ربط وترتیب اور مرحلہ بہ مرحلہ حصولِ علم کے سبب ہی آپ تسلیم شدہ عالم دین کے مرتبہ تک پہنچے ہیں اور دنیا نے آپ کی حیثیت کو اسی ربط وترتیب کی وجہ سے تسلیم کیا ہے۔لہٰذا جس طرح اینٹوں کا ڈھیر عمارت کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا ٹھیک اسی طرح سے غیر مربوط اور نامکمل واقفیت علم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی ہے۔چنانچہ اس حقیقت واقعہ کے علی الرغم علم کی دو بنیادی اقسام قدرتی طور پر ضروری قرار پاتی ہیں، جن کو ہم تمام علوم و معارف کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں، ان میں سے ایک علم النفس ہے، دوسرا علم الرب ہے، جو

---

(۱) ترجمہ: بلکہ ہم تو حق بات کو باطل پر کھینچ مارتے ہیں، جو اس کا سر توڑ ڈالتا ہے، اور وہ ایک دم ملیا میٹ ہوجاتا ہے اور جو باتیں تم بنارہے ہو ان کی وجہ سے خرابی تمہاری ہی ہے۔(سورۃ الانبیاء:۱۸)

انسان کی صلاح وفلاح اورنجات وارتقاء کے لئے ناگزیر ہے، نیز یہ بہر دومبادیات علم جہاں ایک طرف اپنی خاصیات وخصوصیات اور تاثیرات کے لحاظ سے انتہائی اہم اور ضروری ہیں وہیں دوسری جانب بایں معنی بھی فطری ہیں کہ انسان طبعًا سب سے پہلے اپنے قریب کی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے، اس کے بعد ہی دور کی چیزوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے انسان کے نفس سے زیادہ قریب اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ لہٰذا اگر کسی کو اپنے سے اتنے قریب کا بھی علم نہ ہو جو کہ علم النفس کہلاتا ہے تو اس سے زیادہ جاہل اور کون ہوسکتا ہے؟ وہیں دوسری جانب اس سے بھی زیادہ قریب اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد (۱) وہ اس کا رب ہے کہ خود نفس بھی اپنے سے اتنا قریب نہیں ہے تو اس غیر معمولی قرب پر بھی انسان کو اپنے رب کا علم نہ ہو تو اس سے زیادہ اجہل اور کون ہوسکتا ہے؟ تو ثابت ہوا کہ اس قرب وبعد کے لحاظ سے بھی یہی دو مبادیات بنیادی اور اساسی علم اور خشیتِ اول ہیں جو علم الرب کہلاتی ہیں اور انسان کے حق میں ضروری اور واجب قرار پاتی ہیں، باقی تمام علوم الٰہیات سے لے کر مخلوقات تک انہیں دو مبادیات علم کی شرح وتفاصیل ہیں اور انہیں ہر دو علوم کے ذریعہ مقصد بنی نوع انسان کی تعیین ہوتی ہے اور حیات مستعار کا نصب العین قرار پاتا ہے جس کو حاصل مطلب کے طور پر بالفاظ مختصر تعظیم حق اور خدمت خلق کہا جاسکتا ہے، اسی سے خالق کی رضا میسر آتی ہے اور اسی کے ذریعہ مخلوق کا اعتماد بحال ہوتا ہے، گویا کہ معرفت نفس سے معرفت رب کا دروازہ کھلتا ہے جس کو عرفائے اسلام من عرف نفسه فقد عرف ربّه (۲) سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مبارکہ انہیں دو مبادیات علم معرفت نفس اور معرفت رب سے ہی عبارت ہے، کوہِ صفا پر تعظیم حق کے اعلان عام سے لے کر حیات طیبہ کے آخری لمحات

(۱) اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (سورۃ ق:۱۶)

(۲) روح المعانی، ج:۱،ص:۸۲

تک خدمت خلق ہی اسوۂ نبی اور سیرت مبارکہ کا حاصل ہے اور یہی وہ ذمہ داری ہے جس کو بجالانے کے لئے حجۃ الوداع کے موقع پر **ألا لِيُبلِّغ الشاهدُ الغائب**(۱) فرما کر تا قیام قیامت علمائے امت کے سپرد فرمائی، جس کو سرانجام دینے کے لئے دنیا بھر کے مدارس میں ہزار ہا ہزار کی تعداد میں علم دین حاصل کرنے والی جماعتیں تیار ہوکر میدانِ عمل میں آتی ہیں اور اپنے اپنے دَور اور علاقہ کے مسائل کے بالمقابل اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔

عظمتِ رب سے خدمت خلق کے درمیان بے شمار علوم ومعارف کے بحر ذخّار موجزن ہیں جس کو ذاتِ حق جل مجدہٗ کی طرف سے جس قدر توفیق نصیب ہوتی ہے اتنا ہی وہ بحر علم و معرفت میں غوطہ زن ہوتا ہے اور حسب استعداد وصلاحیت گوہر آبدار پالیتا ہے، کیوں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کو حق تعالیٰ نے جامع الکمالات وجامع الصفات بنا کر دنیا میں بھیجا تھا، چنانچہ انہیں دوشئون عظمت رب اور خدمت خلق سے مربوط ہزار ہا ہزار شئون علمی وعملی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے صدور وظہور ہونا جو کہ منجملہ دیگر دلائل نبوت میں سے ایک بیّن دلیل نبوت ہے، لہٰذا بعد میں ان ہی شئون کو سنبھالنے کے لئے سینکڑوں، ہزاروں افراد پر مشتمل محدثین، مفسرین، فقہاء، متکلمین، حفاظ وقراء کی پوری پوری جماعتیں کارِ نبوت انجام دیتے ہوئے ہر دور اور ہر زمانے میں برسر عمل نظر آتی ہیں۔

جس طرح نور کی شناخت ظلمت سے، دن کی پہچان رات سے اور حق کا امتیاز باطل کی موجودگی سے ہے، اسی طرح علم کے مقابل جہل لازمی ہے اور قرآن کریم کی یہ آیت **وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ.**(۲) کی رو سے دراصل یہ عظمت رب کی ہی نشانیاں ہیں، چنانچہ جہل سے علم تک کے سفر سعادت کا تجزیہ درج ذیل آیات کی روشنی میں کیا جائے تو بزبان قرآن ذات حق جل مجدہٗ کا یہ وہ احسان

---

(۱) سنن ابن ماجة، باب من بلغ علما، ج:۱، ص:۸۶، رقم:۲۳۴

(۲) ترجمہ: اور (اس کی نشانیوں میں) تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں دانش مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ الروم:۲۲)

عظیم ہے جس کے سبب بنی نوع انسان کو تمام مخلوقات عالم پر تفوق عطا فرما کر جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کے ذریعہ سند تفوق وامتیاز سے سرفراز فرمایا ہے۔ وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. (۱) دوسری جگہ فرمایا: وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَم وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْماً. (۲)

تو گویا نفس علم، فضل عظیم بایں معنی بھی ہے کہ تمام مخلوقات عالم پر بنی نوع انسانی کی علّت تفوق، معرفت نفس اور معرف رب ہی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ علم ومعرفت اور شعور آگہی کا بالعکس یعنی جہل کا بھی تجزیہ کیا جائے تاکہ جہل کے بالمقابل علم ومعرفت کا تفوق واضح ہوکر بارگاہ ایزدی میں اس کا یہ فضل عظیم موجب تشکر ہو۔

جاہلیت کو کسی خاص قوم، خاص دور اور خاص خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ علم ومعرفت اور جاہلیت بھی اسی قانون اضداد کا حصہ ہے جس پر ذات حق جل مجدہٗ نے اس کائنات کا نظام اور قوانین فطرت کو استوار فرمایا ہے۔ جہل اس کائنات کا بنیادی وتخلیقی عنصر ہے جس کا تعلق عالم خلق سے ہے جب کہ علم ومعرفت ذات حق کی صفت ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے۔ قرآن کریم نے نفسِ جہل کو متعدد مقامات پر بہت بلیغ اور واضح انداز میں ذکر کیا ہے۔ اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ جاہلیت صرف قبل از اسلام جزیرۃ العرب کے ایک مخصوص دور کا نام ہے اگرچہ اسلام کے مطابق منجملہ دیگر خطۂ عالم وہ بھی خطۂ عرب کا دور جاہلیت ہی تھا، تاہم قرآن کریم نے کثیر الجہت وکثیر المعنی نفس جہل کی تعریف سمجھنے کے لئے ایک اصول اور کسوٹی بتادی ہے اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ

---

(۱) ترجمہ: اور اللہ نے تم کو تمہارے ماؤں کے پیٹ سے اسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل پیدا کیے، تاکہ تم شکر ادا کرو۔ (سورۃ النحل: ۷۸)

(۲) ترجمہ: اور (اللہ نے) تم کو ان باتوں کا علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا فضل ہمیشہ بہت زیادہ رہا ہے۔ (سورۃ النساء: ۱۱۳)

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ. (۱)

عہد قدیم سے لے کر دور جدید تک اہل فکر ونظر دانشوارانِ امت اس حقیقت پر متفق ہیں کہ دراصل قرآن کریم کے مطابق جاہلیت اس ذہنی وفکری کشاکش کا عنوان ہے جس کے سبب لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول نہیں کرتے، آیت مذکور سے بھی یہ ہی مفہوم متبادر ہے اور اس مفہوم کے مطابق بھی جاہلیت کو کسی خاص معاشرے خاص خطہ اور تاریخ کے کسی خاص دور کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے مظاہر ہر دور اور ہر معاشرے میں زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں چنانچہ قرآن کریم نے ایک اصول بیان فرمادیا جو کسوٹی ہے لہٰذا یہ علّت جہاں جہاں اور جب جب پائی جائے گی اس کا اطلاق جاہلیت پر ہی ہوگا چنانچہ اس کسوٹی پر دور قدیم کی جاہلیت سے لیکر دور حاضر کی جاہلیت تک ہر دور ہر خطۂ ارض، ہر ملک، ہر معاشرے اور ہر قوم کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، گویا قرآن کریم نے انسانیت کو پرکھنے، جانچنے کے لئے اسلام کو کسوٹی بنادیا ہے کہ جو کچھ ذات حق جل مجدہ کے احکامات کے خلاف ہے وہ جاہلیت ہے خواہ وہ عرب میں ہو یا عجم میں، امریکہ ویورپ میں ہو یا مشرق بعید وقریب میں، افریقہ میں یا آسٹریلیا میں۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے علم وفن، تہذیب وتمدن، مادی ترقیات، فکر اجتماعی یا اقوام عالم کی مشترک اقدار جاہلیت کے بالمقابل نہیں ہیں بلکہ جاہلیت تو حق تعالیٰ کے احکام وہدایات کے بالمقابل اعمال وافکار اور اس سے انحراف کا نام ہے گویا جہاں اللہ کے حکم کو ٹھکرایا اور اس سے ذہنی فکری، علمی یا عملی انحراف کیا وہیں جاہلیت آموجود ہوتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ عربوں کا زمانہ اس لئے دور جاہلیت تھا کہ وہ فلکیات وارضیات، مادیات وطبعیات، اصول سیادت وقیادت ملک وریاست کے قوانین اور سیاسی نظم وانتظام سے ناواقف تھے اس لئے ان کے دور کو دور جاہلیت کہا جاتا ہے بلکہ حسب احوال بقدر ضرورت وہ اس قسم کے امور کے واقف کار تھے لیکن قرآن نے ان کی جاہلیت کا

---

(۱) ترجمہ: بھلا کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ حالاں کہ جو لوگ یقین رکھتے ہوں ان کے لیے اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ (سورۃ المائدۃ: ۵۰)

سبب اللہ کے حکم کی نافرمانی اور اس سے انحراف کر کے خواہشات کا غلام بن جانا بتایا ہے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.[1] میں بھی مذکورہ بالا صفات نہ پائے جانے کو غیر مساوی کی علت قرار دیا ہے، اور نہ ہی جاہلیت کی علّت اصلی عدم معلومات ہے، چنانچہ اس انحراف کے منطقی نتائج جو کچھ ہو سکتے تھے ان کا معاشرے میں پایا جانا کوئی تعجب خیز نہیں تھا، تعصّبات وتوہمات ہوں یا آباؤ اجداد کی روایات ہوں، دختر کشی ہو یا جنگ وجدال، فحاشی وعریانی ہو یا ناچ رنگ اور شراب وشباب کی مجالس، غرض کہ یہ سارے مظاہر اسی انحراف کے منطقی نتائج تھے جس کو دور جاہلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، دور قدیم کی جاہلیت اور دور حاضر کی جاہلیت میں رفتار زمانہ کے سبب طریقۂ کار کے اختلاف کے علاوہ مظاہر و منطقی نتائج کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، وہی قتل وغارت گری ہے، وہی عریانی وفحاشی ہے، وہی جنگ وجدال ہے، وہی تعصّبات وتوہمات ہیں، کوئی قومیت اور وطنیت کے نام پر دوسروں کو مٹانے پر تلا ہوا ہے تو کوئی سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے دوسری قوم کو تہہ تیغ کرنا چاہتا ہے، کوئی اپنی سیادت وقیادت کی برتری کی خاطر شمشیر بدست اقوام عالم کو غلام بنانا چاہتا ہے تو کوئی مذہب کی آڑ لے کر اپنے مذموم مقاصد کے لئے معصوم انسانوں کا خون بہا رہا ہے، ناچ رنگ کی مجالس کا دائرہ محدود سے وسیع تر ہو کر گھر گھر پہنچ چکا ہے، فحاشی وعریانی روشن خیالی کی علامت بنے ہوئے ہیں، تعصّبات وروایات نت نئے انداز اختیار کئے ہوئے ہیں، جوئے خانے اور زنا کاری کے اڈے ہائی سوسائٹی کی علامت کے طور پر جانے جاتے ہیں، شراب وشباب معمولات زندگی کا حصہ ہی نہیں بلکہ فیشن اور روشن خیالی کا تشخص تصور کیا جاتا ہے، غرض کہ دور قدیم کی جاہلیت کے مظاہر اور دور جدید کی جاہلیت کے نمود وشہود اور اس کے منطقی نتائج میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس تناظر میں تعصّبات سے بالاتر ہو کر غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا جائے تو اہل ہوش وخرد کو یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ چودہ سو سال پہلے کی دور جاہلیت اتنی بھیانک اور

---

(۱) ترجمہ: کہو کہ کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ (سورۃ الزمر: ۹)

خطرناک نہیں تھی جتنا کے دور حاضر کی جاہلیت ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی ملک اور کسی بھی خطۂ ارض سے ہو، کیونکہ عربوں کی جاہلیت تو ایک سیدھی سادی سی جاہلیت تھی جو راہ راست سے ہٹ کر تعصّبات وتوہمات اور قبائلی نظام کے زیر اثر اپنے محدود اقتدار کی بقاء کی خاطر مکر وفریب، قتل وغارت گری، جنگ وجدال اور غضب وغصب کا عنوان بنی ہوئی تھی، اگر چہ یہ خرابیاں ہر خطہ کی جاہلیت میں پائی جاتی تھیں، لیکن عربوں میں جو کچھ خوبیاں خرابیاں تھیں، وہ علی الاعلان تھیں، ان میں نفاق کا نہ گذر تھا نہ گنجائش اور ان کی یہی وہ خوبی تھی کہ جس نے ان کی فطرتوں کو مسخ نہیں ہونے دیا، چنانچہ جیسے ہی حق وصداقت نے ان خرابیوں کا آپریشن کیا ان کی فطرت حق شناس سامنے آگئی، گردنیں سر تسلیم خم ہوگئیں، اور ذہنوں سے جاہلیت کے تمام تعصّبات وتوہمات کی ظلمتیں کافور ہوکر سراپا نورانیت کی مثال ہی نہیں بنیں بلکہ وہ دین حق کے دفاع میں بنیان مرصوص بن کر صحابۂ کرام کے باعظمت مقام پر پہنچ کر رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ جیسے عظیم ترین مقام فوز وفلاح کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے، جب کہ اس کے مقابل عہدِ رواں کی جاہلیت کو علم ومعلومات کی تلبیس کے ساتھ تہذیب وتمدن کے ظاہری وخوشنما عناوین میں چھپا کر انجام دیا جاتا ہے، چناں چہ ذرائع ابلاغ کے اس انتہائی ارتقائی دور میں اس کے اثرات ونتائج کی وسعت دنیا کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے ہر ایک ملک وشہر کو یکساں انداز میں اپنے ابلیسی دائرۂ اثر میں گھیرا ہوا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جاہلیت کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ ہوسکتی ہے باوجود یہ کہ تہذیب وتمدن، مادی ارتقاء فکری، سیاسی، سماجی اور معاشرتی ترقی کے دعوے خواہ کتنے ہی بلند وبانگ انداز میں ہی کیوں نہ کئے جائیں، لیکن جب جب اور جہاں جہاں بھی اللہ کے احکام سے انحراف وروگردانی اور خواہشات نفسانی کا اتباع ہوگا وہاں جاہلیت کے منطقی نتائج ومظاہر کا صدور وظہور ہوکر رہے گا، جس کو بالفاظ مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت اور ہوائے نفس ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں لہٰذا

جو لوگ بھی ہوائے نفس کے متبع ہیں وہ جاہلیت میں مبتلا قرار پائیں گے خواہ وہ کسی بھی قوم اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ اپنے علم ومعرفت کے لحاظ سے، تہذیب وتمدن کے لحاظ سے مادی ترقیات کے لحاظ سے کتنے ہی بلند مرتبہ پر فائز ہی کیوں نہ نظر آئیں وہ اپنی اس جاہلیت کے سبب ان نتائج سے ضرور دوچار نظر آئیں گے، اضطراب ہے، بے چینی ہے، تشویش ہے، خوف ہے، حرمان وخسران ہے، کیا جدید تہذیب وتمدن اور نظروں کو خیرہ کردینے والی مادی ترقیات کے علی الرغم آج کی دنیا امن وعافیت کا گہوارہ بن گئی ہے؟ دور نہ جاتے ہوئے جنگ عظیم اول ودوم سے لے کر عراق وافغانستان کی جنگوں تک بوسنیا سے لے کر خطۂ عرب کے موجودہ احوال تک ترقی یافتہ تہذیب جدید کے دعووں کی روشنی میں گذشتہ ادوار کے تاریخی خونی واقعات کے تناظر میں تجزیہ کرلیا جائے تو تہذیب جدید کے تعلیم یافتہ اور ترقی پسندانہ دعووں کی حقیقت بعنوان جاہلیت اس کے مظاہر کے رنگ وروپ میں خود سامنے آجائیں گے، آج کا دور علمی جاہلیت کا دور ہے، بحث ونظر کی جاہلیت کا دور ہے، آنکھوں کو خیرہ کردینے والی مادی ترقیات کا دور ہے، یہ جاہلیت ہے اس دھوکہ اور فریب کی جس کو انسان کی ہلاکت وبربادی کے لئے باقاعدہ علمی بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہے اور یہ جاہلیت مختلف طور طریقوں سے انسانی تصورات پر اثر انداز ہے، بظاہر بلند بانگ نظر آنے والی اقدار، آزادی، جمہوریت، مساوات کے نعرے، معاشرتی انصاف، یہ وہ کھوکھلے دعوے ہیں جن کے سائے تلے انسانیت پل پل سسک رہی ہے، اور یہ سارے نتائج اللہ کے احکام سے انحراف روگردانی ونافرمانی کے ہی پرتو ہیں اور اسی کا نام جاہلیت ہے، یہ انسانی معاشرے کا وہ بگاڑ ہے کہ ساری انسانی زندگی ایک اذیت ناک کرب اور بے چینی کا شکار ہے اور بیمار انسانیت کی بدبختی اپنی انتہاء کو پہنچ رہی ہے، فَاسْتَحَبُّوا الْعَمىٰ عَلَى الْهُدىٰ. (۱) كَذَالِكَ قَالَ

(۱) ترجمہ: انہوں نے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے مقابلے میں اندھا رہنے کو زیادہ پسند کیا۔ (سورۃ فصلت: ۱۷)

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ.(۱)

غرض کہ علم ومعرفت اور جاہلیت میں بھی وہی قانون اضداد کارفرما ہے، یہی وہ حقیقت ہے کہ جہاں ملائکہ بھی نہیں پہنچ سکے، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ.(۲)

اگر علم وآگہی اور جاہلیت میں قانون اضداد کارفرمانہ ہوتا تو حق تعالیٰ کی صفت عدل وقسط کا ظہور وصدور کیسے ہوتا اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً.(۳) کا منشائے ربانی کیسے پورا ہوتا اور قانون جزاء وسزا کا فیصلہ کیسے ہوتا؟

علم وآگہی اور جاہلیت کے مفاہیم سمجھ لینے کے بعد بحیثیت امت احمد مرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خاص طور پر بحیثیت ایک عالم دین کے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ لینا اور ان سے باحسن طریق عہدہ برا ہونے کے لئے اپنے علاقائی احوال کے مطابق لائحہ عمل مرتب کرنے میں کسی قدر آسانی وسہولت پیدا ہوجاتی ہے، فرد سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے، آغاز اصلاح ذات سے کریں، آپ خود درست ہوگئے تو دوسروں پر بھی اثر انداز ہوسکیں گے، تذکیر وتبلیغ اور دعوت کو اپنا نصب العین بنائیں برادرانِ وطن تک وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً.(۴) اور اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ

---

(۱) ترجمہ: جولوگ ان سے پہلے گزرے ہیں وہ بھی اسی طرح کی باتیں کہتے تھے جیسے یہ کہتے ہیں، ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ:۱۱۸)

(۲) ترجمہ: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ کہنے لگے: کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے، حالاں کہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد وتقدیس میں لگے ہوئے ہیں، اللہ نے کہا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (سورۃ البقرۃ:۳۰)

(۳) ترجمہ: جس نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔ (سورۃ الملک:۲)

(۴) ترجمہ: اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے۔ (سورۃ فصلت:۳۳)

بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ .[(۱)] کی روشنی میں کار نبوت کا فریضہ انجام دیں،اسی میں صلاح وفلاح بھی ہےاور یہی نصب العین اور مقصد علم دین بھی ہے،اور یہی علم النفس سے علم الرب تک کا تقاضہ بھی ہے،اور یہی عظمت رب بھی ہےاور یہی خدمت خلق بھی ہے۔

---

(۱)اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو اور (اگر بحث کی نوبت آئے تو) ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔(سورۃ النحل:۱۲۵)

آ گہی کے دم سے ہے روشن جبینِ کائنات

کسی موقع پر دورانِ مطالعہ ایک مسلسل مضمون میں اس کا ایک بڑا ہی خوبصورت اقتباس نظر سے گذرا، جس میں صاحب مضمون نے درسگاہ کی اہمیت وافادیت اوراجتماعی دوائر ومعاشروں میں تعلیم گاہ کی فضیلت وفوقیت کوایک تاریخی حقیقت سے مربوط کر کے بہت دل آویز پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس اقتباس کی تاریخی حقیقت سے قوموں کی ترجیحات، فکرومزاج اوراس کے دوررس ودیرپا نتائج پر بصیرت افروزی کا پتہ ملتا ہے۔ چنانچہ وسیع تر تناظر میں احتسابی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر جب تقابلی موازنہ کرتے ہیں تو کسی نہ کسی درجہ میں طبیعت میں خفت کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اقتباس کچھ یوں ہے کہ:

”دوسری جنگ عظیم کے دوران جب کہ نازی فوجیں یورپ کوتاخت وتاراج کرتی ہوئی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ چکی تھیں، ہٹلر نے غلبہ اور برتری ہونے کے باوجود اس دور میں بریطانیہ کے وزیر اعظم Winstom Churchill کو پیش کش کی کہ اگر آپ ہمیں اس کی یقین دہانی کرادیں کہ اتحادی افواج جرمنی کے دو بڑے تعلیمی اداروں ہائدل برگ یونیورسٹی(Hiedelberg University) اور گوٹن جن یونیورسٹی(Goettingen University) پر

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (رجب المرجب ۱۴۳۸ھ مطابق اپریل ۲۰۱۷ء، جلد:۸، شمارہ:۸۵)

بمباری نہیں کریں گی تو ہم آپ سے یہ معاہدہ کرنے کے لئے تیار ہیں کہ نازی افواج برطانیہ میں عالمی سطح پر معروف یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج کو ہرگز اپنی بمباری کا نشانہ نہیں بنائیں گی، چرچل نے ہٹلر کی یہ پیشکش قبول کرتے ہوئے اس عہد کی پاسداری کی یقین دہانی کرادی۔ بریطانوی وزیراعظم کے ایک قریبی ساتھی نے یہ پیشکش قبول کرنے کا سبب معلوم کیا تو چرچل نے مسکرا کر جواب دیا کہ اگر پورا بریطانیہ تباہ ہوجائے مگر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں بچ جائیں تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے لیکن اگر اس کے برعکس یہ دونوں یونیورسٹیاں تباہ ہوجائیں اور پورا بریطانیہ بچ جائے تو یقین کیجئے کہ سب کچھ تباہ ہوجائے گا۔''

نازیوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ اس حقیقت کا عکاس ہے کہ بنیادی طور پر مہذب و متمدن اقوام و معاشروں میں ارتقاء کی خشت اساس تعلیم و تعلّم ہی ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی قوم، کوئی معاشرہ، کوئی اجتماعیت تعلیم کے بغیر نہ ترقی کرسکتی ہے نہ ہدف تک پہنچ سکتی ہے کیوں کہ جب تک کسی قوم کے مدارس، اسکول، کالجز اور یونیورسٹیاں آباد رہتی ہیں اور ان کے کلاس روم میں لیکچر ہالوں میں علم و ادب، تہذیب و اخلاق، تمدن و کردار، دین و معاملات جیسے موضوعات اپنے دور کے مکمل تقاضوں کے ساتھ زیر گفتگو، زیر بحث رہتے ہیں، تحقیقی تسلسل باقی رہتا ہے تو تب تک ہی عملی پیش رفت بھی جاری رہتی ہے۔ کوئی منصف مزاج شخص اس حقیقت سے منکر نہیں ہوسکتا کہ بات آج کی ہو خواہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہو یا آج سے ڈیڑھ دو صدی بعد کا زمانہ، قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں تعلیم گاہوں کی کلاسوں میں رقم کی جاتی رہی ہیں اور کی جاتی رہیں گی۔ شاید اسی حقیقت کے پیش نظر ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم گاہوں کے طلباء کو کسی ایسے سیاسی و غیر سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا رجحان نہیں پایا جاتا ہے جس سے کہ طلباء کے اہداف و مقاصد متاثر ہوسکتے ہوں کیوں کہ یہ ایک عظیم قومی نقصان سمجھا جاتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر ملک کا مقتدر طبقہ طلباء کو متعین ہدف اور مقصد تک پہنچانے میں متعاون جذبے کے

ساتھ شامل رہنے کو کارِ عظیم سمجھتا ہے جو کہ دوررس نتائج کے حصول کی منصوبہ بندی کا ہی ایک حصہ تصور کیا جاتا ہے اور کسی بھی قوم و معاشرے کے ارتقائی عمل میں تسلسل واستمرار کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس کے نتائج دنیا کے سامنے ہیں۔

اس سلسلے میں مصر کی بھی ایک مثال ہے جہاں ۱۹۵۳ء میں شاہ فاروق کو ملک بدر کرنے کے بعد شاہ کے ستر ملین پاؤنڈ کے اثاثے اور نقدی انقلابی حکومت کے ہاتھ لگے تھے انقلابیوں نے ان تمام اثاثوں سمیت نیز شاہ سے مفاد پرستانہ قربت رکھنے والے بدقماش جاگیرداروں کی جاگیریں فروخت کر کے منصوبہ بند طریقے پر ملک کے طول و عرض میں بڑے پیمانے پر اسکول اور کالجز بنانے شروع کر دیئے اور ایک روایت کے مطابق دو دو دنوں میں تین تین اسکول کھولے گئے اور اہل وطن کو زبردست تعلیمی مراعات دی گئیں۔اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ گذشتہ تیس پینتیس برس سے دنیا میں چوٹی کے عالمی اداروں کے مختلف شعبہ جات میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کی ایک نہایت قابل ذکر حصہ داری ہے۔اگر اسی جوش و جذبے کو فکری منصوبہ سازی اور فراست کے ساتھ دین کی بنیادوں پر بروئے عمل لایا جائے تو یقین ہے کہ اس کے بھی اسی قسم کے خوشگوار نتائج آسکتے ہیں۔

تاریخ کے صفحات پر اس پس منظر میں اس کے مشاہد و محسوس نتائج کی مصداق حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ یہ حدیث ہے **"مَن عمِل بما علِم ورّثه اللّٰهُ علم مالم يعلم"** (۱) جو شخص علم کے بموجب عمل کرتا ہے حق تعالیٰ اسے ان چیزوں کا بھی علم عطا فرماتے ہیں جو کہ اس کو معلوم ہی نہیں ہیں۔اور یہ بھی منجملہ دیگرے حکمت کی تعریف ہے۔یہ نسخۂ کیمیا ہی ہمیشہ کی طرح آج کے مادی علوم میں بھی نتیجہ خیز ہے اور ماضی کے

(۱) مشكاة المصابيح، مع شرحه مرعاة المفاتيح للشيخ أبي حسن عبيدالله بن العلامة محمد عبدالسلام المباركفوري، (بيروت: دارالكتب العلمية، د.ط.د.ت) ج۸،ص۵۶۰۔

بعض ادوار میں دینی لحاظ سے اس سے زیادہ نتیجہ خیزیوں کے شواہد تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اکابرین کی اس سمت اور اس نہج پر مخلصانہ جدوجہد کے طفیل دین کی سطح پر مؤثر و دوررس نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ اگر اُس وقت خوش گوار نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ دین کے معاملے میں اس ضرورت کی اہمیت کو محسوس نہ کیا جاسکے اور اس کے بہتر اور مفید مطلب نتائج کی توقع نہ کی جاسکے؟ تاہم سردست تو صورت حال کچھ یوں نظر آتی ہے:

قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
پھر کہیں جا کے کسی قوم پہ زوال آتا ہے

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

گردش لیل ونہار لمحات ولحظات میں اپنی طبعی وفطری رفتار سے تحلیل ہوتے رہے، مستقبل، حال سے گذر کر ماورائے تصور وخیال ماضی کی داستان پارینہ بن کر عدم کا حصہ بنتا رہا اور گذرے سال کا دورانیہ محض چند لمحات کا تصور، خوشگوار وناخوشگوار یادوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا، سوال یہ ہے کہ اس دورانیہ میں ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا؟ جو پایا وہ محض توفیق الٰہی، جو کھویا وہ سراسر ہماری کوتاہی، جو پایا وہ لائق شکر ہے جو کھویا وہ باعث فکر ہے، گرم سفر قافلے کا ہراول دستہ عرفاً طالبِ علم کہلائے جانے والا بیحد قیمتی اور زندگی کا سنہرا دور پورا کر کے میدان عمل کے لیے پابہ رکاب ہے، وہ میدان عمل جہاں نت نئی ذمہ داریاں، علمی، فکری، معاشی، سماجی، خانگی، اجتماعی اور ملی چیلنجز آپ کا استقبال کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں، گویا ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، بس آپ یہ سمجھئے کہ کامیابی اور ناکامی کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے، پیچھے ہٹ جائیں تو ننگ کائنات، ایک قدم آگے بڑھا لیں تو اشرف المخلوقات اور اگر درمیان میں ٹھہر جائیں تو محض ہجوم آبادی، لیکن اس کا انحصار مستقبل کے تعلق سے آپ کی سنجیدہ فکر، آپ کی محنت واخلاص اور حاصل کردہ بیش قیمت علم وآگہی اور قوت عمل پر ہے، علم نے جہاں آپ کو وسعت فکر ونظر کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہیں اس کی ناقدری اور عمل سے بے اعتنائی تہی دست وتہی

❁ اداریہ: ماہنامہ ندائے دارالعلوم وقف (رجب/شعبان ۱۴۳۶ھ مطابق مئی/جون ۲۰۱۵ء، جلد: ۵، شمارہ: ۶۲، ۶۱)

داماں بھی بنا سکتی ہے باالفاظ دیگر بقول علامہ اقبال مرحوم:

قلزم ہستی تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

یاد رکھیے! غلامی نام ہے دراصل فکری سطح پر اپاہج ہو جانے کا جو انسان کو جسمانی اور فکری دونوں سطحوں پر غلام بن جانے یا بنے رہنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ان پر وقت کبھی نہیں بدلتا، اگر راکھ سے چنگاری ختم ہو جائے تو راکھ سو سال بعد بھی راکھ ہی رہتی ہے، ارباب دانش اسی کیفیت کو علم کی ناقدری سے تعبیر کرتے ہیں **عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ** (۱) علم کیونکہ ذات حق جل مجدہ کی صفت ہے اور ان کی ذات وصفات ایک ہی حقیقت کی جلوہ آرائی ہے لہٰذا بجاطور پر علم پر بھی یہی حقیقت صادق آتی ہے **نَسُوا اللّٰہَ فَأَنۡسَاھُمۡ أَنۡفُسَھُمۡ** (۲)۔ (بھول گئے وہ اللہ کو پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے) لہٰذا ارتقاء کے لیے مطالعہ بالاستمرار اور بقاء کے لیے عمل بالالتزام ہی نسخۂ کیمیا ہے اور بقائے علم مثبت فکری معرفت کی مرہون منت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ نفس علم کی معرفت کے ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق ہی قرار پائیں۔

بالفاظ دیگر اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بغیر جانے ہوئے کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جان کر کسی چیز کو ماننے کا نام علم ہے اور بے جانے ہوئے کسی حقیقت کا اعتقاد واعتراف کر لینے کا نام وہم ہے، اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ علم کو وہم بناتے ہیں یا وہم کے حقائق کا علم صحیح کی روشنی میں ادراک کر کے اس کو علم بناتے ہیں، کیونکہ علم سے مراد ہے ہمارا کسی شے کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا، اگرچہ علم واقفیت ہی ہوتا ہے لیکن ہر واقفیت علم نہیں ہوتی، ہوسکتا ہے کسی انسان کو دینی احکام ومسائل کا علم ہو مگر اس کی یہ واقفیت عالم دین ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہے، حضرت

---

(۱) ترجمہ: انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (سورۃ العلق: ۵)

(۲) سورۃ الحشر: ۱۹

شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ایک جملے میں علوم وفنون کی حقیقت بیان کر دی ہے کہ ''شریعت یعنی ظاہری اعمال کا علم تو بہت سے منافقین کو بھی تھا اور آج بھی سیکڑوں یہودی، نصرانی، لا مذہب دہریے اور مستشرقین ان علوم اسلامیہ کے بڑے محقق اور جاننے والے موجود ہیں مگر وہ نرا فلسفہ ہے دین نہیں ہے۔ دین جب ہی کہلائے گا جب کہ اس کے احکام کے حق ہونے کا اعتقاد بھی ہو اور ان احکام ظاہرہ و باطنہ پر عمل بھی، اس لیے محض علوم ظاہرہ کی فن دانی اور تحقیقی مباحث نہ ہی تو کوئی دینی کمال ہے اور نہ اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت ہے، اس حقیقت کو مکمل طور پر جاننے اور سمجھ لینے کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ کے اس باب کی جانب ہمیں رخ کرنا ہوگا جس میں اصولی طور پر علم صحیح کے حوالے سے چھ امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

پہلا امر یہ ہے کہ کہنے اور کرنے سے پہلے جاننا ضروری ہے:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ. (۱)

ترجمہ: لہٰذا (اے پیغمبر!) یقین جانو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور اپنے قصور پر بھی بخشش کی دعا مانگتے رہو اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی بخشش کی بھی اور اللہ تم سب کی نقل وحرکت اور تمہاری قیام گاہ کو خوب جانتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ انسان کی روحانی اصلاح وترقی میں جس علم کی ضرورت ہے وہ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے جس سے ذات حق جل مجدہ کی ذات وصفات کا کما حقہ عرفان وادراک مراد ہے اور اسی علم کے علماء وارث قرار دیے گئے ہیں اور یہی وہ علم ہے جس کی وراثت کی طرف قرآن کریم میں بعبارت ذیل: **ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا** (۲) اشارہ کرتا ہے۔

---

(۱) سورۃ محمد: ۱۹

(۲) سورۃ فاطر: ۳۲

تیسرا امر وہ عظیم الشان مسئلہ ہے جس کے حوالے سے بعض عاقبت نااندیشوں نے اپنی کم علمی وکوتاہ فہمی سے اختلاف پیدا کرکے بہت سے لوگوں کو عرفانِ الٰہی کے آبِ حیات سے روک رکھا ہے اس سے مراد وہ عرفانِ نبوت ہے جو وحیِ الٰہی کی تجلیات سے حاصل ہوتا ہے، امام بخاریؒ نے اس مسئلہ کا نہایت معقول حل خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ سے کردیا ہے:

مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ (۱)

یہاں جنت سے مراد جنتِ رضوان ہے جو عارفین کو اس دنیا میں دم نقد حاصل ہوتی ہے۔(بحوالہ اسلامی اصول کی فلاسفی روحانی خزائن، جلد۱۰، ص ۳۷۸)

چوتھا امر یہ ہے کہ علماء سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو خشیت اللہ سے خالی اور عقل سے کورے ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو مذکورہ بالا دو آیات کریمہ کے مصداق کہلائے جاتے ہیں، خشیت کے معنی سہم جانے کے ہیں یعنی وہ ذات حق جل مجدہ کی عظمت و کبریائی اور جلالی تصرفات کے حوالے سے اس قدر کامل عرفان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اندر دائمی خشیت کی حالت محسوس کرتے ہیں۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ، خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲)

پانچواں امر عام کی نشر واشاعت ہے خواہ کتنی ہی چھوٹی سے چھوٹی سی بات پر مشتمل ہی کیوں نہ ہو۔

چھٹا امر یہ ہے از روئے احادیث نبوی عالم سے مراد ربانی علوم کا عارف ہے، اصمعی نے اس سے وہ اہل اللہ مراد لیے ہیں جو عالم باعمل ہوں اور لوگوں کی تربیت و اصلاح میں حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا حصول ان کا قبلۂ مقصود ہو، ابن العربی نے بھی

(۱) مسند أحمد، الأنصار، حديث أبي الدرداء، ج۳،ص:۳۶

(۲) سورۃ العنکبوت:۴۴-۴۵

یہی معنی بیان کیے ہیں۔(بحوالہ فتح الباری جز واوّل،ص۳۱۲)

جس سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ علم اور عمل ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، علم بغیر عمل کے تعلّی اور کبر کی جانب لے جائے گا اور انسان گمراہی کا شکار ہو جائے گا اور عمل بغیر علم کے ضلالت وبدعات کی راہ پر ڈال دے گا، اس گمراہی کی علت اصلی بغیر محل کے علم محض کا مزاج تعلّی ہے چنانچہ جہاں ایک طرف قرآن کریم نے جگہ جگہ ایمان جس کی بنیاد واساس علم صحیح اور معرفت حق ہے اس کے ساتھ عمل کو ہی صلاح وفلاح کا ذریعہ قرار دیا ہے وہیں دوسری جانب نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث **اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا**(۱) اور **إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ**(۲) علم، عمل اور اس کے بدیہی نتائج اخلاق فاضلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط حقائق کی جانب ہی مشیر ہیں، اور یہی ذریعہ اعتدال شان عبدیت میں نکھار پیدا کرتی ہے اور یہی علم وعمل میں توازن کی راہ ہموار کر کے انسان میں صراط مستقیم وغیر مستقیم کا شعور پیدا کرتی ہے لہٰذا نفس علم کی معرفت صحیح کے لیے مطالعہ کو جز وحیات اور حرز جان بنائے رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

اور ان حقائق کی روشنی میں اپنے علم وعمل کا جائزہ لیں اور خود اپنا احتساب کریں اور تعمق فکر ونظر کے ساتھ مستقبل کے تعلق سے سنجیدہ فیصلہ کریں، غیر علمی اور لا حاصل اختلافات سے حتی المقدور اپنے کو بچائے رکھیں، بصد خلوص دعاء ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو کامیاب وکامران فرمائیں حسن عمل کی توفیق عطاء فرمائیں۔آمین یارب العالمین

وَمَا علینا إلاّ البلاغ.

(۱)سنن ابن ماجة، المقدمة، باب فضل العلماء والحث علیٰ طلب العلم، ج:۱،ص:۲۱،رقم:۲۲۹

(۲)کنز العمال، الفصل الأوّل في الغرائب، ج:۱،ص:۱۶،رقم:۵۲۱۷

مطالعہ کی میز سے

عصرِ حاضر کی روح مضطرب اور بے تاب ہے کہ شرع پیغمبر ﷺ آشکارا اور غالب ہو، مغرب نے انسان کی بلوغت اور خود مختاری کا اعلان کیا، اس کو کسی بھی بالاتر اور بالخصوص خدائی ہدایت سے مستغنی قرار دیا، خدا کو عام انسانی زندگی سے بے دخل کیا۔ گویا انسان کو انسان کا خدا بنا دیا اور بڑی محنت سے ایک عالم تشکیل دیا، لیکن دو صدیاں بھی نہیں گزرنے پائیں کہ آج وہ عالم پل پل مر رہا ہے اور انسان ایک جہانِ نو کی پیدائش کا انتظار کر رہا ہے، خدا سے بے تعلق ہو جانے کے بعد انسان نے اپنی زندگی کو اور خدا کی زمین کو فساد اور خون ریزی سے بھر دیا ہے، روز نت نئی خواہشات کی طلب ہے، ہر طلب میں روز بروز اضافہ ہے، ہر نئی چیز کو زیادہ سے زیادہ ہونا چاہئے اور جو کچھ چاہئے وہ جلد از جلد ملنا چاہئے، انسان ہو یا ٹیکنالوجی، زمین ہو یا کائنات، ہر چیز صرف خواہشات پوری کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے، ہر سینے میں لالچ اور حسد کی آگ جل رہی ہے، خدا کو بھول کر انسان خود اپنی بھلائی سے غافل ہو گیا ہے، زمین کے فاصلے سکڑتے جارہے ہیں مگر انسانوں کے درمیان نفرت اور لاتعلقی کی ناقابل عبور خلیجیں بڑھتی جارہی ہیں۔

ذرا کسی چیز کے بیج کی طرف نظر کریں جسے کسان زمین کا سینہ چیر کر پھینکتا ہے، وہ اس وقت تک ابھر کر درخت نہیں بن سکتا ہے جب تک زمین وآسمان کی تمام قوتیں آپس

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (صفر ر ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ مطابق جنوری، فروری ۲۰۱۲ء، جلد: ۲، شمارہ: ۲۲/۲۱)

یں مل کراس کی پرورش میں حصہ نہ لیں، زمین موم کی طرح نرم ہوکراسے اپنے پیٹ میں جگہ دیتی ہے، سورج اپنی تپش کے ذریعہ اس کو گرمی پہنچاتا ہے، پانی اپنی مقدار کے موافق اس کی آبیاری کرتا ہے، ہوا اپنا حصہ دیتی ہے، راتیں اسے ٹھنڈک مہیا کرتی ہیں، غرض یہ کہ کائنات کی تمام چیزیں اس بیج کی خدمت میں بہ تسلسل بلا وقفہ کئی مہینے اور سال باقاعدگی سے لگ جاتی ہیں، تب جاکر وہ بیج ایک درخت کی صورت اختیار کرکے ہمارے لئے پھل اور میوے مہیا کرتا ہے، غور کریں اگر صرف اک ہوا ساتھ چھوڑ دے تو تمام نباتات اگنے اور بڑھنے سے جواب دے دیں، بے ساختہ رب کریم کے حضور متوجہ ہونا پڑتا ہے کہ اے مالک کریم! کس طرح ہر چیز ہمیشہ سے تیری لگائی ہوئی ڈیوٹی پر مصروف نظر آرہی ہے، یہ ارض وسماء تیرے حکم کے پابند ہیں، ہوا اور پانی اپنی تاثیر سے حاضری میں مشغول ہیں، ہر چیز آگ، پتھر، دھاتیں مجال ہے جو کوئی بھی چیز اپنی خاصیت تبدیل کردے، ہر چیز اپنی حد کے اندر بہترین سلیقے سے میرے مالک تیری غلامی دے رہی ہیں، ایک لمحہ بھی غفلت نہیں برت سکتی، مگر آدم علیہ السلام کی اولاد جس کو کائنات میں سب سے زیادہ مکرم ومحترم بناکر خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا، وہی تیرے فرمان سے بغاوت پر آمادہ نظر آرہی ہے، تیری نافرمانی پر کمربستہ ہوکر اپنے بنائے ہوئے قوانین سے پیار کررہی ہے، تیرے خوف کے برعکس اپنے ہی جیسے انسانوں سے اتنا خائف ہے کہ عارضی طور پر حکومت وقت اگر گرفتاری کا آرڈر کردے تو بڑا دل رکھنے والے اپنے آپ کو بے بس سمجھ کر چھپنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیج کی مثال سے معلوم ہوا کہ نہ صرف بیج بلکہ انسان بھی مذکورہ چیزوں کا ہر وقت، ہر لمحہ، ہر پل اور ہر سانس محتاج ہے، ہماری زندگی کا دارومدار بھی زمین وآسمان کی ساری طاقتوں پر ہے اگر ہوا اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوجائے تو ہم سب لمحوں کے ہزارویں حصے میں تباہ وبرباد ہوجائیں گے۔ پانی یا آگ کا وجود ناپید ہوجائے تو تمام بنی نوع انسان کا نظام زندگی معطل ہوجائے گا، لوہا اگر آگ سے تعلق منقطع کرلے تو اک سوئی تک نہیں بن سکے

گی ،غرض کہ یہ ساری دنیا جس میں ہم جی رہے ہیں صرف اور صرف اسی وجہ سے قائم ہے کہ حق تعالیٰ کی اس عظیم الشان سلطنت کے تمام محکمے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بلاتوقف اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی یہ کمال درجہ کی ہمواری کیا خود بخود ہے؟ کروڑوں جانور پیدا ہورہے ہیں، درخت اُگ رہے ہیں، آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک انسان پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، مرتے رہے ہیں اور مرتے رہیں گے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ چاندزمین سے ٹکرا گیا ہو، سورج گر گیا ہو، نہ کبھی پانی کا محکمہ ہوا کے محکمہ سے روٹھ گیا ہو اور نہ گرمی نے آگ سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہو، علیٰ ہٰذا القیاس، آخر یہ سلطنت کے تمام محکمے اور صوبے اور کارندے کیوں اس طرح قانون کے پابند ہیں اور کیوں ان میں فساد نہیں ہوتا؟ کون سی طاقت ہے؟ ایک ہی طاقت احکم الحاکمین کی ہے یا کسی سائنسدان یا کسی اور کا اس میں ہاتھ ہے؟ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی زبان حال سے گواہی دے رہا ہے کہ ایک حاکم حقیقی کے سوا ہم کسی کے پابند نہیں ہیں، عرش تا ارض ذرہ ذرہ صرف اور صرف اسی مالک حقیقی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ زمینوں اور آسمانوں کی تمام کائناتوں کے جز وکل اسی کے تابع ہیں۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنِ.

دِیے سے دِیا یوں ہی جلتا رہے گا

ماہِ شوال کا آغاز ہے، طالبانِ علوم دین ہجوم در ہجوم، جوق در جوق پُر امید و پُر شوق دیو بند پہنچ رہے ہیں، طلبائے عزیز کا یہ جم غفیر اپنے مستقبل کے تعلق سے حسب فکر وفہم اور اپنے معاشرتی و علاقائی احوال کے زیر اثر منصوبے اور خواہشات فکر و خیال میں بسائے اپنے مطلوب ہدف تک پہنچنے اور حاصل کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہے۔ دارالعلوم وقف دیو بند اور دارالعلوم دیو بند میں داخلہ حاصل کرنا ان کی اولین ترجیحات کا انتہائی پُر شوق وپُر ذوق حصہ ہی نہیں بلکہ سب سے اہم ترین مقصد بھی ہے اور ہو بھی کیوں نہیں جب کہ طالبانِ علم کی اس خواہش و ترجیح کی خشت اساس وہ عظیم ترین نسبت ہے جو کہ اس ادارے کی وابستگی میں مضمر ہے۔ یہ نسبت ان کو اپنے تاریخی تسلسل کے ساتھ محض ان عظیم ترین اور عبقری شخصیات یا ادارہ سے ہی نہیں جوڑتی بلکہ اس فکری تحریک سے بھی وابستہ کرتی ہے جس کے تحت دارالعلوم دیو بند کا وقف علی اللہ کی اساس و بنیاد پر آغاز ہوا۔ جس کی طویل ترین تاریخی پس منظر کا مختصر ترین اجمال یہ ہے کہ بوقت بنائے دارالعلوم دیو بند ملک کے طول وعرض میں عالمی سامراج کی چیرہ دستیوں کے سبب ماحول کی ہولناکی و تاریکی، ظلم و تشدد، خوف و ہراس اور عدم تحفظ کے احساس نے عمومی سطح پر فکر و سوچ کو ناامیدیوں اور مایوسیوں کے گہرے اور گھٹاٹوپ اندھیروں میں جیسے دفن کر دیا ہو، آج ڈیڑھ سو سال بعد ماحول کے مالۂ و ماعلیہ سمیت اس کا مکمل ادراک واحساس اگر چہ ناممکن

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (شوال رذی قعدہ ۱۴۳۸ھ مطابق جولائی راگست ۲۰۱۷ء، جلد: ۸، شمارہ: ۸۹، ۸۸)

نہ سہی البتہ بایں معنی دشوار گذار ضرور ہے کہ اس وقت کی ٹیس کو من وعن ہم اسی طرح محسوس کر پائیں جیسا کہ اس دورانیۂ وقت کے لوگوں نے محسوس کیا تھا، کیوں کہ وہ لوگ صاحبانِ حال تھے۔ اُس ہولناک مایوسی کے تأثر کو کسی قدر قریب سے سمجھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے اولین صدرالمدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ جن پر اکثر و بیشتر جذب کی سی کیفیت طاری ہوجایا کرتی تھی انہوں نے مکتوبات یعقوبی میں کسی سائل کے جواب میں لکھا ہے کہ عزیزم گذرتے وقت کی ہولناکی وفکرمندی کیسے اور کن الفاظ میں بیان کروں سمجھ میں نہیں آرہا ہے، خدشہ یہ پیدا ہوچکا ہے اور یہی سوچ سوچ کر میں ہلکان ہوا جارہا ہوں کہ اس وقت موجود علمائے وقت کے اپنے وطن اصلی جنت سدھار جانے کے بعد تو ایسا لگتا ہے کہ شاید کوئی یہ بتانے والا بھی موجود نہ رہے گا کہ وضو میں فرائض کیا ہیں اور واجبات کتنے ہیں؟ ایسے پُرہول، مایوس کن اور تاریک ماحول میں اپنی شان کریمی سے اپنے مستجاب الدعوات بندوں کی مضطرب دعائے سحرگاہی کے طفیل ذات حق جل مجدہٗ سرخیل جماعت بزرگان دین بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کو منتخب فرماتے ہیں اور بہ عطائے حق و بطفیل فراستِ ایمان تاریکی ماحول کو گریزاں کردینے والا فکرالہام فرماتے ہیں، جس کا بالاجمال حاصل یہ ہے کہ امت مسلمہ کے تحفظ اور بقائے دین وایمان کی صورت بجز قرآن وحدیث، عقائد وفقہ کی تعلیم کے فروغ اور اس کے ذریعہ سے دل ودماغ کی فکری تعمیر کرکے بقائے دین وایمان کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درسگاہ قائم کی جائے جس میں دینی واسلامی علوم پڑھائے جائیں اور اسی کے مطابق نئی نسل کی دینی اور معاشرتی وتمدنی زندگیوں کو استوار کیا جائے اور اسلامی سانچوں میں ڈھالا جائے۔ یقین یہ ہے کہ اس تدبیر کے ذریعہ نہ صرف موجودہ ماحول کی تاریکیوں کا ہی تدارک ہوگا بلکہ چراغ سے چراغ جلنے کی صالح روایت کے ذریعہ پیدا ہونے والے اثرات بشرط اخلاص فی الدین ولِلّٰہیت، دیانت و امانت، اور بتوکل علی اللہ اس کے خوشگوار اور مثبت نتائج ان شاء اللہ صدیوں پر محیط ہوں گے۔

بقول علوم نانوتویؒ کے وارث وامین اور فکر قاسمی کے شارح حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، ۱۸۵۷ء کے خونچکاں انقلاب کے بعد بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایمانی فراست سے غصب شدہ اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریت فکر کے بقاء وارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم ترین مقصد ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر بہ آسانی حاصل کرلیا۔ اس الہامی نقطۂ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریت فکر اور استقلال وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتب فکر اور بے مثال عظیم تحریک ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند کی ان ہی مقبول عنداللہ اوصاف کے سبب حق تعالیٰ نے اپنے وقت کے منتخب، مقرب اور مخلص ترین مقبول بندوں پر مشتمل عظیم الشان اور عبقری شخصیات کو معاون ومدد بنا کر کھڑا کردیا، تا کہ یہ عظیم مقصد جس میں صدیوں کی کامیابی کا راز پوشیدہ تھا روبہ عمل آسکے۔ یہ تمام اولیاءِ وقت جو کہ بانی دارالعلوم دیوبند کے دست وبازو تھے، اس میں بالخصوص فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، عارف باللہ حضرت سید حاجی عابد حسین صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب، امام الفقہاء حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہم اور بعد میں حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ اس مجلس خیر کے رکن رکین ہوئے اور حضرت نانوتویؒ کے ارشاد وایماء پر وقف علی اللہ کی خشت اساس پر قائم کئے جانے والے دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام کو زینت بخشی۔

اس عظیم ترین اور بابرکت نسبت کا تاریخی تسلسل امام الہند، سرخیل علماءِ حق حضرت اقدس شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی قدس سرہٗ کے واسطے سے نبی اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے جس کی مکمل تفاصیل جاننے کے لئے اپنے اکابر واسلاف کی سیرت و سوانح پر مشتمل کتب کا مطالعہ دینی راہ عمل کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس عظیم ترین نسبت سے وابستگی جس میں دارین کی بے شمار سعادتوں کے رموز پنہاں ہیں ڈیڑھ صدی پر مشتمل ایک طویل ترین وقت گذر جانے کے باوجود آج بھی طالبانِ علم دین کا جوق

درجوق اور پُر امید وپُر شوق انداز میں دیو بند پہنچنا اور اپنی ترجیحات کے حصول کے لئے حتی المقدور کوششوں وکاوشوں کا بروئے عمل لانا اور آج بھی روز افزوں اضافے کے رجحانات کا مسلسل بڑھتے رہنا بلا شبہ ہمارے اکابر واسلاف کے اخلاص فی الدین کی ایسی بین اور روشن دلیل ہے جس کی ماہیت وحقیقت کا بچشم قلب ادراک کیا جاسکتا ہے اور کیفیت کا بچشم سر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی کی دعواتِ نیم شبی کے یہ مشاہد اثرات ہیں کہ دارالعلوم وقف دیوبند اپنی بنائے خشت اساس وقف علی اللہ کے تاریخی تسلسل کی بنیاد پر طالبانِ علوم نبوت کے لئے اولین ترجیحات کا بنیادی اور مرکزی حصہ ہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر بہزار سجدۂ شکر خداوندی اس حقیقت کا اظہار باعث مسرت ہے کہ ماہِ شوال میں ہر سال امتحان داخلہ میں شریک طلباء کی کم وبیش گیارہ ہزار کی تعداد جہاں ایک طرف طالبانِ علوم نبوت کے حصول علم دین کے رجحان میں اضافے کی ترجمان ہے وہیں دوسری جانب بعطائے حق جل مجدہٗ دارالعلوم وقف دیوبند کی عظمت، شہرت اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ روز افزوں بلند معیار، تعلیمی ترقیات اور انتظامی پالیسیوں کے عنداللہ ماجور اور عندالناس مقبول ہونے کی غماز بھی ہے۔ حق تعالیٰ کے اس عظیم ترین فضل وکرم پر جملہ خدام ادارہ بارگاہ رب العزت میں سر بہ سجود وشکر گزار ہیں، اس معنوی حقیقت کے علی الرغم فکر سطحی کی حقیقت تو یہ ہے کہ دورِ حاضر میں نظروں کو خیرہ اور عقل وخرد کو مرتعش کردینے والے مادیات کے اس طوفان بلا خیز میں دینی واسلامی تعلیم کے حصول کا یہ جذبہ، یہ شوق وذوق، یہ روز افزوں اضافوں کا رجحان آیت کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْن (۱) کی بصیرت افروز علمی اور مشاہداتی تفسیر نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بھلے سے بزعم خود یا بواسطۂ ذرائع ابلاغ اربابِ عقل وخرد یا آج کے اصطلاح میں سمجھنے اور سمجھائے جانے والے ''دانشور'' اس راہ میں کتنی ہی حصار بندیاں

(۱) ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (سورۃ الحجر: ۹)

کیوں نہ قائم کر دیں لیکن سورج کی طرح روشن حقیقت تو صرف اور صرف یہ ہی ہے کہ ہو کے وہی رہتا ہے، وہی ہوتا رہا ہے اور وہی ہوتا رہے گا جو کہ میرے رب کی حکمت اور مشیت ہے۔ حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ عقل و خرد حق تعالیٰ جل مجدہٗ کی عطا کردہ لاتعداد نعمتوں میں انتہائی مرکزیت کا حامل حصہ ہے جو محض توفیق حق اور ہدایت رب سے ہی سلامت رہ سکتی ہے۔ اسی حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بزعم خود عقل و دانش کے مدعی انسان کی بے عقلی و گمراہی کا سب سے زیادہ حسرت ناک منظر وہ ہوتا ہے جب خارجی اتفاقات، حادثات و حالات کی بناء پر وہ ایسی بہت سی چیزوں کو مسلّمات میں شمار کر بیٹھتا ہے جو کہ اپنی واقعیت کے لحاظ سے اسی قدر بے سرو پا ہوتی ہیں جس قدر کہ بظاہر مشہور اور مقبول عام نظر آتی ہیں، لیکن ان حقائق کے درمیان فرق کا ادراک صرف بتوفیق رب چشم قلب سے ہدایت کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر اسی حقیقت کا دیگر مذاہب سے وابستہ دانشور حضرات مذہبی، تمدنی اور ثقافتی تعصّبات سے اوپر اٹھ کر بالکل مخلیٰ بالطبع اور غیر جانبدار ہو کر محض عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھے جانے والے حقائق و دلائل کی بنیاد پر بھی تجزیہ کر لیں تو بہت سی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں منکشف ہو جائیں۔ بہر حال دینی و اسلامی تعلیمات کی جانب صرف مدارس میں ہی نہیں بلکہ عمومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی بڑھتا ہوا یہ رجحان اسی بین حقیقت کے ایک حصے کا عکاس ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عالمی سطح پر مبنی یہ اسلامیات اور تعلیمات دین اسلام میں اضافے کا یہ شعوری رجحان تجزیہ نگاروں کے فکری انتشار کا باعث ہو رہا ہو جس کا بشکل دگر عالم اسلام سمیت دنیا کے بہت سے ممالک میں بھی گذشتہ تین دہائیوں سے مشاہدہ ہو رہا ہے۔

لیجئے جناب! بات کہاں سے چلی تھی، کہاں جا پہنچی؟ اسے ہی تو کہتے ہیں خیالات منتشر، فکر اگر راست اور اللہ کی توفیق پر یقین ہو تو یہ اکثر و بیشتر منتشر خیالات اور یہ افکار پریشاں بھی انسان کے لئے فکر راست اور راہِ ہدایت کا موجب بن جاتے ہیں۔

و باللہ التوفیق

یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا

بچوں کی پرورش وتربیت میں سب سے اہم اور بنیادی وکلیدی عناصر میں سرفہرست بچے کے شعور وفہم اور فکری سطح کے مطابق تعلیم دینا، نصیحت کرنا اور اسکی عمر کے مراحل کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکے لئے قابل فہم اشارات سے لے کر مرحلہ بہ مرحلہ ملفوظ انداز اختیار کرتے ہوئے اسکی ذہنی وجسمانی نشو نما کی جانب توجہ دینا ہے، دنیا کی متمدن اقوام وملل کی تاریخ تربیت اطفال کے مطالعہ میں بیّن اور واضح انداز میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ دیگر اقوام میں پائے جانے والے تربیت اطفال کے تعلق سے مرتب کئے جانے والے اصول وضوابط کی بنیادوں کے سرے اسلامی تہذیب وتمدن سے ہی مستعار ہیں، اگرچہ اس میں ان کے قومی اختصاصات کی آمیزش کے بھی غالب رنگ و امتزاجات پائے جاتے ہیں، جبکہ امت مسلمہ کی تہذیبی تمدنی اور اخلاقی اساس کا اصل ماخذ ومرجع کلام اللہ اور سنت رسول اللہ ہی ہیں، لفظ اقــرأ سے اسلام کے آغاز میں دین اسلام کے مکمل ترکیبی عناصر اور اسکے حکم ورموز مستور ہیں جسکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، البتہ تعلیم جسکو کہ ازاول تا آخر تمام مخلوقات عالم میں انسانی علّت تفوق کے سرچشمۂ عزت وعظمت کی حیثیت حاصل ہے اور ازروئے قرآن وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (صفر/ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ مطابق نومبر/دسمبر ۲۰۱۸ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۰۵،۱۰۴)

وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. (۱) کے ضیا پاش حقائق کے تناظر میں بنی نوع انسانی کو مخلوقات عالم پر کرم واکرام کا اور عظمت و برتری کا درجہ حاصل ہے جو کہ بنی نوع انسانی میں صلاحیت علم اور اس کے قبول واستعداد کا ہی مرہونِ منت ہے جس کا آغاز بچے کی پیدائش کے معاً بعد ہی حیات معہد سے ہوجاتا ہے اسی لئے ماں کی پر شفقت آغوش کو بنی نوع انسانی کی تعلیم وتربیت کے لئے اولین ومؤثر ترین درسگاہ قرار دیا گیا ہے جس کے انمٹ نقوش انسان کی زندگی کے نہ صرف آخری سانس تک ہی باقی رہتے ہیں بلکہ اسکے اثرات کا نفوذ طبیعت وفطرت کی صورت میں نسل در نسل جاری وساری رہتا ہے اور اسکے مؤثرات مزاج وطبیعت کی تشکیل میں بنیاد واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسکا دائرہ عمل فرد سے شروع ہوکر خاندان، معاشرے اور قبائلی حیات سے گذرتا ہوا قوموں کے فکر وفلسفے تک پہنچتا ہے، اس سے آگے بڑھئے تو کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح عالم اکبر یعنی کائنات میں رونما ہونے والے تغیرات وحوادث سے عالم اصغر یعنی کہ انسان متأثر ہوتا ہے بالکل یہی صورت حال اسکے عکس میں بھی پائی جاتی ہے کہ عالم اصغر کی فطرت و طبیعت کے تغیرات عالم اکبر کو متأثر کرتے ہیں مثلاً ایک انسان کے ذہنی اختلال یا طبیعت کے تلوّن یا بے سکونی کے نتیجے میں برپا ہونے والی جنگ وجدال اور تباہی و بربادی کا معاملہ ہو یا کسی پر سکون فطرت کے ارتقائی نتائج کی بات ہو جب جب اسکی اکائیت کو تلاش کیا جائے گا تو اسکے سوت ماں کی آغوش میں ملنے والی تربیت وتعلیم گاہ سے ضرور ملیں گے کیونکہ فطرت کے رویے اسی اولین درسگا میں ڈھلتے، پلتے اور پروان چڑھتے ہیں جو بعد میں میسر ماحول کی آمیزش کے ساتھ افکار ونظریات کی صورت اختیار کرجاتے ہیں یا علی سبیل المثال جیسے آم کی گٹھلی میں آم کے مکمل درخت کی مکمل

(۱) ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے، اور انہیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔ (سورۃ الاسراء:۷۰)

خصوصیات صلاحیات واستعدادات پائی جاتی ہیں جس سے کہ آم کے درخت کے نشونما کا ظہور ہوتا ہے تا آنکہ اس سے حاصل ہونے والا پھل جب مکمل غذائی توانائی کے مرحلے میں داخل ہوکر قابل استعمال بنتا ہے اور انسانی جسم کے امتزاجات وطبیعت کے مطابق اپنی ماہیت کا اثر ونفوذ کرتا ہے انہی غذاؤں کی معنوی قوتوں سے رویے اور مزاج وکردار بنتے ہیں، اسی طرح ایک نومولود بچہ ایک مکمل عالم کی صلاحیتیں اور ذات حق جل مجدہٗ کی طرف وجدانی علم لے کر اس دنیا میں آتا ہے بلکہ فرق ماہیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ وجدانی علم کی اقدار میں حشرات الارض، چرندو پرند اور حیوانات بھی کسی نہ کسی درجے میں انسانوں کے ہمرکاب نظر آتے ہیں، اسی لئے دین اسلام نے اپنی تعلیمات میں آغاز سے ہی جا بجا رزق حلال کی اہمیت پر زور دیا ہے یہاں تک کہ خالق کائنات اور انسان کے درمیان بلافصل رابطے کی صورت دعا کی قبولیت کا انحصار بھی رزق حلال پر ہی رکھا گیا ہے۔علیٰ ہٰذا القیاس جب بلاتخصیص اشیائے عالم کی تربیت ونشونما میں ذات حق جلّ مجدہ کے یہ ابدی اصول کارفرما ہیں تو مخلوقات عالم کا سلسلۂ عروج بنی نوع انسانی کی نشونما میں یہ اصول تربیت بدرجہ اولیٰ اور بتمام وکمال کارفرما ہونا عین قرین عقل ہے جسکا آغاز سنِ شیرخواری سے ہی ہوجاتا ہے اور مرحلہ بہ مرحلہ اس عالم کے لئے حق تعالیٰ کی سنت تدریج وارتقا کی بنیاد پر پیدائش سے لیکر زندگی کے آخری سانس تک باقی وقائم رہتا ہے جیسا کہ ابھی مثال میں بتایا گیا ہے کہ آم کی گٹھلی میں آم کے درخت کی تمام صفات واستعداد و صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اسی طرح بنی نوع انسانی کے شیرخوار بچے کی فطرت وطبیعت میں عقل وشعور فہم وفراست، اخذ وقبول، بصیرت وبصارت کی تمام بنیادی صفات موجود ہوتی ہیں جسکا اشارہ قرآن کریم نے اپنے بلیغ انداز میں اس طرح کیا ہے، وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ.(۱)

(۱) سورۃ النحل:۷۸

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا ہے کہ اس وقت تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، اسی نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے کہ تم شکرگذاری کرو۔

اگرچہ ایک بچہ اپنے فہم و بیان پر بلحاظ کمسنی اظہار پر قادر نہیں ہوتا بجز اسکے کہ حق تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ اسکا ظہور ہو جائے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پالنے میں اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے اپنی والدہ حضرت مریم علیہا السلام پر لگائی جانے والی تہمت کا دفاع کرتے ہوئے **قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ آتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا.** (۱) کہنا، یہ خرق عادت کا ظہور معجزے کا استثناء ہے لیکن بنی نوع انسانی کی عام فطرت وطبیعت سن شیرخواری میں کسی بھی قسم کے جذبات وخیالات کے اظہار سے عاجز و قاصر ہی ہے، اگرچہ اجزائے شعور وعقل میں اخذ وقبول کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں، اسی لئے شریعت مطہرہ نے حکم دیا ہے کہ بچے کو بے شعور و بے عقل سمجھتے ہوئے اسکی موجودگی میں نازیبا گفتگو، غیبت، کذب بیانی خواہ مذاق ہی کیوں نہ ہو، چغلی، افتراء پردازی اور مذموم حرکات سے گریز واجتناب کیا جائے کیونکہ بڑوں کی تمام حرکات وسکنات الفاظ و اشارات بچے کے قلب مصفی پر نقش ہو کر اسکی طبیعت وفطرت کی نشونما کا حصہ بن رہے ہیں، چنانچہ تعلیم کا اولین مقتضی یہ ہے کہ اپنے اخلاق وکردار کا محاسبہ ہوتا رہے کیونکہ اثرات ومؤثرات کا دائرہ عمل تنہا اسکی ذات وشخصیت تک محدود نہیں ہے بلکہ لاشعوری طور پر اسکی نسلوں میں منتقل ہو رہا ہے، اسی تناظر میں عربی کی ضرب المثل معروف ہے **الولد سرّ لابیہ** بیٹا باپ کا عکس ہے جسکا دائرہ عمل عادات واطوار، فکرومزاج کو محیط ہوتا ہے، حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے زرّیں وابدی اصول ومسلمات سے مستعار لیکر ہی علمائے نفسیات نے اپنے قوانین تربیت مرتب کیئے ہیں جس میں انہیں نقاط کو بنیادی اور اساسی اہمیت دی ہے جو کہ دین اسلام کے مسلّمات کہلاتے ہیں۔

غرض کہ حاصل یہ نکلتا ہے کہ امن عالم کی بات ہو یا دنیا کی ترقی وارتقا کا معاملہ،

---

(۱) ترجمہ: بچہ بول اٹھا کہ: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (سورۃ مریم: ۳۰)

جنگ وجدل ہو یا اخلاق وکردار غرض کہ بہمہ جہت انسانی رویوں کی اکائیت کے تمام رموز ہائے سربستہ کا آغاز تربیت اطفال اور مدرسہ آغوش مادر سے ہی مربوط ملے گا، چنانچہ انسانی زندگی مرحلہ وار اپنے آغاز سے انجام کی طرف گرم سفر ہوتی ہے، عہد طفولت سے عہد شباب اور عہد شباب کے بعد عہد کہولت سے گذرتی ہوئی پختہ کاری کی طرف بڑھتی ہے، ہر عہد کے اپنے تقاضے اور اپنے مطالبات ہیں جسکا ظہور فطرت انسانی کی صورت میں اپنے اپنے وقت پر ہوتا ہے، جسکی تفصیل کا اجمال حضرت خطیب الاسلام رحمہ اللہ سابق مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کے زبان وبیان میں اس طرح ہے کہ ذات حق جلّ مجدہ نے اس کائنات کے اندر انسان کو پیدا کیا اور اسے زندگی کے ہر دور میں غلام اور فرماں بردار رکھا ہے، گویا انسان بچپن سے لیکر قبر میں جانے تک کسی نہ کسی کی غلامی ضرور کرتا ہے اور اپنی کم فہمی سے اس تصور میں جیتا ہے کہ میں آزاد ہوں، انسانی زندگی کے ان آقاؤں کی تفصیل جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ جانا جائے کہ ہماری زندگی کتنے مرحلوں سے گذرتی ہے، زندگی کے مراحل جاننے کے بعد آسانی کے ساتھ آقاؤں کا تعین ہوسکتا ہے۔

اس کائنات رنگ وبو میں قدم رکھتے ہی پہلا مرحلہ بچپن کی زندگی کا ہے اور زندگی کے ہر مرحلے کے کچھ لوازمات، کچھ خصوصیات اور تقاضے ہوا کرتے ہیں، یہ ممکن نہیں کہ بچپن آئے مگر اسکے لوازمات وخصوصیات نہ آئیں، بچپن آئے گا تو اسکے لوازم بھی ساتھ آئیں گے، زندگی کے اس دور کا آقا بچے کی طبیعت ہے اور اہل علم حکماء کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ طبیعت کے اندر علم نہیں ہوتا ہے، گویا کہ انسان بچپن کی زندگی میں جاہل حاکم کی نگرانی میں رہتا ہے اور اسی کی غلامی کرتا ہے، فطری بات ہے کہ جاہل حاکم اپنے محکوم سے ایسے افعال واعمال کبھی نہیں کرائے گا جس میں علم وآگہی ہو یا فکر وخیال کی بلندی ہو، بلکہ جاہل حاکم ایسے ہی کام کرائے گا جس سے کہ قدم قدم پر جہالت نمایاں ہو اور جہالت کا خاصہ اور تقاضہ نفس پروری وخود غرضی ہے، لہٰذا بچوں کی حرکات وسکنات اور

بات میں نفس کے تقاضوں کے علاوہ کوئی اور تقاضہ نہیں ہوتا ہے، دوسروں کے لئے نہ وہ کچھ سوچ سکتا ہے، نہ کچھ کر سکتا ہے اور اسکے جذبات یہی ہوتے ہیں کہ کھانا ہے تو صرف میرے لئے ہے، پہننا ہے تو صرف میرے لئے ہے، حتی کہ بچہ اپنے ماں باپ اور سگے بہن بھائیوں کو بھی جلدی سے اپنی کوئی چیز دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا، یہ اسلئے کہ حاکم و آقا جاہل ہے اور جہالت کا بنیادی تقاضا خود غرضی ہے، چنانچہ جب طبیعت کے اندر خود غرضی ہوتی ہے تو زندگی محدود رہتی ہے، روابط اور تعلقات کم ہوتے ہیں بچپن کا یہ دور جاہلیت وخود غرضی کا وقت سب پر آتا ہے، عوام پر خواص پر، علماء پر، جہلاء پر، صلحاء پر، صوفیاء پر، انبیا پر، ہر ایک زندگی کے اس مرحلے سے گذر کر آگے بڑھتا ہے، البتہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور عام لوگوں کے درمیان یہ فرق ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام شروع سے ہی فطرت سلیم کے مالک ہوتے ہیں، انہیں بچپن ہی سے فطرت کی پستی سے بچالیا جاتا ہے اور ان کا تحفظ من جانب اللہ ہوتا ہے۔

چنانچہ اگر آپ حضرات انبیاء کے بچپن کی زندگی کو بھی دیکھیں گے تو وہ بھی آپ کو بالکل بے غبار نظر آئے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کا زمانہ ہے آپ فرعون کی گود میں ہیں اور وہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۱)، چونکہ اسکا یہ دعویٰ غیر حقیقی تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام کی صالح فطرت اسے بچپن میں بھی گوارا نہ کر سکی، ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے قول سے جواب نہیں دے سکتے تھے اسلئے انہوں نے اپنے عمل سے جواب دیا کہ ایک ہاتھ سے فرعون کی ڈاڑھی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے طمانچہ رسید کر دیا، فرعون کو کچھ اندازہ ہوا کہ شاید یہ وہی لڑکا ہے جسکے بارے میں نجومیوں نے خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل کا یک بچہ فرعونی سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا، اپنی بیوی سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے گود سے لے لیا کہ ابھی تو یہ بچہ ہے اور بچے اس قسم کی حرکات کیا ہی کرتے ہیں۔

(۱) ترجمہ: کہا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔ (سورۃ النازعات: ۲۴)

اسی طرح نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کے بچپن کا زمانہ ہے، عمر تقریباً آٹھ سال ہے، خانہ کعبہ کی تعمیر جدید کا کام چل رہا ہے، سب کے ساتھ مل کر آپ بھی اپنے کاندھوں پر پتھر رکھ کر لا رہے ہیں، پتھر ڈھوتے ڈھوتے آپ کا ندھا سرخ ہو جاتا ہے، آپ کے چچا ابو طالب نے دیکھا تو سوچا کہ گرمی کی شدت ہے، لاؤ دوسرے بچوں کی طرح تہبند کھول کر کاندھے پر ڈال دیں جیسے ہی آپ نے اس مقصد کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حیا کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی اور ابو طالب نے فوراً اپنا بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیا اور ارادہ ترک کر دیا۔ یہ فطرتیں تھیں کہ جن پر باری تعالیٰ کو نبوت کا بوجھ رکھنا تھا چنانچہ طفولیت کے زمانے میں بھی جب ان سے کسی فعل کا صدور ہوتا تھا تو اس پر دانائی اور سمجھ بوجھ کا ہی غلبہ ہوتا تھا، لیکن یہ استثناء اور تحفظ فطرت کا معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، ورنہ بچپن کے لوازمات عہد طفولیت کے لئے عام اور جاہل حاکم طبیعت کے زیر اثر ہیں جسکو بالفاظ دیگر حیوانی زندگی کہا جا سکتا ہے، اسلئے جو خصوصیات حیوان کے اندر پائی جاتی ہیں وہی انسانی زندگی کے اس دور میں پائی جاتی ہیں، بیل کبھی امتیاز نہیں کرتا ہے کہ یہ کھیت میرے مالک کا یا کسی اور کا ہے، وہ کبھی یہ نہیں پوچھتا ہے کہ اسکا کھانا میرے لئے جائز کہ ناجائز ہے، اسی طرح بچے کی فطرت ہوتی ہے کہ کسی چیز کے اندر اپنے اور غیر کی ہونے میں کوئی فرق نہیں کرتا ہے، اور نہ اسکے نزدیک کوئی چیز حرام ہے اسکے لئے بس حلال کا ہی مسئلہ ہے، اسی طرح بچے کے اندر ہمدردی یا مروت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا، دوسرا بچہ اسکے سامنے تڑپ تڑپ کر مر بھی جائے لیکن وہ اسکے حلق میں ایک لقمہ بھی نہیں ڈال سکتا ہے۔ اس دور طفولیت سے گذر کر جوانی کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو اب اسکے فکر وشعور اور علم و آگہی میں پختگی آچکی ہوتی ہے اور وہ خیر وشر، اچھے برے اور نفع نقصان کو سمجھنے لگتا ہے۔

اب اسکے سامنے جو بھی چیز آتی ہے وہ اپنی عقل سے اسکے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے، اس لئے کہ وہ طبیعت کے اقتدار سے باغی بن کر عقل کے ہاتھ پر بیعت کر کے

اسکو اپنا حاکم و آقا تسلیم کرتے ہوئے اپنی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، اس دور میں بھی انسان غلام ہی رہتا ہے، فرق اتنا ہے کہ اب جاہل طبیعت کے بجائے فاضل عقل کا غلام ہے، جس طرح طبیعت کے کچھ تقاضے اور خصوصیات تھیں ایسے ہی عقل کے بھی اپنے کچھ تقاضے اور خصوصیات ہیں۔ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے جہالت کے بجائے سمجھ داری کے افعال صادر ہوں، مزاج میں جمال پسندی ہو، تعلقات میں وسعت ہو، اور عاقل کی زندگی کا سب سے بڑا مطالبہ اجتماعیت کا ہوتا ہے، جب اجتماعیت پیدا ہوگئی تو پھر ممکن نہیں کہ ایک عاقل خالص خودغرضانہ زندگی گزار سکے۔

انسان زندگی کے اس مرحلے میں صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی کچھ کرنا چاہتا ہے، اب اسکی حالت بچوں جیسی نہیں ہوگی کہ اگر وہ کھانا کھا رہا ہے اور دوسرا بچہ بھی اسکے پاس آکر کھڑا ہو جائے تو فطرت سلیم گوارا نہیں کرے گی کہ وہ اسے کھانے پر نہ بلائے بلکہ اب انسان خود کھانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی کھلانے کی کوشش کرتا ہے۔

بچپن میں انسان چاہتا ہے کہ بس کھانا ملنا چاہیے، جیسے بھی ہو کسی طرح کے برتن میں ہو، ایسے ہی گرمی سردی سے بچاؤ کے لئے کپڑا ہونا چاہئے، چاہے کسی ڈیزائن اور کسی بھی کلر کا ہو اسکو اس سے کوئی مطلب نہیں، نیند آئی سو گیا، زمین پر سو گیا کہاں سو گیا اس سے کوئی مطلب نہیں، لیکن جب عقل کی حکمرانی چلتی ہے تو وہ صرف یہی نہیں کہ ضروریات زندگی کو پورا کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ حسن سلیقہ اور حسن اسلوب کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔

ایک عاقل آدمی جب کھانا کھاتا ہے تو بچے کی طرح اسکے سامنے یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ بس پیٹ بھر جائے بلکہ وہ اس سلسلے میں حسن انتظام اور حسن سلیقہ کو بھی ملحوظ رکھتا ہے، ایسے ہی زندگی کے اس دور میں انسان محض اپنے تقاضوں ہی کو پورا کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اسکے اندر خوبصورتی بھی دیکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اچھے قسم کے برتنوں میں

کھانا کھائے، اچھے سے اچھے مکانوں میں آرام کرے، شاندار لباس زیب تن کرے، کپڑا پہننے سے اسکا مقصد صرف گرمی وسردی سے بچاؤ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ چاہتا ہے کپڑا خوش رنگ بھی ہو ڈیزائن بھی شاندار ہو، دیدہ زیب بھی ہو، نہ صرف یہی بلکہ اس دورشباب میں انسان چاہتا ہے کہ اسکی زبان سے نکلنے والے الفاظ بھی خوبصورت طریقے سے ادا ہوں، انکی تعبیر بھی اچھی ہوجسکو خود کلام اللہ نے زینت سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ اس دور میں فرماں روائی عقل کی ہے، لہٰذا جب آپ نے عقل سے لباس کے بارے میں، بلڈنگوں کے نت نئے ڈیزائنوں کے بارے میں، معیشت، تجارت، زراعت غرض کہ کسی بھی سلسلے میں جب جب اس سے سوال کریں گے تو وہ بھی آپ کے سامنے مجیب بن کر آئیگی۔ لیکن ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ وہاں آکر عقل بھی خود سائل بنکر کھڑی ہوجاتی ہے اوراپنے عجز کا اعتراف کر کے کہنے لگتی ہے کہ تیری فطرت کے اندر جو بلندی رکھی گئی ہے میں اسکے قابل نہیں ہوں، مثلاً اگر آپ اس سے سوال کریں کہ مرنے بعد بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ اور مرنے کے بعد کیا صورت حال پیش آتی ہے؟ قبر میں انسان پر کیا گذرتی ہے؟ اسکے ساتھ کیا کچھ ہوتا ہے؟ اس مرحلے پر آکر عقل اپنے عجز کا اعتراف کرے گی اور کہے گی میں ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی ہوں۔

جب زندگی کے سب سے بڑے حاکم نے بھی عجز کا اعتراف کرلیا اور جب سب سے بڑے مجیب نے بھی جواب دینے سے انکار کردیا اور وہ خود سائل بنکر کھڑا ہوگیا تو ظاہر ہے کہ عقل پر سے بھی اعتماد اٹھ جائے گا۔ پہلے تو حاکم جاہل طبیعت تھی جو اپنے محکوم سے جاہلانہ افعال صادر کرواتی تھی، اس لئے اس سے چھٹکارا لیکر فاضل عقل نے حکمرانی کی، لیکن وہ بھی ناقص نکلی، اب انسانی فطرت بے چین ہے اور کسی کامل واکمل راہنما اور حاکم کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ ندائے ربّانی فطرت انسانی کے اس مطالبے کو پورا کرتی ہے، اب نبوت حاکم وراہنما بنکر آتی ہے جس کا قدرتی مقام عقل سے مافوق اور بلندتر تو ہے لیکن اسکے برخلاف نہیں ہے، فطرت انسانی جس چیز کی طالب تھی اور جس چیز کی اسکو

جستجو تھی نبوت اسکو بدرجہ اتم اور بتمام وکمال پورا کرتی ہے اور پھر فطرت انسانی اپنے اندر ایک قسم کا ٹھہراؤ اور سکون محسوس کرتی ہے۔

نبوت یہ نہیں کہتی ہے کہ ضروریات کو پورا نہ کیا جائے بلکہ نبوت نہ صرف ضروریات کو پورا کرنے کی تعلیم ہی دیتی ہے، بلکہ وہ تو اسکو فرض قرار دیتی ہے، كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ (۱) حلال راستے سے رزق کے حصول کی جدجہد اسی طریقے پر فرض ہے جیسا کہ دیگر فرض عبادات ہیں، لیکن فرق یہ ہوجاتا ہے کہ پہلے انہی ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا طبیعت کو خوش کرنے کے لئے، عقل کو راضی کرنے کے لئے، لیکن نبوت کی حاکمیت کا پہلا درس یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کرو اپنے خالق ومالک کو راضی کرنے کے لئے کرو، اسی حقیقت کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک حدیث پاک میں نہایت واضح اور دلنشین پیرائے میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ: مَنْ اَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ وَ أَحَبّ لِلّٰهِ وَ أَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ أَنْكَحَ لِلّٰهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ. (۲)

ترجمہ: جس نے کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا، اور دینے سے ہاتھ روک لیا تو اللہ کے لئے روک لیا، کسی سے محبت کی تو اللہ کے لئے کی، کسی سے دشمنی کی تو اللہ کے لئے کی، اور نکاح کیا تو اللہ کے لئے کیا، تو اس نے اپنا ایمان کامل کرلیا ہے۔

پہلے جب انسان جاہل طبیعت کی حکمرانی میں زندگی گزارتا ہے تو وہ اسکی حیوانی زندگی ہے، پھر جب اس نے فاضل عقل کی حکمرانی قبول کی تو وہ ہے اسکی انسانی زندگی، اور جب اس نے اپنا راہنما اور حاکم حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول اور پیغمبر کو بنالیا تو وہ ہے اسکی ایمانی زندگی، جس طرح پہلے دور کی زندگی کا تقاضہ تھا نفس پروری، لذت اندوزی، خودغرضی، اور دوسری زندگی کا تقاضہ تھا اجتماعیت، جمال پسندی، اسی طریقے سے اس تیسری زندگی یعنی ایمانی زندگی کے بھی کچھ مطالبات اور اسکے تقاضے ہیں، اس ایمانی

(۱) مرقاۃ المفاتیح، باب الکسب و طلب الحلال، ج:۵،ص:۱۹۰۴،رقم:۲۷۸۱

(۲) مسند أحمد، مسند المکیین، حدیث معاذ بن أنس الجهني، ج:۲۴،ص:۳۹۹،رقم:۱۵۶۳۸

زندگی کا تقاضہ اور مطالبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبی آخرالزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا ہے اسکو پورے طور پر اپنی زندگی کے ایک ایک مرحلے میں اپنا لیا جائے اور جو کام بھی کیا جائے اس میں اپنے رب اور خالق و مالک کی رضا پیش نظر ہو، پہلے آدمی کھانا صرف پیٹ بھرنے کے لئے کھاتا تھا لیکن جب ایمانی زندگی آئے گی تو وہ یہ بھی سوچے گا کیا کھاؤں اور کس طرح سے کھاؤں جس سے کہ صرف میرا پیٹ ہی نہیں بھرے بلکہ میرا خدا بھی مجھ سے راضی ہو، اس احساس کے ساتھ جب آدمی کھانا کھانے بیٹھے گا تو حرام کا ایک لقمہ بھی اسکے پیٹ میں نہیں جائے گا، ایسے ہی جب آدمی کپڑا پہنے گا تو یہ سوچے گا کہ کپڑا ایسا ہو کہ جو اللہ تعالیٰ کی منشا اور اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ مردوں کے لئے ریشم کا بنا کپڑا پہننا حرام ہے، تو ریشم کا کپڑا پہننے سے نفس تو راضی ہو جائے گا اور دوسرے کچھ لوگ خوش بھی ہو سکتے ہیں کہ بڑا اچھا لباس ہے اس میں بڑے خوبصورت لگ رہے ہو مگر اس سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش نہیں ہوں گے، تو ایمانی زندگی میں آ کر آدمی ایسا کوئی لباس اختیار نہیں کرے گا، اسکو جب بھی کپڑا پہننا ہوگا وہ یہ ضرور سوچے گا کون سا کپڑا جائز ہے اور کون سا ناجائز، کون سا حلال ہے اور کون سا حرام ہے، اسی طرح عقل محض میں زنا حرام ہے اور نکاح حلال ہے، لیکن جب آدمی ایمانی زندگی میں آئیگا تو وہ زنا سے بچے گا اور نکاح کی طرف راغب ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ عمارت کی اگر بنیاد اور اساس درست ہے تو پوری عمارت از اول تا آخر سیدھی اور استوار ہوگی، اور انسانی زندگی کی بنیاد و اساس کا آغاز اسکے عہد شیر خواری سے ہوتے ہوئے اور عہد شباب و کہولت سے گذرتے ہوئے پیرانہ سالی تک یکساں طریقے سے مسلسل اور مستمر ہے اور یہی ادوار حیات اور اس کے تقاضوں کی بجا آوری ہی اگلے جہان میں کامیابی و ناکامی کی خشت اساس قرار پاتی ہے۔

ہم نوا وہم سخن اسلاف بن

ماہِ رواں رجب المرجب کم وبیش تمام ہی مدارس میں نصاب کی تکمیل کا مہینہ ہے، گویا کہ سال بھر کی عرق ریز محنت وکاوش، نیتوں کا پیمانۂ اخلاص یا اس کے بالعکس سستی وغفلت اور کاہلی وتساہلی کے حاصل نتائج کا وقت سالانہ امتحانات کی شکل میں دن بہ دن قریب آرہا ہے جو کہ مقاصد وعزائم اور مستقبل کے منصوبوں کی تکمیل یا عدم تکمیل، افادۂ وقت یا تضییع وقت کے لئے آشکارائے فیصل ہوگا، بالخصوص وہ طلبا جو کہ درس نظامی کے آخری پڑاؤ دورۂ حدیث سے گذر کر عرفاً طالب علمی کے دور سے فارغ ہوکر ایک ذمہ دار عالم دین کے زمرے میں شمار کئے جانے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، مستقبل کی مسئولیت اور ذمہ دارانہ حیثیت میں باوقار عالمانہ سنجیدگی عمل واخلاص سے مربوط ہوکر معاشرے میں ان کا مقام ومرتبہ طے کرنے میں عامل ثابت ہوگی کیوں کہ درسگاہوں میں کتاب سے علم کی شناخت حاصل ہوئی ہے، فی نفسہٖ علم میں درک وپختگی کا تعلق ممارست ومزاولت سے ہے جو کہ تدریس سے مربوط ہے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جب تک علم اور عمل کے درمیان مطلوب توازن قائم نہیں ہوگا اس وقت تک علمی وتعلیمی اور فکری واصلاحی مجالات و شعبہ جات میں ارتقاء کی شان پیدا ہوگی اور نہ ہی دنیا کی دیگر اجتماعیات میں آپ کو وارث و جانشین علوم نبوت کے مرتبۂ عظیم پر آپ کی موجودگی کو قبول نہیں کیا جائے گا کیوں کہ علم وعمل دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم اور اجزائے لاینفک ہیں، مزید برآں یہ کہ تفسیق و

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (رجب ۱۴۴۰ھ مطابق مارچ/اپریل ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۰۹)

تضلیل کے اس انحطاط پذیر دور میں علم وعمل کے مطلوب توازن کی اہمیت مزید تر سنجیدہ غور وفکر کی متقاضی ہے کیوں کہ اگر علم حاصل کرنے کے بعد عمل نے اس کو پیچھے کر دیا تو حسب ونسب، مال ومتاع اور دیگر ظاہری وجاہتیں اس کو آگے نہیں کر سکتی ہیں، معاشرے میں باعظمت مقام ومرتبہ طے کئے جانے کی اساس اور اس کی پختگی عمل کی سنجیدگی اور اخلاص نیت پر ہی منحصر ہے۔ قدیم مقولہ ہے کہ علم سب سے بڑی شرافت اور ادب وانسانیت اعلیٰ ترین نسب ہے۔ اس مقولے پر تعلیق یہ ہے کہ عمل سے ناآشنا علم سب سے بڑا ''شر'' ''آفت'' ہے نہ کہ ''شرافت'' ہے۔ عہد حاضر میں لاحاصل اختلافی مباحث میں زبان و بیان کی پراگندگی کے مظاہر ناآشنائے علم وعمل کے ہی تو ''شر'' و ''آفت'' ہیں جو کہ داخلی انتشار کی بنیادوں کو مزید تقویت فراہم کئے جانے کا سبب بنتے ہیں، اس لئے داخلی صفوں میں انتشار کے سد باب کے لئے علم صحیح کی روشنی میں فکر ونظر اور زبان وبیان کے جملہ عوامل کو عالمانہ وقار ومتانت کے ساتھ اسلام کے ضابطۂ اخلاق سے مربوط رکھتے ہوئے بروئے کار لانے کی ضرورت ناگزیر ہے کیوں کہ فطرت کا نظام انقلاب اور قومی زندگی کا مدّ وجزر اس حقیقت کا نہ صرف پتہ دیتے ہیں بلکہ یقین دلاتے ہیں کہ وحدت ملّی کا مرکز ومحور صرف اور صرف اعتماد علی السلف ہے لیکن خیال رہے کہ سلف سے مراد نسل ووطن کے پیش رو ہی نہیں ہیں بلکہ وسیع تر تناظر میں علم ومعرفت کے وہ تمام ستون مراد ہیں جن سے تاریخ کے مختلف ادوار میں علم نبوت پوری امت کو وراثت میں ملتا رہا ہے، فکر ونظر کی وسعتیں بھی انہیں حدود و قیود میں لائق تحسین اور قابل قبول ہیں کہ اعتماد علی السلف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور احساس ملی کا یہ سرچشمہ گدلا نہ ہونے پائے جس کے لئے اپنے اظہار خیال میں سنجیدگی اور وقار ومتانت کا الفاظ وخیال اور فکر ومزاج پر غلبہ ہونا ضروری ہے، ایک عالم دین کے لئے یہی عناصر معاشرے میں باعزت مقام عظمت کی ضمانت ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ

اساسِ بشریت میں مطالعہ کی اہمیت

علمی دنیا میں انسان کا تعارف مختلف انداز و پیرائے میں ملتا ہے۔ علماء، حکماء اور فلاسفہ نے اپنے اپنے فکر ونظر کے مطابق مختلف النوع تعبیرات کو استعمال کیا ہے، اس میں عقل و وجدان، ادراک و آگہی، شعور واحساس کی پختگی، بصیرت اور تحلیل و تجزیے کی صلاحیت، تیقن وایقان غرض کہ تعریف انسانی کو اساس و بنیاد فراہم کرنے کے لیے مختلف طبقات نے اپنے اپنے دلائل کی روشنی میں دنیا کے سامنے نت نئے طرز و قرینے سے انسان کا تعارف پیش کیا ہے، اگرچہ ہر تعارف اپنے پختہ دلائل کے تناظر میں اپنی اپنی جگہ پر کسی نہ کسی درجے میں انسان کی تخلیقی کاملیت کی مظہریت کا عکس پیش کرتا ہے، تاہم انسان کی مشہور عام تعریف جسکو کثرت استعمال سے ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے وہ ''حیوان ناطق'' یا ''حیوان عاقل'' سے کی جاتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے بھی انسان کا امتیاز بخش یا تسلی آمیز تعارف حاصل نہیں ہوتا ہے، ایسی تعریف جو کہ کم وبیش مذکورہ تمام ملکات کو قرار واقعی طور پر محیط ہو جس کو انسان کے منفرد امتیازات کے حوالے سے اس کی حد تام کی جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے جس کا حاصل یہ نکلا کہ مجرد جوہر عقل پر بنیاد رکھ کر انسان کا ایسا تعارف نہیں کرایا جاسکتا ہے جس سے کہ اس کی وہ

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (رجب المرجب ۱۴۴۱ھ مطابق فروری ر مارچ ۲۰۲۰ء، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱۲۱)

انفرادیت متبادر ہو جسکا کہ وہ بلا شرکت غیرے مالک بنا کر پیدا کیا گیا ہے اور دوسری انواع مخلوقات سے افضلیت و اشرفیت کے حوالے سے ممتاز ہے کیونکہ عقل کے جوہر سے تو کسی نہ کسی درجے میں غیر انسان اور حیوانات تک کو حسب ضرورت نوازا گیا ہے، علی سبیل المثال اگر ایک کتے کو کسی جگہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا ڈالا جائے تو اگلے روز وہ پھر اسی جگہ پر ملے گا گویا کہ وہ قیاس کرتا ہے کہ کل اسی جگہ پر آیا تھا تو یہاں خوراک ملی تھی تو بعید از قیاس نہیں کہ آج بھی مل جائے، غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ احوال کے صغریٰ کبریٰ کو ملا کر اس سے غیر معلوم شے پر حکم ثابت کر کے نتیجہ اخذ کرنے کا نام ہی تو قیاس عقل ہے، اگر ایک کتا اسی قیاس کی بنیاد پر اسی جگہ پر اگلے روز ملتا ہے تو کیا اس کے اس عمل کو عقلی قیاس کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، اگرچہ اسکا یہ عمل تعبیری اور لفظی نہ ہو مگر حقیقت کے تناظر میں کیفیت کی مماثلت کا پایا جانا ہی انسان کی محض عقل و خرد کی بنیاد پر انفرادیت اور افضلیت قائم کیے جانے پہ ایک سوال قائم کر دینے کے لیے کافی ہے کیونکہ اگر حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم ہی صحیح نہ ہوتی جو کہ عرف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اندریں صورت محض معقولات کو علی الاطلاق انسان کی خصوصیت و امتیاز کو بنیاد و اساس قرار دے کر اجناس و انواع عالم پر انسان کا تفوق قائم کر دینا انصاف کے قرار واقعی تقاضوں سے صریح متصادم بھی ہے اور اسکے تعارف کی واقعیت پر بھی منطبق نہیں ہوتا ہے، لہٰذا محض جوہر عقل سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع تعارف نہیں ہو سکتا ہے، البتہ استدلالی فکر و تدبر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیازات قائم کرنا، نئے نئے انکشافات و اکتشافات کے ذریعہ سے جزئیات پیدا کر لینا، جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے نئے جزئیات کا نکالنا اور جزئیات کے عواقب و نتائج کے تجزیہ و تحلیل کے بعد ماخوذ نتائج کے معیارات سے انجام دنیا و آخرت کو پیش نظر رکھنا اور نوعی و خیر سگالی، نیز اسکی منظّم تدبیریں اور معاشرے کی

اصلاح کے لیے قوانین کا ترتب جیسی صفات سے متصف ہونا ہی دراصل انسان اور انسانیت کا تعارف کہلائے جانے کے بھی لائق ہوسکتا ہے اور انسانی حقیقت کی جامع و مانع تعریف بھی قرار پاسکتی ہے، اگرچہ اس میں جوہر عقل کو ہی کلید اساس کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس میں دوسری صفات وملکات کی آمیزش سے عمارت تعمیر ہوتی ہے جس سے کہ انسان کی انفرادیت منقح ہوکر سامنے آتی ہے جو کہ دوسری مخلوقات عالم کی اجناس و انواع سے انسان کو ممتاز کردیتی ہے چنانچہ اس تناظر میں حیوان عاقل و ناطق نہیں بلکہ ''حیوان متفکر'' ہی انسان کی تعریف کی اساس و بنیاد قرار پائے گا، کیونکہ فکرمندی فکرنمائی اور فکری پیمائش اور وہ بھی عمومی اور پوری نوع بشری کے لیے نہ صرف حیات موجودہ کو ہی محیط ہے بلکہ حیات بعدالممات تک کے لیے صرف انسان کی ہی خصوصیت ہے جو کہ اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں ہے اس لیے حیوان متفکر کو انسان کی تعریف کی حدتام کہنا ہی کچھ زیادہ قرین عقل وقیاس نظر آتا ہے۔

ان تمہیدی سطور کا انشایہ ہے کہ مخلوقات عالم میں انسان کو حاصل شدہ ان امتیازی فکری اوصاف کا اگر تجزیہ کیا جائے جس پر انسان کی افضلیت واشرفیت یا انسانیت کی عظیم عمارت تعمیر ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ اوصاف بشریت نشونما پاتے ہیں اور فکر و تدبر راہ پاتا ہے، وہ بجز علم کے کسی دوسری شے سے مربوط نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ علم ہی تو وہ شے ہے جو کہ انسان کے فکر وتدبر کو بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ اگر علم ہی نہیں ہوگا تو کیا خاک تفکر وتدبر کرے گا، چنانچہ علم کو خشت اساس کی حیثیت حاصل ہوئی، لیکن خزانۂ رحمت سے مجرد علم تو جنس انسان کے علاوہ ملائکہ علیہم السلام کو بھی عطا ہوا ہے اور اجنہ کی اجناس وانواع کو بھی علم دیا گیا پھر وہ کون سی خصوصیت ہے جس سے کہ انسان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے؟ ملائکہ علیہم السلام کا علم طبعی وفطری نوعیت کا ہے جتنا ان کے دلوں میں تکوینی طور پر ڈال دیا گیا بس وہ ہی ہے جسکی نوعیت غیرارادی اور غیرشعوری طور پر ہے جس کی حدبندی پر قرآن کریم نے یہ فرما کر مہر لگادی وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِي بِاَسْمَآءِ هٰؤُلَاءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَاعِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ [1] اوران کی فطرت کوبھی ان الفاظ میں ظاہر فرمادیا گیا: لَايَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَااَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ، [2] دوسری جانب اجنہ کی جنس کوبھی انسان کوعطا کردہ شریعت کا مکلّف قرار دیکران کے علم کی بھی تحدید کردی گئی ہے جبکہ بشریت کی اساس اوراسکی افضلیت کوعلم طبعی کے علاوہ اکتسابی علم سے مربوط کر کے وہ چیز عطا کی گئی جو کہ مخلوقات عالم میں کسی بھی اجناس وانواع کو حاصل نہیں ہے اور وہ ہے تعلیم وتعلّم، درس وتدریس۔ اسی کے ذریعہ سے انسان کی افضلیت واشرفیت قائم کر کے کائنات کی تمام قوتوں کواس کے لیے مسخر کر کے کرامت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، اوراس کرامت واشرفیت کی علّت اصل انسان کے تکوینی علم کے ساتھ کسبی علم بھی ہے وہ سیکھتا بھی سکھاتا بھی ہے جواسکے ذہن میں محفوظ ہے اس کودوسروں کی طرف منتقل بھی کرسکتا ہے اوراپنے اس حاصل شدہ علم پر اگلوں کی تربیت بھی کرتا ہے اسکا تزکیہ بھی کرتا ہے، اور یہی وہ معلّمی کی خصوصیات وامتیازات ہیں جو عالم میں انسان کے علاوہ کسی اورکو عطا نہیں کیے گئے، نہ ملائکہ علیہم السلام میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ ہے اور نہ جنات اس صفت باعظمت سے متصف کیے گئے ہیں۔ گویا کہ انسان ہی اس کائنات کی وہ واحد مخلوق ہے جسکوعلم متعدی کے امتیازات عطا کیے گئے ہیں جسکی بنیاد پر اشرفیت وافضلیت اور کرامت کا تاج اس سر پر سجایا گیا ہے، تاہم ذات حق جل مجدہ نے انسان کی اشرفیت کے اس منصب جلیل کے حصول کو اکتساب علم سے مربوط کردیا ہے، کلام اللہ کی یہ آیت اسی حقیقت کی جانب مشیر ہے لَقَدْ

(۱) ترجمہ: اورآدم کو(اللہ نے) سارے نام سکھادیے، پھران کوفرشتوں کے سامنے پیش کیا اور(ان سے) کہا اگر تم سچے ہوتو مجھے ان چیزوں کے نام بتلاؤ۔ وہ بول اٹھے آپ ہی کی ذات پاک ہے جوکچھ علم آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے، حقیقت میں علم وحکمت کے مالک توصرف آپ ہیں۔ (سورۃ البقرۃ:۳۲-۳۱)

(۲) ترجمہ: (فرشتے) جواللہ کے کسی حکم میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اوروہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ (سورۃ التحریم:۶)

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ، اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ. (۱) کیونکہ ملائکہ علیہم السلام میں جو علم آتا ہے وہ ان کی ذات کے لیے ہے وہ دوسروں میں منتقل نہیں کر سکتے ہیں جبکہ انسان اپنا اکتسابی علم اپنی نسلوں کو منتقل کرتا ہے اور ازل کا علم ابد تک چلتا رہے گا، یہ صرف انسانی خصوصیت ہے اور تعلیم وتربیت تلقین وتزکیہ انسانی خاصہ ہے،اسفل سافلین سے منصب اشرفیت وافضلیت تک پہنچنے کی راہ اکتساب علم سے مربوط ہے نہ کہ علم طبعی سے اور یہی وہ وصف ہے جس سے کہ انسان کی وجہ اشرفیت اور بناء افضلیت قائم ہوتی ہے اور انسان یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ مخلوقات عالم میں، میں افضل ہوں کیونکہ خزانۂ رحمت سے جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے اس میں اور کسی کی بھی کوئی حصے داری نہیں ہے، میں اپنا علم، تجربہ، مشاہدہ، گمان، قیاس، ظن وتخمین، افکار ونظریات کو ہزاروں تک منتقل کرسکتا ہوں جبکہ دوسرے اپنے عطا کردہ علم کا ایک معمولی حصہ بھی دوسروں کو منتقل کرنے سے عاجز وقاصر ہیں کیونکہ ان تک علم منتقل ہوکر نہیں آیا ہے بلکہ ان کی طبیعتوں اور فطرتوں میں مرکوز ہے اور اس کا بھی ان کو شعور وادراک نہیں دیا گیا ہے کہ ہم میں علم ہے مگر حقیقتاً ان کے اندر عظیم علم ہے جبکہ انسان کو اپنے علم کا مکمل طور پر شعور حاصل ہے کہ علم کا کتنا حصہ تکوینی ہے اور کتنا اکتسابی ہے، مجھے آج اگر دس مسائل معلوم ہیں تو مجھ میں معلوم شدہ مسائل سے استنباط کر کے کل مزید دس مسائل معلوم کر لینے کی بھی صلاحیت موجود ہے اور ان کو دوسروں تک منتقل کردینے کی لیاقت بھی ہے، کیونکہ یہ علم کسبی ہے اور اکتسابی علم جدوجہد کے ذریعہ سے ہی آتا بھی ہے اور اسی راہ سے دوسروں کو منتقل بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ اس پوری بحث کا خلاصہ اگر کیا جائے تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ

(۱) ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے، پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، تو ان کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (سورۃ التین:۴-۶)

اکتسابِ علم کے حصول، اس کی بقاء واضافت اور منتقلی کے جملہ رموز ہائے سربستہ اور اس کی ماہیت وحقیقت مطالعہ میں ہی پوشیدہ ہیں، گویا کہ اپنی ہمہ جہت اہمیت کے لحاظ سے علم وادراک، شعور وآگہی، تعمق فکر، تیقن وایقان، تحلیل وتجزیہ، افکار ونظریات غرض کہ جملہ دوائر علمیہ اور اس کے مستدلات کو اساس فراہم کرنے میں مطالعہ کی اہمیت کو مرکزیت ومحوریت کا درجہ حاصل ہے، اور اکتساب علم کے جملہ مراحل ومظاہر اسی حقیقت اجتماعیہ کے گرد قائم ہیں اور تمام علمی وفکری محاور کے گرد یہی حقیقت مرکزیہ جلوہ طراز ہے۔

وما علینا إلا البلاغ المبین.

تذکرے

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

(خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ)

انجام کار راہِ حیات کے ایک باہمت و حوصلہ مند مسافر میرے والد محترم و مکرم اور دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے بے شمار شہروں، قصبوں اور دیہات میں مصروف عمل ہزار ہا ہزار تلامیذ علمائے کرام کے روحانی باپ، علوم نانوتوی کے شارح، مسلک دیوبند کے ترجمان، ملک و بیرونِ ملک سینکڑوں مدارس کے سرپرست و مربی اور ایک ایسی عظیم علمی شخصیت جو کہ اپنی ذاتی زندگی میں عبادت و ریاضت اور حسن اخلاق و معاملات کے قابل صد رشک التزام کے ساتھ اس منزل پر پہنچ چکی ہو جہاں علم و عمل، فہم و شعور، علوم و معارف، بصیرت و حمیت، خداداد قوت فیصلہ اور فکر مسائل ملت بایں طور جزو ذات بن چکے ہوں کہ ان اوصاف کا تصور کیے بغیر شخصیت کا خاکہ ہی ذہن میں نامکمل رہتا ہے۔ جس میں خود غرضی، خودنمائی کے عناصر مفقود، عاجزی وانکساری کی ایسی قابل تقلید مثال جہاں روشن تر صفاتِ حمیدہ بزبانِ علم و عمل بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل اپنے اور پرائے سب کو روشن کر دینے کی کوشش و کاوش میں سرگرداں، جہاں تند و تیز بادِ مخالف کے شدید تھپیڑوں کے سامنے صبر و سکوت اور استغناء کا کوہِ ہمالیہ بھی شرم سار ہو جائے، جہاں احترام ہو، اکرام ہو، چھوٹوں پر شفقت و محبت کے پھول نچھاور ہوں، جہاں عہد رواں کے تقاضوں سے ہم آہنگ، فکر و خیال کی بلندی بایں طور ہو کہ جمود و تعطل کے سکوت پر ضرب کاری انسانی مزاج کا حصہ بن جائے، جہاں فکر و شعور کی ہر منزل ایسی

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (شعبان / رمضان ۱۴۳۹ھ مطابق مئی / جون ۲۰۱۸ء، جلد: ۹، شمارہ: ۹۸، ۹۹)

پختہ کار ہو کہ اپنی بے نیازی استغناء پسند طبیعت میں مال و منال اور کشش آمیز دنیاوی مناصب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تدابیر دینی و انسانی کو ممیّز و معقول کر کے تقدیرات الٰہیہ پر صبر و شکر وصف امتیاز بن چکا ہو، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے آخری شاگرد اور عصر حاضر کی نابغۂ روزگار شخصیت خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نور اللہ مرقدہ صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند و نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ہیں جنہوں نے مورخہ ۲۴/ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق ۸/ جنوری ۱۹۲۶ء سے اس عالم کون و فساد میں اپنی عارضی زندگی کا آغاز کیا اور اپنی نہایت کامیاب ترین اور قابل صد رشک و تقلید حیات مستعار کی ۹۴/ منازل کا طویل ترین سفر طے کر کے حکم خداوندی سے مورخہ ۲۶/ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۲۰۱۸ء بروز ہفتہ بوقت ظہر ۲/ بج کر ۱۷/ منٹ پر اپنی جان مستعار جان آفریں کے سپرد کر دی اور اس کے معاً بعد اس آفتاب علم و عمل کے ہمیشہ کے لئے غروب ہو جانے والی الم انگیز خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر دیوبند میں پھیلی اور ایسی پھیلی کہ لمحوں میں ہوا کے دوش پر ملک و بیرون ملک پہنچ گئی اور ناقابل شمار ایک جم غفیر ''طیب منزل'' کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۷/ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ شب معراج کی تمام تر برکتوں و سعادتوں سمیت رات دس بجے احاطۂ مولسری دارالعلوم دیوبند میں نماز جنازہ ہوئی اور رات میں گیارہ بج کر دس منٹ پر قاسمی قبرستان میں اپنے جد مکرم بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اور اپنے والد ذی وقار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے درمیان پہلو بہ پہلو اپنی لحد کی پرسکون آغوش میں فردوس بریں کی شبنم افشانیوں کے چھاؤں تلے ابدی نیند سو گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون و إنا إن شاء اللّٰہ بکم لاحقون نسأل اللّٰہ لنا ولکم العافیۃ.

حضرت خطیب الاسلامؒ کا شمار ان ابنائے دارالعلوم دیوبند میں ہوتا ہے جن کو فیاض

قدرت نے خزینۂ اوصاف حمیدہ وصالحہ سے اتنا کچھ عطا کیا تھا کہ یہ چند صفحات میں مقید مضمون تو کیا ایک ضخیم اور مکمل کتاب سے بھی احاطہ ممکن نہیں ہے۔ تجربات ہیں، مشاہدات ہیں، حقائق ہیں، تاریخ ہے، علم وعمل ہے اور اس پر مستزاد ہزار ہا ہزار جید الفہم تلامذہ کا نقطہ ہائے فکر ونظر ہے، تأثرات ہیں، مختلف آراء ہیں، ان متنوع اور مختلف الجہت تقاضوں کے زیر اثر ملک وبیرون ملک سے تلامیذہ کے محبت آمیز وعقیدت مندانہ جذبۂ وابستگی کے اظہار واصرار کے پیش نظر دارالعلوم وقف دیوبند کی جانب سے اس رفیع المرتبت اور مرجع خلائق شخصیت کے علوم وافکار کے مختلف گوشہ ہائے حیات کے تفصیلی تذکرہ کے لئے انہی کے شایانِ شان ماہ ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ کے اواخر میں ایک سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ ان عزائم کو پورا فرمائیں۔

اس مجوزہ سیمینار میں انشاء اللہ ملک وبیرون ملک کے اہل علم ومعارف اور اہل قلم حضرات کے ذریعہ مختلف واقعات وتجربات کی تفصیلات سامنے آئیں گی۔

البتہ پابندیٔ اوقات کے قابل تقلید وصف کا اجمالی تذکرہ یہاں پر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ حضرت رحمہ اللہ کی شعوری حیات مستعار کے اسّی برس کا ایک ایک لمحہ علم دین کی خدمت کے لئے وقف رہا ہے، خواہ تعلیم وتعلّم کا دور رہا ہو یا درس وتدریس کا، سفر ہو کہ حضر ہو، ملّی واجتماعی مصروفیات ہوں یا خانگی مشغولیات، نہ کبھی اپنے فرائض سے غافل ہوئے اور نہ ہی متعین امور کی انجام دہی کے لئے مقرر وقت میں کوئی تخلف پایا گیا، پابندی اوقات کار کا اہتمام وانضباط اس قدر مثالی تھا کہ لوگ ان کے مقررہ وقت سے اپنی گھڑیوں کا ٹائم درست کر لیا کرتے تھے۔ اجلاس واجتماعات اور کانفرنسوں و سیمیناروں میں ہی نہیں بلکہ شادی بیاہ کی تقاریب میں بھی قرار واقعی پابندی وقت کا فقدان بہمہ نوع امور کی طرح ہمارے قومی مزاج کا عکاس وغمّاز ہے، گویا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی لازمی تاخیر کے قومی معمول کو ذہن میں رکھتے ہوئے پروگرام مرتب ہوتے ہیں، بالخصوص اس عمومی عدم انضباط وقت پر حضرتؒ بہت چیں بہ جبیں ہوتے تھے اور ناگواری

کے لہجے میں فرمایا کرتے تھے لاحول ولاقوۃ، پتہ نہیں لوگوں کے ذہنوں میں پابندی وقت کی اہمیت کا شعور کیوں نہیں ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی ضیق اور تکلیف میں ڈالتے ہیں اور خود بھی پریشان ہوتے ہیں، پابندی وقت کے اہتمام کا عالم یہ تھا کہ اپنے تدریس کے زمانے میں اِدھر مدرسے کے گھنٹے کی آواز سنائی دیتی تھی اُدھر حضرتؒ کا قدم درسگاہ میں ہوتا تھا، زیر درس تقریر میں وقت کی اہمیت بایں طور پیش نظر ہوتی تھی کہ اگلے گھنٹہ کی پہلی آواز پر درس اس طرح سے اختتام پذیر ہوتا تھا کہ کبھی بھی طلبہ کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ مضمون کہیں سے ادھورا یا نا تمام رہ گیا ہے، طلبہ کو عام ہدایت تھی کہ گھنٹہ بجنے کے بعد گھڑی میں دیکھ کر صرف دو منٹ انتظا کریں، اگر اس دو منٹ میں تشریف نہیں لائے تو سمجھ لیں کہ آج چھٹی ہے گویا اپنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے اوقات کا بھی اسی قدر اہتمام فرمانا مزاج کا حصہ تھا، اور یہ پابندی اوقات کارخارجی امور میں ہی نہیں بلکہ گھریلو اور روزمرہ کی مصروفیات ومشغولیات بھی اسی اصول کے زیر اثر انجام پاتی تھیں، خورد و نوش سے لے کر سونے، جاگنے تک کے تمام معمولات اسی اصول کے اسیر تھے، اگر کبھی کسی کام کے تعلق سے ہم نے یہ کہہ دیا کہ یہ کام انشاءاللہ دس سوا دس بجے تک ہو جائے گا تو فرمایا کرتے تھے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہارے نزدیک پندرہ منٹوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہے اور حق تعالیٰ نے پابندی عمل کو اس وقت بھی جاری رکھا جب کہ کسی فعل وعمل کی انجام دہی میں انسان کے ارادے کا کوئی دخل باقی نہیں رہ جاتا ہے، نماز جنازہ کے لئے رات دس بجے کا وقت طے پایا، میں خود محو حیرت ہوں کہ منٹ اور سیکنڈ کے ادنیٰ فرق کے بغیر ہزار ہا ہزار شرکائے نماز کے عظیم اژدہام کے باوجود کس طرح حق تعالیٰ نے ٹھیک وقت پر نماز جنازہ شروع کرادی، جس کو بارگاہ خداوندی میں پابندی وقت کی تکوینی برکات کی قبولیت کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جاسکتا۔

بہر حال یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ موت در اصل شمس وقمر کی ضیا پاش نورانیت سے زیادہ روشن تر ایک ایسی حقیقت ہے جس کی عالمگیر صداقت سے انکار کی

جرأت کا تصور بھی کوئی فرد و بشر نہیں کرسکتا ہے، کسی کے لئے کوئی بھی اختصاص نہیں، کوئی راہ فرار نہیں، اگر کوئی تخصیص ہوتی تو طبقۂ بنی نوع انسان کی افضل ترین مخلوق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہوتی، اگر کوئی اختصاص ہوتا تو وجہ کائنات سید الکونین محمد مجتبیٰ و مصطفیٰ ﷺ اس زمرے کے اولین فرد فرید ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بنی نوع انسان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام کائنات و عوالم کی ہمہ جنس و انواع اعظم واخف مخلوقات کو محیط ہے اور قانون موت وفنا سب کے لئے یکساں طور پر مقرر ہے، تاکہ صفات باری تعالیٰ کا مشیت و حکمت کے مطابق بتمام و کمال ظہور و نفوذ ہو سکے، خواہ وہ کائنات ہو جو کہ زمان و مکان کی حدود و قیود اور شش جہات میں مقید ہے یا وہ معلوم و نامعلوم عوالم ہوں جس کے بسائط انسانی عقل و شعور، فہم و ادراک اور بصیرت و بصارت سے ماوراء ہیں اور ان تمام عوالم کی مخلوقات کی بقاء وفنا کے تمام معاملات اسماء باری تعالیٰ کے مؤثرات کے زیر اثر ہی طے پاتے ہیں اور یہ بھی ایک امر تکوینی ہے کہ تمام عوالم میں بلاتوقف لحظہ ولمحات کسی نہ کسی صفت خداوندی کا ظہور و نفوذ رہتا ہے۔ ایک لحظہ کے کروڑویں حصہ میں بھی اگر نفوذ واثر میں انقطاع واقع ہو جائے تو بہ یک دم تمام عوالم کی مخلوقات تباہ و برباد ہو جائیں اور اسی حقیقت کا دوسرا نام قیامت ہے کیوں کہ تمام مخلوقات عوالم ابتداء وانتہا کے اصول کی اسیر ہیں جس کا بدیہی تقاضہ یہی ہے کہ آغاز کے بعد اس کا ایک انجام بھی ہو، تمام مخلوقات عالم میں انسان کو کیوں کہ سلسلۂ تخلیق کے عروج کی حیثیت حاصل ہے اس لئے اس کے مبداء و میعاد اور معاد پر مشتمل سہ جہاتی تسلسل حیات پر بطور خاص کوئی نہ کوئی صفت خداوندی کا بہر لمحہ ولحظہ تسلط رہتا ہے اور اسی کے زیر اثر حکمت و مشیت خداوندی کے تحت اس کی بقاء وفنا کا معاملہ بھی طے پاتا ہے اور یوں انسان اپنی آغاز حیات عہد الست سے منزل بہ منزل حسب مشیت حق جل مجدہٗ سفر کرتا، ٹھہرتا، رکتا اور قیام کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گرم سفر ہے؛ تا آں کہ بطن مادر میں نو ماہ کی ایک مکمل ترین زندگی گذارنے کے بعد اس عالم کون وفساد میں قدم رکھتا ہے اور خالق

کائنات کی طرف سے متعین کردہ مدت قیام کے بعد عالم بقاء کی طرف رخت سفر باندھ لیتا ہے، گویا حال سے مآل کا یہ مختصر ترین درمیانی وقفۂ حیات ہی ازروئے قرآن خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱) کی عملی تفسیر ہے۔

انسان تمام آلام ومصائب سے خوف زدہ ہی اس لئے ہوتا ہے کہ کہیں سلسلۂ حیات منقطع ہوکر موت نہ واقع ہوجائے۔ اسی لئے موت کو ''الفزع الاکبر'' مصیبت کبریٰ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ موت کی حقیقت کو انسانی علم وفہم سے قریب تر لانے کے لئے، کلام اللہ کے یہ الفاظ معجز ایک مومن کو ہمہ وقت فکر وتدبر کی دعوت دیتے ہیں۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۲) جو کہ تذکیر موت ہے روزانہ بلاناغہ بصورت نیند موت کی سی کیفیت بطور تذکیر طاری کردی جاتی ہے، اس فرق کیساتھ کہ موت کی صورت میں جسم کا تمام اعصابی نظام بالکلیہ منقطع کردیا جاتا ہے جب کہ بحالت نینداس اعصابی نظام میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے، حرکت قلب بھی جاری ہے، خون کی روانی بھی بدستور باقی ہے۔ ہاضمہ کا نظام بھی مصروف عمل ہے، سانس کی آمد ورفت بھی جاری ہے اور قوت حس وحرکت سے بھی انسان بالکلیہ محروم نہیں ہوتا ہے، آواز دینے پر یا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجانے پر یا کسی بھی قسم کی معمولی سے معمولی تکلیف پہنچ جانے پر انسان بیک لخت بیدار ہوجاتا ہے یا حالت نیند میں گرمی ہوتو پسینہ اور سردی ہوتو اس کے اثرات کا باہوش وحواس احساس کا پیدا ہونا دراصل زندگی کے غلبے کے ساتھ موت وحیات ایک درمیانی وقفہ کی حسی علامات سے عبارت ہیں، کیوں کہ بحکم خداوندی روح انسانی کا ایک حصہ عالم بدن سے عالم مثال کی طرف پرواز کرجاتا ہے اور عالم مثال خواب کی صورت میں متشکل ہوکر اپنے تمام مؤثرات کے ساتھ حرارت ایمانی سے زندہ

(۱) ترجمہ: جس نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون سے عمل میں زیادہ بہتر ہے۔ (سورۃ الملک: ۲)

(۲) ترجمہ: اللہ تمام روحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرلیتا ہے اور جن کو ابھی موت نہیں آئی ہوتی ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں (قبض کرلیتا ہے)۔ (سورۃ الزمر: ۴۲)

قلوب واذہان والوں کے لئے ذریعۂ تذکیر بن جاتا ہے گویا کہ ہر روز انسان پر عارضی موت طاری کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نیند سے بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ اس دعاء کو پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے: **الحمد لله الذين أحيانا بعد ما أماتنا و إليه النشور.** (۱)

علیٰ کل حال موت وحیات کے درمیان محض ایک سانس کا فاصلہ ہے، چل رہی ہے تو یہ جہاں اور رک گئی ہے تو وہ جہان، لیجئے قصہ تمام!

تاہم واقعہ یہ ہے کہ ایسے الم انگیز مواقع پر اگر مومنین کے لئے ذات حق جل مجدہٗ کی خصوصی دستگیری وکرم بطور نعمت سایہ فگن نہ ہوتو قیامت سے پہلے قیامت ٹوٹ پڑتی اور نظام زندگی درہم برہم ہوجایا کرتا، چنانچہ اپنے والدین واولاد، عزیز واقارب، دوست و احباب اور عامۃ المسلمین کے سانحۂ وفات پر صبر ومصابرت اور قلبی سکون وعافیت کے لئے تیر بہدف دعاء تلقین فرمادی گئی ہے۔ **إن لله ما أخذ وله ما أعطى و كل شيء عندهٗ بأجل مسمى فلتصبر و لتحتسب.** (۲)

چنانچہ جب کسی پر کوئی مصیبت پڑ جائے یا کسی کی موت واقع ہوجائے تو حق تعالیٰ اس دعاء کے ذریعہ دستگیری فرماتے ہیں اور ایک مومن کو جو صبر وتسلی اور دل کو سکینت وقرار حاصل ہوتا ہے وہ ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ **فلله الحمد و الشكر**

وما توفی الا بالله العلی العظیم

---

(۱) مسند أحمد، أول مسند الكوفيين، حديث البراء بن عازب، ج:۳۰،ص:۶۲۱،رقم:۱۸۶۸۶

(۲) الصحيح لمسلم، كتاب الجنائز، باب البكاء على الميت، ج:۱،ص:۳۰۲،رقم:۹۲۳

عرفان وآگہی کا مرقعِ آبدار

(خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ)

عصرِ رواں کی ایک بامقصد وبامعنی حیات مستعار وقت موعود آجانے پر اپنے اختتام کو پہونچ گئی، حقیقت پسندانہ زاویۂ فکر ونظر اور ذات حق جل مجدہ کی سنت ثابتہ کی جہت سے اگر جائزہ لیا جائے تو موت وحیات، شمس وقمر کی ضیاء پاش نورانیت سے زیادہ روشن تر ایک ایسی حقیقت ہے کہ زیر فلک بروئے زمیں سے لیکر بروئے فلک زیر زمیں تک معمولی وغیر معمولی جسیم وخفیف، قوی وضعیف، نورانی وخاکی، آبی وناری کسی بھی مخلوق کو اس حقیقت سے تجاوز، استثناء اور فرار وانحراف کا کوئی موقعہ حاصل نہیں ہے کیونکہ عوالم کے قانون وجود وعدم کے زیر اثر مرگ وزیست اس عالم کون ومنساد کا بھی خاصہ ہے اشرف المخلوقات سے لے کر ارذل المخلوقات تک کو موت کا ذائقہ بلا استثناء سب کو چکھنا ہے سب کو اس منزل سے گزرنا ہے، موت وحیات کا نظام خلّاق ارض وسماء نے اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور کائنات ارضی وسماوی کی تخلیق سے پہلے ہی انہیں فنا کردینے کا فیصلہ اور وقت معین ومقرر فرمادیا تھا جابجا کلام الٰہی میں مختلف پیرائے میں شہادتیں موجود ہیں جو کہ اہل بصیرت کی راہنمائی کرتی ہیں، البتہ عموم سے خصوص کی طرف نظام تسلسل

۞ برائے خصوصی شمارہ ندائے دارالعلوم وقف ''خطیب الاسلام نمبر'' (شوال رذی قعدہ ۱۴۳۹ھ مطابق جولائی راگست ۲۰۱۸ء، جلد ۹، شمارہ: ۱۰۰، ۱۰۱)

میں اشرف المخلوقات کی صفات عالیہ سے متصف بعض ہستیوں کو ذات حق جل مجدہٗ اپنی عطائے خاص سے وہ درجہ ومقام عطاء فرماتے ہیں جو اپنے علم وعمل، شفاف سیرت، بلند اخلاق وکردار اور اعمال صالحہ کی بدولت یہاں سے جانے کے بعد بھی نسلوں تک قلوب و اذہان اور فکر وخیال میں زندہ وتابندہ رہتے ہیں اور ان کے علوم و معارف، اعمال، افعال، اقوال باوقار اہل علم تلامیذہ کی صورت میں نسل درنسل باقی رہتے ہیں اور یہ وراثت علم وعمل مختلف شکل وپیرائے میں مدتوں مستمر رہتی ہے چنانچہ اس معنوی قانون بقاء کے زیر اثر انجام کار راہِ حیات کے ایک باہمت وحوصلے مند مسافر دنیا کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے بے شمار شہروں، قصبوں اور دیہات میں مصروف عمل ہزارہا ہزار تلامذہ علمائے کرام کے روحانی باپ، علوم نانوتوی کے شارح، مسلک دیوبند کے ترجمان، ملک وبیرونِ ملک سینکڑوں مدارس کے سرپرست ومربی اور ایک ایسی عظیم علمی شخصیت جو کہ اپنی ذاتی زندگی میں عبادت وریاضت کے، قابل صدرشک التزام کے ساتھ اس منزل پر پہنچ چکی ہو جہاں علم وعمل، فہم وشعور، علوم ومعارف، بصیرت وحمیت، خداداد قوت فیصلہ اور فکر مسائل ملت بایں طور جزوذات بن چکے ہوں کہ ان اوصاف کا تصور کئے بغیر شخصیت کا خاکہ ہی ذہن میں نامکمل رہتا ہے۔ جس میں خود غرضی، خودنمائی کے عناصر مفقود، عاجزی وانکساری کی ایسی قابل تقلید مثال جہاں روشن تر صفاتِ حمیدہ بزبانِ علم وعمل بلا تفریق مذہب وملت اور رنگ ونسل اپنے اور پرائے سب کو روشن کردینے کی کوشش وکاوش میں سرگرداں، جہاں تندوتیز باد مخالف کے شدید تھپیڑوں کے سامنے صبر وسکوت اور استغناء کا کوہِ ہمالہ بھی شرم سار ہوجائے، جہاں احترام ہو، اکرام ہو، چھوٹوں پر شفقت ومحبت کے پھول نچھاور ہوں، جہاں عہد رواں کے تقاضوں سے ہم آہنگ، فکر وخیال کی بلندی بایں طور پائی جاتی ہو کہ جمود وتعطل کے سکوت پر ضرب کاری انسانی مزاج کا حصہ بن جائے، جہاں فکر وشعور کی ہر منزل ایسی پختہ کار ہو کہ اپنی بے نیازی استغناء پسند طبیعت میں مال ومنال اور کشش آمیز دنیاوی مناصب کو خاطر میں نہ

لاتے ہوئے تدابیر دینی وانسانی کو ممیّز و معقول کر کے تقدیرات الٰہیہ پر صبر وشکر وصف امتیاز بن چکا ہو، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے آخری شاگرد اور عصر حاضر کی نابغۂ روزگار شخصیت خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نور اللہ مرقدہ صدر مہتمم دار العلوم وقف دیوبند و نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ہیں جنہوں نے مورخہ ۲۴؍ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق ۸؍ جنوری ۱۹۲۶ء سے اس عالم کون وفساد میں اپنی عارضی زندگی کا آغاز کیا اور اپنی نہایت کامیاب ترین اور قابل صد رشک و تقلید حیات مستعار کی ۹۴؍ منازل کا طویل ترین سفر طے کر کے حکم خداوندی سے مورخہ ۲۶؍ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۴؍ اپریل 2018ء بروز ہفتہ بوقت ظہر ۲؍ بج کر ۱۷؍ منٹ پر اپنی جان مستعار جان آفریں کے سپرد کر دی اور اس کے معاً بعد اس آفتاب علم وعمل کے ہمیشہ کے لئے غروب ہو جانے والی الم انگیز خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر دیوبند میں پھیلی اور ایسی پھیلی لمحوں میں ہوا کے دوش پر مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں اقصائے دنیا کے ممالک تک پہنچ گئی اور ناقابل شمار ایک جم غفیر ’’طیب منزل‘‘ کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۷؍ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ شب معراج کی تمام تر برکتوں وسعادتوں سمیت رات دس بجے احاطۂ مولسری دار العلوم دیوبند میں نماز جنازہ ہوئی اور رات میں گیارہ بج کر دس منٹ پر قاسمی قبرستان میں اپنے جد مکرم بانی دار العلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اور اپنے والد ذی وقار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند (بانی وصدر اول آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) کے درمیان پہلو بہ پہلو اپنی لحد کی پرسکون آغوش میں فردوس بریں کی شبنم افشانیوں کے چھاؤں تلے آسودۂ رحمت ہو گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون و انا انشاء اللّٰہ بکم لاحقون نسأل اللّٰہ لنا ولکم العافیۃ.

حضرت خطیب الاسلامؒ کا شمار ان مایۂ ناز اور قابل فخر ابنائے دار العلوم دیوبند میں

ہوتا ہے جن کو فیاض قدرت نے خزینۂ اوصاف حمیدہ وصالحہ سے اتنا کچھ عطا کیا تھا کہ یہ چند صفحات میں مقید مضمون تو کیا ایک ضخیم اور مکمل کتاب سے بھی احاطہ ممکن نہیں ہے۔ تجربات ہیں، مشاہدات ہیں، حقائق ہیں، تاریخ ہے، علم وعمل ہے، حادثات ہیں، واقعات ہیں اور اس پر مستزاد ہزار ہا ہزار جید الفہم تلامذہ کا نقطہ ہائے فکر ونظر ہے، تأثرات ہیں، مختلف آراء ہیں، چنانچہ ملک و بیرون ملک سے تلامذہ کے محبت آمیز و عقیدت مندانہ جذبۂ وابستگی کے اظہار واصرار کے پیش نظر دارالعلوم وقف دیوبند کی جانب سے اس رفیع المرتبت اور مرجع خلائق شخصیت کے علوم وافکار کے مختلف گوشہ ہائے حیات کے تفصیلی تعارف و تذکرہ کے لئے دارالعلوم وقف دیوبند کے ترجمان ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم'' کا زیر نظر یہ خصوصی شمارہ خطیب الاسلام نمبر ہی نہیں شائع کیا جارہا ہے بلکہ ہزار ہا ہزار تلامیذہ، محبین و منتسبین اور ارادت وعقیدت کا بے لوث تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد کے جذبات کی ترجمانی کے تعلق سے ایک عظیم الشان سیمنار کا انعقاد دارالعلوم وقف دیوبند کے احاطے میں مورخہ ۱۲/۱۳/اگست ۲۰۱۸ء کو منعقد کیا جارہا ہے تاکہ حضرتؒ کی حیات و خدمات دستاویزی شکل میں محفوظ ہوکر نسلوں کے لئے راہنمائی کا ذریعہ بن سکیں۔ چنانچہ انہی کے شایانِ شان ماہ ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ کے اواخر میں حضرت خطیب الاسلامؒ کی شخصیت پر منعقد ہونے والا یہ دوروزہ سیمنار ان شاء اللہ ایک نئے تاریخ ساز عہد کا عنوان ہوگا، حق تعالیٰ بہمہ نوع جملہ شرکائے کار کے عزائم اور امیدوں کو پورا فرمائیں اور اس کے مثبت اور دوررس نتائج سے امت کو بہرہ ور فرمائیں۔ اس مجوزہ سیمینار میں انشاء اللہ ملک و بیرون ملک کے اہل علم ومعارف اور اہل قلم حضرات کے ذریعہ مختلف واقعات و تجربات کی تفصیلات سامنے آئیں گی۔

البتہ پابندی اوقات کے قابل تقلید وصف کا اجمالی تذکرہ یہاں پر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ حضرت رحمۃ اللہ کی شعوری حیات مستعار کے اسّی برس کا ایک ایک لمحہ علم دین کی خدمت کے لئے وقف رہا ہے، خواہ تعلیم و تعلم کا دور رہا ہو یا درس و تدریس کا، سفر ہو کہ

حضر ہو، ملیّ و اجتماعی مصروفیات ہوں یا خانگی مشغولیات نہ کبھی اپنے فرائض سے غافل ہوئے اور نہ ہی متعین امور کی انجام دہی کے لئے مقرر وقت میں کوئی تخلف پایا گیا، پابندی اوقات کار کا اہتمام وانضباط اس قدر مثالی تھا کہ لوگ ان کے مقرر وقت سے اپنی گھڑیوں کا ٹائم درست کرلیا کرتے تھے۔ اجلاس واجتماعات اور کانفرنسوں وسیمیناروں میں ہی نہیں بلکہ شادی بیاہ کی تقاریب میں بھی قرار واقعی پابندی وقت کا فقدان بہمہ نوع امور کی طرح ہمارے قومی مزاج کا عکاس وغمّاز ہے گویا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی لازمی تاخیر کے قومی معمول کو ذہن میں رکھتے ہوئے پروگرام مرتب ہوتے ہیں، بالخصوص اس عمومی عدم انضباط وقت پر حضرتؒ بہت چیں بہ جبیں ہوتے تھے اور ناگواری کے لہجے میں فرمایا کرتے تھے لاحول ولاقوۃ پتہ نہیں لوگوں کے ذہنوں میں پابندی وقت کی اہمیت کا شعور کیوں نہیں ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی ضیق اور تکلیف میں ڈالتے ہیں اور خود بھی پریشان ہوتے ہیں، پابندی وقت کے اہتمام کا عالم یہ تھا کہ اپنے تدریس کے زمانے میں اِدھر مدرسے کے گھنٹے کی آواز سنائی دیتی تھی اُدھر حضرتؒ کا قدم درسگاہ میں ہوتا تھا، زیر درس تقریر میں وقت کی اہمیت بایں طور پیش نظر ہوتی تھی کہ اگلے گھنٹہ کی پہلی آواز پر درس اس طرح سے اختتام پذیر ہوتا تھا کہ کبھی بھی طلبہ کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ مضمون کہیں سے ادھورا یا نا تمام رہ گیا ہے، طلبہ کو عام ہدایت تھی کہ گھنٹہ بجنے کے بعد گھڑی میں دیکھ کر صرف دو منٹ انتظا کریں، اگر اس دو منٹ میں تشریف نہیں لائے تو سمجھ لیں کہ آج چھٹی ہے گویا اپنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے اوقات کا بھی اسی قدر اہتمام فرمانا مزاج کا حصہ تھا، اور یہ پابندی اوقات کار خارجی امور میں ہی نہیں بلکہ گھریلو اور روزمرہ کی مصروفیات ومشغولیات بھی اسی اصول کے زیر اثر انجام پاتی تھیں، خورد ونوش سے لے کر سونے، جاگنے تک کے تمام معمولات اسی اصول کے اسیر تھے، اگر کبھی کسی کام کے تعلق سے ہم نے یہ کہہ دیا کہ یہ کام انشاء اللہ دس سوا دس بجے تک ہو جائے گا تو فرمایا کرتے تھے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہارے نزدیک پندرہ منٹوں کی اہمیت کا

احساس نہیں ہے حق تعالیٰ نے پابندیٔ اوقات کے عمل کو اس وقت بھی جاری رکھا جب کہ کسی فعل وعمل کی انجام دہی میں انسان کے خود کے ارادے کا کوئی دخل باقی نہیں رہ جاتا ہے، نماز جنازہ کے لئے رات دس بجے کا وقت طے پایا، میں خود محوحیرت ہوں کہ منٹ اور سیکنڈ کے ادنیٰ فرق کے بغیر ہزار ہا ہزار شرکائے نماز عظیم اژدہام کے باوجود کس طرح حق تعالیٰ نے ٹھیک وقت پر نماز جنازہ شروع کرادی، جس کو بارگاہ خداوندی میں پابندی وقت کی تکوینی برکات کی قبولیت کے علاوہ اور کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جاسکتا۔

بہرحال یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ موت دراصل شمس وقمر کی ضیا پاش نورانیت سے زیادہ روشن تر ایک ایسی حقیقت ہے جس کی عالمگیر صداقت سے انکار کی جرأت کا تصور بھی کوئی فرد و بشر نہیں کرسکتا ہے، کسی کے لئے کوئی بھی اختصاص نہیں، کوئی راہ فرار نہیں، اگر کوئی تخصیص ہوتی تو طبقۂ بنی نوع انسان کی افضل ترین مخلوق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہوتی، اگر کوئی اختصاص ہوتا تو وجہ کائنات سید الکونین محمد مجتبیٰ و مصطفیٰ ﷺ اس زمرے کے اولین فرد فرید ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بنی نوع انسان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام کائنات وعوالم کی ہمہ جنس وانواع اعظم واخف مخلوقات کو محیط ہے اور قانون موت وفنا سب کے لئے یکساں طور پر مقرر ہے تاکہ صفات باری تعالیٰ کا مشیت وحکمت کے مطابق بتمام وکمال ظہور ونفوذ ہوسکے، خواہ وہ کائنات ہو جو کہ زمان ومکان کی حدود وقیود اور شش جہات میں مقید ہے یا وہ معلوم ونامعلوم عوالم ہوں جس کے بسائط انسانی عقل وشعور، فہم وادراک اور بصیرت وبصارت سے ماوراء ہیں اور ان تمام عوالم کی مخلوقات کی بقاء وفنا کے تمام معاملات اسماء باری تعالیٰ کے مؤثرات کے زیر اثر ہی طے پاتے ہیں اور یہ بھی ایک امر تکوینی ہے کہ تمام عوالم میں بلاتوقف لحظہ ولمحات کسی نہ کسی صفت خداوندی کا ظہور ونفوذ رہتا ہے۔ ایک لحظہ کے کروڑویں حصہ میں بھی اگر نفوذ واثر میں انقطاع واقع ہوجائے تو بہ یک دم تمام عوالم کی مخلوقات تباہ وبرباد ہوجائیں اور اسی حقیقت کا دوسرا نام قیامت ہے کیوں کہ تمام مخلوقات

عوالم ابتداء وانتہا کے اصول کی اسیر ہیں جس کا بدیہی تقاضہ یہی ہے کہ آغاز کے بعد اس کا ایک انجام بھی ہو، تمام مخلوقات عالم میں انسان کو کیوں کہ سلسلۂ تخلیق کے عروج کی حیثیت حاصل ہے اس لئے اس کے مبداء و میعاد اور معاد پر مشتمل سہ جہاتی تسلسل حیات پر بطور خاص کوئی نہ کوئی صفت خداوندی کا بہرلحہ ولحظہ تسلط رہتا ہے اور اسی کے زیر اثر حکمت ومشیت خداوندی کے تحت اس کی بقاء وفنا کا معاملہ بھی طے پاتا ہے اور یوں انسان اپنی آغاز حیات عہد الست سے منزل بہ منزل حسب مشیت حق جل مجدہٗ سفر کرتا، ٹھہرتا رکتا اور قیام کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گرم سفر ہے تا آں کہ بطن مادر میں نو ماہ کی ایک مکمل ترین زندگی گذارنے کے بعد اس عالم کون وفساد میں قدم رکھتا ہے اور خالق کائنات کی طرف سے متعین کردہ مدت قیام کے بعد عالم بقاء کی طرف رخت سفر باندھ لیتا ہے، گویا حال سے مآل کا درمیانی وقفۂ حیات ہی ازرائے قرآن خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱) کی عملی تفسیر ہے۔

انسان تمام آلام ومصائب سے خوف زدہ ہی اس لئے ہوتا ہے کہ کہیں سلسلۂ حیات منقطع ہوکر موت نہ واقع ہوجائے۔ اسی لئے موت کو الفزع الاکبر مصیبت کبریٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ موت کی حقیقت کو انسانی علم وفہم سے قریب تر لانے کے لئے، کلام اللہ کے یہ الفاظ معجز ایک مومن کو ہمہ وقت فکر وتدبر کی دعوت دیتے ہیں۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۲) جو کہ تذکیر موت ہے روزانہ بلاناغہ بصورت نیند موت کی سی کیفیت بطور تذکیر طاری کردی جاتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ موت کی صورت میں جسم کا تمام اعصابی نظام بالکلیہ منقطع کردیا جاتا ہے

(۱) ترجمہ: جس نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔ (سورۃ الملک:۲)

(۲) ترجمہ: اللہ تمام روحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرلیتا ہے اور جن کو ابھی موت نہیں آنی ہوتی ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں (قبض کرلیتا ہے)۔ (سورۃ الزمر:۴۲)

جب کہ بحالت نینداس اعصابی نظام میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے، حرکت قلب بھی جاری ہے، خون کی روانی بھی بدستور باقی ہے۔ ہاضمہ کا نظام بھی مصروف عمل ہے، سانس کی آمد و رفت بھی جاری ہے اور قوت حس و حرکت سے بھی انسان بالکلیہ محروم نہیں ہوتا ہے، آواز دینے پر یا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجانے پر یا کسی بھی قسم کی معمولی سے معمولی تکلیف پہنچ جانے پر انسان بیدار ہو جاتا ہے یا حالت نیند میں گرمی ہو تو پسینہ اور سردی ہو تو اس کے اثرات کا باہوش و حواس احساس کا پیدا ہونا دراصل زندگی کے غلبے کے ساتھ موت و حیات کا ایک درمیانی وقفہ ہے کیوں کہ بحکم خداوندی روح انسانی کا ایک حصہ عالم بدن سے عالم مثال کی طرف پرواز کر جاتا ہے اور عالم مثال خواب کی صورت میں متشکل ہو کر اپنے تمام مؤثرات کے ساتھ حرارت ایمانی سے زندہ قلوب و اذہان والوں کے لئے ذریعۂ تذکیر بن جاتا ہے گویا کہ ہر روز انسان پر عارضی موت طاری کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے نیند سے بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ اس دعاء کو پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے: **الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور**(۱).

علیٰ کل حال موت و حیات کے درمیان محض ایک سانس کا فاصلہ ہے، چل رہی ہے تو یہ جہاں اور رک گئی ہے تو وہ جہان، لیجئے قصہ تمام۔

تاہم واقعہ یہ ہے کہ ایسے الم انگیز مواقع پر اگر مومنین کے لئے ذات حق جل مجدہٗ کی خصوصی دستگیری بطور نعمت سایہ فگن نہ ہو تو قیامت سے پہلے قیامت ٹوٹ پڑتی اور نظام زندگی درہم برہم ہو جایا کرتا۔ چنانچہ اپنے عزیز و اقارب، دوست و احباب اور عامۃ المسلمین کے سانحۂ وفات پر صبر و مصابرت اور قلبی سکون و عافیت کے لئے تیر بہدف دعاء تلقین فرمادی گئی ہے۔ **ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطی و کل شیء عندہٗ باجل مسمی فاصبروا واحتسبوا و انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.**

---

(۱) مسند أحمد، أول مسند الكوفيين، حديث البراء بن عازب، ج:۳۰،ص:۶۲۱،رقم:۱۸۶۸۶

چنانچہ جب کسی پر کوئی مصیبت پڑ جائے یا کسی کی موت واقع ہو جائے تو حق تعالیٰ اس دعاء کے ذریعہ دستگیری فرماتے ہیں اور ایک مومن کو جو صبر و تسلی اور دل کے قرار کا ذریعہ بنتی ہے یقیناً یہ ایک نعمت عظمیٰ ہے۔

ملکی سطح سے بین الاقوامی سطح تک عامۃ المسلمین سے لیکر اہل علم وفضل علماء مشاہرین دانشوران ملت مفکرین امت اور قدیم وجدید علوم ومعارف اور مختلف فنون اور گوشہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے ارباب فضل وکمال حضرات تک اسفار کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے بغرض تعزیت اور بربنائے اخلاص وتعلق بنفس نفیس بھی تشریف لائے فون ومکتوبات کے ذریعہ تسلی آمیز کلمات اور مستجاب دعوات صالحہ سے بھی اہل خاندان کو سرفراز فرمایا، اور ملک وبیرون کے بے شمار مدارس واجتماعیات میں ایصال وثواب ،تعزیتی مجالس اور دعاؤں کا اہتمام فرمایا۔ از روئے حدیث پاک من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ یقیناً ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر بلا تخصیص تمام محبین ومخلصین کا شکریہ نہ ادا کیا جائے، راقم السطور اپنی طرف سے نیز اہل خاندان اور تمام ارباب دارالعلوم وقف دیوبند کی جانب سے ان تمام حضرات کا شکر گزار ہے جنھوں نے بطور خاص اس صبر آزما وقت میں تسلی آمیز کلمات اور دعاؤں کے اہتمام کے ساتھ تعاون سے نوازا، بارگاہ رب العزت میں ہم سب دست بدعاء ہیں ذات حق جل مجدہ اس حسن سلوک پر تمام حضرات کو دارین میں بہترین جزاء سے سرفراز فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

وما توفیقی إلا باللّٰہ

حسن عمل کا گوہر یکتا علم و نظر کا جلوۂ کامل

(خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ)

اس عالم آب و گل کی صفحہ ہستی پر نہ جانے کتنی ہی ایسی نابغہ روزگار ہستیاں جلوہ افروز ہوئیں جن کو ذات حق جل مجدہ اپنے بیکراں خزائن رحمت اور انسان کے لئے ناقابل تصور و خیال اپنی شان کے مطابق وسعت عطا سے بے شمار محیر العقول خوبیوں اور بے حساب اوصاف حمیدہ سے مزین فرما کر بنی نوع انسانی کی اصلاح و رہنمائی کے لئے دنیا میں بھیجتے ہیں، جس کو مختصر الفاظ میں بایں طور بھی اگر تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص سے ودیعت شدہ اوصاف و کمالات کے سبب یہ طبقہ بنی نوع انسانی کے لئے اپنے متنوع اور ہمہ جہت علوم و معارف کے نقطۂ نظر سے وحدت میں کثرت کی مثال اور مصداق کی عملی شہادت ہے، جس کو ایک طرف اپنے عہد و معاصرین کے درمیان درجہ عبقریت پر فائز کر دیا جاتا ہے جہاں ایک طرف اس عبقریت سے پیدا ہونے والی انفرادیت ان حضرات کو عمومیت کے گرد و غبار سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھتی ہے تو وہیں دوسری طرف سنت اللہ کے مطابق تسلسل فیض کے نقطہ نظر سے پیش رو نسل کے اخلاف صالحین کے لئے نمونۂ عمل اور راہنمائے نقش حیات کا مرتبہ عطا فرما دیا جاتا

۞ مقدمہ: سیرت و شخصیت ''خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی'' از: مولانا محمد اسامہ صدیقی نانوتوی، مطبوعہ حجۃ الاسلام اکیڈمی

رہے، اورحق تعالیٰ کی جانب سے ان شخصیات کی معنوی تزئین کاری کے بنیادی واساسی اجزائے ترکیبی علم وعمل، ورع وتقویٰ، عزم وہمت، تعمق فکر، تحریک عمل، شعور وآگہی میں پختگی، بلندی اخلاق وکردارکوان کے بودوباش، نشست وبرخاست رفتا وگفتاراورطرز معاشرت سمیت تمام چھوٹے بڑے اہم وغیراہم ایک ایک فعل وعمل سے مربوط کرکے اس میں ایسی مقناطیسی دل آویزی اورکشش ودل کشی عطا کردی جاتی ہے گویا کہ شخصیت کا خاکہ تصور وخیال بھی ان اجزائے لاینفک کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے اور یہی صفات حمیدہ ان شخصیات کومرجع خلائق بنادیتی ہیں، اور یہی وہ حق تعالیٰ کی منتخب وچنیدہ ہستیاں ہیں جوکہ بتوفیق حق جل مجدہ پیش رونسل کے خوش بخت وخوش قسمت صالح اخلاف کے لئے تمثیلاً راہ حیات کے نہ جانے کتنے ایسے چراغوں کوروشن کرجاتی ہیں جس کی معنوی روشنی میں سلیم الفکراخلاف نہ صرف منزل مقصود کا پتہ ہی پالیتے ہیں بلکہ اس مشعل حیات کی ہمہ رنگ روشنیوں میں اپنے اپنے عہو دوقرون سے ہم آہنگ تقاضوں کے مطابق نئے رنگ بھرتے ہوئے اپنے سے اگلی نسل کومنتقل کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔

علیٰ رؤس الاشہاد یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ربّ کائنات کی حکمت تخلیق عالم کے عین مطابق بنی نوع انسان کی یہ منتخب وچنیدہ شخصیات علوم وفنون و معارف اورشعور آگہی کے ان گنت مجالات میں حسب توفیق عطائے حق از زمیں تاثریا کے مصداق عروج وکمال کی انتہائی قابل رشک اورلائق تقلید بلندیوں پر پہنچادیے جاتے ہیں اوراپنے پیچھے علوم ومعارف کے بیش بہا خزینے اورنہایت قیمتی تجربات کا ایک بحر ذخّار چھوڑ جاتے ہیں جوکہ بعد میں آنے والوں کے لئے اگلی تعمیر کی بنیادو اساس کا درجہ رکھتے ہیں اور یہی تسلسل بنی نوع انسان کے تدریجی ارتقا کا عنوان ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تجرباتی اورمشاہداتی حقیقت ہے کہ دنیا کے کسی بھی میدانِ عمل کے نقطۂ عروج اورمقام کمال کا راستہ گل پوش وادیوں سے ہوکرنہیں گذرتا ہے بلکہ ہمیشہ سنگلاخ ودل خراش اورانتہائی حوصلہ شکن راہوں کا مرہون منت ہوتا ہے جس سے گذرکرانسان کوعزم

آہنی صبر واستقامت اور فکر وعمل کو استحکام و دوام کی دولت حاصل ہوتی ہے، گویا کہ اس دنیا میں بزبان قرآن کریم خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱) کی کامیاب وکامران، عملی ومشاہداتی تفسیر کا نمونہ ہوتے ہیں، چنانچہ اس حقیقت پسندانہ تجزیہ کے تناظر میں جب کسی محقق ومدقق کی بصیرت افروز اور حقیقت کی متلاشی نگاہیں تاریخ کے دبیز پردوں میں مستور اور ورائے حجاب افراد واشخاص کی سربستہ صلاحیتوں کا منصفانہ جائزہ لیتی ہیں اور بتوفیق حق منصۂ شہود پر لائی جاتی ہیں تو وہ راز حقیقت بھی آشکارا ہوجاتا ہے جس سے کہ پیش رونسلوں میں تحریک عمل کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور ان کے فکر وخیال میں تموج اور طبیعت ومزاج میں انقلابی کیفیت کو جلا میسر آتی ہے۔

ان تمہیدی حقائق کے علی الرغم اس حقیقت واقعہ سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے کہ قحط الرجال کے اس افسوس ناک عہد رواں میں جب کوئی ایسی شخصیت ہم سے جدا ہوتی ہے جس کا بابرکت وجود مسعود کسی ایک گروہ یا کسی ایک جماعت یا طبقے کے لئے مختص نہیں ہوتا بلکہ آج کے درپیش چند در چند اور نت نئے مسائل وافکار سے پریشان حال اور ہدایت ورہنمائی کی متلاشی اور روز کے نت نئے مسائل سے نبرد آزما امت کے سامنے پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات کو حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے متجسس و حساس افراد کے لئے مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہو تو ایسے میں غم والم اور فکر وہموم کا دوچند ہوجانا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے، نہ جانے حادثات کی سرعت رفتار بڑھ گئی ہے یا ایک حادثے سے دوسرے حادثے کے مابین وقفے کی کمی سے اس احساس میں اضافہ ہوگیا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں صادق المصدوق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیا کے اخیر عہد سے تعلق رکھنے والی پیش گوئیوں کے دور کا آغاز ہوچکا ہو اور اسی حساسیت کے زیر اثر، عہد رواں کی رفتار ومزاج کو دیکھتے ہوئے گمان ہو چلا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ

---

(۱) ترجمہ: جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔ (سورۃ الملک: ۲)

کہیں اسی دور کی طرف تو نہیں تھا، جیسا کہ انہی احادیث میں ایک اہم ترین حدیث پاک کے الفاظ بھی مشیر ہیں اِنَّ اللّٰہَ لا یقبِضُ العلمَ انتزاعًا ینتزِعه من الناس ولکن یقبِضُ العلمَ بقبضِ العلماء حتّٰی إذا لم یترك عالما اتّخذ الناسُ رؤوسا جهالا فسئلوا فأفتوا بغیر علم فضلّو و أضلّوا[۱]۔ اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے یک بارگی ختم نہیں کریں گے بلکہ اہل علم کی وفات سے رفتہ رفتہ علم کو ختم کردیں گے، چنانچہ جب ایک بھی عالم کا وجود نہیں رہے گا تو لوگ جہلا کو اپنا امیر اور راہنما بنالیں گے اور ان سے مسائل دریافت کریں گے، اور وہ اپنے ناقص علم اور جاہلانہ معلومات کے مطابق مسائل بتا کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اہل علم کی وفات کے پے در پے حادثات سے حدیث مذکور کے یہ الفاظ فکر و نظر اور قلب و دماغ میں ہلچل اور ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کردیتے ہیں کہ کہیں اس حرماں نصیب دور کی شہادت ہمارے حصے میں تو نہیں آرہی ہے؟ گرد و پیش کے حوصلہ شکن احوال و حوادث کی واقعاتی شہادتیں اس خیال کے فکری نقوش کو مزید گہرا کردینے کے لئے کافی ہیں، تاہم وَ لَا تَیْئَسُوْا مِن رَّوْحِ اللّٰہِ[۲] گردش احوال پر حوصلہ شکنی کا کیسا ہی غلبہ کیوں نہ ہو ایک مومن کے لئے یہ یقین ہی تقویت کے لئے کافی ہے کہ ذات حق جلّ مجدہ نبی رحمت علیہ السلام کی امت کو کسی بھی دور میں بے سہارا نہیں چھوڑیں گے۔ بے شک عمومی سطح پر ہماری بداعمالیوں اور ایمان و عقائد میں کمزوری کے سبب ہمارے فکر و خیال پر گرد و غبار آگیا ہے لیکن سنت اللہ کے مطابق ان شاء اللہ پھر کسی اولی العزم مجدد وقت کے ذریعہ باران رحمت برسے گا اور فکر و ہموم کا یہ گرد و غبار ایک مرتبہ پھر صاف ہوگا، کیوں کہ ذات حق جلّ مجدہ کی سنت ثابتہ کے تسلسل کی معنوی تاثیرات و برکات کے سبب کوئی عہد و قرن ابرار و صالحین سے خالی نہیں ہوتا ہے اور پھر کسی شخصیت کا اللہ کے احکامات کا نقیب و منادی کی حیثیت سے

(۱) صحیح البخاري، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، ج:۱،ص:۲۰، رقم:۱۰۰

(۲) ترجمہ: اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ (سورۃ یوسف: ۸۷)

منصۂ شہود پر ظہور ہوتا ہے من وعن نہیں بلکہ اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ فکر ومزاج کے فرق سے بنیادی طور پر رخصت پذیر راہنما شخصیت کا نعم البدل قرار دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ ایک ناقابل تردید تجرباتی ومشاہداتی حقیقت ہے کہ رخصت پذیر شخصیت کی اپنی فردیت وانفرادیت کی ہیئت ترکیبی کے عناصر میں من وعن خوبیاں وخامیاں مالۂ و ماعلیہ سمیت کسی دوسری شخصیت میں منتقل نہیں ہوتی ہیں کیوں کہ ہر دور کی شخصیات کے مابہ الامتیازات اوصاف کے تفاوت سے ہی ارتقائے انسانی مربوط ہے، تاہم مشبہ بہ کے طور پر کسی شخصیت کے کسی پہلو یا جھلک کا دوسرے میں پایا جانا نہ ناممکن ہے اور نہ ہی بعید ہے، اور اس حکمت حق جلّ مجدہ کے ظاہری پہلو سے یہ حقیقت بھی منکشف وعیاں ہوتی ہے کہ افراد واشخاص کی فردیت اور اس کے مخصوص مابہ الامتیازات وخصوصیات کا تعلق اپنے ہی دور کے فکر ومزاج اور طریقۂ رد وقبول کی صلاحیتوں سے مربوط ہوتا ہے کیوں کہ گردش احوال سے زمانوں کے مزاج میں زاویۂ فکر ونظر میں انداز غور وفکر میں استدلالات میں اصطلاحات میں طریقۂ فہم وتفہیم غرض کہ بہر طور بہمہ نوع صلاحیتوں کے استعمال میں تغیر واقع ہوجاتا ہے، گویا کہ مرور زمانہ سے تبدیل ہونے والے اسی فکری وعملی تغیرات کو بنی نوع انسانی کے تدریج ارتقا کی خشت اساس بھی قرار دیا جاسکتا ہے، البتہ گردش احوال اور مرور زمانہ بنیادی واساسی اصولوں پر نہ اثر انداز ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے۔

حق تعالیٰ نے اس دنیا کو اسباب کے تابع کیا ہے، چنانچہ اسلاف کے جانے کے بعد اخلاف پر ذمہ داریوں کے احساس میں اضافہ اسی ارتقائی تسلسل سے منسلک ہے، بلاشبہ خوش نصیب وخوش بخت ہیں وہ اخلاف صالحین جن کے دلوں میں جن کی نظروں میں بڑوں کی تعظیم بایں طور جاگزیں ہو کہ وہ مقاصد کی عظمت وجلالت کا ادراک کرتے ہوئے اپنی تمام علمی وفکری قوتوں کو مجتمع کر کے اس کی تکمیل کو مقصد حیات قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ نظری طور پر موت کسی مومن کے لئے حادثہ نہیں ہے بلکہ ایسا ہی ہے جیسے دن کے بعد رات کا آجانا یا رات کے سیاہ پردے سے دن کے نور کا پھیل جانا، لیکن

بہر کیف و بہر طور موت ایک ایسی حقیقت اور ایک ایسی عالمگیر سچائی ہے کہ روئے زمین پر از آدم تا آخر دم کوئی ایسا نہ گذرا ہے اور نہ گذرے گا جو کہ اس حقیقت کی صداقت سے انحراف کی جرأت کر سکے، زیر فلک بروئے آسماں کسی بھی مخلوق کو موت سے رستگاری حاصل نہیں ہے، دوام و بقا اور ہمیشگی صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کو روا ہے، اس کے علاوہ تمام مخلوقات عالم میں کسی کو دوام حاصل نہیں ہے، ہر چیز عدم سے عطائی وجود تک اور اس سے گذر کر پھر عدم کی طرف رواں دواں ہے، حرکت جمود کی طرف گامزن ہے، زندگی موت کے سائے تلے لمحہ بہ لمحہ لحظہ بہ لحظہ گرم سفر ہے بشمول انسان کے تمام مخلوقات عالم کوئی بزبان حال تو کوئی بزبان قال اس امر رب کا اشتہار ہے کہ ہر شے کو کسی نہ کسی دن فنا ہونا ہے، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (۱) کسی کو مہلت کم ملتی ہے تو کسی کو زیادہ، مگر اس دنیا میں کامیاب انسان وہ ہی سمجھا گیا جو موت کو بھی اپنے لئے بایں طور خوشگوار مرحلہ بنالے کہ موت بھی اس کو فنا نہ کر سکے اور اس دنیا سے جانے کے بعد بھی وہ کسی نہ کسی صورت میں ہمارے قلوب و اذہان میں، افکار و خیالات میں اپنے علوم و معارف کی شکل میں، اپنے قلم کی شکل میں، اپنی خدمات کی صورت میں یا تلامذہ کی صورت میں زندہ و تابندہ رہے، جس سے کہ بعد میں بھی قوم اس سے مستفید ہوتی رہے، علیٰ سبیل المثال امام غزالیؒ پانچ صدیوں سے شہر طاؤس کی خاک تلے آسودۂ رحمت ہیں لیکن بارگاہ رب العزت میں ان کی قبولیت و مقبولیت کے منجانب حق جلّ مجدہ اس دنیا میں اعلان و اشتہار کے طور پر ان کے بیش بہا علوم و معارف کے فیض کو بقا کی دولت سے سرفراز فرما دیا گیا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ اس دنیا میں بقا کی ظاہری صورت صرف علم ہی ہے، جس سے کہ اہل علم کی ایک ایسی جماعت ہر دور میں تیار ہوتی رہتی ہے جو اپنے استاذ کو اپنے محسن کو اپنے

(۱) ترجمہ: جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور آپ کی پروردگار کی ذات جو کہ عظمت اور احسان والی ہے، باقی رہ جاوے گی۔ (سورۃ الرحمٰن: ۲۶)

مربی کو لازوال بنا دیتی ہے۔

عہد رواں کی ایسی ہی ایک لازوال ہستی خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب قدس اللہ سرہ سابق مہتمم دار العلوم وقف دیوبند تھے جن کی ہمہ جہت علمی، تعلیمی، انتظامی اور ملّی خدمات کا دورانیہ ستّر سال اور حیات مستعار کا دورانیہ چورانوے سالوں کو محیط ہے جو کہ مورخہ ۲۶/رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۴/اپریل ۲۰۱۸ء کو وقت موعود آجانے پر ستر سالہ علمی و تعلیمی خدمات کے حاصل نتیجہ پر ہزرہا ہزار صالح تلامذہ پر مشتمل جماعت کو امانت علم اور تربیت عمل کی دولت سونپ کر خالق حقیقی سے جا ملے، إنا للّٰه و إنا إليه راجعون. و إنا إن شاء اللّٰه بكم لاحقون نسئل اللّٰه لنا و لكم العافية.

حضرت خطیب الاسلام رحمہ اللہ کی علمی، تعلیمی، انتظامی اور ملّی خدمات کا طویل ترین دورانیہ اور اس طول طویل دورانیہ کے حقائق علم و عمل کے تذکرۂ جلیل کو چند صفحات میں تو کیا چند با قاعدہ کتابوں میں بھی سمیٹنا ممکن نظر نہیں آرہا تھا، جب کہ کسی عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے جرأت آغاز کو علمی و عملی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور از روئے حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام من لم يشكر الناسَ لم يشكر اللّٰه (۱)، جس نے بندہ خدا کا شکر نہیں ادا کیا اس نے خدا کا بھی شکر ادا نہیں کیا، لہٰذا اس عظیم الشان کام کے آغاز پر سب سے پہلے موجب شکر و دعا ہیں برادر مکرم و محترم جناب حضرت مولانا محمد زکریا صاحب صدیقی نانوتوی مدظلہ، رکن مجلس مشاورت دار العلوم وقف دیوبند کے صاحبزادگان عزیزم مولانا محمد اسامہ نانوتوی سلّمہ، جنہوں نے اپنی سعادت مندانہ طبیعت و مزاج کے زیر اثر حضرت والد مکرم رحمہ اللہ کی حیات میں ہی ان کی اجازت سے ان کی سوانح حیات کی ترتیب کے کام کا آغاز کر دیا تھا اور ان کی خوش بختی و خوش نصیبی کی یہ جہت لائق ذکر ہے، حضرت خطیب الاسلام کی زیر نظر سوانح میں تاریخی حقائق و واقعات کو

(۱) جامع الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في الشكر لمن أحسن إليك، ج:۲، ص:۱۷، رقم:۱۹۵۵

حضرت رحمہ اللہ کی زبانی سند و تصدیق حاصل ہے، عزیزم سلّمہٗ نے بالالتزام اس کا اہتمام کیا کہ وقفے وقفے سے حضرت رحمہ اللہ کی خدمت حاضر ہوتے اور اگر طبیعت میں نشاط پاتے تو تیار کردہ نوٹس کے جوابات کو ریکارڈ کر لیتے تھے، ان کے اس عمل سے سوانح حیات میں مندرج حقائق و واقعات کی تاریخی اہمیت مستند ہوگئی ہے، اسی طرح لائق شکر و سپاس ہیں ان کے برادر مکرم عزیزم مولانا محمد اویس نانوتوی سلّمہٗ، جن کو حق تعالیٰ نے ٹھوس علمی صلاحیت کے ساتھ عربی زبان و بیان اور تحریر و تقریر کے بہترین ذوق سے سرفراز فرمایا ہے، آج جب کہ بہمہ نوع قحط الرجال کا دور ہے بقول شخصے کہ پرانے بادہ کش اٹھتے جاتے ہیں، ایک چراغ بجھتا ہے تو ظلمتوں کے سائے مزید گہرے اور طویل نظر آنے لگتے ہیں، بالخصوص ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے حوالے سے افرادی تیاری روبہ زوال ہے، ایسے میں بالخاص کسی نوجوان عالم دین کی اس طرف توجہ اور دلچسپی کا پایا جانا یقیناً امید کے چراغ کو روشن رکھنے کے مترادف ہے، عزیزم موصوف سلّمہٗ زیر نظر سوانح کو عربی زبان میں منتقل کئے جانے جیسے لائق تحسین ستائش کام میں مصروف عمل ہیں، کیوں کہ خاندانی قرابت کے تعلق سے عزیزان سلّمہما راقم السطور کے بھانجے بھی ہوتے ہیں، لہٰذا بلحاظ حق قرابت وانسیت بھی راقم السطور بہر لمحہ ولحظہ دعا گو ہے کہ برادر مکرم جناب حضرت مولانا زکریا صاحب نانوتوی کے زیر سایہ عزیزان سلّمہما کی علمی و عملی صلاحیتوں کو حق تعالیٰ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کے مصداق فروغ و مقبولیت عطا فرمائیں۔ نیز مقام عزّت و عظمت کی سربلندیوں کو ان کے لئے مقدر فرمادیں اور ان کی ان تاریخ ساز علمی کاوشوں کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمادیں۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبہ ریسرچ و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے قیام کے منجملہ دیگر بلند پایہ علمی و تعلیمی و تحقیقی مقاصد کے بطور محرک اس کا بنیادی و اساسی مقصد اکابرین امّت کی بالعموم اور تحریک دارالعلوم دیوبند سے وابستہ اکابرین کی علمی، تعلیمی، ملّی،

انتظامی ہمہ جہت جہود و کاوشوں، ایثار و قربانیوں کی قرار واقعی اہمیت کو عہد رواں کے ریسرچ و تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت مستند اہل علم کی زیر نگرانی منقیٰ و مصفیٰ اور مجلّٰی کر کے دور رواں کے اسلوب تفہیم کے مطابق اعلیٰ اور معیاری انداز میں منصۂ شہود پر لانا، نیز مستند و پیشہ ور مترجمین کی خدمات حاصل کر کے ان بلند پایہ علوم و معارف پر مشتمل بے حد قیمتی سرمائے کو عربی و انگریزی کے علاوہ دنیا کی دیگر اہم ترین زبانوں میں منتقل کرنا اکیڈمی کے ہمہ جہت مقاصد کا ایک اہم ترین حصہ ہے، اور بحمداللہ و بفضلہٖ گذشتہ پانچ سالوں میں حجۃ الاسلام اکیڈمی اپنے مقاصد و اہداف کے تعلق سے باوقار حسن کارکردگی کی بنیاد پر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مقام عظمت کی سربلندیوں میں اپنی ایک منفرد شناخت پیدا کرنے کے ساتھ بہمہ نوع علمی و تعلیمی دوائر و اجتماعیات کی طرف سے، نیز ایشیا، افریقہ، یوروپ، امریکہ اور جزیرۃ العرب کے اہل علم و دانش اور باوقار علمی شخصیات کی جانب سے موصول ہونے والے تأثرات کو بلاشبہ حجۃ الاسلام اکیڈمی کی باعظمت حسن کارکردگی کی سند کا درجہ حاصل ہے، یقیناً ناسپاسی ہوگی اگر اکیڈمی کے اس پورے ترقیاتی منظر نامے کے روح رواں عزیزم مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی سلّمہٗ ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی و استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کی شبانہ روز کوششوں، کاوشوں اور جہود و جذبۂ ایثار کا ذکر نہ کیا جائے جو کہ اپنے بڑوں کی زیر نگرانی اپنی جواں سال مخلص و محنت کش جماعت کو ساتھ لے کر اکیڈمی کے بلند پایہ اہداف کی تکمیل کی جانب شبانہ روز محنتوں کے ساتھ گرم سفر اور بہتر از بہتر کی بنیاد پر تعمق فکر و نظر کے ساتھ نت نئی ترقیات کی راہوں کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں و مصروف عمل ہیں، دعا گو ہوں کہ ذات حق جل مجدہٗ اپنے خاص لطف و کرم سے دارالعلوم وقف دیوبند کی باعظمت و بابرکت سرپرستی کے زیر سایہ عزیزم موصوف سلّمہٗ اور ان کی جماعت کے جملہ مخلص اراکین کی تمام مخلصانہ جہود کو شرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے ادارے کے لئے نفع بخش اور ان کے لئے دین و دنیا میں باعزت سربلندی کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یا ربّ العالمین

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخن ور تھے سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جگا کر چل دیئے

وما علینا إلا البلاغ المبین

اکابرین دارالعلوم دیوبند کے درخشندہ چہرے

برصغیر کی روحانی، عرفانی، علمی اور عبقری شخصیات جنہوں نے اپنے انقلاب آفریں کارناموں، زندہ جاوید کاموں، زریں خدمات کی وجہ سے ماضی قریب کی اسلامی تاریخ پر گہرا اثر مرتب کیا ہے، ان میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ذات گرامی ایک شخصیت ساز کی حیثیت سے متعارف ہے۔ حجۃ الاسلام الامام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے نادر روزگار، عبقری شخصیات ان کے کمالات، روحانیت اور صلاح وتقویٰ کی زندہ تصویر تھے۔ فضل وکمال کے اس سلسلۃ الذہب کی خدمات اور کارناموں پر اہل علم واہل قلم نے یوں تو ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں مگر شورش کاشمیریؒ نے اپنے اشعار میں جس طرح ان اکابر امت کا تعارف کرایا ہے وہ اپنی جگہ ایک بے مثال چیز ہے۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بارے میں کہتے ہیں:

پیچ وخم کھاتی ہوئی راہوں کو چمکاتا رہا — مہر عالم تاب رنگ ونور برساتا رہا
قرن اول کے صحابہ کی ادائے خاص میں — داستان سید الابرار دہراتا رہا
عہد استبداد کی تیغ ستم کا بانکپن — اس کی شمشیر نگہ کے ڈر سے تھراتا رہا

بوذرؓ و سلمانؓ کے اوصاف کا مظہر تھا وہ
اُس صدی میں غیرت اسلام کا پیکر تھا وہ

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (رمضان رشوال ۱۴۳۶ھ مطابق جولائی راگست ۲۰۱۵ء، جلد: ۶، شمارہ: ۶۲، ۶۳)

ان اشعار کے ایک ایک لفظ نے سینکڑوں صفحات کے مفاہیم ومطالب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ نہ شاعرانہ مبالغہ، نہ بے جا مدح سرائی اور نہ غیر واقعی اوصاف کا شاعرانہ رنگ ڈھنگ میں ذکر، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ اپنی سیرت، اوصاف اور روحانیت وتقویٰ میں ہو بہو ویسے ہی تھے جیسے شورشؔ اشعار کے آئینے میں انہیں دکھارے ہیں۔

قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی شخصیت روئے زمین پر خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی، علم وفضل، بصیرت و دانش، تاریخی حقیقت کی ایک سادہ مگر پرکشش، تکلفات کے رنگ وروغن سے خالی، یہ انتہائی جاذب قلب ونظر، مدح سرائی کی غیر پسندیدہ روایت سے بال بال محفوظ، مگر دلکش اور دلفریب، چند اشعار میں ایک بلند پایہ شخصیت کا معیاری تعارف، ایک بلند قامت انسان کی سیرت وسراپا کی حسین تصویر۔ ملاحظہ کیجئے:

شافع کون ومکاں کی راہ پر لاتا رہا — گمراہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا
پرچم اسلام ابر دُرفشاں کے روپ میں — بت کدوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا
ہمراہان دل گرفتہ کو بہ اعلان جہاد — تیغ جوہردار کا آئینہ دکھلاتا رہا

اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمین میں حجۃ الاسلام تھا

فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا زہد وتقویٰ اللہ اکبر، اتباعِ سنت، توحید میں ضرب المثل، علمی پایہ ظاہر و باہر، شورشؔ نے کس جامعیت کے ساتھ شخصیت کے عناصر ترکیبی کا ایک خوبصورت مرقع تیار کیا ہے۔

اس زمیں پر عصر حاضر کا فقیہ بے مثال — عظمت اسلام کی تصویر دکھلاتا رہا
امت مرحوم کو دیتا رہا درس حدیث — سنت خیر الوریٰؐ کے زمزمے گاتا رہا
ضرب توحید سے اشراک کی بنیاد و بیخ — جس طرف نکلا جہاں پہنچا وہیں ڈھاتا رہا

نام اس کا حشر تک تاریخ میں پائندہ ہے
اس مقدس بزم میں تابندہ و درخشندہ ہے

حضرت الامام النانوتویؒ کے علوم وافکار کے ترجمان، مردم ساز، مردم گر، تحریک آزادی کے سرخیل صبر ورضا کے پیکر، فقر واستغناء کی تصویر، ایثار وقربانی کا نقشِ جمیل، جذبۂ جہاد سے سرشار، خلافتِ اسلامیہ کے قیام کے لئے باطل طاقتوں سے برسر پیکار، حاصل جمع ان اوصاف کا شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہی نکلتا ہے۔

گردش دوراں کی سنگینی سے ٹکراتا رہا — مالٹا میں نغمۂ صبر و رضا گاتا رہا
فقر و استغناء کی تصویر کہن کا ہمہمہ — اس کی جدوجہد کا عنوان کہلاتا رہا
حادثوں کی جانگسل موجوں سے ہوکر بے نیاز — نقشۂ قربانی و ایثار دکھلاتا رہا

واقعہ یہ ہے کہ شمع عشق کا پروانہ تھا
خواجۂ کون و مکاں کے نام کا دیوانہ تھا

علم وکمال کا تاج محل، قوت حافظہ میں کرشمہ قدرت، سرعتِ مطالعہ میں بے نظیر، سادگی میں ''مااانا من المتکلمین'' کی تفسیر، تفقہ میں **من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقّھہ فی الدین** کے زمرہ کا ایک فردِ فرید، علوم حدیث میں راسخین فی العلم کی مثال، دقیقہ رسی میں ضرب المثل، یہ ہے ایک عبقری شخصیت کی لفظی تصویر، جو علمی دنیا میں محدث عصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے نام سے متعارف ہے۔

حاشیہ بردار دربارِ رسول اللہؐ کا — ماضی مرحوم کے اعجاز دکھلاتا رہا
آدمی کے روپ میں قدرت کا روشن معجزہ — علم کی ہیبت سے رزم وبزم پر چھاتا رہا
سادگی میں عہداولیٰ کے صحابہؓ کی مثال — سیرت پیغمبر کونینؐ سمجھاتا رہا

یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں
پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں

اپنے فکراوراپنے نظریہ کی ایک منفرد شخصیت، آندھیوں میں چراغ مصطفوی جلائے

رکھنے والا مجاہد جلیل، قافلۂ شیخ الہند کے جاں نثار سپاہی، لشکر احرار کا جرنیل، یعنی حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ
عمر بھر اپنے تخیل کی سزا پاتا رہا	دار پر بھی نغمۂ مہر و فا گاتا رہا
اپنے دامن کی ہوا سے لشکر احرار میں	جہد وایثار و وفا کی آگ بھڑکاتا رہا
ہر کہ و مہ سے حدیث عاشقی کہتا ہوا	آئے دن کے حادثوں پر ناز فرماتا رہا
کیا ہمیں اس نے کہا یہ بات ہی مانی نہیں
ہم نے اس کی صورت افکار پہچانی نہیں

حکیم الامت تو حکیم الامت ہیں، ہزاروں کتابوں کے مصنف، معتبر اور متبحر عالم، صلاح وتقویٰ کا ایسا روشن مینار کہ سینکڑوں نے اس کی روشنی میں تاریک راہوں کا سفر کیا اور اجالوں میں پہنچے، تزکیہ نفس، تربیت، اصلاح باطنی، امت مرحوم کی خیرخواہی اور سماجی و معاشرتی بدعات ومحدثات کی جگہ سنتوں کی اشاعت اور تجدیدی کارنامے ان کی پہچان ہے
جس کی صحبت سے ہوئے اہل طریقت مستفید	جس کی ہیبت سے بتوں کا دبدبہ جاتا رہا
باندھ کر اپنے خدا سے رشتۂ عہد الست	دعوت وارشاد کے میدان گرماتا رہا
اس خدا آگاہ پر شورش خدا کی رحمتیں	جو دل پیر وجواں پر لطف فرماتا رہا
اس طرح شیرازۂ صرصر پریشاں کردیا
اس نے ہر شاخ گلستاں کو گل افشاں کردیا

باطل کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کرنے والا ایک بطلِ جلیل، ابرار وصالحین کا روشن نمونہ، حق کے معاملہ میں شمشیرِ برہنہ، اتباع سنت کا جلی عنوان، تحریک شیخ الہند کا ایک مضبوط ستون، بے باک، بے لوث اور نڈر مردِ مومن، آپ اس عظیم انسان کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نام دے سکتے ہیں۔
شہر استبداد کے دیوار و در ڈھاتا رہا	گم شدہ اسلاف کی تصویر دکھلاتا رہا
ہیچ تھا اس کے لئے اندیشۂ دار و رسن	پائے استحقار سے دنیا کو ٹھکراتا رہا

خواجۂ کونینؐ کے روضے کی جالی تھام کر نور کے تڑکے دعاء کو ہاتھ پھیلاتا رہا

ان کمالات و محاسن میں جواب اس کا نہیں
اس قبیلے میں کوئی بھی ہمرکاب اس کا نہیں

فقہ وتفسیر میں یکتائے روزگار، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی صحبت کیمیاء اثر سے فیضیاب، راسخ الفکر، ہزاروں کا مخدوم، خلوت وجلوت میں دین حق کا نقیب اور کتاب وسنت کا ترجمان، امرتسر ان کا وطن مالوف، دیوبندیت ان کا مسلک محبوب، تھانویت ان کی شناخت، یعنی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ۔

فقہ و تفسیر کے انوار برساتا رہا شرع کے عقدے بڑی خوبی سے سلجھاتا رہا
تھانویؒ کی صحبت علم ونظر کے فیض سے اپنے گردوپیش کی روحوں کو گرماتا رہا
اس کے در پر میں نے دیکھے ہیں کئی میر ووزیر روز وشب ان میں خدا کا خوف پھیلاتا رہا

موت اس کے حلقۂ عظمت میں آسکتی نہیں
اس کا پرچم گردش دوراں گرا سکتی نہیں

بے مثال مفسر، علوم قرآن کا ماہر، جرأت اسلاف کا آئینہ، بادصرصر میں اسلام کی شمع روشن رکھنے والا، ایک بافیض، باعمل اور صاحب بصیرت عالم دین جنہیں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

عمر بھر قرآن کا پیغام پھیلاتا رہا ہر گھڑی اسلام کی تبلیغ فرماتا رہا
دوستداران جنوں کا دل بڑھانے کیلئے اپنے تلوے راہ کے کانٹوں سے سہلاتا رہا
گوشۂ زنداں میں کیا دار ورسن کے ساز پر داستان جرأت اسلاف دہراتا رہا

سید خیرالبشرؐ کے خلق کی تصویر تھا
اس صنم آباد میں توحید کی شمشیر تھا

زاہد مُرتاض شب زندہ دار

(حضرت مولانا محمد یوسف متالا صاحب رحمہ اللہ)

دور جاہلیت کے عرب شعراء میں امرؤ القیس کا درجہ بہت بلند ہے، اس کے کمال فن نے نہ صرف عرب و ایشیا بلکہ یورپ تک کے ناقدین سے داد تحسین وصول کی ہے، اس کا ایک قصیدہ معلقہ زمانہ جاہلیت کے ان سات لازوال شاہکار قصائد میں سے ایک ہے جو کہ سبعۂ معلقات کے نام سے معروف ہیں، صدیوں پر محیط ان قصائد کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے انہیں آب زر سے لکھ کر کعبۃ اللہ پر آویزاں کیا گیا تھا، اسی امرؤ القیس کا ایک شعر ہے:

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم قد تهدم

قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے، بلکہ ایک پوری قوم کی عمارت منہدم ہو گئی ہے۔

عموماً شعری خصوصیات میں مبالغہ آمیزی کو فنی مہارت اور شعر کا حسن سمجھا جاتا ہے لیکن تفہیم میں اصل کنایہ مقصود ہوتا ہے، چنانچہ اس شعر کے حوالے سے زیر نظر مضمون میں وہی کنایہ مقصود ہے جسکا مفہوم اصحاب علم کے درمیان معروف ہے۔

مؤرخہ ۹ رمحرم الحرام کی صبح آنکھ کھلتے ہی بلیک برن کے مقیم از یکے علمائے برطانیہ ہمارے محبّ وکرم فرما برادر مکرم جناب مولانا محمد ہاشم صاحب کا فون پر صوتی پیغام ملا کہ گجرات سے لیکر یورپ و امریکہ اور کینڈا تک ہزار ہا ہزار طالبین حق کے مصلح و روحانی

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (صفر المظفر ۱۴۴۱ھ مطابق اکتوبر رنومبر ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱۱۶)

سرپرست برطانیہ میں دارالعلوم بری کے بانی جو نہ صرف انگلینڈ بلکہ اطراف یورپ اور دنیا کے مختلف ممالک میں اسلاف واکابر کے طرز ومنہج پر دین مبین کی خدمت میں مصروف عمل ذی اثر وذی حیثیت جماعت علمائے کرام کی مادر علمی، اور شفیق تر استاذ حضرت مولانا محمد یوسف متالہ صاحب نوراللہ مرقدہ اپنے وقت موعود آجانے پر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے رفیق اعلیٰ سے جا ملے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگرچہ ٹورنٹو کینیڈا کے ہسپتال میں حضرتؒ کئی روز سے موت وحیات کی کشمکش سے نبرد آزما تھے جس کی ہر گذرتے وقت کے ساتھ مولانا ہاشم صاحب کے ذریعہ خبریں موصول ہوکر جہاں ایک طرف دعاؤں کے استمرار کا ذریعہ بن رہی تھی وہیں دوسری جانب پل پل دھیمی رفتار کے ساتھ حضرتؒ کی برگزیدہ ہستی منزل مقصود کی جانب رواں دواں تھی۔ معالج بظاہر اسباب ممکنات کی حد تک جو کچھ تدبیرات ہوسکتی تھیں انہیں بروئے عمل لانے میں مصروف تھے، اور اعزہ واقارب، محبین ومنتسبین بادیدہ نم زیرلب تلاوت کلام اللہ اور پُرسوز دعاؤں کے ساتھ متحرک ومتنفس شکل میں اپنے درمیان پائے جانے والے حضرتؒ کے وجود مسعود کا دارفناء سے دار بقاء کی جانب آخری سفر کا منظر دیکھ رہے تھے، لیکن اس امر واقعہ سے تو واہمہ وخیال کی حد تک بھی روگردانی ممکن نہیں ہے کہ اس عالم کون وفساد کی خاصیات وخصوصیات میں سلسلۂ موت وحیات ایک ایسی روشن تر وضیاپاش حقیقت کا عنوان ہے جسکے سامنے نورانیت آفتاب وماہتاب کی لو بھی مدھم ہے، یہی تو وہ حقیقت ہے کہ جس سے ہر ذی روح کو ایک لحظہ وپل کے کروڑویں حصے کے بقدر بھی تقدیم وتاخیر کے بغیر بہر کیف وبہر حال گذرنا ہے، اگرچہ کوئی بھی انسان ظاہری ومعنوی، دینی یا دنیاوی مراتب ومدارج کی عظمتوں کے کسی بھی مقام پر ہی کیوں نہ پہنچا دیا جائے، ارض وسماء کے تکوینی وتخلیقی حقائقِ علم ومعلومات اور ادراک وشعور کی کسی بھی منزل کو کیوں نہ عبور کرلے، دائرہ بشریت میں کسی بھی عروج وبلندیوں پر کمند کیوں نہ ڈال لے لیکن قدرت کے ناقابل تبدیل قانون انتقالِ عالم در عالم سے نہ کسی کو فرار کی راہ

حاصل ہوئی ہے اور نہ کسی انسان اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ امتیازات وخصائص کے علی الرغم اس قانون مرگ وزیست میں کسی قسم کے تغیر وتبدل کی علت بن سکا ہے اور نہ صبح قیامت تک بن سکتا ہے کیونکہ اگر بحکم حق جل مجدہ اس قانون موت وحیات میں کسی بھی ادنیٰ درجہ کے تغیر وتبدل کا امکان ممکن ہوتا تو عالم بشریت کے افضل واشرف اور اکرم واقرب ترین طبقہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام اولین ترجیحات کی بنیاد پر احق و مستحق قرار پاتے لیکن کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام. (۱) کیونکہ خالق کائنات نے ارضی وسماوی تمام اکبر واصغر عوالم کی تخلیق کے وقت ہی اس کی فناء کو متعین و مقرر فرما کر موت وحیات کے اس عظیم تر ومعجز ترین نظام بقاء وفناء کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھ کر بالخصوص سنت بنی آدم کا حکم تکوینی قرار دیا ہے۔

انسان کی زندگی میں بے شمار لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے گفتگو ہوتی ہے، لیکن اس بھیڑ میں معدودے چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چند ساعتوں کی ملاقات کے بعد ہی ملاقات کرنے والا مجلس سے ایک ایسا دلکش ودل آویز نقش وتأثر لے کر اٹھتا ہے جس کی اپنائیت کا رنگ وآہنگ ایک باشعور انسان کے قلب ونظر میں مدتوں تک اپنی ساعت اوّل جیسی تازگی وشادابی سمیت باقی رہتا ہے، گویا کہ اس مصرعہ کے مصداق ہے ؏

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

بالخصوص جب ملاقات کسی ایسی مؤثر علمی شخصیت سے ہو جسکے علم وعمل کا خاموش مگر کمال درجے کا توازن شخصیت کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں فہم وبصیرت کے تقاضے بایں طور پائے جاتے ہوں کہ احباب وقرابت دار سے لیکر اغیار تک ہر آنے اور ملنے والے میں غیر محسوس طریقے پر دینی حمیت وبیداری کا جذبہ وشعور پیدا کرنے کی کوشش ہی زندگی کے مقصدی اہداف کا مرکزی محور ہو جائے، جہاں لاحاصل وبے نتیجہ گفتگو سے

---

(۱) ترجمہ: اس زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے اور (صرف) تمہارے پروردگار جلال والی فضل وکرم والی ذات باقی رہے گی۔ (سورۃ الرحمٰن: ۲۷،۲۶)

سے گریز و پرہیز اور اجتناب فطرت وطبیعت کا ایسا حصہ بن جائے جس پر دعوتی اور اصلاحی مزاج اس قدر غالب اور حاوی ہو کہ مجلس میں کسی کی بھی کسی ایسے موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہ ہو سکے جسکا اصل دینی مقصد حیات سے دور کا بھی تعلق نہ ہو، اور جہاں خود نمائی و خود غرضی کے بجائے تواضع انکساری و عاجزی، ملنساری و مہمان نوازی جیسی صفات شخصیت کا بذات خود ایسا تعارف بن جائیں کہ پھر اس کے بعد مزید الفاظ تعارف کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔

یہ وہ افکار و خیالات ہیں جو آج سے قریب ڈیڑھ سال قبل حضرت اقدس مولانا محمد یوسف متالہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے برطانیہ میں ان کے دولت کدے پر پہلی تفصیلی روبرو ملاقات کے وقت قرطاس قلب وذہن پر نقش ہوئے، اور آج بھی ویسی ہی تازگی و شادابی لئے ہوئے اپنی مکمل مہک کے ساتھ دل و دماغ میں تازہ ہیں، اگرچہ اس سے قبل متعدد بار حضرت قبلہ والد محترم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب رحمہ اللہ کی معیت میں دیوبند اور دیگر مقامات پر حضرتؒ سے ملاقات ہو چکی تھی لیکن ذمہ دارانہ طریق پر یہ پہلی ملاقات کا موقعہ تھا۔

قادر رب کریم نے اس زاہد مُرتاض و شب زندہ دار کو علم و عمل کے متوازن امتزاج کے ساتھ جن اوصاف و کمالات اور ظاہری و معنوی مقناطیسی کشش سے سرفراز فرمایا تھا اس کے حامل افراد اس دور قحط الرجال میں بڑی کمی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں، اس ملاقات کے موقعہ پر سوال کرنے والے نے موجودہ دور فتن کے حوالے سے سوال کیا جب کہ دنیا میں ہر چہار جانب ہمہ اقسام فتنوں کا دور دورہ ہے جسکو مختصر الفاظ میں تعبیر یہ ہے کہ امن در دہن ہے، کفن در بغل ہے، ایسے میں ایک مومن کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داری ہونی چاہئے؟ فرمایا کہ ایسے میں خاص طور پر اپنے ایمان کو پوری توجہ اور مضبوط تر قوت ارادی کے ساتھ سنبھالنے کی ضرورت ہے اور یہ قوت آپ کو کہیں باہر سے نہیں بلکہ اپنی داخلی سطح سے حاصل کرنی ہوگی، جسکا راستہ خود احتسابی سے ہو کر گذرتا ہے، اور یہ

ایمان کی تاثیری خصوصیات وخاصیات ہیں کہ جیسے جیسے ریاضت ومجاہدے سے ایمان میں استحکام کی شان پیدا ہوتی جائے گی ویسے ویسے ہی انسان کے قلب میں اس عقیدے کا رسوخ بڑھتا چلا جائے گا کہ یہ انفسی وآفاقی آلام ومصائب جن سے کہ اسوقت بنی نوع انسانی کے قلوب لرزہ باندام اور مضطرب وبے چین ہیں یہ مومنین کے لیے آزمائش ہے، جس کی قرآن حکیم نے بہت واضح الفاظ تشریح کردی ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ. (۱)

اس عقیدے کے رسوخ وپختگی کا منطقی اور لازمی نتیجہ رجوع الی اللہ، طمانیت قلب اور استغناء کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا۔ تا آنکہ اللہ کی طرف سے آنے والی سکینتِ قلب میں ہی تمام موجودہ پریشانیوں اور اضطراب انگیزیوں سے نجات کے رموز پوشیدہ و مستور ہیں، اس حقیقت کو مستحضر رکھا جائے کہ اصل پریشانیاں خارجی نہیں بلکہ اس کا تعلق داخلی کمزوریوں سے ہے جو مختلف صور واشکال میں منصۂ شہود پر ظاہر ہوتی ہیں، ارادے سے، کوشش سے، ریاضت سے، مجاہدے سے اس عقیدے کا رسوخ اپنے قلب و ذہن میں پختہ کرنے میں اگر آپ کامیاب ہوجائیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی حادثہ نہ تو آپ کو کوئی حقیقی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ آپ کے فکر وخیال کو مضطرب کرسکتا ہے۔ **ألا بذکر اللہ تطمئن القلوب.** (۱)

وما توفیقی إلاّ باللہ العلی العظیم

---

(۱) ترجمہ: بھلا کیا تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے مقصود پیدا کردیا اور تمہیں واپس ہمارے پاس نہیں لایا جائے گا۔ (سورۃ المومنون: ۱۱۵)

(۲) یادرکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ (سورۃ الرعد: ۲۸)

شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

(مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ اسماعیل پٹیل صاحبؒ)

اہل علم حضرات کی مجالس میں اکثر و بیشتر استعمال کیا جانے والے لفظ ’’ہشت پہلو اشخاص وافراد‘‘ سے کان مانوس تھے لیکن بچشم سر ایسے اشخاص کی زیارت وقربت کی آرزو اور تمنا خاموش دعاء کی صورت میں ہمیشہ دل میں موجزن رہتی تھی اور جب بھی اس جذبۂ دروں میں تموّج کی سی کیفیت ہوتی تو یہ آرزو یہ تمنا خاموشی کے قالب سے نکل کر ملفوظ دعاء کی صورت میں دل سے لبوں تک پہونچ جاتی اور میں دعاء کرتا تھا کہ حق تعالیٰ بہمہ صفات مطلوبہ جس کے سبب کسی مقرب بندے کے لئے بالقائے ربانی لوگوں کے قلوب واذہان میں ہشت پہلو صفات کی حامل شخصیت کا تصور بایں طور راسخ ہو جائے کہ یہ لفظ اپنے مکمل معانی سمیت اس شخصیت کا ایسا جزو لازم قرار پا جائے کہ اہل علم کے نزدیک اس کے بغیر تعارف ہی نامکمل ہو، حق تعالیٰ جل مجدہٗ ایسے شخص کی زیارت وقربت کا موقع عطاء فرمادیں جس کوان کے بیکراں خزانۂ عطاء سے یہ مقام بلند حاصل ہو، عالم تکوین کے فیصلوں کا اس عالم اسباب میں نفاذ کے لئے ایک وقت مقرر ہے جو کسی نہ کسی سبب سے مربوط ہوتا ہے اور میں ایسا سمجھتا ہوں کہ بارگاہ رب العزت میں کسی حسن عمل کی قبولیت کے نتیجہ میں یہ دعاء جو کہ ایک آرزو ایک تمنا اور ایک تڑپ کی صورت نہاں خانۂ دل کے

۞ برائے خصوصی شمارہ ندائے دارالعلوم وقف ’’مفکر ملت نمبر‘‘ (ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۸ء، جلد ۹، شمارہ: ۱۰۲)

خاکستر میں مدت مدید سے جگہ بنائے ہوئے تھی اس کی قبولیت و وقوع کے لئے ۲۰۱۴ء کا ہی وقت مقرر تھا جب کہ والد محترم و مکرم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی معیت اور محترم المقام جناب حضرت مولانا غلام محمد وستانوی صاحب دامت برکاتہم کی راہنمائی میں کاپودرہ کا سفر ہوا اور اس تاریخ ساز موقعہ پر مفکر ملّت رئیس العلماء فخر گجرات نمونۂ سلف مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ اسماعیل پٹیل صاحب کاپودری رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ سے بہ لحاظ قرب وانسیت پہلی مرتبہ بامعنی ملاقات ہوئی، اگرچہ اس سے قبل جدّ محترم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہ کے ہمراہ بطور رفیق سفر راندیر و سورت کا سفر ہوا اور یاد پڑتا ہے کہ اس موقعہ پر ملاقات بھی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے بعد بھی گجرات اور ملک کے دیگر مقامات اور مختلف مواقع پر راقم کو حضرت مفکر ملّت علیہ الرحمہ کی زیارت کا شرف حاصل تھا لیکن بوجہ متعارف وقربت سے محروم تھا، تا آں کہ ۲۰۱۴ء میں والد مکرم ومحترم رحمہ اللہ کی معیت ہوئی اس ملاقات میں شاید بہر دو اکابرین کی جانب سے تصرف باطنی کا اثر تھا یا اس پرنور مجلس کے دورانیہ میں بہر دو بزرگان امت کے درمیان نہایت بلند پایہ علمی گفتگو کی تاثیر تھی جس سے کہ علوم ومعارف کے جواہرات ونوادرات کا گویا تانتا بندھا ہوا تھا جو کہ ہم خوردوں کے لئے باعث استعجاب اور موجب اشتیاق تھا۔ کچھ ایسا سماں تھا جس سے قلب وذہن منور اور زاویۂ فکر ونظر میں وسعت پذیر جوش وخروش کے ساتھ قلب وذہن میں ایک تموج کی سی کیفیت موجزن تھی اور اس پر مستزاد حضرت مفکر ملّت رحمہ اللہ کے نورانی چہرے بشرے پر ایک نہایت دل آویز ہلکی سی مسکراہٹ گویا کہ بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (۱) کی ایسی واضح ترین مشاہداتی تفسیر کہ درون قلب بصوت تکوینی یہ گواہی سنائی دے رہی تھی کہ ہشت پہلو شخصیت کا لفظ ایسے ہی اہل علم وعمل کے لئے وضع ہوا ہے اور میرے نزدیک حضرت مفکر ملّت رحمہ اللہ ایسے ہی قافلۂ علم وعمل کے ایک

(۱) سورۃ الرعد: ۲۸

جاں نثار سالار کارواں تھے جن کو ذات حق جلّ مجدہ نے اپنی بارگاہ عزت سے سند قبولیت بایں طور عطاء فرمائی تھی کہ آثار علم وعمل کی جزئی جزئی کو گواہ بنا کر اپنے لامحدود خزانۂ عطاء سے علم وفہم ،شعور وآ گہی ، وسعت فکر ونظر ،حسن کردار وگفتار، گہری بصیرت، بہترین اوصاف، اعلیٰ اخلاق و اخلاص، سلیقۂ حسن عمل، تواضع و انکساری اور اکرام ضیوف جیسی بہت سی صفات حمیدہ سے متصف فرما کر ایسی سربلندی و مقام عظمت سے سرفراز فرمایا تھا کہ فکر وفہم رکھنے والوں کے لئے حضرت مفکر ملّت رحمہ اللہ کی شخصیت نمونۂ عمل بن گئی اور اس پر مستزاد بلا تفریق علاقائیت اور تعارف و شناسائی تمام مدارس اسلامیہ کے اساتذہ وطلباء کے لئے ہمہ وقت فکر مندی اور دل دردمند رکھنے والی شخصیت، ایک بلند پایہ مصنف ومحقق، مدبر ومنتظم ،غرض کہ بہمہ انواع اوصاف کی حامل ہشت پہلو شخصیت، بالفاظ مختصر یہ کہ بہر دو بندگان مقبولین کی اس نورانی مجلس کے اختتام تک حضرت مفکر ملّت رحمہ اللہ کی دلآویز اور پراثر وپرکشش شخصیت ان کے علوم ومعارف کا تبحر، دلکش اندازِ گفتگو اور ان کی بزرگانہ شفقتوں کا دل اسیر ہو چکا تھا اور یہ اوصاف اس طرز وشکل کے تھے جس کا نمونہ سلف صالحین کے حالات و واقعات سے اس طرح مطابقت رکھتا تھا گویا کہ اکابر واسلاف کی کتابوں کے مطالعہ کی روشنی میں اس کا مشاہداتی عکس، متحرک ومتکلم صورت میں نظروں کے سامنے ہو۔غرض کہ اس صحبت بافیض کے دورانیہ میں حضرت مفکر ملت رحمہ اللہ کی شخصیت ایک بلند پایہ باعمل عالم دین، عمیق النظر دانشور، صاحب بصیرت مفکر، اعلیٰ پائے کے مدبر ومحقق، بالغ نظر منتظم ، درویش صفت، منکسر المزاج اور تواضع پسند، سراپائے انس والفت اور مجسم محبت وشفقت کی حیثیت سے فکرو نظر پہ نقش ہو چکی تھی اور دل اس ہشت پہلو شخصیت کے فضل وکمال کا گرویدہ ہو چکا تھا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ دل بلا توقف عقل ودماغ اور قوت ادراک کو یہ پیغام دے رہا تھا کہ اگر علم وعمل کے اس چشمۂ صافی سے علمی استفادہ اور صحبت فیض حاصل نہ کر سکا تو یقیناً یہ تیرے حق میں حرماں نصیبی ہوگی پھر تو اس کے بعد موقعہ بہ موقعہ وقفے وقفے سے حضرت

مفکر ملتؒ کی زیارت وصحبت کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ کم وبیش اسی دورانیہ میں الٰہ آباد کا سفر ہوا اور عارف باللہ شیخ طریقت مخدوم گرامی حضرت مولانا شاہ قمرالزماں صاحب الٰہ آبادی ادام اللہ فیوضھم کی خدمت اقدس میں حضرت قبلہ والد محترم قدس سرہ کا مکتوب گرامی بہ سلسلۂ رکنیت برائے مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند لے کر حاضری کا شرف حاصل ہوا، اور دوران گفتگو بتایا کہ یہاں سے اسی غرض وغایت کے ساتھ کاپودرہ جانے کا عزم ہے حضرت والا دامت برکاتہم نے یہ جان کر نہ صرف بیحد خوشی ومسرت ہی کا اظہار فرمایا بلکہ اسی وقت حضرت مفکر ملتؒ سے فون پر بات کی اور اپنے بزرگانہ عالی مقام سے نہایت شفقت آمیز وقیع ترین کلمات سے راقم کی کاپودرہ آمد کا ذکر فرمایا اور بالخصوص بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ سے نسبی رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا میرا وجدان یہ گواہی دیتا ہے کہ اس وقت دارالعلوم وقف دیوبند کو عالم تکوین سے لے کر عالم ظاہر تک جو مقام عظمت اور عنداللہ قبولیت وعندالناس مقبولیت کا درجہ حاصل ہے وہ اس امر کی طرف مشیر ہے کہ موجود و رخصت شدہ اسلاف واکابر دیوبند کی تمام نسبتیں اس ادارہ میں مجتمع ہوگئی ہیں لہٰذا دارالعلوم وقف دیوبند کے ساتھ یہ وقیع انتساب روایات اکابر کی نشأۃ ثانیہ اور اس کے تحفظ کا محض عنوان ہی ہے بلکہ وجدان یہ کہتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ سے نسبت وقربت کے لحاظ سے اس ادارے کو عالم تکوین میں مقام عزت وعظمت کی سند قبولیت حاصل ہے، حضرت شیخ طریقت دامت برکاتہم العالی کے الفاظ کی تاثیر اور حضرت مفکر ملتؒ کے باطنی فیوض وبرکات کے زیر اثر مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند کی رکنیت کو حضرت نانوتویؒ کی نسبت وتعلق کے حوالے سے نہ صرف قبول ہی فرمایا بلکہ دارالعلوم وقف دیوبند اور اس کے بلند پایہ علمی و تعلیمی امور کے سبب ادارے سے ایسا والہانہ تعلق قائم ہوا کہ اس کے بعد مدۃ العمر سفر ہو کہ حضر، مجلس ہو کہ اجتماعات، اہل خاندان ہوں یا حضرتؒ کے پاس آنے والے واردین

وصادرین، موقعہ بہ موقعہ دارالعلوم وقف دیوبند کے بلند پایہ علمی کاموں کا بہت ہی وقیع ترین الفاظ میں تذکرہ فرماتے اور ہمہ وقت ادارے کی ظاہری ومعنوی ترقیات کے لئے کوشاں رہتے۔

دارالعلوم وقف دیوبند میں دارالقرآن کی پرشکوہ عمارت حضرت مفکر ملتؒ کی توجہات اور خصوصی مستجاب دعاؤں کا ہی ثمرہ ہے جس کی تکمیل کے لیے تادم رخصت فکرمند رہے، زیرتعمیر اطیب المساجد کی تکمیل اور ادارے کے مہمان خانہ کی تعمیر کے لئے بیحد متفکر اور دعاگو رہتے تھے اور ان دوضروریات ادارہ کے تقدم اور ترجیح کو بہت ہی اہمیت کے ساتھ ذکر فرماتے ہوئے ادارے کی دوسری اہم ترین ضرورت ایک نئے اور مجوزہ دارالاقامہ جدید کی تعمیر کا تذکرہ بہت اہمیت کے ساتھ فرماتے تھے۔

ادارے کے ساتھ حضرتؒ کے والہانہ تعلق کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وفات سے قریب ہفتہ عشرہ قبل جب کہ مرض کی شدت غالب آچکی تھی اور نوساری کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹروں کی انتہائی نگہداشت میں ظاہری تدابیر جاری تھیں اور بار بار غفلت کا طاری ہونا اہل خانہ ومعالجین کے لئے تشویش اور فکرمندی میں بتدریج اضافہ کا باعث بنا ہوا تھا اسی موقعہ پر عزیزم میاں محمد شکیب قاسمی سلمہ کا بغرض زیارت وعیادت گجرات کا سفر ہوا جیسے ہی غفلت کم ہوئی اور ان کے پہنچنے کی اطلاع ملی تو فوراً اپنے پاس بلایا اور دل موہ لینے والی شفقت سے ملاقات کے بعد ادارے کے احوال اور کنٹریکٹر کی جانب سے غفلت وکوتاہی کے سبب دارالقرآن کی ناقص فنشنگ اور دیگر ادھورے کاموں پر دوبارہ مجوزہ کام کے آغاز کے تعلق سے اظہار افسوس کے ساتھ دیگر علمی وتعلیمی اور انتظامی وتعمیراتی سرگرمیوں پر تفصیلی گفتگو اس طرح فرمائی کہ درمیان میں اگر غفلت طاری ہوجاتی تھی تو دوبارہ بیدار ہونے پر وہیں سے گفتگو کا آغاز فرماتے جہاں سے غفلت طاری ہونے کے سبب بات منقطع ہوئی تھی اور اس ذہنی استحضار پر حضرتؒ کی گرفت بہ عطائے خداوندی آخری لمحات تک باقی رہی، اسی سلسلۂ گفتگو کے دوران دارالقرآن کو دیکھنے کی شدید

خواہش کا اظہار کرتے ہوئے بصد شوق وحسرت اس آرزو اور تمنا کو بیان فرمایا کہ دعاء کریں کہ اگر زندگی کی کچھ مہلت باقی ہے تو حق تعالیٰ اتنے وقت کے لئے صحت و ہمت عطاء فرمادیں کہ میں دارالعلوم وقف اور اس میں بنے دارالقرآن کی زیارت کر آؤں۔

اسی استحضار ذہنی کا راقم نے بھی مشاہدہ کیا جب کہ وفات سے ٹھیک ایک روز قبل ۹؍ جولائی ۲۰۱۸ء کو طویل سفر سے واپسی کے معاً بعد بغرض زیارت وعیادت کاپودرہ حاضر ہوا، اس وقت اگرچہ آواز ساتھ چھوڑ چکی تھی اور اپنی بات اشاروں میں فرما رہے تھے، حضرتؒ کے لائق و فائق فرزند ارجمند حضرت مولانا اسماعیل عبداللہ پٹیل صاحب کاپودروی نے حضرتؒ کو راقم کے آنے کی اطلاع دی، فوراً طلب فرمالیا اور بوقت ملاقات چہرے پر غایت درجہ بشاشت، لبوں پر نہایت دل آویز مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کی غیر معمولی چمک ان کیفیات کو میں نے ہی نہیں بلکہ وہاں پر موجود تمام ہی حاضرین نے بہت ہی واضح انداز میں محسوس کیا، راقم نے دست بوسی کے لئے حضرتؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو دیر تک انتہائی شفقت کے ساتھ دباتے رہے اور اشاروں سے فرمایا کہ دعاء کیجئے، قلب و دماغ مضطرب اور آنکھیں اشکبار، یہ آخری ملاقات تھی، ہسپتال لے جانے کی تیاری ہے، ایمبولینس دروازے پر آچکی ہے، تمام اہل خانہ و متعلقین سرگرداں و پریشان، دلوں کی دھڑکنیں لمحہ بہ لمحہ اس خوف و ہراس میں تیز سے تیز تر ہو رہی ہیں کہ نہ جانے کب دم آخر ہو جائے لیکن اس کیفیت اور صورت حال میں بھی ذہنی استحضار کا یہ عالم کہ ہسپتال لے جانے کے لئے اسٹریچر پر لٹایا جارہا ہے، برادر مکرم جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب سے اشاراتی زبان میں راقم کے بارے میں دریافت فرما رہے ہیں کہ ناشتہ ہوا کہ نہیں، پروگرام کیا ہے؟ کھانے کا نظم کیا ہے؟ ائیر پورٹ کون جائے گا؟ اللہ اکبر! مولانا نے جواب میں فرمایا کہ آپ بالکل مطمئن رہیے گا، جناب حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی ناظم مدرسہ ماٹلی والا مولانا کے ساتھ ہیں۔

غرض کہ حالات وواقعات کا ایک تسلسل ہے، اگر تفصیل کے ساتھ واقعات کا ذکر

کیا جائے تو یہ چند صفحات ہرگز اس کے متحمل نہیں ہوسکتے ہیں، اگرچہ جی یہی چاہتا ہے کہ تمام واقعات اور احوال کو بالتفصیل ذکر کیا جائے لیکن اس وقت نہ تو وقت میں گنجائش ہے اور نہ ہی دارالعلوم وقف دیوبند کے ماہنامہ اردو ترجمان ''ندائے دارالعلوم'' کے زیر نظر مفکر ملتؒ نمبر کی ضخامت اس کی اجازت دے رہی ہے، البتہ چند اجزاء کا بالاختصار ذکر نا گزیر ہے۔

ایک موقع پر راقم السطور نے بغرض شرف زیارت حاضری کے لئے اجازت چاہی، بزرگانہ مقام عظمت سے فرمایا کہ آپ کا آنا باعث سعادت اور حاضری میرے لئے موجب مسرت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند نسبت عطا فرمائی ہے، آپ کے لئے دل و دماغ اور گھر کے دروازے بلا قید وقت بہر لحظہ و لمحہ آج بھی کھلے ہوئے ہیں اور میرے جانے کے بعد بھی ہمیشہ اسی طرح کھلے رہیں گے، کبھی بھی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ آج حضرت مولانا شیخ محمد حنیف صاحب لوہاروی دامت برکاتہم شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ و رکن مؤقر مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند نے بندے کی خواہش پر گجرات مدارس کے اساتذہ وطلباء کا ایک اہم اجلاس طلب کیا ہے اور اتفاق سے وہی وقت آپ کے پہنچنے کا بھی ہے، بہت ہی اچھا ہو کہ آپ پہلے کھروڈ آجائیں تاکہ آپ کی بھی اس اہم اجلاس میں شرکت ہو جائے اور کچھ بیان بھی ہو جائے، اس اجلاس کے انعقاد کا موقعہ و موضوع دراصل حضرت مفکر ملتؒ کا مدارس اسلامیہ اور اس کے اساتذہ وطلبا کے تعلق سے ایک خاص پس منظر میں فکرمندی سے تھا، یہ بات قابل ذکر و اتباع ہے کہ حضرتؒ نے اس متاع حیات کو ہمیشہ بایں طور عبادت سمجھ کر گذارا ہے کہ اُس کا ایک ایک لمحہ و لحظہ بے ہوش نہیں باہوش تھا، از پاکیزہ خلوت تا متبرک جلوت، حضرت کی زندگی عبادِ اتی تمثیل سے ہی عبارت تھی کیونکہ وہ ایک عالم باعمل تھے، ان کے نزدیک علم محض جانکاری کا نام نہیں بلکہ عملی استواری کا نام علم تھا، محض کتابی علم تطہیر باطن کا ذریعہ نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ علم و عمل میں عدل و توازن قائم نہ ہو، اگرچہ کسی کا علمی مقام و مرتبہ

دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اور حضرت رحمہ اللہ کا وجود مسعود اسی عدل وتوازن کا تمثیلی پیکر تھا۔

جامعہ قاسمیہ کھروڈ کے اس تاریخی اجلاس میں حضرت مفکر ملتؒ نے بہت دل سوزی کے ساتھ تاریخ ساز بیان کرتے ہوئے اساتذہ وطلباء کو نصیحت فرمائی کہ اسلام کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا ہے جس میں کہ اس کے سامنے چیلنجز پیش نہ آئے ہوں اور بیدار مغز اہل علم وعمل نے سر بہ کف توکل علی اللہ کی مضبوط ترین بنیادوں پر موقعہ ومحل کے حسب حال پیش آمدہ حالات کا مقابلہ کر کے عوام الناس کے قلوب میں ہمت وحوصلوں کے چراغ روشن نہ کئے ہوں اس قائدانہ وصف کا بقائے مستمر ہی دراصل مدارس کی روح ہے اور نفسیاتی اصول کے مطابق بھی مایوسانہ فکر وعمل سے کبھی بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے ہیں لہٰذا اسلام کو درپیش موجودہ شدید معاندانہ روش سے نتیجہ خیز مقابلے کے لئے علمی وفکری اور عملی سطح پر بصیرت وحکمت کے ساتھ، ذہنی بلندی، ہمت وحوصلہ اور حکمت عملی کے علی الرغم بہمہ جہت کردار کی مضبوطی کی شدید ضرورت ہے، اس کو تقویت بہم پہنچانے کے لئے اپنے اکابرواسلاف کی حیات وخدمات کا بالاستیعاب مطالعہ اور اس کو اپنی عملی زندگی کا جزو لازم بنانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اساتذہ کے لئے لازم ہے کہ اپنے اکابرواسلاف کے حیات بخش کارناموں کو طلباء کے گوش گزار کریں اور انہیں بتائیں کہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اپنے دور کے امام المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین اور اس تابندہ ودرخشاں کہکشانی سلسلے کے دیگر تمام آفتاب و ماہتاب حضرات نے کس قسم کے مایوس کن اور انتہائی شدید وحوصلہ شکن احوال میں اسلام

کی سربلندی کے لئے کس ایثار و اخلاص اور جانفشانی اور ہمت و حوصلے کے ساتھ جاں گسل حالات کا سامنا کیا جس کے حیات بخش نتائج صدیوں کو محیط ہیں، یہ حضرات بھی انہیں مدارس کے پروردہ تھے، میرے نزدیک درپیش احوال کے سامنے اہل علم اور خصوصاً اہل مدارس کے لئے مایوسانہ فکر وعمل اور جمود و تعطل کا کوئی جواز نہیں ہے اگر کوئی کمی ہے تو محض اپنے اکابرین کے عظیم الشان علم وعمل سے ناواقفیت اور عدم توازن کی ہے۔ لٰہذا اس تجزیہ کے تناظر میں تمام اہل علم کے لئے بالعموم اور ارباب مدارس کے لئے بالخصوص اکابر و اسلاف کی حیات و خدمات کا ناقدانہ نہیں بلکہ منصفانہ اثبات فکر کے ساتھ مطالعہ و عمل ناگزیر بھی ہے اور ذمہ داری بھی ہے۔

بالفاظ مختصر یہ کہ حضرت مفکر ملتؒ عہد حاضر کے ہم آہنگ تقاضوں کے مطابق ذات حق جل مجدہ کی طرف سے اس دور کے ایسے نقیب و منّاد مقرر فرمائے گئے تھے جنہوں نے جو کچھ اپنے بزرگوں کے طرز عمل کو دیکھا سنا پڑھا اور سمجھا اس کو اپنے وقت کی آواز میں ڈھال کر دور رواں کے اسلوب فہم و تفہیم اور استعارہ و اصطلاحات میں منتقل کر کے **کلّموا الناس علی قدر عقولھم** کے اصول کے مطابق اپنے سے اگلی نسلوں کی راہنمائی کا فریضہ مدۃ العمر انجام دیا اور یہی وہ مابہ الامتیاز اوصاف تھے جس کے سبب حضرتؒ کو اہل علم اور عوام الناس میں یکساں طور پر قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، آج بے شک جسم و جان اور متحرک و متکلم صورت میں حضرتؒ ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہیں اور اتنی دور جا چکے ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا لیکن اپنے علم وعمل اور ورع و تقویٰ کے حیات بخش نقوش کی صورت میں اپنے تلامذہ کی شکل میں اپنے افکار و معارف کے پیرائے میں اور اپنی بااصول طرز حیات اور بود و باش کے آئینے میں اپنی بیش بہا اور قیمتی ترین تصانیف و ملفوظات کے قالب میں ہمارے قلوب و اذہان میں تابندہ و پائندہ ہیں اور ان شاء اللہ صدیوں اور نسلوں تک باقی رہیں گے۔

انہی یادگار باقیات کے تسلسل کے ذیل میں حضرت مفکر ملتؒ کا ایک قیمتی ترین

سرمایہ وہ کتب خانہ بھی ہے جس میں بقول شخصے کہ:

جمع کیا ہے جگر لخت لخت کو

جو کہ ایک بیش قیمت خزانے سے کم نہیں ہے، حضرتؒ کی خواہش تھی کہ اس بیش قیمت کتب خانے کو رفاہ عام کے پیش نظر بایں طور محفوظ کردیا جائے جہاں اہل علم کے لئے رسائی بھی آسان ہو اور آمد و رفت بھی کثرت سے ہو، چناں چہ اس غرض وغایت کی قرار واقعی تکمیل کے لئے حضرتؒ کی نظر انتخاب جامعہ قاسمیہ کھروڈ پر ٹھہری جو کہ حضرتؒ کی رہائش سے بھی نزدیک ہے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ حضرت مولانا شیخ محمد حنیف صاحب لوھاروی دامت برکاتہم العالیہ مؤقر رکن مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند نے اپنے بلند علمی مقام سے اس گوہر نایاب کی صحیح جہت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس قیمتی ترین علمی سرمائے کو ادارہ کی عام لائبریری میں محفوظ نہیں کیا بلکہ حضرت مفکر ملتؒ کی یادگار میں ایک ریسرچ اکیڈمی قائم کی اور اس کے لئے ایک مستقل پرشکوہ و دیدہ زیب عمارت تعمیر کرائی جس میں بحث و تحقیق کا کام کرنے والے اہل علم حضرات کی جملہ ضروریات کا بھرپور خیال رکھا گیا، اکیڈمی کی عمارت سے ملحق نہایت آرام دہ مہمان خانہ ہے، اکیڈمی کی لائبریری کو جدید انداز میں منظم کیا گیا ہے، بلاشبہ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کا یہ اقدام نہایت لائق ستائش اور قابل استفادہ ہے، حضرتؒ کے پاس جو بھی متنوع علوم وفنون کے دلدادہ صاحبان علم تشریف لاتے، حضرتؒ ان کو اکیڈمی کی زیارت کی ضرورتاکید وترغیب فرماتے تھے۔

حضرت مفکر ملتؒ کی حیات سے وابستہ مختلف النوع واقعات کا ایک طویل تسلسل ہے اور ہر واقعہ ایک مستقل مضمون کا عنوان ہے چنانچہ اس حقیقت واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت مفکر ملتؒ کی حیات و خدمات کی مختلف جہات کے تفصیلی تذکرے کو دستاویزاتی صورت میں آنے والی نسلوں کے لئے بطور نقوش حیات خزینۂ تاریخ میں

محفوظ کردینے کی غرض سے دارالعلوم وقف دیوبند نے سال رواں ۱۴۴۰ھ کے ماہ جمادی الثانی میں حضرت مفکر ملّت کی حیات وخدمات پر ایک سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے جس میں یقین ہے کہ حضرت مفکر ملتؒ کی مجالس علم وعمل اور درس وتدریس کے فیض یافتہ صاحبان علم کے تجربات، مشاہدات، تأثرات، واقعات کو مدون کرکے ایک نہایت بیش قیمت دستاویز کی شکل میں انشاء اللہ تعالیٰ منصۂ مشہود پر لانے کا عزم وقصد ہے، حق تعالیٰ مساعد احوال کے زیر اثر اس تاریخ ساز عزم کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں، حضرتؒ سے وابستہ اہل علم وقلم حضرات سے خصوصیت کے ساتھ درخواست ہے کہ اس مجوزہ سیمینار کے تعلق سے دارالعلوم وقف دیوبند کے ساتھ علمی وقلمی معاونت فرمائیں، تاکہ ادارہ کی جانب سے اس فرضِ کفایہ کی ادائیگی میں آپ کی حصہ داری کو بھی تاریخ ہمیشہ کے لئے محفوظ کردے۔

آخر میں راقم السطور اپنی طرف سے اور جماعت علمائے دارالعلوم وقف دیوبند کی جانب سے مفکر ملّتؒ کے تمام اہل خاندان کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے، بالخصوص برادران مکرم ومحترم جناب مولانا اسماعیل عبداللہ پٹیل صاحب جنہوں نے اپنے آپ کو حضرتؒ کی خدمت وراحت کے لئے وقف کرکے دارین کی ابدی سعادت کو اپنے نام کرلیا ہے، بلاشبہ یہ عظیم ترین حسنِ عمل موجودہ نسل کے لئے ایک روشن مثال اور حاصلِ سبق ہے دوسرے لندن میں مقیم محترم ومکرم جناب حافظ ابراہیم عبداللہ پٹیل صاحب جو کہ دیارِ غیر میں اپنے والد مرحوم ومغفور کی روایات کے امین بھی ہیں اور اس کے علم بردار بھی ہیں، جب جب ملاقات ہوتی ان میں محبت وانسیت اور ادارے سے والہانہ تعلق میں حضرتؒ کی جھلک پاتا ہوں۔ دعاء ہے کہ حق تعالیٰ تمام اہل خانہ کو حضرت مفکر ملّت رحمہ اللہ کی ہمہ نوع روایات کا ہمیشہ امین بنائے رکھیں۔ آمین یارب العالمین

وما علینا إلّا البلاغ المبین

ایک مردخوش خصال وخوش خو

(حضرت مولانا غلام نبی صاحب کشمیری)

آج سے قریب ڈیڑھ دو سال قبل کی بات ہے، معمول حیات کی روز مرہ مصروفیات سرانجام دینے کے لیے دفتر اہتمام میں صبح سویرے حاضر ہوا، معمول کے مطابق روز مرہ کے پیش کیئے جانے والے دفتری کاغذات میں سب سے اوپر حضرت مولانا غلام نبی صاحب کشمیری رحمہ اللہ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کی درخواست رخصت کو پایا، جس میں انہوں نے اپنی علالت کا ذکر کرتے ہوئے بہ غرض علاج بمبئی جانے کی اجازت چاہی تھی، اس وقت شاید اس جانب ذہن بھی مبذول نہ ہوتا کیونکہ یہ معمول کے کاموں کا حصہ تھا، لیکن درخواست کی آخری لائن نے اچانک غیر محسوس انداز میں ذہن پر تشویش کی دستک دی، جس میں غالباً کچھ اس طرح کی عبارت تھی کہ غیر حاضری کے دورانیہ میں طلبہ کے اسباق کا حرج نہ ہو اس لیے مناسب ہوگا کہ کسی متبادل نظم پر غور کرلیا جائے کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مدت علالت دراز ہو جائے، درخواست کے اسلوب بیان اور اسکے بین السطور میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو کہیں نہ کہیں ظاہر کر رہی تھی کہ اخفائے راز کی کوشش کے باوجود کہیں کچھ گڑبڑ ہے، سب کچھ ٹھیک نہیں ہے، دل میں یہ غیر محسوس انقباض کی سی کیفیت خواہ مخواہ نہیں تھی، وقت گذرتا گیا، بات ذہن سے محو ہوگئی، اور پھر انجام کار وہ مہین سا خیال تشویش جو ذہن کے لاشعوری حصہ میں کسی جگہ موجود تھا، ایک دن اچانک حقیقت واقعہ بن کر سامنے آگیا جبکہ ایک روز صبح میں برادرم جناب مولانا

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۹ء، جنوری ۲۰۲۰ء، جلد: ۱۱، شمارہ: ۱۱۸)

عبداللہ ابن القمر الحسینی صاحب ناظم شعبہ نشر و اشاعت کا فون موصول ہوا، انہوں نے اطلاع دی کہ مولاناؒ کو بمبئی کے سائی ہسپتال چیمبور میں داخل کیا گیا ہے، جہاں ڈاکٹروں نے طبی معائنوں کے نتائج کی روشنی میں کینسر کی مہلک ترین بیماری تجویز کرتے ہوئے تشویش ظاہر کی ہے کہ بیماری اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، جیسا کہ اس موذی مرض کا سنتے بھی ہیں کہ اس کا پتہ ہی اس وقت چلتا ہے جبکہ علاج دشوار ہو چکا ہوتا ہے، نیز اسی حوالے سے ظاہری اسباب کے تناظر میں اس موذی اور جان لیوا مرض کا دوسرا عنوان مایوسی وتشویش کی صورت میں ذہن پر مرتب ہوتا ہے اور واقعتاً ہوا بھی ایسا ہی کہ دن ہفتے اور مہینے گذرتے رہے اور مولاناؒ روز بروز ضعف واضمحلال اور کمزوری قویٰ میں اضافے کے ساتھ دھیمے دھیمے بتدریج اپنی آخری منزل کی جانب قدم بہ قدم بڑھتے رہے اور مآل کار مورخہ ۹/ ربیع الاول ۱۴۴۱ھ مطابق ۷/نومبر ۲۰۱۹ء بروز جمعرات صبح فرشتۂ اجل وقت موعود کی خبر لے کر آ پہنچا اور دست قضا نے صبح چھ بجکر پچاس منٹ پر دہلی کے ڈوائن ہسپتال میں زیر علاج مریض ناتواں کی حیات عارضی پر دستک دیتے ہوئے دائمی افاقۂ مرض کی مومنانہ نوید سنائی کہ لمحہ بہ لمحہ رو بہ زوال اس عالم فناء کی ظاہری رنگینیاں چھوڑ مہلت حیات تمام ہوئی، رحمت حق حیات جاودانی بخشنے کے لیے منتظر ہے، فرستادہ موت کی اس صدائے بازگشت پر معبود برحق کی بارگاہ عالی میں بصد شوق مومن نے لبیک کہا اور اپنی جان جان آفریں کو سپرد کرتے ہوئے مولانا کشمیریؒ آسودۂ رحمت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سب کے سب ہیں رہ رو کوئے فنا
جا رہا ہے ہر کوئی سوئے فنا
بہہ رہی ہے ہر طرف جوئے فنا
آتی ہے ہر چیز سے بوئے فنا

حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ اس عالم باد و خاک کی صفحہ ہستی پر نہ جانے کتنی ہی نابغۂ روزگار اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہستیاں جلوہ افروز ہوئیں اور رخصت ہوگئیں اور

ایسے ہی نہ جانے کتنے بندگان مقبولین ہیں جو پردۂ اخفا میں مستور و پوشیدہ بتوفیق حق جل مجدہ اس کارگاہ عالم میں اپنی مہلت حیات کو بکار آید بنانے میں مصروف عمل ہونگے اور ان کے اعمال پر قبولیت حق کا ترتب ہورہا ہوگا، جس کا علم خدائے لم یزل کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ہے کہ کس کا کون سا حسن عمل اس کے لیے رحمت رب ذوالکرم کی توجہات و التفات کے ارتکاز کا سبب بن رہا ہے جو کہ ہماری ظاہر بین نگاہ خام اور محدود تر شعور و ادراک سے مستور ہے، بعد از مرگ پس پردہ جانے والے کے محاسن کی جانب قلوب کا التفات واقعاتی صورت میں زبان خلق پر جاری کر دیا جانا ہی اپنے آپ میں حق تعالیٰ جل مجدہ کی جانب سے اعلان قبولیت ہے کہ ہم اپنے فرمانبردار اور مقبول بندوں کو اس طرح بھی اپنے انعامات سے نوازتے ہیں کہ اسکے پوشیدہ محاسن کو بندگان خدا کے قلوب پر القا کر کے اپنی بارگاہ میں اسکی قبولیت کو عام کر دیتے ہیں، جس کو قرآن کریم اپنے کلام معجز میں لَاتَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَةِ اللّٰه (۱) سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ اس زاویۂ فکر ونظر کے تناظر میں مولانا کشمیریؒ کی شخصیت آخرت میں مدارج و مراتب کی بلندیوں کے ساتھ مزید دلکش نظر آتی ہے۔حق تعالیٰ مرحوم و مغفور کو اعلیٰ علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرمائیں۔آمین

دل لگتی بات بھی یہ ہی ہے کہ مولانا کشمیریؒ کی مرنجا مرنج شخصیت مجسم اخلاق حمیدہ سے مزین تھی، اکابر ہوں یا اصاغر، قرابت دار ہوں کہ اغیار، معاصرین ہوں کہ ہم نشین، ہر کوئی بخوبی محسوس کرسکتا تھا کہ چہرے بشرے کا دلآویز تبسم گویا کہ شخصیت کی ایک ایسی امتیازی شناخت تھی کہ چشم تصور میں بھی تبسم آمیز چہرے کے ماسوا کوئی دوسری صورت متشکل ہوکر دکھائی نہیں دیتی تھی، ان کی شخصیت میں پائے جانے والے وہ اوصاف جن سے کہ ان کی فردیت کا امتیاز قائم تھا ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو نقشہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ زندہ دلی اور خندہ جبینی قلب کے اطمینان اور روح کے انبساط کا پتہ دیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے گردش دوراں کے تمام غم و آلام سے بے نیاز ہیں، عام ہم نشین و

(۱) ترجمہ: اللہ کی رحمت سے مایوں نہ ہو۔ (سورۃ الزمر:۵۳)

معاصرین پر کسی کو بھی اپنی پریشانیوں یا پشیمانیوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، بلکہ اس کو خودداری کی ردا سے ڈھانپے رکھتے تھے، البتہ بے تکلف حلقۂ احباب کے رمز شناس ان کی ازحد داخلی وخارجی الجھنوں سے بھی واقف تھے اور علی حسب حال ازالہ وتعاون کی راہیں بھی ڈھونڈتے تھے۔

ارباب علم وآگہی اس واقعاتی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ علم کی اثر پذیری اور تاثیر کا براہ راست تعلق حلم سے ہے، علم وحلم کے اس باہمی ارتباط کے جو خوشگوار اور مثمر نتائج برآمد ہوتے ہیں اسکا ادراک وشعور بھی اسی کو حاصل ہوتا ہے جو کہ ان بہر دو صفات کی قرار واقعی اہمیت اور ماہیت کو جانتا اور پہچانتا ہو، مولاناؒ کے فکر وخیال اور طبیعت و مزاج میں ان دونوں صفات کا بہترین امتزاج پایا جاتا تھا، اس کا مجھے بارہا تجربہ ہوا کہ جب کبھی بھی مولاناؒ سے ہم نشینی کا موقعہ ہوتا تھا تو زیر بحث موضوع پر ان کا معتدل تبصرہ جہاں ایک طرف ان کے حلم کا عکاس ہوتا تھا وہیں خارجی مطالعہ کی وسعت کا بھی پتہ دینے کے ساتھ ساتھ احساس علم کی طمطراقیوں کے اظہار کے اسیر اہل علم پر ان کا ناقدانہ مدلّل ومتوازن اور محتاط تبصرہ بھی ان کی گفتگو میں اکثر دلچسپی کا محور ہوتا تھا، جس میں کسی کی غیبت کے عنصر قبیح کی بو دور دور تک بھی محسوس نہیں ہوتی تھی، ان کی فردیت کے اجزائے ترکیبی میں ان کی زعم تقویٰ سے خالی متقیانہ طرز زندگی کو بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تقویٰ کی حقیقت کے حوالے سے استفسار کے جواب میں مستفتی کے سینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ إن التقوىٰ ھاھنا، جسکا حاصل یہ کہ تقویٰ تو دراصل قلب کے خشوع وخضوع اور انابت الی اللہ کی کیفیت کا نام ہے، اسکے اظہار کا تعلق نہ تو لباس وپوشاک سے اور نہ ہی انسان کے ظواہر کی علامت یا اسکی کسی طرز ادا سے ہے بلکہ دل کی اس خاص کیفیت کو جاننے والی بھی صرف وہی ذات بابرکت ہے جو اپنے فضل واحسان سے جس کو چاہے اس دولت عظیم سے نواز دیتے ہیں، میرا وجدان یہ کہ ہے حق تعالیٰ نے اس دولتِ عظمیٰ سے بھی ان کو

وافر حصہ عطا فرمایا تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد سے بجز عرصۂ قلیل مدت العمر دار العلوم وقف دیوبند میں تدریسی خدمات سے وابستہ رہے، انداز درس وتدریس کے حوالے سے طلباء میں ایک مقبول استاذ کی حیثیت بھی ان کے امتیازی اوصاف کا ایک قابل ذکر حصہ تھا، اتالیقی رعب داب سے عاری طلبا کے ساتھ دوستانہ انداز گفتگو اور مشفقانہ و ہمدردانہ روش کے علاوہ دوران تدریس خواہ اس کا تعلق درس حدیث سے ہو، عقائد وفقہ سے ہو یا تفسیر واصول سے ہو، نقلی دلائل کے علی الرغم جدید معاصر علوم سے بھی حسب موقعہ عقلی براہین سے استنباط وتطبیقات بھی ان کے ہمہ جہت خارجی مطالعہ کی عادات کے ساتھ فکری وسعت کو بھی ظاہر کرتی تھی، گویا یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ تحقیق کا زعم نہ علمی طنطنہ کا بیجا اظہار، طلباء میں درس کی مقبولیت کے یہی اجزائے ترکیبی تھے۔

بہرحال یہ ایک ناقابل تردید اور آفتاب و ماہتاب کی نورانیت سے زیادہ روشن تر حقیقت ہے کہ سلسلہ موت وحیات اور بقا وفنا تمام عوالم اور بلا تخصیص اس میں بسنے والی مخلوقات کی خاصیات کا حصہ ہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَام. (۱) بقا اور دوام تو صرف اسی ذات واجب الوجود کے لیے ہے جسکی توجہات سے موجودات عالم میں حیات بخش توانائیاں کارفرما ہیں ورنہ تو ہم کیا اور ہماری زندگی کیا بس ایک سانس کا ہی تو فاصلہ ہے جب تک چل رہی تو یہ جہاں رک گئی تو وہ جہاں، لیجئے ہوگیا قصہ تمام۔

آخر میں دعاء ہے کہ حق تعالیٰ حضرت مولانا غلام نبی صاحب کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرماتے ہوئے ترقی درجات سے سرفراز فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

---

(۱) ترجمہ: اس زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے اور (صرف) تمہارے پروردگار جلال والی فضل وکرم والی ذات باقی رہے گی۔ (سورۃ الرحمٰن: ۲۷،۲۶)

ایک معتدل مزاج شخصیت

(حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانیؒ)

یہ ایک ایسا امر واقعہ ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کے شک وشبہ کی کوئی ادنیٰ درجہ کی بھی گنجائش موجود نہیں ہے کہ اس عالم باد وخاک میں آنا گویا کہ عالم برزخ کی راہ سے آخرت کی جانب رخت سفر باندھنے کی تمہید ہے، اس عالم فنا کا پہلا سانس عالم بقا کی جانب پہلا قدم ہے، کیونکہ اس عالم جوئے فنا میں آنے والے ہر ذی نفس کو انجام کار وقت معین آجانے پر ایک لمحہ ولحظہ کی معمولی ترین تقدیم وتاخیر کے بغیر مآل کار وادئ اجل کا مسافر بننا ذات حق جل مجدہ کا ایک ایسا اٹل اور ناقابل تبدیل وترمیم قانون ہے جس سے کسی بھی ذی روح کو نہ کوئی راہِ فرار ہے اور نہ ہی کسی کے لیے کوئی امتیاز، نہ ہی کسی کے لیے کوئی رعایت ہے، اور نہ کسی کے لیے کوئی انفرادیت، صرف چند لمحات کے لیے فکر وخیال، جذبات وآلام سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو الگ کر کے اور اس دنیا کی تمام آسائشوں اور آلائشوں سے ذہن کو بالکلیہ صاف کرتے ہوئے گویا بالکل مخلّی بالطبع ہو کر اگر غور کریں تو اس حقیقت کے ادراک میں کسی بھی ذی شعور انسان کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی وقت نہیں لگے گا کہ اس عالم فنا کے نظر فریب اسٹیج پر جن بادشاہوں اور شہنشاہوں نے اپنے جاہ وجلال کے جلوے دکھائے، خواہ وہ طاقت اور رعونت وغرور کے پیکر رہے ہوں یا سراپا رحم وکرم کی مثال وہ سب بھی چل بسے، وہ بھی نہ رہے جنھوں نے

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ مطابق جنوری ۲۰۲۰ء، جلد:۱۱، شمارہ:۱۱۹)

اس دنیا کو ہی منتہائے مقصود جان کر اسکی زیبائش و آرائش میں اپنی عمریں صرف کر دیں، وہ اصحاب فضل وکمال اور مرجع خلائق علمائے ربانیین اور بارگاہ ایزدی کے عرفائے مقربین جن سے استفادہ اور کسب فیض کے لیے ایک دنیا ان کے علم وعمل سے متأثر ہوکر کشاں کشاں مقناطیسی کشش کی مانند ان کے دامن فیض سے سعادتیں اور برکات کے حصول کی تمنائیں اور آرزوئیں دل میں لیے ان کی جانب کھنچی چلی آتی تھی وہ بھی وقت موعود آجانے پر رخت سفر باندھ کر اس دنیا کو چھوڑ گئے، حتیٰ کہ روئے زمین کا وہ باعظمت ترین سرچشمۂ عزت وتعظیم طبقہ جن کو ذات حق جلّ مجدہ کی جانب سے انبیاء ورسل کے مناصب جلیلہ پر فائز فرما کر دنیا کی اقوام وملل کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنایا گیا تھا جن سے ملائک بھی مصافحہ کرنے میں فخر وافتخار کرتے تھے وہ بھی باقی نہ رہے، تا آنکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام جنکی ذات اقدس اس بساط کائنات کے بچھائے جانے کی علّت اصل ہے انہیں بھی رفیق اعلیٰ سے ملاقات اور ان کی بارگاہ عالی میں حاضری کے لیے اسی راہ اجل سے گذرنا پڑا ہے۔ الغرض موت سے کسی کو بھی تو مفر نہیں ہے، منبع انوار آفتاب و ماہتاب کی ضیا پاش حقیقت سے ہزاروں گنا زیادہ آشکارا موت جس سے کہ از روئے کلام اللہ: وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِب وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (۱) جسکا حاصل بھی یہ ہی ہے کہ اس دنیا کی عارضی زندگی جو کہ تعلق باللہ سے خالی وعاری ہو اسکی اسکے سوا اور کوئی حقیقت اللہ کے نزدیک نہیں ہے کہ وہ فانی خواہشات کے بہلانے کا محض ایک کھیل اور ایک ذریعہ ہے، اصل اور دائمی زندگی تو آخرت کی ہی زندگی ہے کاش کہ وہ جانتے اور اس حقیقت میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ عالم دنیا کی موجودہ عارضی زندگی کی بھی تمام تر رعنائیاں موت سے ہی عبارت ہیں ع

نہ ہو مرنا تو پھر جینے کا مزا کیا

---

(۱) ترجمہ: اور یہ دنیوی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ دار آخرت ہی اصل زندگی ہے، اگر یہ لوگ جانتے ہوتے۔ (سورۃ العنکبوت: ٦٤)

اور یہ ایک ایسی روشن تر سچائی ہے جس کا ہم روز بچشم سر نظارہ کرتے ہیں، اسی امر واقعہ کا بادیدہ نم مشاہدہ اس وقت ہوا جبکہ ۵/دسمبر۲۰۱۹ء بروز جمعرات صبح سویرے اچانک ایک جاں سوز اور المناک خبر نے فکر وخیال میں ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کردی، خبر آئی کہ نمونۂ سلف، عالم باعمل، فقیہ ومفسر، متنوع مضامین پر مشتمل ایک قابل ذکر تعداد میں کتابوں کے مصنف ومؤلف، افتاء وفتاویٰ کی ایک معتبر ترین شخصیت، دیوبند کے خاندان شیوخ عثمانی کے مربی وسرپرست اور بزرگان امت کی لائق قدر نسبتوں کے امین جناب حضرت مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب رحمہ اللہ صدر مفتی ورکن رکین مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند ایک طویل اور صبر آزما علالت سے اپنی قوت ایمانی کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے مآل کار وقت موعود آجانے پر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے آسودۂ رحمت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس صاعقہ صفت خبر نے قضا وقدر کی آشکارا حقیقت کے باوصف گویا چند منٹوں کے لیے قلب ودماغ پر جیسے کہ ایک سکتہ سا طاری کردیا ہو، موت کی صداقت کے علی الرغم نگاہیں کسی ایسے شخص کی متلاشی تھیں جو اس خبر کی تردید کردے مگر اس سچائی سے روگردانی کی تمنا ایسی ہی تھی جیسے کوئی عین نصف النہار کے وقت رات کی لاحاصل توقع کرے، اس خبر کے ساتھ ہی لمحوں اور لحظوں میں درالعلوم وقف کا ماحول غم انگیزی میں تبدیل ہوگیا، اور مرحوم ومغفور کے لیے آیت کریمہ کا ورد، ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا سلسلہ جاری ہوگیا، موت کی سچائی اور جلوہ نمائی نے جب بشری فطرت پر پڑے غفلت کے پردے کچھ دیر کے لیے چاک کیے اور صداقت وحقیقت نمائی سے سامنا ہوا تو دل سے دبی دبی ایک صدائے بے آواز سنائی دی کہ یہ عالم رنگ وبو اور ہمارے اطراف میں ہر چہار جانب بکھری ہوئی یہ غفلت انگیز چمک دمک، یہ حیات عارضی اور یہ رونقیں محض ایک جلوۂ سراب ہے، قلب ونظر کو خیرہ کردینے والے شان وشکوہ کے یہ قصر زرنگار، افکار ونظریات میں زلزلہ بپا کردینے والے یہ مال ودولت کے انبار جس کو غافل انسان نے

منتہائے مقصود قرار دیکر اپنی عاقبت کو فراموش کر دیا وہ محض ایک مرقع عبرت، افسانۂ حسرت اور آئینۂ حیرت کے ماسوا کچھ بھی تو نہیں ہے، اس حقیقت کا ہمہ وقت استحضار ہی دراصل ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہے، مرحوم ومغفور کے دینی وایمانی، ذہنی وفکری استحضار کے مدۃ العمر مختلف مواقع پر حیرت انگیز مشاہدات تو ہوتے ہی رہتے تھے، گفتگو کا موضوع ومحور کوئی بھی ہو لیکن درمیان درمیان میں موصوفؒ کے غیر محسوس انداز میں مختصر مگر مؤثر اصلاحی جملے دیر تک سننے والے کے فکر وخیال میں گونجتے رہتے اور اصلاح احوال کی جانب متوجہ کرتے رہتے تھے۔

ان کی حیات کے آخری دور میں ان کے ذہنی اور فکری حیرت انگیز استحضار کا مشاہدہ دو مرتبہ ہوا، جبکہ جسمانی ضعف نے بشکل علالت اس حد تک مغلوب کر دیا تھا کہ بغیر سہارے کے دو قدم چلنا بھی ایک دشوار گذار مرحلہ بن گیا تھا، قابل تشویش حد تک بصارت کی کمزوری ان کے فکر وخیال کو مختل کیے ہوئے تھے، ایسے میں گذشتہ سال ۲۹ دسمبر ۲۰۱۸ء کو میرے برادر زاد اور ان کے دختر زاد عزیزم محمد یاسر قاسمی سلمہ کا نکاح ان کو پڑھانا تھا، نکاح کے حوالے سے مکمل تفصیلات کو بغور سنا اور اسکے بعد قریب بیس منٹ پر مشتمل نکاح کے فضائل اور اسکی اہمیت پر بڑے شرح بسط کے ساتھ نہایت مفصل ومدلّل بیان کیا، ان کی ظاہری صورت حال کو دیکھتے ہوئے سب کا اغلب گمان یہی تھا کہ بتائی گئی نکاح کی تفصلات ذہن سے محو ہو چکی ہوں گی، لیکن خطبۂ نکاح کے بعد بتائی گئی تفصیلات تمام جزئیات سمیت اسی ترتیب سے بیان کیں جس ترتیب سے بتائی گئی تھیں، اسی مجلس میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ تقریب میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جناب مولانا سید اسجد مدنی صاحب بھی مدعو تھے، مرحوم ومغفور سے ملاقات کے وقت انہوں نے صرف اپنا نام بتا کر تعارف کرایا جسے سن کر برجستہ فرمایا کہ ان کی ولادت پر تو ہم نے درسگاہ میں حضرت شیخ سے مٹھائی کھائی تھی، قویٰ مضمحل ہیں، بینائی ساتھ نہیں دے رہی ہے اور قریب پینسٹھ سال پرانی بات ہے،

واقعتاً یہ ایک حیرت انگیز استحضار تھا۔

دوسرا موقعہ وہ ہے جبکہ وفات سے محض قریب ایک ماہ قبل راقم السطور ان سے ملاقات کی غرض سے مالیرکوٹلہ گیا، اسی روز اتفاق یہ ہوا کہ ان کے صاحبزادے عزیزم میاں عمیر احمد عثمانی جنہوں نے سالوں پر محیط مدت دراز سے اپنے آپ کو والد مکرم رحمہ اللہ کی خدمت کے لیے وقف کر کے اخروی سعادتیں سمیٹنے کو اپنا مقصد حیات قرار دے رکھا تھا، بر بنائے محبت، تعلق اور قرار واقعی خاندانی وضعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے ہی پرجوش اور والہانہ انداز میں استقبال کیا، مجھے بتایا گیا کہ وہ میری آمد کے شدت کے ساتھ منتظر تھے، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سوال کر رہے تھے کہ کب پہنچیں گے، اسی دوران حسب معمول عمیر میاں کا سہارا لیکر غسل خانے میں گئے، وہاں سے اٹھتے وقت توازن کے غیر متوازن ہو جانے سبب گر گئے جس سے بائیں آنکھ کا حصہ سیاہی مائل ہو کر اس قدر متاثر ہوا کہ ورم کے سبب آنکھ ہی بند ہوگئی جس کو دیکھ کر تکلیف کی شدت کو دیکھنے والا بھی محسوس کرسکتا تھا، لیکن کسی انداز واطوار سے محسوس نہیں ہونے دیا کہ کوئی تکلیف بھی محسوس کر رہے ہیں، گویا میری آمد پر از حد خوشی ومسرت کا اظہار ان کے چہرے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا، چوٹ کی تکلیف کا احساس گویا دل و دماغ سے یکسر غائب ہو چکا تھا، ان کے ساتھ ڈھائی تین گھنٹے کی مجلس میں نہ صرف گذشتہ واقعات ہی موضوع گفتگو رہے بلکہ حیرت انگیز طور پر حالات حاضرہ، دارالعلوم وقف دیوبند کی علمی وتعلیمی اور تعمیراتی ترقیاتی کاموں کی تفصیلات پر اظہار مسرت و اطمینان اور بصیرت افروز مشورے، ملک کے نہایت تشویش انگیز احوال میں پُر تاثیر و پُر درد اور دل گداز و دلسوز انداز میں ہندوستان میں بسنے والی امت مسلمہ کے حوالے سے ملک کو درپیش متوقع خدشات پر بڑے سنجیدہ اور پر مغز تبصرے، اصابت رائے، عصر حاضر کے تناظر میں نوجوان نسل کے لیے راہ عمل کی نشاندہی، علما اور مدارس کے فرائض کی جانب اشارات اور بالخصوص آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے حوالے سے زیر عمل مختلف تحریکات ومقدمات

پر اپنے نقطہ ہائے نظر کی وضاحتیں، پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ میں ایک طویل وقت سے بستر پر دراز ایک ایسے مریض ناتواں سے محو گفتگو ہوں جسکی شمع حیات گل ہونے میں محض ایک ماہ کی ہی مہلت باقی رہ گئی ہے، بلکہ لگتا تھا کہ ذہنی اعتبار سے ایک نہایت تندرست وصحت مند و جواں سال شخص محو تکلم ہے، متنوع موضوعات پر واقعاتی اعتبار سے حضرت مفتی صاحبؒ کا اس پیرانہ سالی میں جبکہ عموماً ذہول ونسیان اس عمر کی خاصیات کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے ایسے میں ان کا یہ مستحضرانہ اور چست و مفصل انداز گفتگو مسلسل پورے دورانیہ مجلس میں میرے لیے شدید حیرت واستعجاب کا موجب بنا رہا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات کے تین بہت نمایاں پہلو ہیں جو کہ آغاز سے ہی ان کی زندگی کو محیط رہے ہیں، ایک ان کی علمی زندگی ہے، دوسرے عملی زندگی ہے اور تیسرا گوشۂ حیات ان کی اجتماعی زندگی سے عبارت ہے، مرحوم ومغفور نے اپنی علمی زندگی کا آغاز تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں درجہ فارسی میں ایک محنت کش استاذ کی حیثیت سے کیا اور جلد ہی طلبا میں اپنے مربیانہ ومشفقانہ اور دلنشین انداز درس نیز اپنے سے متعلق درسی موضوعات پر مطالعاتی عالمانہ گرفت کے سبب عام مقبولیت ومحبوبیت کے تذکرے دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں سنائی دینے لگے، یہ وہ دور ہے جبکہ خاندان میں اور خاندان سے باہر بہت سے اساتذہ اور دارالعلوم دیوبند کی بہت سی بزرگ ہستیوں کا سایۂ عاطفت سر پر موجود ہے، خاندان کی علمی وجاہتوں کے جوہر واضح طور پر ان کی ذات میں محسوس کیے جاسکتے ہیں جن کو جوہر شناس اور مستقبل بین نگاہوں نے آغاز میں ہی بھانپ لیا تھا کہ آنے والے دور میں یہ جواں سال عالم اپنے بزرگوں کی علمی وجاہتوں کی وراثت کا امین بننے والا ہے، فقہ وفتاویٰ میں ان کی بصیرت افروز آرا اور صلاحیتوں نے بڑوں کی توجہات کو اس جانب مبذول کیا تا آنکہ غالباً ۱۹۷۵ء میں مالیرکوٹلہ پنجاب میں مفتی اعظم کی حیثیت سے ان کا انتخاب حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی حسب ایماء ومنشا عمل میں آیا، اگرچہ دارالعلوم

دیوبند کے منصب تدریس سے جدائی اختیار کرنا ان کے لیے ایک گراں بار مرحلہ تھا لیکن بڑوں کی مستقبل شناس نگاہیں ان کی ہمہ جہت ترقیات اسی نقل مکانی میں مضمر دیکھ رہی تھیں، ادھر حضرت مفتی صاحبؒ کا اپنے اساتذہ اور بالخصوص حضرت حکیم الاسلامؒ رحمہ اللہ سے والہانہ محبت اور عقیدت مندانہ تعلق ہی دراصل اس اعتماد کی بنیاد واساس تھا جس کو مدنظر رکھتے ہوئے ادارے سے منفصل ہوکر مالیر کوٹلہ میں رہ کر بالواسطہ دارالعلوم دیوبند کی ہی خدمت کو ترجیح دی، ۱۹۸۰ء کے مابعد پیش آمدہ احوال کے تناظر میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیے مالیر کوٹلہ کا انتخاب ایک الہامی فیصلہ تھا اور وہی ان کی علمی، عملی اور اجتماعی زندگی میں ترقیات وقبولیت کے لیے خشت اساس ثابت ہوا، دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات سے انفصال کی کسک وہ مدۃ العمر محسوس کرتے رہے، متعدد موقعوں پر اس کا اظہار والد مکرم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہ سے کیا کرتے تھے کہ اگرچہ مالیر کوٹلہ میں مفوضہ فرائض کو میں دارالعلوم دیوبند سے بالواسطہ انتساب ہی تصور کرتا ہوں مگر براہ راست انتساب میرے لیے سعادتوں میں اضافے کا باعث ہوگا، کیوں کہ رفتہ رفتہ ہم بھی عمر کی اس منزل میں پہنچ گئے ہیں کہ ”نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے“ ان کی اس قلبی اور طبعی خواہش کے احترام میں دارالعلوم وقف دیوبند کے منصب صدارت افتاء پر ان کا اعزازی تقرر عمل میں آیا جو کہ آخری عمر تک ان کے لیے قلبی طمانیت کا موجب رہا جسکا بار بار اظہار تشکر کے انداز میں قبلہ والد صاحب رحمہ اللہ سے تذکرہ فرماتے تھے۔

پنجاب کے ۴۵ رسالہ دور قیام میں مالیر کوٹلہ اور اطراف کے ماحول میں دینی شعور و بیداری کی نشاۃ ثانیہ میں مفتی صاحبؒ کی جاں گسل محنتوں اور کاوشوں کا ایک بڑا ہی لائق قدر حصہ ہے، اپنی اسی اجتماعیت پسند طبیعت، اعلی اخلاقی اقدار اور معتدل مزاجی کے سبب غیر مسلم حلقوں میں بھی از حد مقبول اور مقتدر حیثیت کی حامل شخصیت تصور کیے جاتے تھے، حیات اجتماعی کا دائرہ عمل پورے ہی ملک کو محیط تھا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا

بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت کی تحریکات سے خصوصی دلچسپی، متوازن مشورے اور محتاط عملی حصہ داری مدۃ العمر ان کی حیات اجتماعی کے اجزائے ترکیبی رہے ہے، اس کے علاوہ ملک کے اکثر علمی و اجتماعی دوائر میں ان کی موجودگی کو ہمیشہ ایک خاص عزت و احترام کا درجہ حاصل رہتا تھا، خصوصا ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونے والے بین المذاہب اجتماعات اور کانفرنسوں میں ان کی موجودگی و شرکت کی اہمیت کو برادران وطن کے دیگر طبقات بھی خاص طور پر محسوس کرتے تھےاوراس میدان میں اپنے انہی مزاجی اختصاصات کی بنیاد پر خصوصیت کے ساتھ مدعو کیے جاتے تھے، مرحوم و مغفور نے درجۂ فارسی کے ابتدائی تدریسی دور میں فارسی کا بڑا جامع اور مفید کورس مرتب کیا تھا جس کو اس زمانے میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور ملک کے متعدد مدارس نے بطور نصاب ان کتب کو اپنے تعلیمی اداراتی نظام کا حصہ بنایا تھا فارسی میں ان نصابی کتب کی بڑی خصوصیت یہ تھی مدارس کے اس دور کے طلبا کی مزاجی ساخت اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر اس نصاب کو مرتب کیا گیا تھا، اہل علم کے نزدیک ان کتب کی قبولیت و مقبولیت میں اس پہلو کے علاوہ اس کے سہل انگیز الفاظ و تراکیب کو بھی بڑا دخل تھا جس سے کہ لغت کی تفہیم میں طلبا نے کافی آسانی محسوس کی تھی اور علوم اسلامیہ کے فارسی زبان میں بڑے مآخذ تک رسائی ان کے لئے سہل اور آسان ہوگئی، اس کے علاوہ متعدد موضوعات پر ان کی تصنیفات و تالیفات کو حلقہ اہل علم میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی بالخصوص ان کے دور حیات کے آخری چھ سال جس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے بڑی عرق ریز محنت کے ساتھ تفسیر قرآن پر کام کیا اور ''نور القرآن'' کے نام سے سات جلدوں پر مشتمل یہ عظیم الشان کام منصۂ شہود پر آیا جس کو مکتبہ فیصل دیوبند نے بڑے اہتمام کے ساتھ عمدہ اور اعلی طباعتی معیار پر شائع کیا ہے، عام فہم انداز تحریر، سلیس زبان و بیان، مبتدئین کے لیے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کے لغوی اعتبار سے علیحدہ علیحدہ معانی، با محاورہ ترجمہ، آیات کی جامع تشریحات، اور تمام سورتوں کے مضامین کا بہت ہی عام فہم انداز

میں ایک جامع تعارف جیسے اجزا کے سبب تفسیر نورالقرآن کو عوامی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی، یقین ہے کہ ان شااللہ مرحوم ومغفور کا یہ مہتم بالشان کام ان کے لیے آخرت میں بلندی درجات کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

آخیر میں ہم سب بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہیں حق تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کی بال بال مغفرت فرماتے ہوئے اعلی علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرمائیں۔آمین یارب العالمین

وماعلينا إلا البلاغ المبين

عصرِ حاضر کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت

(حضرت مولانا علامہ خالد محمود صاحبؒ)

سال رواں کے رمضان المبارک کی ۲۰؍تاریخ کو عصر کی نماز کے معاً بعد انگلینڈ سے یکے بعد دیگرے جناب حضرت مولانا فاروق ڈیسائی صاحب مدظلہ اور برادر عزیز جناب مولانا محمد عمار صاحب مدنی کے فون موصول ہوئے، جس کے واسطے سے یہ الم انگیز وصاعقہ اثر خبر ملی کہ ابھی دو گھنٹے قبل برطانیہ میں مقیم جماعت علمائے اہل حق کی ایک نہات ہی قدآور ومقبول ترین شخصیت جناب حضرت مولانا علامہ خالد محمود صاحب رحمہ اللہ اس دار فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر حضرت حق جل مجدہ کی مشیت کے قانون ازلی کے تحت اس کے بیکراں و بے حد ونہایت فضل واحسان کی راحت آمیز ٹھنڈی چھاؤں تلے ماہ صیام کے مقدس ومتبرک ایام میں تا ابد آسودۂ رحمت ہو گئے۔انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

حضرت علامہ صاحبؒ کے سانحۂ وفات کی خبر سے نہ صرف یورپ میں جماعت کے حلقہ ہائے علم وعمل میں، بلکہ برصغیر کے تمام اصحاب علم وفضل کے علمی دوائر و اجتماعیات میں پہنچنے والے الم انگیز جذبات وصدمات کو یکساں انداز میں شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا اور مرحوم ومغفور کی عمر کے ایک طویل ترین عرصے پر محیط عظیم علمی و تصنیفی نیز اعلائے کلمۂ حق کے حوالے سے کی جانے والی ان کی نہایت قابل قدر ولائق تقلید جہود وکاوش اور عظیم تر کارناموں سے دنیا بھر میں علمی وعملی وابستگی رکھنے والے ہزار ہا

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (شعبان تا شوال ۱۴۴۱ھ مطابق اپریل تا جون ۲۰۲۰ء، جلد:۱۱، شمارہ:۱۲۲تا۱۲۴)

ہزار افراد ملت نے بشمول دارالعلوم وقف دیوبند ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کیا،اور سر بسجود حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بہ دعاء ہوئے کہ رب ذوالکرم ہماری دعاؤں کوشرف قبولیت سے نوازتے ہوئے حضرت علامہ صاحب رحمہ اللہ کو اعلیٰ علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرمائیں اور جنت الفردوس کے مقام ابدی میں شہداء اور صدیقین وصالحین کی ہمراہی نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت علامہ صاحب رحمہ اللہ کی بلند وبالا علمی شخصیت اپنے مقام علم وعمل اوراپنے ہمہ جہت وسعت مطالعہ اورتعمق فکر ونظر کے لحاظ سے دنیا بھر کے اصحاب علم وفضل کے درمیان ایک بے حد ممتاز ترین قد آور اور نمایاں ہستی کی مالک تھی، بالخصوص فرق باطلہ کے عقائد وعلمی ترجیحات وتعاملات نیز جماعت اہل حق پر اعتراضات پر منقولات و معقولات سے مدلل ومزین سنجیدہ وبصیرت افروز اور مسکت ولاجواب تبصروں کے حوالے سے اہل سنت والجماعت کے ترجمان اور عصر حاضر میں اس میدان سے تعلق رکھنے والے سلف صالحین کے صحیح وسچے جانشین وترجمان کی ممتاز حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ذہانت وفطانت،قوت حافظہ اور برجستہ وبرمحل مستدلات واستحضاراور مدۃ العمر علم وعمل میں تطہیر باطنی کی بنیاد پر متوازن اور قابل رشک تعامل کے سبب سے امتیازی اوصاف کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے خزانۂ غیب سے ایسی متعدد صفات حمیدہ اور جواہر مطلوبہ سے مرحوم ومغفور کوخوب نوازا تھا۔

دنیا کے پر پیچ وپرخطر راستوں سے اپنے آپ کو مامون ومحفوظ نکال کر بارگاہ رب العالمین میں بایں طور باریاب ہوجانا بقول شخصے کہ ’’خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے‘‘ یہ مقام قبولیت انسان کی حیات دنیوی واخروی کی خوش بختیوں کی علامات میں بنیادی ومرکزی حیثیت رکھتا ہے، حضرت علامہ خالد محمود صاحب رحمہ اللہ سے علماً و عملاً یا عقیدت ومحبت اور شفقت کی بنیاد پر ان سے ذہنی اور فکری قربت کا تعلق رکھنے والے اکثر اصحاب علم وعمل کا ظن غالب یہ ہے کہ ان کا شمار بھی ان کے بتمام وکمال علم وعمل

کی متوازن بنیاد پر ایسے ہی خوش بخت و بانصیب افراد امت میں ہوگا، اہل علم کا اس حقیقت منکشفہ پر بھی اجماع ہے کہ انہوں نے اپنے پیش رو علماء و صلحاء کی فکر انگیز و حسین تر علمی و عملی تحقیقی و تصنیفی تراث و روایات کو نہ صرف یہ کہ مدۃ العمر اپنے ہی لیے مشعل راہ کے طور پر حرز جاں بنائے رکھا بلکہ اس بصیرت افروز فکر کو عصر حاضر سے ہم آہنگ معیار رد وقبول کے تناظر میں فکر و تحقیق کے قالب میں ڈھال کر نسلوں کی راہ اصلاح کو منور کیے جانے کا فریضہ انجام دیا، حضرت علامہ صاحب کا تعلق عہد رواں کے ان اصحاب علم و فضل میں ہوتا تھا کہ جو محض کتابی علم کو تطہیر باطن کے جہد و شاقہ کے بغیر کافی نہیں گردانتے، ان کے نزدیک علم محض جانکاری کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عملی استواری کے لزوم کو علم کی دنیا میں وسیلۂ نجاح و فلاح کے تناظر میں مرکزی کلید کی حیثیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ تطہیر باطن کے بغیر علم کی حیثیت ایک خبر سے زیادہ کچھ نہیں ہے، چنانچہ علم و عمل کی راہ کو متوازن رکھنے کے لیے کسی صاحب بصیرت کی فکری راہنمائی لازمی ہے، علی العموم مشاہدہ یہ ہے کہ کسی صاحب بصیرت کی راہنمائی کے بغیر علمی مقام و مرتبے کا ترفع خود نمائی و خود پسندی کا مرض پیدا کر دیتا ہے، شعور و آگہی رکھنے والے اکثر افراد کے تجربات و مشاہدات اس حقیقت کی صداقت پر کسی نہ کسی درجے میں دلیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، حضرت علامہ صاحبؒ اس اصول کے رمز شناس بھی تھے، عامل بھی تھے اور اس کے داعی بھی تھے، چنانچہ انہوں نے اس بصیرت آفرینی کو بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتویؒ کی فکری آفاقیت میں تلاش کیا، اسی سے اخذ کیا، اور اسی کو راہنما قرار دے کر مدۃ العمر اپنے آپ کو انہی راہنما خطوط سے مربوط رکھا، چنانچہ علوم نانوتوی سے روحانی و فکری وابستگی اور علمی قربت کی جھلک ان کی تحریرات و مصنفات کے منقولی و معقولی مستدلات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، حق آفریں و حکمت افروز نقاط کو منقول و معقول دلائل سے مزین کر کے **کلّموا الناس علی قدر عقولھم** کے اصول پر مؤثر انداز میں پیش کرنا ان کے امتیازی اور بلند فکر اوصاف کا ایک نمایاں

حصہ تھا جس کو برملا وہ فکر نانوتوی سے ماخوذ قرار دیتے تھے۔

اسی حوالے سے یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے جس کو میں اپنے لیے سعادت اور خوش بختی کی علامت پر محمول کرتا ہوں اور ان لمحات کی خوشگوار یادیں تا دم تحریر آج بھی پہلے دن کی طرح سے قرطاس ذہن پر نقش ہیں، واقعہ کی تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ گذشتہ سال دورۂ برطانیہ کے موقعہ پر راقم السطور کو حضرت مولانا فاروق ڈیسائی صاحب مدظلہٗ اور بعض دیگر مقتدر علمائے بولٹن کی معیت میں حضرت علامہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا شرف حاصل ہوا، والہانہ شفقت آمیز و مسرت انگیز انداز میں پرتپاک خیر مقدم کیا جس کا اظہار ان کے ظاہری انداز و اطوار کے علاوہ آنکھوں سے محسوس کی جانے والی محبت آمیز چمک سے ایسے چھلک رہا تھا جیسے جسم کا رُواں رُواں قلب و ذہن میں کارفرما جذبات محبت و شفقت کی بزبانِ حال گواہی دے رہے ہوں، جماعت علماء کو سنت کے مطابق واجب تعظیم و تکریم سے سرفراز فرمانے کے بعد راقم السطور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ خود اپنے ارادے سے نہیں آئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرے پاس میری دعاء کی قبولیت کے نتیجے میں بھیجا ہے، یہ فرما کر اپنی غالباً آخری تصنیف کا کتابت شدہ مسودہ جو طباعت کے لیے پریس میں جانے کے لیے تیار رکھا ہوا تھا اپنے معتمد رفیق کار جناب مولانا مفتی فیض الرحمٰن صاحب سے طلب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب حضرت نانوتویؒ کے علمی مستدلات پر ایک کوشش ہے، پھر اس کی تفصیلات و جزئیات اور اس کے محتویات کو مفصل انداز میں بیان فرماتے ہوئے کہا کہ میرے رفیق کار مفتی صاحب اپنی از حد مصروفیات کے سبب اس کو بروقت طباعت کے لیے پریس میں نہ دے سکے جس کے سبب میں ان پر ناراض بھی ہوا، ادھر اسی کے ساتھ ساتھ میرے دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے کاش کہ حضرت نانوتویؒ سے صُلبی نسبت رکھنے والا ان کے خاندان کا کوئی فرد یہاں آجائے، سعادتاً جس کے وسیلے سے میں اس کتاب کو طباعت کے لیے بھیج سکوں، اور میں اس کے لیے دعاء کرتا

تھا، اللہ نے میری دعاء قبول فرمائی اور آپ کو میرے پاس بھیج دیا، یہ کہہ کر کتاب کا مسودہ میرے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا کہ اب آپ یہ مفتی صاحب کو اپنے ہاتھوں سے حوالے کردیں، عجیب بات یہ ہے کہ جس تاخیر کو میں مفتی صاحب کا قصور سمجھ کر ناراض ہو رہا تھا وہ دراصل عالم تکوین میری دعاء کو شرف قبولیت سے نوازا جارہا تھا۔

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بلاشک وشبہ میرے لیے موجب شرف وسعادت اور تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے علم وعمل کی کم مائیگی کے آئینے میں اس واقعہ کو میں ان کی بزرگانہ خوردنوازی کی روایت کے پس منظر میں اسی عنوان سے تعبیر کرسکتا ہوں۔ ’’چہ نسبت خاک را با عرش پاک‘‘ پھر اس کے بعد یہ واقعہ سنایا کہ حضرت نانوتویؒ کا غالباً آخری سفر حج ہے، معاصر علماء کی ایک جماعت اس مبارک سفر میں ساتھ ہے، راہ سفر میں کسی مقام پر ایک جرمن اسکالر سے ملاقات ہوئی، تبادلۂ افکار وخیالات کے لیے دونوں کے مابین زبان کی اجنبیت کے سبب ترجمان ناگزیر تھا جس کو انگریزی اور اردو پر عبور حاصل ہو، یہ مرحلہ بھی اللہ تعالیٰ نے حل فرمادیا، گفتگو ہوئی جس کا موضوع امن عالم اور فلسفۂ انسانیت تھا، اس ملاقات کے بعد حضرت نانوتویؒ نے بڑے پرعزم لب ولہجے میں اپنے معاصرین سے فرمایا کہ اگر زندگی نے مہلت دی تو جی چاہتا ہے کہ سفر حج کے بعد ہندوستان جاکر انگریزی سیکھوں اور پھر ایک مرتبہ یورپ جاکر وہاں کے اہل علم طبقے پر اسلام کی یہ حقیقت واضح کروں کہ جس چیز کو تم لوگ فلسفہ سمجھتے ہو وہ فلسفہ نہیں بلکہ تمہارے افکار پریشاں اور فاسد نظریات کا ایسا مجموعہ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ قالب بدلتا رہتا ہے جس کی سیکڑوں مثالیں تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں، درانحالیکہ اصل اور برحق فلسفہ تو وہ ہے جس کو اسلام نے پیش کیا، جو کہ رہتی دنیا تک تمام بنی نوع انسانی کو ہر دور اور عہد میں فکر وتدبر کی دعوت بھی دیتا ہے اور ہر عہد سے ہم آہنگ دنیا میں امن وانصاف کے واضح اور قابل عمل راہنما خطوط کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لیکن حضرت نانوتویؒ کی یہ خواہش ان کی زندگی میں تو پوری نہ ہوسکی، البتہ ان کی دعاء ذات حق جل مجدہ کی بارگاہ عالی میں قبول ہوگئی

اور اللہ تعالیٰ نے اس بندۂ عاصی کو اس کام کے لیے منتخب فرما کر یورپ بھیج دیا اور یہاں آنے کے بعد روز اول سے میں انہی کا فرض کفایہ ادا کر رہا ہوں، اور خانوادۂ قاسمی سے میری محبت و عقیدت کی بنیاد و اساس اسی فکر و خیال اور جہد پیہم میں مضمر ہے۔

صحبت فیض کی غرض حاضر باش اصحاب علم اور ان کی فکر سے قربت رکھنے والے رفقاء بیان کرتے ہیں کہ حضرت علامہ صاحبؒ اپنی ذات کے ہالے میں گم رہنے والے سرد مہر اور خشک قسم کے عالم نہیں تھے بلکہ مزاج میں سرزمین پنجاب کی روایتی شگفتگی و مزاح کے عنصر کا بھی خوب غلبہ تھا، ان کے علمی لطائف کی نکتہ رسی مدتوں ارباب علم کو سرشار رکھا کرتی تھی، ان سے منسوب مزاح آمیز واقعہ راقم السطور نے اپنے والد مکرم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب رحمہ اللہ کی زبانی بار ہا سنا کہ ایک مرتبہ ساؤتھ افریقہ کے دورے کے درمیان کسی موقعہ پر ایک شیعہ عالم دین سے ان کی ملاقات ہوئی، برسبیل گفتگو شیعہ عالم نے اپنے عقائد کے معروف پس منظر میں سوال کیا کہ حضرت! یہ فرمائیے کہ امہات المؤمنین میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو افضلیت کا درجہ حاصل ہے؟ علامہ صاحبؒ سمجھ گئے کہ یہ کہاں بول رہے ہیں اور سوال کے پس پردہ کیا مقصد و منشاء مضمر ہے، چنانچہ مزاح کے پیرائے میں برجستہ فرمایا کہ بھائی قرآن سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ افضل ہیں، سائل نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قرآن میں ان امہات کا کہاں ذکر ہے؟ کہا کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ قرآن میں ان کا ذکر ہے میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن سے ایسا پتہ چلتا ہے، سورۃ الضحیٰ میں حق تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۱) شیعہ عالم اس استدلال مزاح سے حد درجہ محظوظ ہوتے ہوئے بولے کہ حضرت گذشتہ چودہ صدیوں میں اس آیت سے شاید کسی مفسر قرآن نے یہ دلیل ہرگز اخذ نہیں کی ہوگی، میں آپ کے جواب سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن آپ کی برجستگی اور ذہانت کا قائل ضرور ہو گیا ہوں، اس کے بعد کافی دیر تک اس

(۱) ترجمہ: یقیناً آگے آنے والے حالات تمہارے لیے پہلے حالات سے بہتر ہیں۔ (سورۃ الضحیٰ: ۴)

موضوع پر سنجیدہ اور محقق گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، عرض کرنے کا حاصل یہ ہے کہ ان کے ذوق ومزاج کا رنگ اعتدال ان کے ہر انداز بیاں سے جھلکتا تھا۔

حضرت علامہ صاحبؒ کا جد مکرم حضرت حکیم الاسلامؒ سے علمی عظمت اور وقیع تر نسبت کے سبب اخلاص وللّٰہیت پر مبنی نہایت عقیدتمندانہ تعلق، حضرت والد مکرمؒ سے علمی بنیادوں پر معاصرانہ محبت آمیز بے تکلف قربت اور اسی حوالے سے راقم السطور کے ساتھ بھی انتہائی مشفقانہ روش ان کے قول وعمل کی صداقت پر دلیل تھی اور اس کے من و عن اثرات دوطرفہ تھے، یہی وجہ تھی کہ بصد شوق ان سے ہر ملاقات ان کی علمی و عملی عظمت ومحبت میں ہمیشہ اضافے کا سبب بنا کرتی تھی، اسی موقعہ پر عزیزم میاں محمد شکیب قاسمی سلّمہٗ کو جو کہ میرے ہمراہ تھے، تعارف کے بعد ان کو آباء واجداد کی علمی میراث کی جانشینی ونقش ثانی کی مخلصانہ ومستجاب دعاؤں اور بے حد قیمتی نصائح سے عزیز موصوف سلّمہٗ کو نوازتے اور پُر شفقت انداز میں حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ''حیاتِ طیب'' کے مرتب کی حیثیت سے کتاب کے متفرق اقتباسات کے حوالے سے نہایت بیش قیمت و مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا اور اگلے ایڈیشن میں ان اصلاحات کی جانب توجہ دینے کی تاکید فرمائی، چورانوے سال کی عمر میں جبکہ عموماً انسان کے قویٰ مضمحل اور فکر ونظریات پر گرفت کمزور ہو جاتی ہے، ان کے حفظ وضبط کا یہ قابل رشک مرتبۂ کمال ان کے علم وعمل کے درمیان مدۃ العمر مضبوط ربط وتوازن قائم رہنے کی حسی دلیل تھی، کیونکہ اصحاب علم نے حفظ وضبط کے مرتبۂ کمال کی مرکزی کلید علم وعمل کے توازن واعتدال کو ہی قرار دیا ہے۔

یہ سن ۲۰۰۷ء کے ماہ اپریل کی بات ہے جب کہ میرے بڑے بیٹے عزیزم میاں محمد صہیب قاسمی سلّمہٗ بریطانیہ کی معروف باتھ یونیورسٹی سے معاشیات میں ماسٹرس کی ڈگری مکمل کر کے اپنی پہلی ملازمت کے حوالے سے اسکاٹ لینڈ کی راجدھانی ایڈمبرا میں مقیم تھے اور اسی دور کے پس وپیش میں بیس روزہ انگلینڈ کے دورے پر ان دنوں میرا قیام عزیز موصوف سلّمہٗ کے مکان پر تھا اسی درمیان اطلاع ملی کہ اسکاٹ لینڈ کے دوسرے بڑے

مرکزی شہر گلاسگو کی سینٹرل مسجد میں حضرت علامہ صاحب کا بعد نماز جمعہ پروگرام ہے، تفصیلی ملاقات کے لیے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے راقم نے عزیزم سلّمہٗ کے ہمراہ سفر کا ارادہ کیا، حضرت علامہ صاحب رحمہ اللہ کا حد درجہ شفقت آمیز والہانہ اور پُر شوق انداز ملاقات اور وقیع تر استقبالیہ کلمات کا ایک ایک لفظ و ادا دل کی گہرائیوں سے خانوادۂ قاسمی کے ساتھ دیرینہ محبانہ وعقیدت مندانہ تعلق کی عکاس واظہار تھا جس کی چاشنی وشگفتگی کے دلکش نقوش کی تازگی کو روز اوّل کی طرح آج بھی نہاں خانۂ قلب میں محسوس کرتا ہوں۔ ظہرانہ کے بعد منعقدہ مخصوص اصحابِ علم واحباب کی مجلس میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ دعوت حق کی قبولیت کے مؤثر دواعی نیز عصر حاضر میں ردّ وقبول کے بدلتے فکری معیارات کے تناظر میں وہ کون سے تقاضے ہیں جن کو عہد رواں میں اساس کا درجہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ حضرت علامہ صاحب نے نہایت شرح بسط کے ساتھ اس حوالے سے جو بات بیان فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عہد کوئی بھی ہو دعوت حق کی خشتِ اساس للّٰہیت کے ساتھ ہمیشہ اخلاصِ قلب ونیت اور داعی کا عامل ہونا ہی رہا ہے، البتہ قبولیت کے حوالے سے انسان کی طبیعت ونفسیات اور اس کی خلقی فطرت کے لازمی تقاضوں کے مطابق ذات حق جل مجدہ نے سورۂ ملک: وَ قَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۱) میں ایک ابدی اصول بیان فرمادیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قبولیت حق کے دو ہی طریقے ہیں، پہلا یہ کہ بیان کرنے والے کی بات پر اور اس کی صداقت وامانت پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے بلا ردّ وقدح اپنے ضمیر کی آواز پر اعترافِ حق کرتے ہوئے علی الاعلان اپنے قلبی عزم وجزم اور ارادہ وعمل کا اظہار کرے جب کہ داعی کی صداقت وامانت بطور وصف واختصاص معاشرے میں اس کے تعارف کا ایک اہم ترین وسیلہ بھی تسلیم کیا جاتا ہو جس پر از بچپن تا پچپن بیشمار مشاہداتی گواہیاں بھی شاہد عدل ہوں، جب کہ دوسرا طریقۂ عمل یہ ہے کہ داعی کی بات اور معاشرے میں پائے

(۱) سورۃ الملک: ۱۰

جانے والے اس کے اثرات و مؤثرات پر سنجیدہ اور بصیرت افروز غور و خوض کر کے براہ عقل و وجدان نتائج مقصود کو اخذ کرنے کی کوشش کرے، دراں حالیکہ مذکورہ دونوں مثبت راہوں سے از راہ حسد و عناد انحراف اختیار کیے جانے کا آخری اور لازمی نتیجہ دائمی حرمان وخسران اور ناامیدی و مایوسی کے سوا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا ہے اور مذکورہ بالا تینوں طریقوں کی مثالیں ہمیں مکی دور سے ہی مل جاتی ہیں۔ طریقۂ اولیٰ کی مثال خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے جنھوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک ایک قول و عمل اور فعل پر بغیر کسی قیل وقال، حیل وحجت اور ہمہ جہت مخالفتوں کو خاطر میں لائے بغیر اٰمَنْتُ و صَدَّقْتُ کا نعرۂ حق بلند کر کے قبولیت حق پر مہر تصدیق ثبت کیے جانے کی مثال قائم فرمائی۔ دوسرا معاملہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے جنھوں نے دوسرے طریق کی نظیر کو اپنے قبولیت حق کا وطیرہ قرار دیا کہ ایک طویل عرصے تک پیش کردہ دعوت حق کے دلائل، اس کے اثرات اور مکہ کے قبائل اور خاندانوں میں مرتب ہونے والے مؤثرات اور باہمی آویزشوں کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتے رہے اور اپنی خلوتوں میں بصیرت افروز غور و خوض اور عقل و خرد کی راہ سے برپا شدہ اس تحریک اسلام کے لازمی اور منطقی نتائج کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے، تاآں کہ ایک طرف دلائل و براہین کی بنیاد عقل کی سطح پر تحریک کی شفافیت پر قائم و استوار نظر آتی ہے، دوسری جانب بقول شخصے کہ اسلام قبول کرنے والوں پر سنگ و آہن کو پگھلا دینے والے لرزہ خیز مظالم کے باوجود دعوت اسلام کے قبول کرنے والوں کے فولادی پائے استقامت میں ادنیٰ درجے کی بھی لرزش کا نہ پایا جانا بھی تحریک کی سچائی اور حقانیت کو ثابت کر رہا ہے جب کہ غور و فکر کی تیسری جہت مکہ ہر چہار جانب پائی جانے والی شورش ایک سوال پیدا کر رہی ہے، چناں چہ اس متضاد صورتحال کے پس و پیش نے ان کی فکری قوتوں کو جیسے ہلا کر رکھ دیا ہو اور یہی وہ مختلف النوع اسباب تھے جس نے ان کو انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا اور اسباب ظاہری کے تناظر میں یہی ذہنی کشمکش اور یہی ارادہ

ان کے لیے درقبولیت حق پر سر تسلیم خم کر دینے کا وسیلہ بن گیا، تو گویا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تعقل اور غور وفکر کی راہ سے اسلام کی حقانیت تک پہنچے، اسی معاشرے کے اندر تیسری قوت معاندین وحاسدین اور اصحاب السعیر کا وہ طبقہ تھا جن میں سے بعض کے قلوب و اذہان پر دلائل و براہین کی معقولیت کو کسی درجے میں سمجھنے کے باوجود غلبۂ اسلام کے نتیجے میں عرب قبائل پر قریش کی برتر سیادت وقیادت کے زوال کے موہوم خدشات، خاندانی غرور وتکبر اور قبائلی ونسلی جذبۂ تفاخر نے ان کے لیے سمع و طاعت اور فکر وخرد کی دونوں راہیں بند کر دیں تھیں اور انہوں نے طبقۂ سعیر کے سرخیل ابوجہل وابولہب وغیرہ کے ہمنوا ٹولے کا حصہ بن کر ابدی حرمان وخسران کی راہ کو اپنے لیے منتخب کرلیا تھا، چناں چہ یہ وقائع وحقائق محض اسی دور سے مربوط نہ تھے، بلکہ تا قیامِ قیامت ان ہی متصادم قوتوں میں خیر وشر کے تمام رموز ہائے سربستہ نہاں و پنہاں ہیں، لہٰذا آیت کریمہ کی اس مختصر تشریح میں آپ کے سوال واشکال کے جوابات، غور وخوض اور تدبر وتفکر کے تمام مواقع مجتمع ہیں۔

حضرت علامہ صاحب رحمہ اللہ کی صحبت ومعیت میں گزرے ان گراں بہا لمحات اور اس بیش قیمت ناصحانہ بیانیہ نے اس ملاقات کو میرے لیے ایک ایسا یادگار وقت بنا دیا کہ آج بھی ان کلمات کی خوشگوار اور قرار واقعی تاثیر کو محسوس کرتا ہوں، مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد بریطانیہ کا کوئی سفر ایسا ہوا ہو جس میں التزاماً ان سے پُرشوق ملاقات سفر کے اہم مقاصد کا حصہ نہ بنا ہو۔

بارگاہِ رب کریم میں ہر لحظہ وپل مرحوم ومغفور کی مغفرت کاملہ اور بلندیٔ درجات کے لیے دعا گو ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

وما توفیقی إلا باللّٰہ العلی العظیم

دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث کا ایک گوہر نایاب

(امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ)

دنیا میں علم حدیث کے حوالے سے مختلف نوعیّتوں سے ہونے والے کاموں کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس میں تنہا برصغیر میں علم حدیث اور متعلقات حدیث کے متنوع موضوعات پر انجام دیے جانے والے امور اپنی وسعت و پھیلاؤ اور جامعیت کے لحاظ سے دنیا کے علمی میدان میں اپنے ایک منفرد اور نمایاں ترین مقام پر نظر آتے ہیں جو کہ اپنے بعض مخصوص امتیازات واختصاصات اور تاریخی شواہد نیز درجۂ قبولیت کے تناظر میں دنیا کے شرق وغرب، اور شمال، وجنوب میں بسنے والے اہل علم کے نزدیک استنادی حیثیت کا درجہ رکھتے ہیں، اس حوالے سے انجام دیئے جانے والے تصنیفی، تالیفی، تحقیقی عظیم الشان اور رفیع القدر امور اپنی جامعیت اور نافعیت کے لحاظ سے اسقدر وسیع الاطراف حیثیت کے حامل ہیں کہ یہ مختصر تحریر تو اس کی کسی ایک جہت کا محض تعارفی تذکرے کے احاطہ کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی ہے، علمائے عرب میں متعدد اصحاب علم نے اپنے وسیع اور گہرے مطالعہ کے پس منظر میں نہایت فراغ قلبی اور کھلے ذہن کے ساتھ اس بین حقیقت کا مدلل انداز میں اعتراف کیا ہے کہ علم حدیث کے حوالے سے برصغیر میں انجام دیے جانے والے بلند پایہ اور گرانقدر علمی کارناموں کے گہرے اثرات وسیع

۞ تقریظ: الإمام محمد أنور شاه الكشميري و إسهاماته في علوم الحديث من خلال كتاب ’’فيض الباري‘‘ از: ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی، مطبوعہ حجۃ الاسلام اکیڈمی

پیمانے پر عالم اسلام، جزیرۃ العرب اور اس کے گرد و نواح سمیت یورپ و افریقہ کے متعدد ممالک کے علمی حلقوں میں بھی برابر محسوس کیئے جاتے رہے ہیں، اس حوالے سے پائی جانے والے مختلف تاریخی وقائع اور شواہد کے تفصیلی تذکرہ سے قطع نظر تقریب الی الفہم کے طور پر ماضی قریب میں دنیائے عرب کے قدآور مصری عالم علامہ سید رشید رضا رحمہ اللہ کا ایک تبصرہ ہی کافی ہے، جن کی علمی شہرت و عظمت کو عالم عرب میں دنیائے علم و معرفت کی حدود مقید نہ کرسکیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کی علمی عظمت کے یکساں اعتراف کے ساتھ دنیا کی مقتدر علمی شخصیات کی صف اول کی ایک ممتاز اور نمایاں شخصیت کی حیثیت سے ان کو جانا اور پہچانا گیا ہے، ان کا یہ اعتراف بلا شبہ ایک تاریخی سند کا درجہ رکھتا ہے ''کہ اگر سلسلۂ دین و اسلام کے مضبوط ترین اور از روئے کلام اللہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۱) کے زیر اثر رشتۂ اخوت کی اساس سے مربوط برصغیر کے مسلمان بھائی نہ ہوتے تو مشاہداتی اسباب ظاہری کے تناظر میں شاید علم حدیث سے التفات میں اس قدر کمی واقع ہو جاتی کہ اس کو علم حدیث کے اٹھ جانے سے تعبیر کیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ برصغیر میں اٹھارویں، انیسویں صدی کی ان عظیم شخصیات اور علمائے کرام پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائیں جنہوں نے اس دور میں اپنے خطے کے سیاسی بکھراؤ کے تعلق سے پیدا ہونے والے پر آشوب و پرفتن دور کی اجتماعی تحریکی اصلاحات کی ہمہ جہت اور پر مشقت جہود و مصروفیات کے علی الرغم علم حدیث کے پرچم کو بلند کرنے اور اصحاب علم کے تدریسی حلقوں میں تدریس حدیث کا ذوق پیدا کیے جانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، یہ وہ دور ہے جبکہ برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام صلیبی رہنماؤں اور ان کے فکری حلیفوں کی جانب سے اسلام اور علمائے اسلام کے برخلاف پھیلائی جانے والی مختلف قسم

(۱) ترجمہ: حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اس لیے اپنے دو بھائیوں کے درمیان تعلقات اچھے بناؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے۔ (سورۃ الحجرات: ۱۰)

کی شورشوں اور عسکری ریشہ دوانیوں سے دوچار تھا، جسکے مختلف نوعیّتوں سے جاری تسلسل کے بچشم سر نظر آنے والے مختلف النوع اثرات چار صدیاں گذر جانے کے باوجود تا حال باقی و فعال ہیں، ایسے پر پیچ و ناموافق حالات میں ذات حق جل مجدہ نے برصغیر میں دہلی سے جماعت علمائے اسلام کے سرخیل کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے بعد ان کی اعلیٰ ترین علمی روایات کے امین ان کی صلبی اولاد کو بعد ازاں ان کی معنوی اولاد تلامذہ کو اپنی توفیق خاص سے سرفراز فرماتے ہوئے اس عہد میں علم حدیث کا علم بردار بنایا اور یوں بتوفیق حق جل مجدہ علم حدیث کی کمزور پڑتی روایت کو محدث دہلویؒ کی علمی قیادت میں برصغیر کے اصحاب نے علم حدیث کے پرچم کو نہ صرف تھاما ہی بلکہ بایں طور زندہ کر دیا کہ اس کے نہایت گہرے اثرات عالم اسلام سے لیکر پوری دنیا میں یکساں طریقے پر محسوس کیے جانے لگے جو کہ ارباب علم کے لیے دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں تحریکی قوت کے حصول کا مؤثر ترین ذریعہ ثابت ہوئے، یہ زیر بحث موضوع کا ایجابی اور مثبت پہلو ہے، لیکن بالعموم کسی کام یا خدمت کی فی الواقع عظمت و اہمیت اور اس کام کے پھیلاؤ وسعت، اہمیت اور اس کے گہرے اثرات کے سبب مزید تر متوقع مواقع کو جاننے کے لیے اس کے بالمقابل سلبی پہلو کا ذکر بھی ناگزیر سمجھا جاتا ہے، چنانچہ اس کام کی عظمت و وقعت کے علی الرغم سلبی ناحیہ سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے تأسفی پہلو کا اجمال و اختصار بایں طور سامنے آتا ہے کہ برصغیر ہی نہیں بلکہ جنوب ایشیا سمیت صف اوّل کے ایسے اصحاب علم اور اساتذۂ فن جن کے انقلابی علمی کارناموں کو دنیائے عرب کے صف اول کے علمائے قائدین واہل علم اور اصحاب تحقیق نے اور عجمی دنیا کے اکابر علمائے اسلام اور سلاطین معرفت نے تسلیم کیا ان کو بعض تنگ نظر عناصر نے مسلکی تقسیم کی بھینٹ چڑھا کر علم کے بہت سے متوقع اور امید افزاء وسیع الاطراف راستوں کو مسدود کر دیا گیا ہے جس کے سبب بعض صف اوّل کے علماء محدثین کے کام سے دنیا کے لوگ اس لیے واقف نہیں ہو سکے کہ ان محدثین کا تعلق اس مسلک

سے نہیں تھا جس مسلک کے علمبردار یہ حضرات خود کو کہتے اور جانتے تھے، اگرچہ ان کے کاموں کا اصول تحقیق و تنقید کی سنجیدہ اور بین الاقوامی سطح پر مروج بنیادوں پر ہی کیوں نہ سہی اگر ذکر ہوتا تو اس سے کم از کم عرب دنیا کے طالبان علم ابلاغ کے اس ارتقائی دور میں اس درجہ بے خبر نہ ہوتے جیسا کہ علماء کی دوسری صف کا عمومی مشاہدہ سامنے آتا ہے، بصورت دیگر شاید باخبری کے نتیجہ میں اس پہلو سے بھی اسلام کے قیمتی ذخیرۂ علم میں مختلف انداز کا تحقیقی مواد ایک قیمتی اضافہ کا موجب بنتا جس کے سبب مسلمان علم کے ایک بیش قیمت اضافی ذخیرہ سے محروم ہوگئے ہیں، یہ پہلو علی الاطلاق تمام ہی صیغہ ہائے علم کو محیط ہے، لیکن یہاں پر یہ حقیقت بھی بالخصوص پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ برصغیر میں علم حدیث امت مسلمہ کی روشن علمی تاریخ سے جدا کوئی چیز نہیں ہے، بہ نظر تحقیق اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک مسلمہ حقیقت سامنے آتی کہ علم حدیث جنوب ایشیا کی علمی تاریخ کا ایک نہایت روشن و تابندہ اور شاندار باب ہے۔

اس تمہیدی اجمال کے بعد برصغیر کے وسیع تر تناظر میں علم حدیث کے تدریجی ارتقاء اور برصغیر میں علم حدیث پر عہد بہ عہد انجام دیے جانے والے کام کو باعتبار کیفیت و کمیت اور وضع و اسلوب دیکھا جائے تو یہ ایک طویل موضوع کا عنوان ہوگا، تاہم اس طوالت سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی مجملا برصغیر میں علم حدیث کے ارتقائی سفر کا تذکرہ بایں طور ناگزیر اور ضروری ہے کہ اس کے بغیر جاری مضمون کی تفہیم ادھوری ہونے کے سبب دشوار ہوگی کیونکہ برصغیر میں علم حدیث کے ارتقائی سفر کی تاریخ و تذکرہ اس علاقہ میں اس میدان کے عماد العلم کہلائے جانے والی دو قد آور و باعظمت شخصیات کے ذکر سے ہو کر ہی گذرتا ہے، بلحاظ عہد پہلی شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ہے اور دوسری اصالت مآب شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ہیں۔

برصغیر میں علم حدیث کے ارتقائی سفر کے ابتدائی نقوش کے تاریخی پس منظر کا اختصار بایں طور سامنے آتا ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب اور ان کے بعد خلیفۂ

ثالث حضرت عثمان غنی رضوان اللہ علیہما کے ادوار کی تاریخ میں ہندوستان میں نجد و حجاز سے صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیت تجار کے سلسلۂ آمد و ورود کا مستند تذکرہ ملتا ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت و تربیت کی بدولت احادیث کا حفظ و عمل ان کی سرشت میں مکمل طور پر اس طرح سے نفوذ کیے ہوئے تھا گویا کہ اس کے بغیر ان کے نزدیک حیات دنیوی کا تصور ہی خام تھا، چنانچہ ان کے اس ناحیۂ عمل کا تجزیاتی نتیجہ یہی ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کے ورود کا آغاز دور خلافت راشدہ میں ہی ہو چکا تھا، اگرچہ اس دور میں باقاعدہ تدریسی انداز کی کسی صورت کی کوئی سند نہیں ملتی ہے لیکن یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیض صحبت کی خاصیات اور سرزمین ہند پر ان نو وارد اصحاب رسول کا تعلیمات حدیث کے مطابق انسانی بنیادوں پر مساویانہ تعامل اخلاق نے یہاں کے مقامی باشندوں کے فکر و مزاج پر گہرے اثرات مرتب کیے، اصحاب علم نے اس حکمت علمی کو ہندوستان کی سرزمین پر حدیث کی عملی تدریس کی خشت اساس کا عنوان دیا ہے، جس کو فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ کی خطے میں آمد سے مزید علمی و عملی تقویت حاصل ہوئی اور تاریخی اسناد کے حوالے سے یہ سلسلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی خودمختار اور مستقل بالذات سلطنت کے قیام تک دراز ہوا، البتہ عہد بہ عہد جزوی اور وسیع تر پیمانے پر سیاسی و عسکری منظرناموں کی تبدیلی کے بشمول اسباب دیگرے یہ بھی اثرات مرتب ہوئے کہ مسلمانوں کے علمی روابط حجاز و شام سے پہلے کے بمقابلہ قدرے کمزور ہو کر عراق کے ساتھ مضبوط ہوئے جس کے نتیجہ میں عرب کے دیگر علاقوں کے بمقابلہ عراق سے بڑی تعداد میں لوگ آ کر ہندوستان میں آباد ہوئے، ان میں محدثین اور اہل علم کی بھی بڑی تعداد شامل تھی، ان محدثین کے جزوی احوال و تذکرے تاریخ کے صفحات پر غیر مرتب انداز میں مجملاً ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ذریعہ علم حدیث کی نشر و اشاعت کی کوششیں مقدور بھر جاری رہیں، البتہ نہ ہی تو اس خطے میں اس دور کے کسی نمایاں تصنیفی و تحقیقی کام کی کوئی مستند روایت ملتی ہے اور

نہ ان میں سے بیشتر حضرات اہل علم کا کوئی مفصل تذکرہ دستیاب ہے، تاہم اس حوالے سے قلت معلومات کے باوجود اصحاب علم نے اس دور کو برصغیر میں علم حدیث کے ارتقائی سفر کے حوالے سے اولین عہد کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی باقاعدہ سلطنت قائم ہونے کے بعد بڑی تعداد میں مختلف علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے ارباب علم وفن کا اس خطے کی جانب رجوع میں قابل ذکر اضافہ کے تاریخی شواہد موجود ہیں، سلاطین اور امرائے سلطنت کی جانب سے علوم وفنون کی قدر دانی قدر افزائی کے دور میں اس وقت بڑی تعداد میں مختلف علوم وفنون کے متخصصین ماہرین فن اور علمائے کرام نے دنیا کے الگ الگ ممالک سے ہجرت کر کے برصغیر کے مختلف علاقوں میں سکونت اختیار کی، ان میں علم حدیث کے ماہرین کا بھی ایک معتد بہ اضافہ شامل تھا، البتہ اس دور کے رجحان کی ایک بڑی تبدیلی یہ نوٹ کی گئی کہ مسلمانوں کے علمی روابط جزیرۃ العرب خصوصاً نجد وحجاز اور شام ویمن کے علمی وثقافتی مراکز سے کٹ کر عجمی دنیا سے قائم ہو گئے، اگر اس سلسلے میں ظاہری اسباب ومحرکات کے حوالے سے بات کی جائے تو نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ خلافت عباسیہ کا رو بہ زوال ہو کر اسکا خاتمہ ہونا اور عالم اسلام پر اس کی گرفت کا کمزور ہو جانا جبکہ اس کے متبادل کے طور عجم کی سیاسی وعسکری برتری کا زور آور ہونا اور طاقت ووسعت کے جدید مظاہر کا سامنے آنا اور خطے میں ابھرتے نئے رجحانات اور مضبوط سیاسی وعسکری قیادت کی بنیاد پر سلطنت عثمانیہ کے قیام جیسے عوامل کو بھی اس حوالے سے بنیادی محرکات میں شامل سمجھا گیا ہے، نیز برصغیر میں عہد سلطنت کہلائے جانے والے اس دور میں مختلف علوم فنون کے ماہر حضرات نے ایران وافغانستان، سینٹرل ایشیا اور جنوب ایشیا کے دیگر ممالک سے ہندوستان کی جانب رخ کیا اور ان کے روابط وہاں کے علمی مراکز سے مضبوط بنیادوں پر بدستور قائم رہے جس کے سبب ہندوستان میں سینٹرل ایشیا کی علمی ودینی روایات کو فروغ حاصل ہوا جن کی مذہبی روایات میں اصول فقہ، منطق، کلام اور عقلیات کا زیادہ رواج تھا، جس کا

اثر یہ ظاہر ہوا کہ اس دور میں نہ صرف یہ کہ علم حدیث پر نسبتاً زور کم ہی ہو گیا بلکہ ایک دور ایسا بھی گذرا جس میں محسوس ہوتا تھا کہ شاید برصغیر کے مرکزی علمی مقامات سے علم حدیث تقریباً ختم ہو گیا ہے، چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ منجملہ دیگر سیاسی اسباب کے یہ محرکات بھی عرب کے علمی مراکز سے انقطاع میں عامل و کارفرما رہے تا آنکہ مابعد مغلوں کے ابتدائی دور اکبری و جہانگیری میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحریکی و علمی جہود کے تسلسل سے ہندوستان میں علم حدیث کو ایک مرتبہ پھر زور حاصل ہوا اور علمی حلقوں میں حدیث کے فروغ اور رجحان میں قابل ذکر تبدیلی آئی، حضرت شیخؒ کا ذہنی اور فکری اٹھان مدۃ العمر اپنے والد کی نصیحت کے زیر اثر پروان چڑھا کہ ملی بحث ومباحث میں جنگ صرف اپنے نفس سے کی جاتی جبکہ علمی مسائل میں محبت والفت میں ڈھلا لب ولہجہ فریق مخاطب کے فکری رجحان میں تبدیلی کے حوالے سے عموماً تیر بہ ہدف ثابت ہوتا ہے، والد کی یہ نصیحت ان کے فکر وحیات اور تحریک عمل کا جزو بن گئی تھی، عہد اکبری کے دور الحاد میں بحث ومباحثہ، تکفیر و تضلیل کے متعدد ہنگامے برپا ہوئے یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر کے غیر متعین افکار نے دین الٰہی کی شکل اختیار کر لی تھی، ملک کا سارا مذہبی ماحول خراب ہو چکا تھا، شریعت وسنت سے بے اعتنائی عام ہوئی تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کے اقوال ''می فرمودند'' کے عنوان سے جمع کئے تھے۔ جگہ جگہ ''احمدی ترکش'' کہہ کر فقہ اسلامی کا مذاق اڑایا گیا تھا، حد تو یہ کہ مدرسے اور خانقاہیں تک اس مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ حجاز سے واپسی پر شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے مسند درس وتدریس دہلی میں بچھا دی، اس زمانے میں درس حدیث کی جامعیت کے لحاظ سے شمالی ہند کا یہ پہلا مدرسہ تھا جو دہلی گیٹ سے آگے باغ مہندیان کے قریب واقع تھا، اس دور کی سلطنت مغلیہ کے مہیب الحادی عہد میں اول تو اس مدرسے کا قیام ہی کسی کارنامے اور جرأت و ہمت کے مظہر سے کم نہ تھا، مزید براں وہاں سے شریعت وسنت کی آواز کا باوقار اور مؤثر انداز میں بلند کیا جانا اکبر کے دین الٰہی کے عنوان سے بچھائے گئے جال کو کمزور کرنے

کے حوالے سے تازیانہ تھا، شیخ محدثؒ کا یہ دارالعلوم اس طوفانی دور میں شریعت اسلام اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی پشت پناہ تھی، ہر چہار جانب فکری گمراہی کے منڈلاتے بادل اور مخالف طاقتیں اس کے بام و در سے آ کر ٹکرائیں، لیکن شیخ محدثؒ کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی، ان کے عزم واستقلال نے وہ کام انجام دیا، جو ان حالات میں ناممکن نظر آتا تھا مگر شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ جس طرح خود شب و روز کام میں مشغول رہتے تھے۔ اپنے تلامذہ اور عقیدت مندوں کے لئے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ بے کار نہ بیٹھیں، وقت کی قدر کریں اور سرگرم عمل رہیں اور اس عمل کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں، اس مدرسہ کا نصاب تعلیم دوسرے مدرسوں سے مختلف تھا، یہاں قرآن وحدیث کو تمام علوم دینی کا مرکزی نقطہ قرار دے کر تعلیم دی جاتی تھی، یہ اپنے دور میں ملک کا علم حدیث میں سب سے بڑا حلقہ شمار ہوتا تھا جہاں سے ہزار ہا ہزار طالبان علم نبوت کے خوشہ چیں پیدا ہوئے اور بیشمار اہل علم نے کسب فیض کیا جس کے علمی ومعنوی اثرات کو پھیلنے سے روکنے میں ذات حق جل مجدہ کی استمداد و اعانت سے دہلی کی حدود عاجز وقاصر ثابت ہوئیں، شیخ کے فیض یافتہ تلامذہ نے ملک کے متعدد مقامات پر اسی طرز ومنہج پر حلقہ ہائے دروس قائم کیے جس سے علم حدیث کے رجحان کو عوامی سطح پر نہایت قابل ذکر فروغ حاصل ہوا اور اسی عہد کے پس وپیش کی تاریخ نے شیخ محدث کے اس کارنامے کو احیائے علوم قرآن وحدیث کے تجدیدی کارنامے کی حیثیت سے درج کیا ہے، اس کے علاوہ جو تصنیفی، تالیفی، اصلاحی، انقلابی اور تحریکی کارنامے اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات سے انجام دلوائے اس میں ہر ایک کی تفصیل ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے جو کہ زیر نظر موضوع کی بحث سے جدا ہونے کے سبب محذوف ہے۔

جیسا کہ ماقبل بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ وسط ایشیا کے فکری رجحان کے غلبہ کی وجہ سے ہندوستان میں عقلیات کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور منطق وفلسفہ کی گہری اور مفصل تعلیم کے سبب منطق وفلسفہ کے رنگ و آہنگ کے اثرات فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم

تک پر واضح انداز میں نظر آنے لگے، چنانچہ اصول فقہ کے موضوع پر جو کتابیں برصغیر میں تصنیف ہوئیں ان میں سے اکثر کا اسلوب تحریر منطق وفلسفہ کے انداز میں ڈھلا ہوا ملے گا جو کہ برصغیر میں رائج تھا، لہٰذا شیخ عبدالحق محدثؒ کے بعد گذرتے وقت کے ساتھ فکری رجحان میں واضح تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں اور ایک مرتبہ پھر علم حدیث پر توجہ کمزور پڑگئی جس کی نبض شناس تشخیص کا تجدیدی کارنامہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بعون اللہ اخلاص نیت کے ساتھ بایں طور انجام دیا کہ ان کا جاری کردہ سلسلۂ فیض تاحال نہ صرف برصغیر کی درسگاہوں میں بلکہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں رائج ہے اور بلاخوف تردید اس مبنی بر تاریخی حقیقت کے بارے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی اس منہج اساس پر علم حدیث کی تعلیم ہورہی ہے اور ہر وہ طالبعلم جو علم حدیث حاصل کررہا ہے یا ہر وہ استاذ جو علم حدیث کا درس دے رہا ہے وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے دائرۂ ممنون کرم سے باہر نہیں ہے، اگر اس حوالے سے جائزہ لیا جائے اور اہل علم اس بات کو مبالغہ پر محمول نہ کریں تو اندازہ یہ ہے کہ برصغیر اور دنیا کے دیگر خطوں کے وابستگان حدیث کے ۹۹ر فیصد وہ تمام طلبا جو علم حدیث حاصل کرتے ہیں اور وہ تمام اساتذہ، تدریس حدیث جن کی مصروفیات ومشغولیات کا جزو لاینفک ہے وہ سب کے سب اس راست وصالح روایت سے وابستہ ہیں، محدث دہلویؒ کی عمومی تعلیم وتربیت سے لیکر اور خصوصی طور پر علم حدیث کے گہرے درک وتعمق کی صلاحیتوں کو زیبائی واونچائی کے تحیر خیز مرحلے تک پہونچنے میں ابتدائی نقوش اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ کے زیر شفقت ونگرانی ان ہی کی فکری اساس کے مرہون منت ہیں، اس کے علاوہ علم حدیث کے فنی اسرار ونکات کی ابتدائی تحقیق وجستجو کے ذوق کی بالیدگی کا ذریعہ اس دور کے معروف محدث حاجی شیخ محمد افضل صاحبؒ کے شرف تلمذ کا حاصل ہے جن کے حلقۂ درس حدیث سے سیالکوٹ اور اس کے اطراف کا بیشتر علاقہ منور تھا، بعدازاں عمومی تعلیم اور خصوصاً درس حدیث کے ارتقائی مراحل سر کرنے کے لیے مکہ مکرمہ کا رخ کیا جہاں اس

دور کے مشہور محدث حضرت شیخ ابو طاہر الکردیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا جن کے حلقۂ درس کی مقبولیت کے شہرہ سے دنیائے عرب کے اکثر علمی مجالات معمور تھے اور دمشق و بغداد کی بلند پایہ علمی مجالس میں ان کا تذکرہ عام تھا، حضرت محدث دہلوی نے حدیث میں شیخ ابو طاہر الکردیؒ کے علمی ترفع و تعمق مطالعہ کے اثرات کو بایں طور قبول کیا کہ ان کی علمی و عملی زندگی سمیت بالخاص درس حدیث اور اس کے فنی اسرار و نکات کے بیان و تحریرات پر اپنے استاذ کے مرتفع علم کے گہرے اثرات کے واضح نقوش کا پتہ چلتا ہے، علی کل حال تفصیلات سے قطع نظر حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی و عملی پوری زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ اپنے عہد کے معاشرتی پیچ وخم کی اصلاحی تحریکات کی ہمہ جہت مصروفیات کے علی الرغم حدیث نبوی ﷺ کی تشریح و تفہیم، تدریس واشاعت، مدافعت ونصرت اور حمایت وتائید میں مصروف رہے، ان کی اس مخلصانہ جہود نے ملک کے طول و عرض کی وسعتوں کو عبور کرتے ہوئے دہلی کو علم حدیث کے ایک مضبوط و مستحکم مرکز علم حدیث کی حیثیت سے دنیا میں متعارف کرایا جہاں صرف ملک کے طول وعرض سے ہی نہیں بلکہ عرب و فارس اور سمرقند و بخارا تک سے طالبان علم حدیث کشاں کشاں کھنچے چلے آرہے تھے، شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کے علوم ومعارف اور شعور وآگہی کے صلبی وارث وامین حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے اس مسند کو رونق بخشی اور اس طرح حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ سلسلۂ فیض وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا چار نسلوں تک دراز ہوا، بعد ازاں خانوادۂ ولی اللّٰہی سے کسب فیض کرنے والے لائق و فائق تلامذہ کی جماعت نے عہد بہ عہد اپنے اپنے علاقوں اور خطوں میں وہاں کے حسب حال اس مبارک سلسلہ کے احیاء کی تحریک کو جاری کیے رکھا، تا آنکہ غیر ملکی استبدای قوتیں ہندوستان میں غلبہ پاتی چلی گئیں جو کہ مسلمانوں کے قریب ہزار سالہ دور اقتدار کے خاتمہ پر منتج ہوا، لیکن قبل اس کے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا قائم فرمودہ زائد از سو سالہ نظام درس حدیث استبدادی قوتوں کی خوں چکاں عصبیت وانتقام کے فتنہ آشوب دور میں مکمل

تباہ کاریوں کا شکار ہو کر نابود ہو جاتا بارگاہ ذوالجلال سے عالم تکوین میں اس سلسلۂ ولی اللہی کی حفاظت واحیاء اور اس کے باوقار نشأ ۃ ثانیہ کا فیصلہ ہو چکا تھا، جسکا شرف رب کریم کے فضل واحسان سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم ومعارف کی وسعتوں اور رفعتوں اور گہرائیوں کے محرم اسرار اور علم حدیث میں سلسلۂ ولی اللہی کے مکتب علم کے وارث وامین حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ محدث دہلوی کے شاگرد رشید اور اپنے دور کے سرخیل جماعت حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند کے حصے میں آیا اور ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو بتوفیق رب کریم انہوں نے اپنی مخلص ترین رفقائے کار کی دردمندانہ ومخلصانہ جہود کے شانہ بہ شانہ دہلی کے مرکز حدیث کی آفتابی ونورانی کرنوں کو دارالعلوم دیوبند کے قیام سے مربوط کر کے دیوبند کی سرزمین کو ایک عظیم شرف سے ہمکنار کرتے ہوئے نہ صرف منتقل ہی کیا بلکہ حدیث اور متعلقات حدیث کے علم وفن کو صدیوں کا تحفظ فراہم کر دیا، **فللّٰہ الحمد والشکر**

اس عہد کے انتشار آمیز منظر نامے میں قیام دارالعلوم دیوبند کے وسیع تر مقاصد اور مطلوب نصاب تعلیم کے حوالے سے علم حدیث کی مرکزیت کے زیر اثر دیگر متداول علوم بھی اپنی مکمل اہمیت وجامعیت کے ساتھ ایک ہی جگہ پر جمع کیے جانے کے متقاضی تھے، جبکہ اس دور کا تعلیمی ذوق ومزاج کسی ایک جگہ پر کسی ایک علم وفن سے مرتب ومشہور تھا، دہلی کو علم حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی جبکہ علم الفقہ واصول فقہ میں دلچسپی رکھنے والے طلباء لکھنؤ کا رخ کرتے تھے، اسی طرح معقولات کی تعلیم کے لیے خیر آباد کو مرکزیت کا مقام حاصل تھا، دارالعلوم دیوبند کے وسیع تر مقاصد کے تناظر میں نیز اس کے دوررس اثرات اور متوقع نتائج کو مستقبل میں مزید پائیدار اور مفید وخوشگوار بنائے جانے کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بانئ دارالعلوم دیوبند نے اپنے وسیع الفکر نقطۂ نظر کے زیر اثر اپنی جماعت رفقائے کار کے مخلصانہ مشورے سے علم حدیث کے ساتھ مذکورہ بالا مسالک کو بھی لاکر دارالعلوم دیوبند میں جمع فرمادیا، تاریخ کے حوالے سے ملک میں

مسلمانوں کے برخلاف متحارب و متعصب قوتوں کے ذریعہ برپا کیے جانے والی شکست و ریخت کے عمل سے سرمایۂ ملت اداروں کی تباہی و بے اثری کے عمل نے بانی دارالعلوم کے اس فیصلے کو مستقبل شناسی پر مبنی الہامی فیصلہ ثابت کیا، بصورت دیگران مسالک کو بھی پیش آمدہ واقعات و حوادث کے نتیجہ میں عوامی سطح پر عدم توجہی کا شکار ہوکر بے اثر ہوجانے کا خدشہ لاحق ہو چلا تھا۔

سرخیل جماعت حضرت حجۃ الاسلام رحمہ اللہ کی مدبرانہ قیادت میں جماعت شرکائے کار کی مبنی بر اخلاص جہود اور عنداللہ قبولیت کے یقین سے معمور حسن نیت و حسن عمل نے دیگر متعدد علوم و فنون سمیت ادارہ کو بہت مختصر سے عرصہ میں علم حدیث کی مرکزیت کے مقام پر پہنچا دیا اور توقع سے کہیں زیادہ کم وقت میں حسن شہرت نے چہار دانگ عالم میں طالبان علم نبوت کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور پھر گذرتے وقت کے ساتھ ملک کے شرق و غرب اور شمال و جنوب ہی نہیں بلکہ عرب و عجم کے متعدد ممالک سے سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں علم حدیث و سنت اور فقہ و معقولات کے تشنہ و آرزومند جماعت در جماعت خراماں خراماں دہلی کے بعد اس جدید مرکز کی جانب متوجہ ہونے لگے، اور یوں دارالعلوم دیوبند کے مسند حدیث سے فیض یافتہ ملکوتی صفات محدثین کے ایک درخشاں سلسلہ کی علمی و عملی نورانیت نے ایک عالم کو منور کردیا۔

اسی مسند حدیث کے رنگ و نور کے ایک گوہر نایاب نے خاندانی ذہانت، ذوق علم کی رفعت اور اپنے فکر کی وسعت سے ایک طویل ترین مدت تک اپنے تلامذہ کو فن حدیث کی نت نئی جہات سے متعارف کرایا اور دنیا نے اس درویش صفت محدث کبیر کو اپنے عہد کے امام المحدثین کی حیثیت سے حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے نام سے جانا جن کا مفصل تذکرہ تو باقاعدہ ایک تصنیف کا متقاضی ہے، یہ مختصر مضمون اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے جس کی تفصیل کا جزوی اجمال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے تاریخ ساز علمی افق پر جن نابغۂ روزگار شخصیات کی منور خدمات سے مزین اور تاریخ کے سنہرے

حروف سے منقش لوح علم و عمل روشن اور ضیاء بار نظر آتی ہے اس میں اپنے عہد کی ایک عظیم تر اور ممتاز ترین شخصیت امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے نام نامی اسم گرامی کو حاصل شدہ متعدد علمی امتیازات واختصاصات سمیت خصوصاً علم حدیث اور اس کے متعلقہ فنون میں بایں طور متفق علیہ سند کا درجہ حاصل ہے کہ فن حدیث اور اس کے دیگر متعدد متعلقات علم کی جامعیت پر عمیق ترین درک و مطالعہ اور اس کے فنی شذرات پر مجتہدانہ گرفت کے باب میں علامہ کشمیریؒ کا شمار تاریخ کے صفحات پر متذکرہ جماعت محدثین سابقین کی عظیم تر شخصیات کی فہرست میں شامل نظر آتا ہے جن کو ہر دور کے علماء میں سند اعتبار حاصل رہا جو بجائے خود جامعیت کے ہمہ جہت مفہوم سے معنون ہے، مختلف علمی و عملی جہات سے حقیقت کی واقعیت کے تناظر میں اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کے عہد کے پس و پیش میں اس حوالے سے بر اعظم کے معدودے چند افراد ہی ان اختصاصات کے باب میں صف اول کے شاہوار کے طور پر نظر آتے ہیں، علامہ کشمیریؒ اپنے اخلاف کے لیے ہی کیا، بلکہ اپنے معاصرین کی صف میں بھی محض ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کی ڈیڑھ سو سالہ روشن علمی تاریخ میں ایک ایسی علامت و شناخت کی دلیل اور مظہر ہیں جس نے اپنے اختصاصی علم وفن کے راستوں میں آنے والے بعض دشوار گزار مراحل کو اپنی اعلیٰ استعداد کی بنیاد پر عقلی ونقلی مستدلات کی روشنی میں بایں طور سہل الفہم بنایا کہ جس نے ان کے تلامذہ اور بعد کے آنے والے اساتذہ و طلباء کو اصل مقصود و مطلوب تک رسائی کے حصول میں معاونت کی راہ کو ہموار کیا ہے۔

ماہنامہ دارالعلوم کے سابق مدیر اور علامہ کشمیریؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ نے امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی سوانح، حالات اور خدمات سے متعلق مضامین پر مشتمل ''حیاتِ انورؒ'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی تھی، جو آج سے تقریباً چالیس سال قبل شائع ہوئی تھی، اس کے ابتدائی تعارفی صفحات میں علامہ کشمیریؒ کے نقش ثانی اور ان کے شاگرد رشید محدث العصر حضرت علامہ یوسف

بنوریؒ رقم طراز ہیں کہ ''علمی دنیا کی تاریخ میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات وعلوم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دنیا اُن کے کمالات سے واقف بھی ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق میں اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع سرزمین میں کتنی ایسی ہستیاں گزری ہوں گی جن کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہو۔ اور یہ بھی ایک مسلَّم امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کی محض عددی کمیت واکثریت کی بنا پر علامہ عصر بن جائے ایسا نہیں ہوسکتا، علماء اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسے بیش بہا موتی موجود ہیں جو کبھی کسی تاجِ مُرصَّع کی زینت نہیں بنے۔ قدرت کی معدنی کائنات میں ایسے بے بہا جواہرات موجود ہیں کہ ''کوہِ نور'' نامی ہیرے اس کی چمک وتابانی کے سامنے ماند پڑ جائیں: وَإِنْ مِّنْ شَئٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔''(۱)

حافظِ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے محققِ عصر جن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اُمتِ محمدیہ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گزرا، اگر ان کی کتاب ''الاحکام'' یا ''کتاب الإمام شرح الإمام'' کی ناتمام نقول کتابوں میں نہ ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا۔ کیا کوئی گمان کرسکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصریؒ اپنی کثرتِ مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العیدؒ جیسے محققِ روزگار سے سبقت لے جائیں گے؟

بسااوقات دفترِ تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، فیض یافتہ معاصرین اور چشم دید کمالات کا مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے وہ ان کے مؤلفات کے صفحات پڑھنے والوں کے لیے اس کا پورا احساس بے حد مشکل ہے۔ پھر قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماء امت اور اربابِ ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقلِ نارسا حیران رہتی ہے، کوئی دینی خدمت، تعلیم

(۱) ترجمہ: اور کوئی (ضرورت کی) چیز ایسی نہیں ہے جس کے ہمارے پاس خزانے موجود نہ ہوں، مگر ہم اس کو ایک معین مقدار میں اتارتے ہیں۔ (سورۃ الحجر: ۲۱)

وارشاد اور افادہ وافاضہ کے پیشِ نظر تالیف وتصنیف میں مشغول نظر آتا ہے، کوئی اصلاح وتربیت کی حرص کی خاطر حلقۂ صحبت واستفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ خمول پسندی وتواضع وشہرت سے نفرت کی بنا پر گم نامی کو اپنا شیوہ امتیاز بنائے ہوئے ہے، نہ نظامِ قدرت کے عجائبات کی انتہاء ہے، نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار ہوسکتا ہے، غرض یہ کہ حضرت امام العصر کشمیری رحمہ اللہ نے باوجود اس محیر العقول جامعیت، تبحُّر، کثرتِ معلومات، وسعتِ مطالعہ، حیرت ناک استحضار وقوتِ حفظ کے شوق سے کبھی تالیف وتصنیف کا ارادہ نہیں فرمایا اور اُمت کے دل میں یہ تڑپ رہی کہ کاش! کسی اہم کتابِ حدیث پر کوئی خدمت یادگار چھوڑ جاتے، محترم جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا ایک بلیغ جملہ اس حقیقت کے چہرے سے ماہنامہ معارف (غالباً جون ۱۹۳۳ء) میں پوری نقاب کشائی کرتا ہے، فرماتے ہیں کہ ''مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کے اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں'' حضرت بنوریؒ دار العلوم دیوبند کے بلند پایہ علمی وقار کی مشخص جماعت کی صف اول میں شامل شہ سوار اور علامہ کشمیریؒ کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا بدر عالم صاحب کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ ''ایک دفعہ انہوں نے عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرمادیتے تو پس ماندگان کے لیے سرمایہ ہوتا، غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ: ''زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی خدمت بکتی رہے۔'' ہاں! دینی اور کچھ علمی شدید تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل یادگار چھوڑ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ علمی دنیا کچھ ان کی علمی تحقیقات وخصوصیات سے مستفید رہے۔ نیز ان کے تلامذہ واصحاب کی وساطت سے بھی اچھا خاصا اُن کے علمی کمالات کا ذخیرہ اُمت کے ہاتھ آیا۔ اس طرح یہ محققِ یگانہ عصر حاضر، جامع الکمالات امام دنیا میں علم کا آفتاب وماہتاب بن کر چمکا۔ میرے ناقص علم میں غیر منقسم ہندوستان کی سرزمین میں جامعیت

وتبحُّر کے اعتبار سے ایک حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ اوران کے بعد حضرت امام العصر کشمیری رحمہ اللہ کی نظیر نہیں ملتی ہے۔علامہ بنوریؒ کے بیان کے مطابق ’’جامعیت ودقتِ نظر وسرعتِ انتقالِ ذہنی وکثرتِ آمد کی بنا پر طبیعت اختصار کی عادی بن گئی تھی، معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے بیان فرمایا کرتے تھے، حدیث کے لطائف میں جب علمِ عربیت وبلاغت کے نکات کا بیان شروع ہوجاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علم عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کا اصلی موضوع ہیں، مفید ترین وعمدہ ترین مآخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے جن سے محققانہ شروحِ حدیث کا دامن بھی خالی ہوتا تھا، افسوس کہ اختصار کی وجہ سے میں اس کی مثالیں پیش نہیں کرسکتا، اسی لیے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور بہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں، علامہ کشمیریؒ کے مختصر سے مختصر رسالے سے قرار واقعی تفہیم لیے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ضروری ہے، ان تصانیف کی صحیح قدردانی وہی عالم کرسکتا ہے جس کو کسی موضوع کے بیان میں مشکلات پیش آئی ہوں اور وہ پورے متعلقات کی چھان بین کرچکا ہو۔‘‘

کسی بھی شخصیت کے محاسن کی واقعیت کو جانچنے سمجھنے اور پرکھنے کے لیے معاصر شخصیات کی تصدیق وگواہی کی اہمیت کو تمام علمی مجالات میں تسلیم کیا گیا بلکہ علم اسماء الرجال میں تو معاصر تصدیقات اساسی فہرست میں شامل ہیں، چنانچہ اس کسوٹی پر علامہ کشمیریؒ کی شخصیت کی بلندی وزیبائی کا ایک الگ ہی جہت سے تعارف سامنے آتا ہے، یہاں علامہ کشمیری کے چند ایک ان بلند علم معاصرین کی آراء کا ذکر ہے جو بذات خود اپنی ذات میں نہ صرف ایک مکمل انجمن ہی ہیں بلکہ امت کے ایک وسیع ترین حلقۂ اثر میں منارۂ علم وعمل کی حیثیت سے مستند قائدانہ کردار کے مالک تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ’’میرے نزدیک حقانیت اسلام کے دلائل میں سب سے بڑی دلیل انور شاہ کشمیری کا امت مسلمہ میں وجود ہے۔‘‘

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ’’واقعی شاہ صاحب آیت من آیات اللہ ہیں۔‘‘ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے الفاظ ہیں کہ ’’میرے جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کرسکتا ہے، البتہ صرف اتنا کہہ سکتا ہے کہ صحابۂ کرام کا قافلہ جارہا تھا یہ پیچھے رہ گئے۔‘‘ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ کی وفات پر ان الفاظ میں خراج عقیدت ومحبت پیش کیا کہ ’’مجھ سے اگر مصر وشام کا کوئی شخص پوچھتا ہے کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین، ابن دقیق العیداور سلطان العلماء شیخ عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کرکے کہہ سکتا ہوں ہاں دیکھا، کیونکہ صرف زمانے کا تقدم وتاخر ہے، ورنہ علامہ انور شاہ بھی چھٹی یا ساتویں ہجری میں ہوتے تو آپ کے مناقب ومحامد بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے، میں محسوس کررہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین، اور سلطان العلماء کا آج انتقال ہوا ہے‘‘۔ ایسے ہی علامہ اقبالؒ لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ ’’اسلام کی ادھر کی پانچ سوسالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔‘‘

مثل مشہور ہے کہ کمال کو کبھی زوال نہیں ہے، صاحب کمال اپنی متواضعانہ طبیعت سے مجبور ہوکر اپنی زندگی میں اپنی ذات کو کتنا ہی مخفی اور پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرلے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے صالح اخلاف میں ایسے اصحاب علم کو پیدا فرماتے رہتے ہیں جن کے ذریعہ ان کے کمالات واسرار عہد بہ عہد نسلوں میں آشکارا ہوتے رہتے ہیں اور ہر ایک گذرتے عہد میں نسل بہ نسل علم کے اس چشمۂ صافی کی روحانیت ونورانیت سے اپنی علمی کاوشوں کو مصفی ومجلی کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اس پس منظر میں علامہ کشمیریؒ کی حیات و خدمات پر برصغیر میں گذشتہ دہائیوں میں ہونے والے تحقیقی کاموں کو علمی دنیا میں قدر کی نظر سے دیکھا گیا ہے، زیر مطالعہ کتاب کے مصنف دارالعلوم وقف دیوبند کے نائب مہتمم واستاذ اور ادارہ کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ڈائریکٹر جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب کی یہ کاوش احادیث وسنن کے حوالے سے حضرت

علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی عظیم الشان اور رفیع القدر تحقیقی خدمات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت اور ملیشیا انٹرنیشنل یونیورسٹی کوالالمپور سے ''الشیخ المفتی محمد شفیع العثمانی فقیها للنوازل والواقعات ''کے زیر عنوان لکھے جانے والے رسالہ پر 2012ء میں بحمد اللہ ماجستیر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد PHD کے لیے عزیز موصوف سلّمہ، کو مذکورہ یونیورسٹی سے ہی ''الامام انور شاہ کشمیری و مساہمتہ فی السنۃ وعلومہا''عنوان کے تحت 2016ء میں امتیازی کامیابی کے ساتھ ڈگری تفویض کی گئی، عصر حاضر کے جدید مروّجہ اور دنیائے علم کے بین الاقوامی مسلمہ اصول تحقیق کے امتیازات سے مرصع اس رسالہ کو تحقیقی ذوق ومزاج رکھنے والے متعدد اصحاب علم نے بلحاظ عنوان واسلوب بحمد اللہ قدرومنزلت کی نظر سے دیکھا اور سراہا، رسالۂ مذکورہ کو باقاعدہ تصنیفی اسلوب کے قالب میں ڈھالنے کے لیے وقت طلب وباریک بین مطالعہ اور اس کی روشنی میں مزید اہم اور ضروری اصلاحات کی تکمیل مصنف کی ہمہ جہت ادارتی مصروفیات کے پیچ تاخیر کا سبب بنی رہی، لیکن ذات حق جل مجدہ کی جانب سے عالم تکوین میں ہر کام کا ایک وقت معین ہے اور اسی تعیین وقت سے کام میں برکت اور اس کی افادیت مربوط ہوتی ہے، زیر مطالعہ تصنیف کے خدوخال جن موضوعات سے عبارت ہیں اس کا اجمالی اور اساسی خاکہ علامہ کشمیریؒ کا حدیث کے متون وشروح کی وسیع معلومات پر بلیغ نظر، رواۃ کے طبقات، رجال وتاریخ، جرح وتعدیل، روایت ودرایت کی متعدد انواع واقسام اور مقاصد مدرکات جیسے موضوعات پر محیرانہ استحضار کی بنیاد پر گہری نظر کے علاوہ خارق عادت حافظہ، ذہانت وذکاوت، مکارم اخلاق، خصائل حمیدہ، تواضع اور زہد وتقویٰ کے ساتھ صبر واستقامت سمیت خزائن علمیہ کی امثال جیسے امتیازات واختصاصات کے تذکرہ کو محیط ہے جس کو مصنف نے کمال سلیقہ کے ساتھ عرق ریز محنت سے بایں طور ترتیب دیا ہے کہ توقع کی جاتی ہے کہ تصنیف ہذا اصحاب علم وفضل

کے نزدیک دنیا کے علمی مجالات میں ان شاء اللہ پذیرائی کی مستحق قرار پائے گی۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے قیام کے اوّلین اہم مقاصد میں اکابر واسلاف کے بیش قیمت گنجینہ علوم و معارف اور ان کی خدمات جلیلہ سے مختلف رائج الوقت زبانوں جیسے عربی، انگریزی اور دیگر اہم زبانوں میں تراجم اور علم کے ان مصادر اور ان کے تحقیقی دراسات سے دنیا کو متعارف کرانا ایک اہم بنیادی اہداف کا حصہ ہے، بحمداللہ و بفضلہٖ اکیڈمی کے گذشتہ سات سالوں میں دارالعلوم وقف دیوبند سے وابستہ اکابرامت کی مخلصانہ و مستجاب دعاؤں کے زیر سایہ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کی مصنفات سمیت حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اور دیگر اکابر واسلاف کی بیش قیمت تصنیفی خدمات جلیلہ عزیزم مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی کی بیدار مغز قیادت اور عرق ریز شبانہ روز جہود کی زیر نگرانی ادارہ کے مؤقر اساتذۂ کرام کی لائق پذیرائی محنتوں نیز مختلف فرائض سے وابستہ اکیڈمی کی جواں سال جماعت کی مخلصانہ مساعی نے شعبۂ بحث و تحقیق کے اس بنیادی ہدف کو شرمندۂ تعبیر کیے جانے میں لائق ستائش کردار ادا کیا ہے جس کے نتیجہ میں تاحال قریب تیس کتابیں منصۂ شہود پر آ کر ملک و بیرون ملک کی معروف دینی واسلامی اور ملی دوائر واجتماعیات و شخصیات کی جانب سے قرار واقعی توصیفی اعترافات کی سند اعتبار کا اعزاز حاصل کر چکی ہیں، اکابر امت کی ہمہ جہت جہود و خدمات سے کما حقہ نسل نو کو متعارف کرانا بحالات موجودہ حجۃ الاسلام اکیڈمی کی سطح سے جماعتی مقاصد کے اعلیٰ نصب العین کے ترجیحی ہدف کا اہم ترین حصہ ہے، عزیز موصوف کی زیر مطالعہ بیش قیمت کاوش بھی ان شاء اللہ اسی سلسلے کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا، ذات حق جل مجدہ کی بارگاہ ذوالکرم میں دست دعاء دراز ہے کہ حق تعالیٰ اس علمی کاوش کو بھی قبولیت و مقبولیت کے شرف سے سرفرازی فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین..

و ما علینا إلا البلاغ المبین

اپنی مثال آپ تھے اور بے مثال تھے

(حکیم ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی)

انسانی زندگی کے مقاصد میں شخصیت کی تعمیر اور استحکام نہایت اہمیت کا حامل مقصد ہے، جیسے حیات انسانی اپنے پیچھے ہزاروں برس کے مختلف مراحل چھوڑ آئی ہے، اسی طرح اس کے آگے بھی زندگی کے ابد تک پھیلے ہوئے مختلف امکانات ہیں اور انسان ان دونوں کے درمیان نہایت ہی مختصر ترین مگر ساتھ ہی نہایت نازک اور اہم ترین کڑی ہے، ہزاروں برس کی سابقہ زندگی اور اسی طرح تا ابد پھیلی ہوئی آئندہ زندگی کے مقابلے میں فرد انسانی کی ساٹھ، ستر سالہ حیات ناپائیدار کی وہی حیثیت ہے جو پوری انسانی زندگی میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی ہو، بلکہ شاید اس سے بہت ہی کم، دراصل یہ کہنا بھی محض سمجھنے سمجھانے کے لیے ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے محدود کو غیر مختتم سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، تاہم فرد کی اس اقل ترین مدت حیات کی اہمیت ملاحظہ ہو کہ اس ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی حیات سے مرتب شدہ نتائج پر ہی ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی و ناکامی کا دارو مدار ہوتا ہے اور جب حق تعالیٰ جل مجدہ کا خصوصی فضل و کرم کسی پر سایہ فگن ہوتا ہے تو اس محدود ترین لمحۂ حیات میں اس سے ایک ایسا رفیع الشان اور تاریخ ساز کارنامہ انجام دلوا دیا جاتا ہے کہ سنت اللہ کے مطابق فرد تو رخصت ہو جاتا ہے، تاہم اس کے ذریعہ انجام شدہ کارنامہ نسل بہ نسل صدیوں پر محیط فیض رسانی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ

۞ تقریظ: ''حکیم شمیم احمد سعیدی، حیات و خدمات'' از: ڈاکٹر انور سعید، ڈاکٹر اختر سعید، ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی

کیفیت ہے جس کو وقت میں برکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان بدیہی حقائق کے تناظر میں جب ہم ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی صاحب علیہ الرحمہ (بانی وصدر جامعہ طبیہ دیوبند) کی حیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی شخصیت تاریخ کی ان نامور شخصیات کے درمیان ایک ممتاز مقام پر نظر آتی ہے جن کے نام سن کر یا پڑھ کر ہر ایک ذی فہم کے قلب سلیم میں عقیدت ومحبت کے ناقابل بیان جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔

انتہائی نامساعد حالات میں بفضل آہنی اور لائق تقلید عزم کے ساتھ جامعہ طبیہ دیوبند کا قیام اور محض چند برسوں کی شبانہ روز محنتوں اور جدوجہد سے اس کو استحکام کی ٹھوس بنیادیں فراہم کر دینا بلاخوفِ تردید اک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو ان کی شخصیت کو عبقریت کا درجہ عطا کر دینے کے لیے کافی ہے، ظاہر ہے یہ مقام بلند حق تعالیٰ نے اسی مخلصانہ جہد مسلسل اور سعی پیہم کے ثمر آور نتائج کے بطور عطا فرمایا ہے، اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو فروگذاشت نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے تا حال کسی بھی میدان سے تعلق رکھنے والی کسی بھی تحریک کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں یہ پہلو روشن اور عیاں ہے کہ کسی بھی تحریک کا آغاز اور اس کے ابتدائی مراحل ہمیشہ ہی نامساعد حالات سے دوچار ہوتے ہیں، لیکن بر بنائے اخلاص وللّٰہیت جس کے ساتھ رضائے حق ہو اس کو اللہ تعالیٰ عزم واستقلال کی بے بہا دولت سے سرفراز فرما دیتے ہیں، پھر اس پر مستزاد ڈاکٹر صاحبؒ کا حسن اخلاق، حسن معاشرت، تواضع، انکساری، دیانت وامانت جیسی صفات حمیدہ نے خواص وعوام کے درمیان ان کی شخصیت کو مزید پُر کشش اور دل آویز بنا دیا تھا، ایسی منفی گفتگو سے گریز جس میں کسی حاضر وغائب کی دلآزاری کا امکان ہو اور اجتماعیت کے اختلافی موضوعات پر نہایت محتاط وسنجیدہ ومدلل تبصرہ ان کا وصف خاص تھا۔

جد محترم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے دورِ اہتمام میں ایک طویل مدت تک جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند سے نہ صرف وابستہ ہی رہے بلکہ دارالعلوم دیوبند میں جامعہ طبیہ کے قیام کے سلسلے میں

اک مؤثر اور فعال کردار ادا کیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کو میں نے اکثر و بیشتر بر سبیل تذکرہ یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میاں شمیم صاحب کی انتظامی امور میں رائے بری صائب ہوتی ہے، معاملات کا سنجیدگی اور متانت سے تجزیہ کر کے مدلل انداز میں مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں، دوسری طرف ڈاکٹر صاحبؒ کا حضرت حکیم الاسلامؒ سے والہانہ اور نہایت مخلصانہ تعلق کا یہ انداز دیکھا ہے کہ جب کبھی ذکر کرتے تو قلب کے جذبات محبت چہرے پر عیاں کیفیات سے نمایاں ہو جایا کرتے تھے۔

طب یونانی جو کہ علم کا ایک نہایت ہی اہم اور مفید ترین شعبہ ہے، اس ملک کے بعض مخصوص پست فکر طبقہ کی ریشہ دوانیوں کے سبب معاندانہ طور پر ایک قوم کے ساتھ مخصوص کر کے حکومتی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ہے، اگر امت مسلمہ کے با فکر افراد اس جانب توجہ نہ کرتے تو کچھ بعید نہیں تھا یہ علم وفن کب کا تاریخ پارینہ کا حصہ بن چکا ہوتا، یہی وہ فکری خطوط تھے جن پر دارالعلوم دیوبند نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے دورِ اہتمام میں ڈاکٹر صاحبؒ کی تجویز پر جامعہ طبیہ قائم کر کے اس علم وفن کی سرپرستی کے فرائض انجام دیے جس کو ہر چہار جانب سے امت کے تمام طبقات نے ایک نہایت ہی مستحسن اور دور رس نتائج کا حامل اقدام قرار دیا۔ ۱۹۸۲ء کے ناگفتہ بہ حالات کے پس منظر میں رفعت فکر ونظر سے محروم بعض سیاسی عناصر کے ذریعہ انتہائی مذموم اغراض و مقاصد کے تحت سرزمین دیوبند سے اس فیض رساسوتے کو بند کیا جانا تمام ہی دردمندانِ ملت کے لیے کسی حادثے سے کم نہیں تھا، لیکن اولوالعزم افراد کے نزدیک ایک شمع گل کر دینے سے اندھیرا نہیں ہو جاتا ہے، اس حادثے پر لاحاصل تبصروں و تذکروں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحبؒ نے اسی حادثے کو جامعہ طبیہ دیوبند کے قیام کے لیے محرک بنا کر اس چشمۂ فیض کو پھر سے جاری کر دیا اور آنے والی نسلوں کو اس سبق آموز حقیقت سے روشناس کرایا کہ تخریب اور منفی اندازِ فکر کا جواب تعمیر اور مثبت انداز فکر میں ہی مضمر ہے، یہی مؤثر مستحسن اور پائیدار جواب ہے۔

انہی فکری خطوط پر ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے دونوں صاحبزادوں جناب ڈاکٹر انور سعید صاحب اور جناب ڈاکٹر اختر سعید صاحب کی تربیت کی ہے۔ والد محترم کی جانب سے متوارث اوصاف حمیدہ سے مزین جامعہ طبیہ کی اس نئی قیادت سے قوم کی بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ ہیں اور اس میں خوش قسمتی کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ بہردو صاحبزادگان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی زیرنگرانی حق تعالیٰ نے علمی اور عملی میدان میں خوب خوب موقع عنایت فرمایا ہے، ان کی بہتر از بہتر کارکردگی پر ڈاکٹر صاحبؒ کا اظہار اطمینان سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عزم وحوصلہ میں مزید استقامت عطا فرمائے اور قلوب کو جذبۂ خلوص وللّٰہیت سے سرفراز فرمائے نیز ڈاکٹر صاحبؒ کے حسنات کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے اعلیٰ علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرمائے۔ آمین یارب العالمین

تاریخ ترے نام کی تعظیم کرے گی
تاریخ کے اوراق میں تو زندہ رہے گا

ذوقِ علم وعمل کی لذت شناس شخصیت

(حضرت مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحب رحمہ اللہ)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رب کائنات نے بے مثل و بے مثال اختصاص کی عظیم ترین دولت کے ساتھ رسول اول الزماں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار جماعت انبیاء علیہم السلام کی مختلف ومتنوع خصوصیات کو رسول آخرالزماں آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جمع فرما کر اپنے آخری پیغمبر کے طور اس دنیا میں مبعوث فرمایا اور از روئے کلام اللہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی سرمدی اور ابدی نوید کے ساتھ اپنے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کو امت خیر اور خیر الامم کے عظیم تر عنوان سے بایں طور متعارف کرایا گیا کہ اب تا قیام قیامت یہ امت خیر اپنے منفرد اختصاصات وخصوصیات کی اساس پر اس زمین کی رونق بنی رہے گی اور اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاء (۱) کے مصداق کی صورت ہر عہد وعصر میں دنیا کا ہر خطہ اس کے ذریعہ متنوع علوم ومعارف سے روشن رہے گا، چنانچہ فکر و نظر کے اس راست زاویہ سے مختلف عصور وقرون اور ادوار کا کیا جانے والا مطالعہ جہاں ایک طرف ہمیں اس حقیقت تک رسائی بہم پہنچاتا ہے کہ اسلام کی آمد وظہور کے بعد

۞ تقریظ: ''تذکرۂ شہید علم'' از: حضرت مولانا محمد فاروق ڈیسائی صاحب

(۱) ترجمہ: علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ (جامع الترمذی، أبواب العلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، ج۲، ص:۹۷، رقم:۲۶۸۲)

کسی صدی کا کوئی عشرہ بھی ایسا نہیں گذرا ہے جس نے علمائے اسلام کے درخشاں وجود کی مہکار سے اس عالم کو خالی رکھا ہو اور دنیا کے مختلف خطے اور علاقے اصحاب علم وفضل کی علمی مسندوں سے زینت نہ پاتے رہے ہوں، وہیں دوسری جانب معنوی گہرائی سے جاری اصل سرچشمۂ فیض کے ان حقائق کو بھی روشن کرتا ہے جس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے جد مکرم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اس اقتباس میں بایں طور رقمطراز ہیں کہ:

''امم واقوام کے شئون کو پیش نظر رکھ کر دنیا کی اس آخری قوم اور خیر الامم امت اسلامیہ کو لیجیے تو محسوس ہوگا کہ اس کی ذہنیت بھی اپنے مربی اعظم حضرت اعلم الاولین والآخرین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک شان کا عکس وپرتو ہونے کی وجہ سے خالص علمی ذہنیت ہے کیونکہ خود آپ ﷺ کی غالب شان علم وادراک اور بصیرت ومعرفت تھی، جس قوم کا دستور العمل قرآن کریم جیسی تِبۡیَانًا لِکُلِّ شَیۡءٍ (۱) کتاب ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی ذہنیت علم میں غرق نہ ہو ظاہر ہے ظہور علم کے آلات دو ہی ہیں ایک زبان اور دوسرا قلم، چنانچہ ان دونوں کے لحاظ سے اس امت نے جن نادر اور غیبی علوم کا افشاء کیا ہے ہم حقیقت پسندانہ مشاہدات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ علمی امت علمی کمالات میں امم سابقہ سے نہ صرف یہ کہ منزلوں آگے ہی ہے بلکہ علم کی مضبوط ترین اساس پر بدرجۂ اولی فائق بھی ہے، یہی سبب ہے کہ ایک طرف اس امت کے خطبات، تقاریر، شعلہ بیانی اور دریا روانی اس درجہ ہے کہ خود ہی کلام نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی بولنا سکھلا دیا، گونگوں کو مقرر وخطیب بنا دیا، بے زبانوں کو زبان آوری پر قادر کر دیا تو دوسری طرف صاحب مواہب امام زرقانیؒ کے بقول کثرت تصانیف اس امت کی بے بدل خصوصیت ہے، بقول شخص ہے کہ دنیا کے کتب خانے آباد ہی ان کی تصانیف سے ہیں، کوئی علم وفن ایسا نہیں چھوڑا جس کے بے حد ونہایت ذخائر جمع نہ کر دیے ہوں، خلافت عباسیہ میں عراق

(۱) سورۃ النحل: ۸۹

کے عظیم الشان کتب خانے، خلافت اندلس میں اسپین کے کتنے ہی مکتبے، حجاز وروم اور مصر وہندوستان کے ہزار ہا ہزار ذخائر اور لائبریریاں نیز دوسرے محروسہ ہائے اسلامیہ کے سیکڑوں علمی خزانے باوجود یہ کہ تباہ و برباد بھی ہوئے، اعدائے اسلام کے ہتھے بھی چڑھے، نذر آتش بھی کیے گئے، کروڑ ہا کروڑ کتابیں دیمک کی خوراک بھی بنیں اور اسلام دشمن قوتوں نے پچاس پچاس برس کی طول طویل مدتیں ان عظیم الشان علوم ومعارف کو مٹانے وضائع کرنے اور دریا برد کردینے میں صرف بھی کیں جیسا کہ اندلس میں ہوا اور فتنۂ تاتار میں بغداد کا علمی ذخیرہ دجلہ اور فرات میں بہادیا گیا جس سے کہ مہینوں ان دریاؤں کا پانی رکا رہا اور جب چلا تو گاڑھی روشنائی بن کر دواتوں میں مدتوں استعمال کیا گیا لیکن علمی ذخائر کے ساتھ ماضی کی ان تمام تباہ کاریوں کے باوجود صدیوں پر محیط علمائے اسلام کی کروڑ ہا کروڑ تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ آج بھی منصۂ شہود پر بایں طور موجود ہے کہ یورپ وایشیا کے مطابع چھاپتے چھاپتے تھک گئے مصر و بیروت سمیت عالم اسلام اور برصغیر کے پریس اور چھاپے خانے بھی کم پڑ گئے گویا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت پوری دنیا میں موجود ذخائر علم وفن جو مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے ہے وہ ان مصنفات کا عشر عشیر بھی نہیں ہے جو کہ پریس کے میدان میں نہیں پہنچ سکا۔‘‘

چنانچہ آج بھی بنظر انصاف غیر جانبدارانہ سروے کیا جائے تو بلا خوف تردید یہ کہنے میں قطعاً کوئی عار یا جھجک نہیں ہے کہ عالم اسلام اور برصغیر کے علاوہ یورپ کے موجودہ کتب خانوں اور بالخصوص جرمنی میں میلوں آراضی پر پھیلے عظیم الشان کتب خانوں میں کثیر تر حصہ اسلامی علوم ومعارف اور فنون پر مشتمل مصنفات کا ہے، جس میں علاوہ متنوع علوم شرعیہ کے علوم معاشیات، طبعیات، حیاتیات، نباتات، حیوانات، طبا قات الارض اور سائنس جیسے متعدد علوم وفنون اور معارف پر مشتمل بے حد وشمار کتابیں دستیاب ہیں جن سے آج ان کے اصل مالک وحقدار محروم ہیں اور عصر حاضر کی اقتدار یافتہ قومیں اپنے مالکانہ حق کے ساتھ ان پر مسلط ہو کر ان سے استفادہ کر رہی ہیں اور عین

ممکن ہے کہ عہد رفتہ کے ان علمی ذخائر سے حاصل کردہ معلومات کو وہ اپنی کاوش طبع کا نتیجہ قرار دیکر دنیا سے خراج تحسین وصول کررہی ہوں، مختصر یہ کہ ایک حبر امت اٹھتا ہے اور دہائیوں سے متجاوز ہوکر سیکڑوں اور سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک اپنی تصانیف کا عدد پہنچا دیتا ہے اور بحمد اللہ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، حاصل بحث یہ ہے کہ جس طرح حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام بارگاہ علمی میں باریاب ہوئے اور آپ ﷺ کی غالب شان علم وحکمت تھی اسی طرح آپ ﷺ کے فیضان علم ومعرفت کے طفیل اور برکت اقدام کے صدقے سے آپ ﷺ کی امت بھی علمی بارگاہ سے فیضیاب ہوئی اور ایک علمی امت بن گئی جس میں قیامت تک ہر عہد وعصر میں ہر خطے میں اللہ تعالیٰ ایسے افراد پیدا فرماتے رہیں گے جن کی علمی وعملی انفرادیت ان شاء اللہ نسلوں کو نشان منزل کا پتہ دیتی رہے گی۔

حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ چودہ صدیاں کم نہیں ہوتی ہیں اور چودہ سو سال پر ممتد زمانہ تھوڑا نہیں ہوتا اتنے عرصہ میں نہ جانے کتنی ہی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور نابود ہوگئیں، کتنی ہی اقوام وملل کی تاریخوں کے اوراق پریشاں ماضی میں مدفون ہوگئے مگر اسلامی تاریخ کے ذوق ومزاج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور اس کی آغوش سے سرکردہ حضرات، ممتاز ہستیوں اور صاحبان علم وکمال کی نمود کا سلسلہ جاری رہا اور زندگی کی بساط پر قطار اندر قطار چراغ سے چراغ جلتے رہے ہیں جن کی روشنی میں علم کے جویا اور متلاشی قافلوں کی صورت میں محو سفر رہے، یہ وہ مبارک افراد واشخاص ہیں جنہیں رب ذوالکرم علم وعمل کی تابندگی اور تقویٰ وللّٰہیت کی درخشندگی اور بصیرت وادراک کی تازگی کے لیے پیدا فرماتا ہے ایسی سربرآوردہ شخصیات سے کوئی خطہ وعلاقہ اور کوئی دور کبھی خالی نہیں رہا، کم یا زیادہ ایسے لوگ ہر مقام پر اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے رہے ہیں، ایسے اصحاب کمال اور ارباب علم وفضل کی حیات منفردہ کے آثار ایسے نہیں کہ جن کو نظر انداز کرکے آدمی اپنے لیے صحیح معنی میں سامان زندگی مہیا کرلے بلکہ اس سے ایک قدم آگے آنے والی نسلوں

کے دینی و اسلامی طرز زندگی کو راہنما خطوط فراہم کیے جانے کے حوالے سے ان اصحاب کمال کے احوال و آثار کی حفاظت ہماری ایسی دینی ذمہ داری ہے جس سے کہ سعادت کی راہوں کو روشن و ہموار ہونے میں مدد ملتی ہے اور یہ سطور مذکور بھی ایسی ہی ایک نابغۂ روزگار شخصیت جناب حضرت مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحب رحمہ اللہ کی ''داستان حیات'' کے سرنامہ کے طور پر ان کے تذکرۂ جمیل کو محیط ہیں جن کی زیارت وصحبت کے شرف سے تو راقم السطور محروم ہی رہا، جس کو بزبان ادب تعبیراً یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔

سنی حکایت ہستی تو درمیان سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہاء معلوم

البتہ بریطانیہ کے اکابر واصاغر اور معاصر اصحاب علم وفضل میں اخلاص مجسم کے پیکر ومربی کے تعارفی سرنامہ سے معروف ومحترم ہر دل عزیز شخصیت جناب حضرت مولانا فاروق ڈیسائی صاحب مدظلہ کی زبانی متعدد بار ان کی باغ و بہار مجالس میں مولانا موصوف رحمہ اللہ کا تذکرہ اور احوال وواقعات کچھ اسقدر دلچسپ انداز بیان کے ساتھ اس کثرت سے بیان ہوئے گویا کہ فکر واحساس میں مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحبؒ سے ذہنی قربت بایں طور جاگزیں ہوگئی کہ جیسے کہ میرا ان سے بالمشافہ واقفیت کا دورانیہ دہائیوں پر محیط ہو، مزید براں ان کے گوشۂ حیات کے دیگر لائق قدر وستائش اور رشک آمیز پہلو احوال و واقعات زیرنظر داستان حیات سے معنون مفصل سوانح حیات سے ذہن میں مزید روشن ہوگئے ہیں۔

حضرت مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحب رحمہ اللہ کی زندگی کا ابتدائی دور ہی ایسا ہے جو ان کو قابل رشک انسانوں کی صف اول میں شامل کرنے کے اشارات کو بایں طور محیط ہے کہ ان کے والد مرحوم کی دینی تڑپ اور اپنی اولاد کے لیے دینی و اسلامی ماحول سازی اور عمدہ واعلیٰ تعلیم وتربیت فراہم کرنے کی بے چینی اور ایک اولاد کے بعد دوسری اولاد سے بہتر سے بہتر توقعات قائم کرنے اور امیدیں وابستہ کرنے کا تسلسل ایک ایسی

صورت میں سامنے آتا ہے کہ ان کے گھرانے میں مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحب رحمہ اللہ جیسے بچے کی پیدائش باپ کی آرزؤں اور تمناؤں کا مرکز بنتی ہے اور جن بنیادوں پر والد مکرم چاہتے تھے ذات حق جل مجدہ کے بے حدو کنار فضل واحسان اور والدین وخاندان کے دیگر بزرگوں کی مستجاب دعوات سحر گاہی سے وہ عظیم اور قابل رشک دولت علم وعمل ذات حق جل مجدہ کے خزانۂ غیب سے اس بچے کو عطاء ہوئی جس کی تمنا ترجیحی بنیاد پر ہر ایک والدین اپنی اولاد کے لیے کیا کرتے ہیں، حضرت مولانا ڈیسائیؒ کو عمر کی ایک منزل پر ترکیسر کے معروف ادارہ مدرسہ فلاح دارین میں داخل کرایا گیا جہاں اس بچے نے انتہائی عرق ریز محنت، سخت تکالیف وصعوبتوں کے مراحل کو نہایت صبر وشکر اور عظیم مقصد کے حصول کی خاطر نہایت متانت اور سنجیدہ جھود وکاوش سے طے کرتے ہوئے تنگیوں اور سختیوں کے باوجود اپنے عزم کی پختگی کو ہر گذرتے وقت کے ساتھ استحکام کی تقویت بہم پہنچائی، تا آنکہ جلد ہی اکابر اساتذہ کی قیافہ شناس نگاہوں نے اندازہ لگالیا کہ صبر و استقامت کے ساتھ ہمہ جہت مشکلات سے نبزد آزمایہ بچہ مستقبل قریب میں راہ حیات کے ایسے نقوش وخطوط قائم کرے گا جو کہ دوسروں کو سفر علم میں نہ صرف مہمیز کا ذریعہ ہی ثابت ہونگے بلکہ اس کی ذات سے ایسے روشن آثار نمایاں ہوں گے جن سے مستقبل میں آنے والے علم وعمل کے قافلے اس کے نقوش وخطوط سے علم ومعرفت کی عظیم دولت کے حصول میں مدد حاصل کریں گے، گذرتے وقت کے ساتھ تجربہ کار اور جہاں دیدہ اساتذہ کی بات میں صداقت کے پہلو روشن ہوتے گئے، مرحوم ومغفور مولاناؒ فلاح دارین سے ابتدائی تعلیم کے بعد جدا ہوئے تو اگلا قدم گجرات کے قدیم ومعروف ادارے جامعہ حسینیہ راندیر تھا جہاں انہوں نے عربی درجات میں داخلہ لیا اور کچھ ہی وقت کے بعد اپنی محنت ومستعدی اور مقصد کو پالینے کی لگن نے ادارہ کے ذہین ونیک چلن طلباء کی صف میں نمایاں مقام پر لاکھڑا کیا اور ان کا شمار اساتذہ کے پسندیدہ تلامذہ میں ہونے لگا۔

چندسال وہاں کی علمی بہاریں اور اساتذہ کی محبتیں شفقتیں اور اعتماد کی دولت سمیٹنے

کے بعد اکابر کے مشورے سے اگلا پڑاؤ ام المدارس دارالعلوم دیوبند قرار پایا جہاں انہیں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، شیخ معقولات ومنقولات حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہ اللہ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ جیسے نابغۂ روزگار اساتذہ سے شرف تلمذ کی سعادت حاصل ہوئی، دارالعلوم دیوبند کے علمی ماحول اور تقوی وللّٰہیت کی حامل متعدد شخصیات کی قربت اوران کی پاکیزہ مجالس کی شرکت نے مولانا ڈیسائیؒ کے زاویۂ فکر ونظر اور زندگی کے علمی وعملی گوشوں پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے جہاں سے انہیں علم وفکر کی نئی وسعتوں میں پرواز کے مختلف مواقع میسر آئے، چنانچہ ایک نئی زندگی، نئے حوصلوں، نئے جذبوں اور نیک ارادوں کے ساتھ اس عظیم درسگاہ سے رخصت ہوئے جہاں انہوں نے انتہائی لگن، ذوق وشوق، یکسوئی اور شب وروز کی جاں فشاں محنتوں کے ساتھ اپنا طالب علمانہ سفر طے کیا تھا اور اسباق کی حاضری، اساتذہ کا واجب احترام، ہر کتاب کے مباحث کو عمیق مطالعہ کی مدد سے ذہن نشین کرنے کی کوشش نے انہیں اساتذہ کی نظر میں قابل اعتماد اور باصلاحیت جوہر میں تبدیل کردیا تھا۔

رفتہ رفتہ گذرتے وقت کے ساتھ مولاناؒ کی تدریسی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آنے لگیں، چنانچہ جامعہ حسینیہ راندیر کے ارباب حل وعقد کی جوہر شناس نگاہوں نے بحیثیت عربی مدرس اسی مدرسہ میں انتخاب کرلیا جہاں کی طالب علمانہ زندگی میں ان کی علمی صلاحیتوں کا قریب سے مشاہدہ کیا گیا تھا جو اب حقیقت واقعہ کی صورت میں تدریسی کمالات کے ساتھ کھل سامنے آنے لگا تھا۔ شرح وقایہ، ہدایہ، مشکوٰۃ شریف، اور جلالین وغیرہ کی تدریس کا زمانہ مثالی رہا جو کہ ادارہ کی علمی شہرت وعظمت اور نیک نامی میں اضافے کی توجیہ قرار پایا، تا آنکہ مولاناؒ کی تدریسی شہرت راندیر کی فضاؤں سے پرواز کرتے ہوئے تنزانیہ کے ارباب کمال اور اصحاب علم کی سماعتوں تک جا پہنچی جو کہ بصد شوق ان کے فیوض وبرکات سے حصول کی آرزو اور ازحد اصرار پر منتج ہوئی جس کو مولاناؒ نے قبول فرماتے ہوئے جامعہ حسینیہ راندیر کو خیر باد کہا اور تنزانیہ کے ایک تعلیمی ادارے سے

وابستہ ہوگئے، مولاناؒ کی علمی وعملی زندگی کا آخری پڑاؤ بریطانیہ کی معروف درسگاہ دارالعلوم بری قرار پایا، بریطانیہ کے اصحاب علم اور وہاں کے محبین ومخلصین کے اصرار پر آپ نے وہاں کے لیے رخت سفر باندھا جہاں مولاناؒ کی دید کے مشتاق اور آپ کے فیوض علم کی برکات سے استفادہ کے طالبین نے پروانہ واران کے گرد حلقہ جمالیا، علم وعمل کے معنوی اثرات اور پاکیزہ طرز حیات کی خاصیات تلامذہ اور مستفدین کے فکر ومزاج پر مثبت آثار ونقوش قائم کرنے میں ممد ثابت ہوئے اور وقت کے ایک عالم باعمل کے شب وروز سے اہل بریطانیہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔

زیر نظر ’’داستان حیات‘‘ کے وسیلہ سے حاصل ہونے والے تعارف کا ایک قوی پہلو مولاناؒ کی فن خطابت پر مضبوط پکڑ کی صورت میں بایں طور سامنے آتا ہے کہ رب ذوالکرم نے اپنی عطائے خاص سے ان کو مسحور کن خطابت کے فن سے بھی خوب نوازا تھا، گویا تاثیر اور کیفیت کے وہ عناصر جو خطابت کی بنیادوں کو استحکام اور مقبولیت سے گذارتے ہیں وہ آپ کو انتہائی مؤثر انداز بیان، شستہ کلام، جملوں کی ادائیگی، اور بات کہنے کا خصوصی ملکہ جیسی صفات کی صورت میں حاصل تھا، آپ کی خطابت کی شیریں بیانی کا انداز خوبصورت اور دلکش ہونے کے ساتھ اخلاص و دردمندی سے معمور ہوتا تھا، اس سے تقریر میں جو رنگ پیدا ہوتا تھا وہ سامعین کو آمادۂ عمل کرتا تھا، قلوب میں قبولیت کی صلاحیت رکھنے والے سیکڑوں انسان آپ کی خطابت کے ذریعہ یقین وعمل کی دولت سے سرفراز ہوئے، درانحالیکہ اردو آپ کی مادری زبان نہیں تھی مگر جب اردو میں خطاب کرتے تھے تو نہایت سلیس اور بامحاورہ زبان کی چاشنی کو سامعین اسی رنگ و آہنگ میں محسوس کرتے تھے جو کہ واقعتاً اہل زبان کا ہی شیوہ ہوتا ہے۔

حاصل شدہ سلسلۂ تعارف میں مولاناؒ کے علمی ملفوظات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولاناؒ کی مختلف علوم وفنون پر بڑی گہری نظر اور بصیرت افروز مطالعہ تھا جس کے سبب نکتہ آفرینی، اطراف و جوانب سے آگاہی، حالات حاضرہ سے باخبری ان کی

طبیعت کا حصہ بن گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے ملفوظات سے ایک باخبر وباکمال عالم اور دیدہ ور شخصیت کا جو خاکہ ذہن میں بنتا ہے وہ ان کی زندگی کو بے شمار دوسرے لوگوں کی زندگی سے ممیّز وممتاز کرتا ہے۔

مولاناؒ کی حیات دنیوی کا دورانیہ اگرچہ محض پچاس سالوں کے مختصر ترین عرصہ کو ہی محیط ہے لیکن اگر فیوض وبرکات کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ عرصۂ حیات کم ازکم ایک صدی کے کاموں کا احاطہ کرتا ہے جو کہ معنوی اعتبار سے مولاناؒ کی عنداللہ قبولیت ومقبولیت پر دلیل ہے جس کا عمومی مشاہدو مدرک حصہ بریطانیہ کے پانچ ممتاز اصحاب علم وعمل کے ساتھ ایک سفر کے دوران کار حادثہ کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہونے والی حادثاتی موت کے وسیلہ سے ذات حق جل مجدہ کی جانب سے فوت شدہ اصحاب علم کا قیاساً مرتبۂ شہادت پر فائز کیا جانا بھی ہے۔

یہاں یہ قابل ذکر بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات وحوادث اگرچہ ہمارے محدود علم وشعور کے اعتبار سے محض اتفاقات کا درجہ رکھتے ہیں لیکن کسی بھی واقعہ کی وقوع پذیری ذات حق جل مجدہ کی مشیت وحکمت سے خالی نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ علماء بریطانیہ کی شہادت کے اس اثر انگیز واقعہ کے موقعہ پر عالم ربانی حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند کے سابق صدر حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب رحمہ اللہ جیسی مقتدر شخصیات کا بیک وقت بریطانیہ میں موجود ہونا اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی اقتداء میں بریطانیہ کے طول وعرض سے شریک علماء وصلحاء اور عامۃ الناس کا کثیر تعداد کے ساتھ نماز جنازہ میں شرکت کرنا جیسے تکوینی امور بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مولاناؒ کی قبولیت کے ضمن میں ایک مضبوط معنوی دلیل کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحب قدس سرہ کی زندگی کے حالات وواقعات اور عظیم تر خدمات کا یہ وقیع تذکرہ نہ صرف اہل گجرات کے لیے ہی بلکہ علمی دنیا سے تعلق

رکھنے والے ہر اس شخص کے لیے **کحل البصر** ہے جس نے اپنی زندگی کو علم وعمل اور اخلاص وللّٰہیت کے راہنما خطوط پر استوار کرنا مقصد حیات کا ترجیحی حصہ قرار دے رکھا ہو، نیز یہ داستان حیات ہر اس طالب علم کے لیے نسخۂ اکسیر ہے جس کے قلب سلیم میں علم باعمل حاصل کرنے کا جذبۂ صادق موجزن ہو، ایسے ہی یہ ان عام انسانوں کے لیے بھی تیر بہ ہدف ترکیب ہے جو بندگی کے حقوق سے آگاہی کے خواہشمند ہیں اور بحیثیت ایک صالح انسان اپنے فرائض سے واقفیت چاہتے ہیں اور یہ ان تلامذہ کے لیے بھی کامیابی کی نوید ہے جو استاذ کے بلند مراتب اور درجات کے اسرار سے واقفیت کے بعد اپنے لیے لائحۂ عمل تیار کرنا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ متعدد طبقات کے لیے مختلف ناحیوں اور زاویوں سے حضرت مولانا ڈیسائی صاحبؒ کی یہ سوانح بعنوان ''داستانِ حیات'' نور وضیاء کا ایک مینار ہے، حق تعالیٰ اس کو قبولیت عامہ سے سرفراز فرماتے ہوئے بہ ہر نوع اس کار خیر میں جملہ شرکائے کار کے لیے ان کی عرق ریز جہود اور مخلصانہ کاوشوں کو وسیلۂ نجات بنائیں۔ آمین یا رب العالمین .

وماعلینا إلا البلاغ المبین

زورِ بیاں میں سحر نگارش

(بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ کسی شخصیت کے تعلق سے کسی خاص دائرۂ کار میں رہتے ہوئے حدود و قیود کی پابندیوں کے ساتھ فرمائش پر لکھنا رقص پابہ زنجیر کے مترادف ہے اور اس پر مستزاد کہ شخصیت بھی اپنی علمی عظمت کے لحاظ سے ایسی رفیع الدرجات، بلند و بالا، عبقری اور ہمہ جہت صفات سے متصف کہ اک طویل ترین وقت تو محض یہ سوچنے اور فیصلے تک پہنچنے میں صرف ہوجائے کہ ایسی رفیع المرتبت اور عظمت کی حامل شخصیت کی کس جہت کو، کس صفت کو، کس عمل کو، کس گوشۂ حیات اور پہلو کو موضوع سخن قرار دیا جائے؟ ان کے علوم و معارف کی عظمت و آفاقیت کو موضوع تحریر بنایا جائے، یا ان کے فکر کی عالمیت اور تعمق علم پر بات کی جائے، دین مبین کے اسرار و حکم اور ان کی دلائل نقلی اور براہین عقلی سے مزین تشریحات پر مشتمل ان کی مبسوط تحریرات کا تذکرہ کیا جائے، یا ان کی مناظرانہ عظمت و فتوحات زیر تحریر لائی جائیں، ان کی وسعت فکر و نظر کو سخن ہائے گفتنی قرار دیا جائے یا صدیوں پر محیط و مؤثر ان کی ایمانی فراست کے زیر اثر دوررس فیصلوں کا ذکر کیا جائے، حریت وطن کی جدوجہد میں شامل ان کے مجاہدانہ کردار سے بات کا آغاز کیا جائے، غرض کہ ان جیسے اور کتنے ہی موضوعات ہیں، جو کہ اس عظیم شخصیت کی زندگی سے جزو لاینفک کے مثل بایں طور مربوط ہیں کہ ہر ایک موضوع اپنی جگہ پر مستقل ایک تصنیف

۞ تقریظ: نگارشاتِ اکابر بتذکرۂ جواہر معارف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مطبوعہ حجۃ الاسلام اکیڈمی

کا عنوان اور بہت سے ذیلی عناوین کے ساتھ مستقل محنت طلب ایک تالیفی کام اور تفصیل طلب باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

وسعت فکر ونظر رکھنے والے اہل علم حضرات کے بسیط مطالعہ سے یہ حقیقت مستور ونہاں نہیں ہے کہ اسلام کے صدر اول سے لے کر آج تک دستیاب ہمہ نوع اور ہمہ اقسام علمی، تاریخی اور تہذیبی تراث امت کا ایسا لائق صد افتخار سرمایہ ہے، جس سے کہ ہر دور کی دیگر اقوام وملل ورطۂ حیرت میں ہیں، جو کہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ ناقابل تردید شہاداتی اساس پر اسلام کی ایسی بدیہیات کا حصہ ہیں کہ متقدین سے لے کر متاخرین تک تمام علمی دوائر واجتماعیات میں تسلیم شدہ مسلّمات کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، ہر خطے میں یہ عظیم الشان علمی وعملی تراث جن عظیم ترین اور نابغۂ روزگار شخصیات کی مرہونِ منت ہیں، ان کا ایک کہکشانی سلسلہ ہے جو کہ ربع مسکون میں کم وبیش ہر صدی کے ہر عشرے کو محیط ہے، گویا کہ ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْن''[1] کی مشاہداتی تفسیر ہے اور من حیث المجموع اگر تعارف کرایا جائے، تو اشتراک نصب العین کے نقطۂ نظر سے اس تفصیل کا مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ حسن نیت، علم وعمل اور خالص ایمانیات کی بنیاد پر فکر و خیال کی عظمت میں ہی دراصل بنی نوع انسانی کے زمین پر منصب خلافت الٰہیہ کے استحقاق کے اسرار وحکم اور اس حقیقت سے وابستہ رموز ہائے فوز وفلاح مضمر ہیں۔ اس حقیقت کے علی الرغم یہ بھی ایک ناقابل تردید کلیہ ہے کہ تمام اجزائے علم وعمل کی تعمق فکر کے ساتھ اگر تحلیل کی جائے، تو کسی بھی جہت میں کاملیت کے کلیدی عناصر کے طور پر کردار کی عظمت، حسن نیت، جذبۂ للّٰہیت، علم وعمل میں توازن وتطابق اور فکر ونظر میں رفعت و وسعت، مزاج وخیال میں بلند نظری، طبیعت وعادات کا بایں طور لازمہ بن کر

(۱) ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (سورۃ الحجر: ۹)

سامنے آتے ہیں۔ جیسے کہ آیت کریمہ ''وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْراً كَثِيْراً'' (۱) کی مشاہداتی تفسیر ہو۔ چناں چہ اس پس منظر میں تمام ادوار کے سنجیدہ فکر اہل علم حضرات کے نزدیک محض نظری ہی نہیں؛ بلکہ چودہ صدیوں پر محیط علی رؤوس الاشہاد یہ امر حقیقت واقعہ پر مبنی ہے، کہ تاریخ بنی نوع انسانی کے وسیع تر تناظر میں بہم رنگ ونوع اپنے گہرے نقوش اور مؤثر ترین بدیہیات کے لحاظ سے اسلام ہی دنیا کی واحد واولین عالمی تحریک قرار پاتی ہے، جو ایک طرف اپنے جلو میں عقل وخرد کو زیر کردینے والے مؤثرات کے نفوذ کی صلاحیت رکھتی ہے، تو دوسری طرف اپنے اپنے ادوار سے ہم آہنگ مقتضیات کے مطابق گذشتہ چودہ صدیوں پر محیط علمی، فکری اور تحریکی انداز میں علمی کہکشانی سلسلے کے آفتاب وماہتاب کے علمی آثار وشواہد کا ایک غیر منقطع و بہمہ رنگ ونوع ایک ایسے تسلسل کی حامل ہے، جس میں ذات حق جل مجدہٗ کی حکمت بالغہ اور مشیت کے زیر اثر نہایت واضح ترین نقوش، علمی تراث کی صورت میں ہر صدی کے ہر عشرے پر محیط اسی کاملیت کی شانِ امتیاز کی حامل باعظمت شخصیات کی اور ان کے عظیم تر علمی آثار کی صورت میں بطور دلیل دعویٰ ظاہر وباہر ہیں، خوئے تجسس ہے تو بہر رنگ ونوع گوہر آبدار کی مشاہداتی گواہیاں جابجا موجود ہیں، جن کے ذریعہ حق تعالیٰ نے عظیم الشان، محیر العقول اور دنیا کی دیگر اقوام وملل کو ورطۂ حیرت واستعجاب میں ڈال دینے والی علمی و عملی اور تحریکی مہمات سر کرائی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں اسلام کے آفاقی پیغام علم و عمل کے اسرار بھی اسی نقطہ ہائے عمل کے تسلسل اور استمرار میں مضمر ہیں کہ مختلف ادوار کے تقاضوں سے میل کھاتی، مختلف علاقوں میں بسی مختلف اقوام عالم کے طرزِ فکر کے مطابق مختلف انداز میں مختلف طریقوں سے مجموعی طور پر تمام ربع مسکون میں سکونت پذیر امت مرحومہ کے دین وعقائد کی حفاظت کا ایک تکوینی نظام بزبان قرآن اس اعلان کے

(۱) ترجمہ: اور جسے دانائی عطا ہوگئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ (سورۃ البقرۃ:۲۶۹)

ساتھ قائم فرما دیا گیا: ''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا'' (۱) . ایک نقطۂ فکر ونظریہ بھی سامنے آتا ہے کہ بعض اربابِ بصیرت فکری جہت میں تھوڑے فرق کے ساتھ حکمت کی حقیقت کو سبب کے زمرے میں تسلیم کرتے ہیں، تاہم اگر حکمت کو محض سبب کے درجے میں بھی تسلیم کیا جائے، اگرچہ لفظ حکمت بذاتِ خود اپنے آپ میں معانی ومفاہیم کے نقطۂ نظر سے بڑی وسعت کا حامل لفظ ہے،تو بھی من جملہ دیگر اسباب کے اسی ایک سبب کی حیثیت بھی خود اپنی جگہ پر بنیاد واساس کی حیثیت کی حامل قرار پاتی ہے؛ کیوں کہ اسلام کے نظام عبادات ومعاملات سے لے کر اوامر ونواہی تک کوئی جز بھی ایسا نہیں ہے، جس کی بنیاد و اساس میں کوئی حکمت بطور سبب کے ظاہر یا پوشیدہ نہ ہو؛ لہٰذا ہمہ جہت فکر اسلامی کی کوئی ایک جہت اور کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کو محض نظریات کے زمرے میں رکھتے ہوئے ٹھوس اور پختہ علمی بنیادوں پر قابل قبول حیثیت کے ساتھ اسی عظمت اور درجہ کی حامل کوئی دوسری دلیل برنگ حکمت بطور سبب کے ہی اس کے متبادل کے طور پر لائی جاسکے، جیسا کہ فلسفیانہ نظریات، جو کہ ہر نئے دور، ہر نئے تجربے کے بعد تبدیل ہوجاتے ہیں اور متاخرین کے تجربات ومشاہدات اور ان کے دلائل کے سامنے متقدمین کے نظریات دنیا کے لیے ناقابل قبول ہوجاتے ہیں؛ کیوں کہ نظریات کا تعلق ظن وتخمین پر ہے اور امور اسلام کا تعلق امر تکوین سے قائم ہے۔ چناں چہ نظام تکوین کے نقطۂ نظر سے اگر اسلام کی علمی تراث اور شخصیات کا جائزہ لیتے ہیں، تو یہ تسلسل بذات خود اسلام کی ناقابل رد خصوصیات کا ایک اہم ترین حصہ ہی شمار کیا جاتا ہے جو کہ صدر اول سے لے کر تا حال غیر منقطع تسلسل کے ساتھ حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے زیر اثر جاری ہے اور قیامت تک امت مسلمہ میں یہ تسلسل باقی رہے گا اور اضاعف مضاعف کے طور پر اس کی ایک لطیف

(۱) ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کرلیا۔ (سورۃ المائدۃ:۳)

اور نا قابل تردید حکمت یہ بھی ہے کہ اب حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ اس امت کی داستان عمل بھی پہلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

سلسلۂ علم و عمل میں اس کہکشاں کے نہ جانے کتنے آفتاب و ماہتاب اپنے علوم و معارف کی تابانیاں بکھیر کر مدتوں سے تہہ خاک آسودہ ہیں؛ لیکن ان کے علم و عمل کی نورانیاں آج بھی اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ تشنگانِ علم کے قلوب کو منور کیے ہوئے ہیں، نہ جانے کتنوں نے یہاں علوم و معانی اور معارف و فنون کی مبادیات سے کتنے ایسے چراغ روشن کیے ہیں، جس کی لازوال روشنی جویائے علم و عمل کو منزل مقصود تک پہنچانے کی صدیوں سے ضامن بنی ہوئی ہے۔ علیٰ سبیل المثال جس طرح زمین کی نباتات کا حسن بیج کی خوبی کا مرہونِ منت ہوتا ہے؛ لیکن بایں ہمہ زمین کی خصوصیات کو بھی اس نمو میں بڑا دخل ہوتا ہے اور ان دوطرفہ خصوصیات کا متوازن امتزاج ہی مفید اور ثمر آور ثابت ہوتا ہے، کچھ اسی طرح کی دوطرفہ خصوصیات و امتزاجات کا معاملہ میدان علم و عمل میں بھی ہے، جس کو ہم علم کے ارتقائی سفر میں تاریخی تسلسل کا عنوان دیتے ہیں اور اسی عنوان کے ذیل میں جب ہم علمی آثار و تراث کے تعلق سے یا شخصیات کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں، تو ایک دور سے دوسرے دور کی نسبت میں تکوینی تسلسل بایں طور مربوط نظر آتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسے کہ ہر ایک شخصیت کو اپنے اپنے ادوار اور اپنے اپنے علاقوں میں امر تکوینی کے زیر اثر مصروف عمل رکھا گیا ہے اور ان کے وظائف علم و عمل متعین کر دیے گئے ہیں۔ چناں چہ تکوینی طور پر فکر و عمل کے اس غیر معمولی امتزاجات کے نتیجہ میں جہاں ایک طرف علمی آثار کے نہایت غیر معمولی اثاثوں سے امت مسلمہ کو مالا مال فرمایا گیا، وہیں ہر نسل میں روح عمل کو روبہ عمل رکھنے کے لیے حد درجہ بسیط الفکر و ہمہ جہت شخصیات، ان کے احوال، ان کی جہود، ان کی محنتیں، نازک ترین احوال میں ان کی استقامت اور صبر و مصابرت جیسی صفات کے بارے میں بسیط مطالعہ بھی از بس کہ زندہ قوموں کے لیے مثل خوراک و پوشاک معنوی

بقائے حیات فکری کے لیے ضروری اور لازمی ہے، جس سے کہ ہر نئی نسل کو جہاں ایک طرف علوم و معارف کے ارتقاء کی بنیادیں فراہم ہوتی ہیں، وہیں دوسری طرف ان شخصیات کے احوال ان کی جہد و تحریک عمل کے لیے مہمیز ہوتے ہیں۔

اور بقول مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ ایک عہد اور اس عہد کی بنیاد نیز انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے۔

بخوف طوالت اسباب وعوامل نیز واقعاتی شہادات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان نازک ادوار کا سرسری جائزہ لیتے ہیں، جب کہ برصغیر میں عقائد اسلام، شعائر دین، اسلامی تہذیب و معاشرت کو شدید ترین خطرات درپیش ہوئے؛ مگر ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ''(۱) کے دعویٰ حق جل مجدہٗ کے زیر اثر اسی نظام تکوین کے مطابق حق تعالیٰ نے اولوالعزم مردان آہن صفات کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے بایں طور کھڑا کر دیا کہ نہ صرف اسی دور کے باطل عقائد کا قلع قمع ہوا؛ بلکہ دیر تک ان کے اثرات سے امت مسلمہ کو تقویت حاصل ہوتی رہی؛ بلکہ ''لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ''(۲) کے عقیدہ کو پختگی حاصل ہوتی رہی۔

اکبری الحاد کا فتنہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی حمایت اور اس کے حلقہ نشین درباری علمائے سوء کی مفاد پرستانہ و خودغرضانہ تائیدات و تعاون سے اپنے اندر زبردست انقلاب انگیز قوت لیے ہوئے تھا؛ لیکن حق تعالیٰ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ذریعہ اس باطل تحریک کا ایسا قلع قمع فرماتے ہیں کہ نسلوں پر محیط لاکھوں لاکھ کی تعداد میں عامۃ المسلمین کے عقائد کے تحفظ کا ایک طویل عرصہ تک کے لیے

(۱) ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (سورۃ الحجر: ۹)

(۲) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ (سورۃ الزمر: ۵۳)

حفاظت کا بندوبست ہوجاتا ہے، بعدازاں اسباب وعوامل کے فرق کے ساتھ سترہویں صدی میں یہ ہی باطل پرست قوتیں اسلام کی بیخ کنی جیسے مذموم مقاصد کے زیراثر غدّاران امت کی سازشانہ حمایت وتائید کے ساتھ برنگ دیگر کچھ زیرزمین کچھ بالائے زمین تخریبی تحریکات کی صورت میں پھر سر ابھارتی ہیں، تو حق تعالیٰ اس دور کے مطلوبہ تقاضوں سے ہم آہنگ ان باطل پرستانہ عزائم کی حوصلہ شکنی اور اس کے دوررس مقاصد و اثرات کو زائل کرنے کے لیے اپنی ایمانی فراست سے ادراک کرنے اور بروقت اس کا سدباب کردینے والی عظیم ترین اولی العزم شخصیت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی صورت میں پیدا فرماتے ہیں، بصیرت افروز حقیقت کی سچائی یہی ہے کہ ہر دور کے فرعون یا نظام فرعونیت کے مدمقابل ہر دور کے موسیٰ کی پیدائش حق تعالیٰ کے امر تکوین کی بدیہیات کی وہ روشن ترین جہت ہے کہ انسان کے لئے محض اپنی عقل کے بھروسے نہیں بلکہ وحی الٰہی کے ضیاء پاش حقائق کے تناظر میں ایمانیات کو سنبھالنے کے لیے یہی ایک کلید تاعمر کافی ہے۔

بہرحال! ایک عہد کا دوسرے عہد سے یہ ارتباط ہی ہے کہ عزائم اور مقاصد میں یک گونہ یکسانیت کے اعتبار سے ابھرنے والی تحریکات کے بالمقابل حق تعالیٰ افراد کار پیدا فرماتے رہتے ہیں، خواہ مجدد الف ثانیؒ کے دور کی تحریکات ہوں، یا محدث دہلویؒ کے عہد کی بات ہو، دور، افراد کار اور طریقۂ کار میں فرق کے علاوہ باطل پرستوں کی تحریکی سرگرمیوں میں مقاصد کے نقطۂ نظر سے کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ باطل پرستوں کا یہی تحریکی تسلسل ہے، جو کہ ۱۸۵۷ء کے حریت وطن کی جدوجہد یا باطل پرستوں کی زبان میں غدر کے نام سے موسوم ہوا، جو کہ اپنے جلو میں بہزار رنگ فتنوں کی سونامی لیے اسلامی تعلیمات، تہذیب وتمدن، اقدار وروایات، عقائد واحکام کو جڑ سے ختم کردینے جیسے فاسد ومذموم ترین عزائم کے علی الرغم اپنی تمام تر قوت وطاقت اور نشۂ اقتدار کے ساتھ سرگرم عمل تھا۔ لہٰذا اس وقت کے طوفان بلاخیز اور خوں آشام احوال میں ذات حق جل مجدہٗ

اپنی حکمت تکوینی سے حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ بانی دارالعلوم دیوبند کو مجدد الف ثانیؒ اور محدث دہلویؒ کے تحریکی تسلسل کی قیادت اوران کے متوارث امین کے طور پر منتخب فرماتے ہیں، عہد بہ عہد ارتباط کے تناظر میں جن کی شخصیت کے لیے تمہیداً مذکورہ بالا سطور ضبط تحریر میں لائی گئیں ہیں۔

چناں چہ جس عہد وتحریک اور مصلح شخصیت کا تذکرہ اس تحریر کا موضوع ہے اس کو بہمہ طور جاننے اور سمجھنے کے لیے اس دور کے احوال اور پس منظر سے کسی نہ کسی درجہ میں واقفیت ضروری ہے۔

گذرا ہوا عہد ہو یا کہ دور رواں کی بات ہو، اس کے کیف وکم، رنج و راحت، اندیشہ وخدشات، عواقب ونتائج، فکر ونظر کو مالہ وماعلیہ سمیت من وعن انداز میں صاحبان حال کی طرح صاحب قال کے لیے محسوس کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہوتا ہے؛ البتہ باندازِ دگران اصحابِ علم وآگہی کا معاملہ قدرے مختلف ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ذوقِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ حسّاس طبیعت سمیت ادوار کے تکوینی ارتباط اور تسلسل کے ساتھ غیر محسوس انداز میں مرتب ہونے والے نتائج وعواقب کے ادراک کا شعور عطا فرمایا ہے، کہہ سکتے ہیں کہ ان کا درجہ حسّاسیت کے نقطہ نظر سے صاحبان قال میں صاحبانِ حال سے قدرے قریب ہوتا ہے؛ کیوں کہ صاحبانِ حال کے اقوال وتحریرات ہی اپنے دور کی عکاس وغماز ہوتی ہیں اور بجز ان کے دوسرا کوئی پیمانہ بھی نہیں ہوتا ہے، اور ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کے اصول کے تحت مابعد کے ثقہ اصحاب علوم ومعارف غیر واقعی روایات کی مدلل انداز میں نکیر کرتے ہوئے، قرار واقعی حقائق کی امانت کو اگلی نسلوں کی رہنمائی کے لیے محفوظ کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ حضرت نانوتویؒ کی تحریک کو جاننے اور سمجھنے کے لیے مختصر انداز میں ہی سہی، اس دور یعنی ۱۸۵۷ء جس کی ہم بات کررہے ہیں، اس کی اشد ترین اضطرابی کیفیات اورانتہائی نازک ترین احوال کو جاننا ضروری ہے۔

تاریخ وہ وقت کیسے فراموش کرسکتی ہے، جب کہ ہندوستان کے آخر مغل فرماں روا

بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے پا بہ زنجیر رنگون میں منتقل کیا جا رہا ہو، دہلی میں قتل عام، لوٹ مار کی کھلی اجازت ہو، لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے ہوں، اور بالخصوص اہل اسلام کی لاشوں سے دہلی اور اطراف کو پاٹ دیا گیا ہو، دہلی سے پشاور تک سڑک کے دو رویہ درختوں میں شاید ہی کوئی درخت ہو، جس پر کوئی لاش نہ لٹکی ہوئی ہو۔ ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار سے زائد علمائے کرام کو تہہ تیغ کر دیا گیا ہو، باقی ماندہ علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت پر فرضی مقدمات قائم کر کے بغاوت کے الزامات عائد کر کالے پانی کی سزا کے طور پر جزائر انڈومان بھیج دیا گیا ہو، جہاں بے شمار مقتدر علمائے کرام نہایت کسمپرسی اور بے بسی کی زندگی گذار کر آسودۂ خاک ہو گئے ہوں، اوقاف بحق سرکار ضبط ہو چکے ہوں، جن کی آمدنیوں سے دینی درسگاہیں اور مدارس قائم تھے، ان ہی خوں چکاں احوال کے بیچ یورپ سے پوپ کی ایما پر ہزار ہا ہزار کی تعداد میں پادریوں کا ایک جم غفیر حکومت کی فوجوں کے سائے میں علی الاعلان اسلامی تعلیمات، اسلامی عقائد، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات کو ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی سرزمین میں دفن کر دینے اور تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کی ناکام و نامراد خواہش کو انجام دینے کے لیے بے چین ہو۔ ”یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ“.(۱)

اسی شورش بلاخیز اور ہلاکت خیز احوال کے سبب پیدا شدہ مایوسی کو بانداز دگر بھی جانیے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ، جو کہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے اولین صدر مدرس قرار پائے تھے اور مجذوبانہ طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کا پورا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کی ایک تحریر سے یاس کی کیفیت جھلکتی ہے۔ مکتوبات یعقوبی میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

(۱) ترجمہ: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ بات کتنی بری لگے۔ (سورۃ الصّف: ۸)

”مجموعۂ حال کے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب دین کا خاتمہ ہے، نہ کوئی پڑھ سکے گا اور نہ کوئی پڑھا سکے گا، بڑے بڑے شہر (جیسے دہلی) جو مرکز اس دائرے کے تھے خراب ہو گئے ہیں، علماء پریشان، کتب مفقود، جمعیۃ ندارد، اگر کسی قلب میں شوق اور طلب علم کی ہمت ہو، تو کہاں جائے، کس سے سیکھے اور یوں نظر آتا تھا کہ بیس تیس سال میں جو علماء بقید حیات ہیں، جب اپنے وطن اصلی جنت کو سدھار جائیں گے، تب شاید کوئی اتنا بتانے والا بھی نہ رہے کہ وضو کے فرائض کتنے ہیں اور نماز میں کیا واجب ہے“۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا تذکرہ کیے بغیر دارالعلوم دیوبند کی بنا، یا حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کی تحریک کو سمجھنا مشکل ہے، جس کا نصب العین ہندوستان میں آنے والی مسلمان نسلوں کے اسلامی عقائد و شعائر، روایات، تہذیب و تمدن کا تحفظ تھا، جس کا اثر و نفوذ بجز راہ تعلیم کوئی دوسرا نہیں تھا؛ کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کے اسلامی تشخص کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے لارڈ میکالے کے روپ میں اٹھا اور اس میں مزید مذہبی تخریب کاری کے نقطۂ نظر سے پادریوں کی منظّم تبلیغ کے ساتھ مستزاد آریہ سماج کے منظّم پرچار کی صورت میں جو طوفان تھا، اس پر بندھ لگانے کا کام صرف اسی تعلیمی تحریک نے کیا، جو کہ بالہام حق جل مجدہٗ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

موضوع زیر نظر کے تعلق سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند ”سوانح قاسمی“ جلد اوّل کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ:

”دنیا میں مذہبی و قومی مقتداؤں کی سوانح نگاری کا معمول تو قدیم دور سے چلا آرہا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایسی مقتدر و ممتاز شخصیات کی سیرت و سوانح کا تحفظ اور بھی زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے، جو اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے سبب کوئی خاص نصب العین اور نظریہ لے کر اٹھی ہوں اور اپنی دعوت و رہنمائی اور کارہائے عظیم کے سبب کسی قوم کا مرکز و مدار قرار پا گئی ہوں، ایسی شخصیات کی زندگیوں کا دنیا کے سامنے پیش کیا جانا محض اس لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ زندہ رہیں؛ بلکہ اس لیے کہ ان کے حیات بخش

نصب العین پر عامل قومیں اور جماعتیں صدیوں تک زندہ رہتی ہیں، یعنی ایک رہنمائے ملّت کو بعد از مرگ اس لیے زندہ نہیں رکھا جاتا ہے، کہ صرف اس کا نام باقی رہے؛ بلکہ اس لیے کہ اس کا کام باقی رہے، اور اس کے نصب العین کے تسلسل و استمرار سے اس کی قوم اور اس کی جماعت کامیاب ہو کر باقی رہے۔ اور پھر ایسی شخصیت جو کہ کسی قوم کے ناہموار اور بگڑے ہوئے حالات میں سامنے آئے اور اپنی قریب المرگ قوم کو سہارا دے کر سنبھال لے جائے، تو کوئی شبہ نہیں کہ ایسی شخصیت کو مدام باقی رکھنا درحقیقت اس کے اصلاحی نقوش کو باقی رکھنا ہے، تاکہ ان نقوش سے ان جیسی اپنے اپنے ادوار کے تقاضوں سے ہم آہنگ شخصیات آئندہ بھی بنتی رہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی منفرد شخصیت کا اس کے اصول ونظریات کے پردہ میں قائم رکھنا حقیقتاً شخصیت سازی کی فیکٹری قائم کرنا ہے، جس سے ڈھل ڈھل کر شخصیات کے بنتے رہنے کا ایک غیر منقطع تسلسل قائم رہے۔

بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ بارہویں صدی ہجری مطابق اٹھارہویں صدی عیسوی کی ایسی ہی فردِ فرید، ممتاز ترین اور عبقری شخصیت ہیں، جو نہ صرف اپنے منتخب علم وعمل، ممتاز اخلاق و کردار اور مثالی کمالات وفضائل کے ساتھ سرزمین ہندوستان پر نمایاں ہوئے؛ بلکہ ساتھ ہی ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر و ہمہ جہت نصب العین بھی لے کر اٹھے جس میں مردہ دلوں میں روح پھونک دینے اور قوم کے پژمردہ پیکر میں ازسرِنو جان ڈال دینے کی اسپرٹ موجود تھی اور جس نے بالآخر عملی طور پر یہی تاثیر بھی دکھلائی اور قوم کا ایک یگانۂ روزگار بطل جلیل بنا کر پیش کیا گیا ہے‘‘۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا مرکزی نصب العین تعلیم اسلامی کا فروغ تھا، جس سے کہ علم الٰہی کی شعاعیں ہندو بیرون ہند میں پڑیں، ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اس دور میں ہندوستان کے خوں آشام احوال اور ملت اسلامیہ کے تیز رفتاری کے ساتھ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی زوال پذیر حالات کے مدنظر اصلاح احوال اور

تحفظ عقائد و دین کے لیے بجز اسلامی تعلیم کے سادہ؛ مگر مضبوط نظام کے ناگزیر قیام کے علاوہ اور کوئی دوسری راہ بھی نہیں تھی اور وقت نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ فیصلہ ان کی ایمانی فراست اور بالہام حق جل مجدہٗ دور رس نتائج کے ادراک کو محیط تھا۔ امت مسلمہ کے لیے تاریخ اسلامی کی وہ محسن ساعات تاریخ میں ایک انقلاب انگیز اور سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہیں، جب کہ ملک کے عمومی ظلمت آمیز اور جبر و استبداد سے بھرپور ماحول میں حضرت قاسم العلوم الامام النانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی بابرکت قیادت میں حق تعالیٰ کی جانب سے منتخب کردہ نفوس قدسیہ کی نہایت مبارک و مسعود معیت میں مؤرخہ ۱۵ رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ- مطابق ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء کو دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ انگریزی دور حکومت میں یورپ سے آئے ہوئے طوفانی الحاد، دہریت و عیسائیت کے طوفان پر قدغن لگانے والا پہلا تعلیمی ادارہ یہی دارالعلوم دیوبند ہے، جس کی داغ بیل کے لیے جہاں ایک طرف سرخیل جماعت حضرت نانوتویؒ اور ان کے ساتھ مخلص ترین معاون جماعت کے نفوس قدسیہ کو بالہام خداوندی منتخب فرمایا گیا تھا، وہیں دوسری طرف پاک باز خلوتوں میں سید الطائفہ شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ کی الحاح وزاری، التجا اور دعائے نیم شبی نے کام کیا اور حق تعالیٰ نے ان برگزیدہ و خدارسیدہ علماء اور بزرگوں کی مستجاب دعواتِ صالحہ کو ایسی قبولیت سے سرفراز فرمایا اور اس اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مدرسہ کو ایسی ترقی عطا فرمائی، کہ مایوس کن اور ظلمت آمیز ماحول میں جو مدرسہ چھتہ مسجد کے ایک انار کے درخت کے نیچے ایک استاذ حضرت ملا محمود صاحبؒ اور ایک شاگرد حضرت مولانا محمود حسن صاحب المعروف بہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما سے جاری ہوا تھا، اسے نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی علمی مرکز و مرجع بنا دیا اور اس نے کتاب وسنت، اسلام اور مسلمانوں کی ایسی محیر العقول اور عظیم الشان خدمات انجام دیں، جس سے دین اسلام کا چرچا عام ہو گیا اور نصب العین کے مطابق سوئی ہوئی امت مسلمہ میں دینی و اسلامی شعور بیدار ہو گیا اور غیر ملکی حکومت کا خوف و ہراس ان کے دلوں

سے نکل گیا؛ بلکہ اسی مدرسہ کے فارغین وفضلاء کی ہی جدوجہد کی بدولت ہی ملک نے استبدادی قوتوں سے آزادی حاصل کی اور ملک کے طول وعرض میں حضرت بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی مخلصانہ جہود سے عوامی چندوں سے چلنے والے دوسرے ادارے اسی نہج اور طرز پر قائم ہوئے، اوراس طرح سارے ملک میں دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی عام مسلمان ایمان وایقان کی دولت سے مالامال ہوگئے۔ چناں چہ جہاں ایک طرف حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کی یہ تحریک مدارس انحائے عالم میں مسلک دیوبند یا دیوبندیت کے عنوان سے معروف ومتعارف ہوئی، وہیں دوسری جانب مرورِوقت کے ساتھ اصحابِ علم وعمل سے لے کر عامۃ المسلمین تک اس مبنی برحقیقت تاریخی روایت کوتواتر کے ساتھ ذات حق جلّ مجدہٗ کی طرف سے یہ سند قبول بھی عطا ہوئی، کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے ہی بانی ہیں؛ بلکہ برصغیر سے لے کر عالمی سطح تک تحریک مدارس کے بھی بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سوسالہ تاریخ اسی حقیقت واقعہ پر شاہد عدل ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی معتدل مسلک صحیح کے مطابق خواہ مدارس کی شکل میں، خواہ دعوت وتبلیغ کی صورت میں ہو، خواہ اجتماعی اور علمی دوائر کے پیرائے میں ہو، بہمہ نوع اشکال میں دین بین کی عظیم الشان اور رفیع المرتبت خدمات انجام دی جارہی ہیں، ان تمام فیض رسانیوں کے سلسلے اورسوت واسطہ یا بلاواسطہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی تحریک مدارس سے جڑتے ہیں؛ کیوں کہ دارالعلوم دیوبند کا قیام محض ایک مدرسہ اورایک ادارے کا ہی قیام نہیں تھا؛ بلکہ بصورت مدرسہ صدیوں پرمحیط عظیم نتائج برآمد کرنے والی رجال سازی کی تحریک اورعلم وعمل کے کہکشانی سلسلے میں اجتماعیت کا شان آغاز تھا اورگذرتے وقت نے بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی ایمانی فراست کے زیراثر دوررس نتائج کے حامل آفاقی فکر پرمہر تصدیق ثبت کردی کہ علم وعمل، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، سیاست وصحافت، اجتماعیت وقیادت، تحریک حریت وطن جیسا کون سا میدان ایسا ہے، جس میں کثرت کے

ساتھ اس رجال ساز فیکٹری میں عظیم الشان اور عبقری شخصیات ڈھل ڈھل کر اپنے اپنے ادوار کے مطلوبہ تقاضوں سے ہم آہنگ عظیم المرتبت افراد کار نے امت کی رہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام نہ دیے ہوں۔ اس تحریک کے کہکشانی سلسلے کے جلو میں علم وعمل کے آفتاب و ماہتاب کے محض ناموں کو ہی شمار اگر کیا جائے، تو کارنامے تو بجائے خود صرف ناموں کی فہرست اور ان کا تعارف ہی ایک مستقل کتاب کی صورت بن جائے۔ علیٰ سبیل المثال اس تحریک کے آسمان علم و عمل میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب، فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین جیسے ہزاروں درخشاں وتابندہ شمس وقمر اپنے علم وعمل کی معنویت کے لحاظ سے آج بھی فیض رساں ہیں، یہ سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ! جاری رہے گا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ رقم طراز ہیں کہ: ”دارالعلوم دیوبند کے اس ہمہ گیر تعلیمی نظام نے جو مدارس کی ضرورت میں ہندوستان بھر میں پھیلا اور دہریت والحاد کے اس سیلاب پر بندھ لگایا، جو مغرب کی جانب سے ہوتا ہوا دیار ہند کے گھروں میں داخل ہوا چاہتا تھا، اگر لارڈ میکالے نے یہ کہہ کر اپنا نظام تعلیم ہندوستان میں پھیلایا تھا کہ: ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے، جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی اور روح وفکر کے لحاظ سے انگریز“، تو حضرت قاسم العلومؒ نے دارالعلوم کی بنیاد ڈالتے ہوئے لسانِ حال سے یہ علمی صدا بلند کی: ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے، جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندی وسندھی، ایرانی وافغانی اور خراسانی وترکستانی ہوں؛ لیکن روح وفکر کے لحاظ سے اسلامی وعربیت کی روح سے معمور ہوں“۔

جیسا کہ زیر نظر تحریر کی ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ایسی ہمہ جہت وہشت پہلو شخصیت پر محدود صفحات کی حدود و قیود کے ساتھ کسی ایک جہت پر ہی سہی مضمون تو بجائے خود ہے،

تقریظ کے تعارف وتمہید کا بھی حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بس بالفاظ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی تابندہ و پائندہ تاریخ کی ایک اعلیٰ و بامقصد زندگی اپنے تبحر علم وفہم، بصیرت و فراست، ذکاوت وذہانت، عدیم المثال جد وجہد، حسن کردار وعمل اور اعلیٰ اخلاق واخلاص سے صدیوں تک کے لیے اپنے مابعد لوگوں کو حیات آفریں مقصد وہدف سے متعارف وہم کنار کر کے آسودۂ رحمت ہوگئی ہے۔

دار العلوم وقف دیوبند میں عہد حاضر کے تقاضوں اور مطالبات سے ہم آہنگ شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے قیام کے بنیادی واساسی مقاصد کا ایک اہم ترین حصہ بہ شمول طلبۂ عزیز کو عصر حاضر کے لازمی تقاضوں سے متعارف وروشناس کرانے اور مختلف ومتنوع عناوین پر مشتمل، شخصیتوں کے سیر حاصل محاضرات کے ذریعہ مفید مطلب معلومات فراہم کرانے؛ نیز آج کی رائج الوقت زبان انگریزی میں قدرتِ تحریر وبیان اور منظّم تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے جیسے اہم ترین مقاصد کے حامل ہیں، تاکہ اپنے اکابر واسلاف کے عظیم الشان کارناموں اور ان کی علمی تراث کی بایں طور حفاظت کی جاسکے، کہ بحث وتحقیق کے جدید اسالیب وضوابط کے زیر اثر نئے سرے سے اس پہلو پر کام کرایا جائے؛ نیز عربی، انگریزی میں ان کے بلند پایہ تراجم کے ذریعہ عرب و یورپ اور دنیا کے دیگر علمی دوائر میں اپنے اکابر واسلاف کی تاریخ ساز اس عظیم ترین علمی تراث کو متعارف کرایا جائے۔

بارگاہِ ایزدی میں بہ ہزار سجدۂ شکر بطور تحدیث نعمت وتوفیق اس حقیقت کا اظہار برموقع وبرمحل ہوگا کہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی عزیزم مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی سلّمہٗ، ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی، استاذ ونائب مہتمم دار العلوم وقف دیوبند کے زیر انتظام ان کے مخلص رفقائے کار کی مخلصانہ جہود وکاوشوں کے ساتھ اپنے بنیادی واساسی مقاصد کی راہ پر گامزن ہے، اور یہ تاریخ ساز عظیم ترین علمی دستاویز: ''نگارشاتِ اکابر بتذکرۂ جواہر معارف'' بھی اکیڈمی کے علمی سفر کا سنگ میل ہے، جس کے لیے بجا طور تمام شرکائے کار تشجیع وتبریک کے

مستحق ہیں۔

حق تعالیٰ ہم جملہ اخلاف کو اتباعِ رسول اللہ ﷺ پر استقامت کے ساتھ اپنے اکابر و اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے سرفراز فرماتے ہوئے اس تاریخ ساز دستاویز کی اشاعت میں شریک تمام افراد کارکو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائیں۔

وباللّٰہ التوفیق و ما علینا إلا البلاغ المبین

بانٹا ہے جس نے بادۂ عرفانِ مصطفیٰ

(حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمی)

رجال کار خدائی نظام ہدایت کا حصہ ہوتے ہیں، جو اپنی تعلیمات، سیرت و کردار، اخلاق و عمل، اپنی ظاہری و باطنی قوتوں اور ذہنی وفکری صلاحیتوں سے انسانی تہذیب و تمدن کو اس نظامِ ہدایت کے سانچہ میں ڈھالنے اور اس کی مرضی ومنشاء کی ترویج وتطبیق کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، یہ رجال کار اپنے آپ میں ایک عہد کی دینی تاریخ اور اپنی ذات میں ایک مستقل امت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے ایک تاریخ بنتی ہے، ایک زمانے کے دینی تصورات اور فکری ارتقاء کی ایک اجلی تصویر اور تجدید دین کی ایک صاف ستھری تفسیر خود ان کی ذات ہوتی ہے۔ آنے والے ان کی کتابِ زندگی کے جب اوراق پلٹتے ہیں تو لفظ لفظ ان کے تقویٰ وطہارت کی شہادت فراہم کرتا ہے، سطر سطر ان کی دینی عظمت، ایمانی قوت اور سیرت وکردار کی پاکیزگی کی سند پیش کرتی ہے۔ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے پاکیزہ قصوں کے ضمن میں جگہ جگہ ان مقدس ہستیوں کی صلاح وتقویٰ سے معمور زندگیوں اور ان کے ایمان افروز تذکروں کو بار بار دوہرا کر یہ سبق دیا ہے کہ رجال دین کے حالاتِ زندگی انسانی سیرت واخلاق کی درست نہج پر تعمیر کا ایک پراثر اور طاقتور پیغام اپنے اندر رکھتے ہیں، ان کی زندگی کے قیمتی لمحات، کتنی ہی زندگیوں میں صالح انقلاب کا ذریعہ، ان کی سیرت وکردار کی روشنی مخلوقِ خدا کے لئے قندیل ربانی اور ان کی للّٰہیت اور حسن نیت کے سچے واقعات پژمردہ دلوں کے لئے حیات نو کا سامان بنتے ہیں۔

✿ تقریظ: حیاتِ طیبؒ از: مولانا غلام نبی قاسمی ومولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی، مطبوعہ حجۃ الاسلام اکیڈمی

انہیں پاکیزہ مقاصد کو سامنے رکھ کر سلفِ صالحین کی سوانح عمریاں مرتب ہوئیں اور تراجم کا ایک خزانہ عامرہ امت کے سامنے آیا، اسے حکمت الٰہیہ کی کارفرمائی کہئے کہ دین اسلام کی تعلیمات، عباداتِ نظام اخلاق اور شرائع واحکام کے تحفظ کا ذریعہ جب رجال دین کو بنایا تو خود رجالِ دین کے نقوش زندگی اوران کے ذکر خیر کی حفاظت کا بھی تکوینی طور پر اس طرح بندو بست فرمادیا کہ تراجم رجال اور شخصیات دین کی سوانح حیات کو منضبط ومحفوظ کردینے کا داعیہ امت مسلمہ میں پیدا فرمایا۔ اس تکوینی نظام کے تحت امت مسلمہ کے پاس اپنے آخری پیغمبر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ایک ایک گوشہ اور آپؐ کے مقدس ارشادات کے الفاظ اور جملے ہی نہیں، ایک ایک حرف اور ایک ایک شوشہ محفوظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیاز اور شرف صرف امت ہی کو حاصل ہے کہ اس کے پاس نہ صرف اللہ کی آخری کتاب اور آخری پیغمبرؐ کی سنت محفوظ ہے بلکہ اللہ کے آخری نبیؐ کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ کے اعمال، طور طریقے اور احوال تک محفوظ ہیں، حتی کہ جن نفوس کو آپؐ کی پاکیزہ صحبت میں ایک لمحہ بھی گزارنے کی سعادت میسر آئی، ان کے حالاتِ زندگی بھی محفوظ بلکہ دین کا حصہ بن گئے۔ ابتدائی دینیات کے ایک معصوم اور سادہ لوح بچہ سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے بارے میں کوئی سوال کیجئے، یقین ہے کہ وہ بھی انشاء اللہ بے خبر نہ ہوگا، اس کے برخلاف کسی عیسائی یا یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں ان کے ماننے والوں میں سے کسی بڑے سے بڑے عالم سے بھی سوال کریں گے تو سکتہ میں آجائیں گے، ان تک اولاً تو کچھ پہنچا ہی نہیں اور بدقسمتی سے پہنچا بھی تو وہ تحریف و تصرف کا ایسا ملغوبہ ہے کہ جس کو پڑھ کر کسی صحیح بات کا پتہ لگانا تو دور، یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ آخر یہ ہے کیا چیز؟

جد مکرم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے

علوم وافکار اور نسبی خصوصیات کے امین اور ترجمان تھے۔ امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسی عظیم الشان ہستیوں سے انہوں نے کسب فیض کیا اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ جیسے شیخ کامل سے روحانی تربیت پائی۔ گھر کا ماحول خالص علمی اور دینی، تقریباً ساٹھ سال تک اپنے جد امجد کے قائم کردہ سرچشمہ فیض دارالعلوم دیوبند کے عدیم المثال مہتمم کی حیثیت سے فقید المثال اور تاریخ ساز خدمات انجام دیں اور اپنے دور میں ملت اسلامیہ ہند کے متفق علیہ دینی قائد، عظیم داعی دین، بلند پایہ خطیب، بہترین متکلم، شاندار مصنف اور کامیاب مدرس، ایک دانشور، مفکر اور تقویٰ وطہارت اور اخلاص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔ راقم السطور کو اپنے بچپن سے حضرت حکیم الاسلامؒ کے آخری وقت تک ان کے معمولات، معاملات، معاشرت، سیرت و اخلاق اور عادات و اطوار کو دیکھنے اور سمجھنے کی سعادت میسر آئی، بعض اسفار میں بھی حضرتؒ کی معیت نصیب ہوئی، گھر میں بچوں کے ساتھ گھلے ملے رہتے اور شفقت کے ساتھ پیش آتے، تربیت کا انداز بھی حکیمانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، ڈانٹ ڈپٹ اور سخت سست کا کوئی لفظ ان کے لغت میں تھا ہی نہیں، ان کے ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں ایک روشنی، سکینت، طمانیت کی بارش ہورہی ہے۔ اعزہ واقرباء کی خبرگیری، بیمار پرسی، خوشی وغم میں شرکت، ہمدردی، مہمان نوازی، فیاضی، اتباع سنت، نفاست، لطافت، احتیاط، دیانت، شرافت یہ سب اوصاف حکیم الاسلامؒ کی شخصیت سے نمایاں ہوتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی ادارہ کے مہتمم و منتظم کی حیثیت سے صرف ہندوستان ہی نہیں ایک دنیا انہیں جانتی تھی، ان کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف کرتی تھی، بڑے بڑے لوگ ان کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے، بایں ہمہ انکساری اور خاکساری کا پیکر معلوم ہوتے، قول وعمل اور برتاؤ میں کبر اور غرور کا شائبہ تک نہ تھا، ایک اجنبی بھی اپنائیت محسوس کرتا، بیگانہ بھی محبت کرتا، صبر و برداشت کے تو گویا کوہ وجبل تھے۔ عمر کی آخری منزل میں جن آزمائشوں سے گزرے ان میں مومنانہ صفات کھل کر

سامنے آئیں، اف تک نہیں کیا اور سب برداشت کر گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی مصروفیات اور پیہم اسفار، دعوتی مشاغل اور جسمانی عوارض وضعف کے باجود مطالعہ و کتب بینی، تصنیف وتالیف، وعظ وخطابت اور تلاوت اور ذکر وفکر کے ہی معمولات جاری رہے جوان کی زندگی کا جزء لاینفک تھے۔ عہد طفولیت سے لے کر تعلیم سے فراغت تک کے تقریباً بائیس برس اگر نکال لئے جائیں تب بھی نصف عمر ایسی گزرتی ہے جس کے شب وروز علم وعمل، خدمت دین میں گزرتے ہیں اور ایک لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں آرام سے بیٹھے ہوں یا قلب ودماغ علمی مشاغل سے فارغ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر دیوبند میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعد دین کے ہر موضوع پر سب زیادہ تصانیف آپ ہی کی ملتی ہیں۔

ہر مسئلہ کو حکمت قاسمیہ کے رنگ میں حل کرتے اور مخاطب کے ذہن میں نقش کر دیتے۔ تحریر وتقریر، مجلس وگفتگو ہر ایک میں یہی حکیمانہ اسلوب ان کا امتیاز تھا۔ بعض ادق علمی مسائل کو انہوں نے اپنے انداز میں امثال وواقعات اور نئے نئے مقدمات کے ذریعہ اس طرح حل کیا ہے کہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی۔

حکیم الاسلامؒ کی وفات کو تقریباً اکتیس برس ہو چکے ہیں، ہماری دلی خواہش تھی اور کوشش بھی کہ آپؒ کی ایک مفصل سوانح حیات سامنے آنی چاہئے جس میں آپ کی حیاتِ مبارکہ اور علمی کارناموں کا ایک ایک گوشہ آجائے مگر ایسی عظیم شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس عرصہ میں حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کے بعض گوشوں پر مفید تحریریں بھی سامنے آئیں، بالخصوص ۲۰۰۶ء میں جب آپ کی حیات ووفات پر ایک عالمی سیمینار کا اعلان کیا گیا، اس وقت مقالات ومضامین کی صورت میں مشاہیر اہل علم کی معیاری تحریریں ہمیں موصول ہوئیں، جنہیں سیمینار کے بعد شائع کرنے کا عزم تھا، مگر تاخیر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ تحریریں حکیم الاسلامؒ کی سوانح کا حصہ بنیں۔

رب کریم کا احسان ہے کہ آج ہمارے اس دیرینہ خواب کی تعبیر ''حیاتِ طیب''

کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔

''حیاتِ طیب'' کی ترتیب میں جناب مولانا غلام نبی قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند وعزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی سلّمہٗ ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند نے جس محنت، صلاحیت اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے وہ حقیقت میں قابل ستائش ہے۔

جدید طرز تصنیف کے ساتھ ترتیب، کتابت، تصحیح، طباعت، سرورق اور کاغذ کا جو بہتر سے بہتر معیار ہوسکتا تھا اس کے لئے امکانی کوشش کا یہ نمونہ آپ کے سامنے ہے، اس کے لئے عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند بطور خاص مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جن کی جہود کے دائرۂ عمل حجۃ الاسلام اکیڈمی کے قیام کو سنگل میل کی حیثیت حاصل ہے جس کا سالِ رواں میں عزیز موصوف ہی کی تحریک سے قیام عمل میں آیا اور اس مختصر عرصہ میں اکیڈمی سے متعدد ومتنوع امور انجام دیے گئے ہیں، اس میں ایک عالمی سطح کے مجلّہ محکمہ ''وحدۃ الامہ'' کو ایک خاص اہمیت و حیثیت حاصل ہے جس کا اجراء گزشتہ دنوں ساؤتھ افریقہ (جوہانسبرگ) میں منعقدہ سہ روزہ امام محمد قاسم نانوتوی سیمینار کے موقع پر عالمی سطح کے مشاہیر علماء ودانشوران دین کی موجودگی میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے شیخ الحدیث جناب ڈاکٹر محمد عوامہ صاحب ادام اللہ حفظہ اور خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ، سابق مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے اور دوسرا عظیم الشان کارنامہ ''حیاتِ طیب'' کی ترتیب و اشاعت ہے، جس کے لئے بشمول ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی، جملہ معاون اراکین اکیڈمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کی افادیت کو عام فرمائے۔ آمین

کہکشانِ علم وعرفان کی نابغہ روزگار شخصیت

(بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)

حق تعالیٰ جلّ مجدہٗ نے رسالت مآب محمد رسول اللہ ﷺ سے منسوب ومربوط خیر امت کو اپنے حبیب پاک کی جوتیوں کے صدقے میں جہاں اپنی بے حد ونہایت نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے، بہ ہزار سجدۂ شکر محض ایک نعمت کا بھی قرار واقعی حق ادا کرنے سے قاصر وعاجز بندے پر اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت بہ صورتِ آسانی بایں طور بھی ہے کہ مہد سے لحد تک ایک مومن کو جب جب زندگی کے کسی بھی مرحلے، کسی بھی شعبہ، کسی بھی عنوان کے زیرِ اثر کسی بھی علمی یا عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ سب سے پہلے اسوۂ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے براہِ راست، یا اس کے قوس وقزح کے اَن گنت الوان میں پھیلے علمی ذخائر سے فیض پاتے ہیں اور خوش بخت وخوش نصیب ہدایت پا جاتے ہیں، علیٰ رؤس الاشہاد یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کتب خانۂ اسلام کے گنج ہائے گراں مایہ میں بہمہ رنگ ونوع ایسے ایسے گوہر آب دار مصادر موجود ہیں، جن میں سے ہر ایک بلا فرق عہد وقرن ہماری علمی تشنگی کو تفاوتِ فہم وعقل اور بہمہ نوع زاویۂ فکر ونظر کے علی الرغم سیرابی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ سب بہمہ رنگ ونوع مصادر اسی قوس وقزح کی کرشمہ سازیاں ہیں، جس کا منبعِ فیض نبی اکرم علیہ الصلاۃ والسلام کی ذات اقدس ہے؛ البتہ اندازِ فکر وفہم پر مرورِ زمانہ کے اثرات اور زمانے سے ہم آہنگ تعبیرات و

۞ تقریظ: منہاجِ علم وفکر، فکرِ نانوتوی اور جدید چیلنجز از: مولانا فخر الاسلام مظاہری، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

اصطلاحات، استعارات کی بہ اسلوبِ جدید، تفہیم کو اصحاب علم نے علم و آگہی کے ارتقائی سفر کا ناگزیر حصہ قرار دیا ہے۔ اسلام کے علمی و فکری گنج ہائے گراں مایہ کی عظمت وافادیت کا اعتراف تو دیگر اقوام کے راست فکر اصحابِ علم نے بھی کیا ہے، اور اس کی بنیاد ہم آہنگی ادوار تعبیرات، اصطلاحات، توضیحات و تشریحات ہی بنی ہیں اور یہ بھی دراصل امت محمدیہ پر انعامات خداوندی کا تکوینی حصہ ہے، جس کے زیر اثر اس خیر امت کو حق تعالیٰ نے علمی امت بنا کر پیش کیا ہے۔ اقرب الی الفہم کے طور پر حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، بانی و صدر اوّل آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی معرکۃ الآراء تصنیف ''تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام'' کا یہ اقتباس برموقع ومحل ہے، رقم طراز ہیں: ''امت مسلمہ علمی امت ہے، جس پر علم وحکمت کا غلبہ ہے، امم واقوام اور ان کے شئون کو پیش نظر رکھ کر دنیا کی اس آخری قوم اور خیر الامم امت اسلامیہ کو لیجیے، تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ذہنیت بھی اپنے مربیٔ اعظم حضرت اعلم الاولین والآخرین نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی مبارک شان کا ایک ظل اور پرتو ہونے کی وجہ سے خالص علمی ذہنیت ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ کی غالب شان علم وحکمت، درک وادراک اور بصیرت ومعرفت تھی؛ چناں چہ جس قوم کا دستور العمل قرآن کریم جیسی جامع اور تِبیانــاً لکل شیئ کتاب ہو، تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی ذہنیت علوم ومعارف میں غرق نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ظہور علم کے آلات دو ہی ہیں: ایک زبان ہے اور دوسرا قلم ہے، اور ان بہ ہر دو ذرائع کے لحاظ سے اس امت نے جن علمی نوادرات اور غیبی علوم کا افشاء کیا ہے، ہم علیٰ رؤس الاشہاد بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ علمی امت علمی کمالات میں امم سابقہ سے منزلوں آگے بھی ہے اور بہت واضح طور پر فائق بھی ہے۔ بقول شخصے کہ: اس امت کے خطبوں، تقریروں، شعلہ بیانیوں اور دریا روانیوں نے اس درجہ اثر ونفوذ کیا کہ خود ہی کلام نہیں کیا، دوسروں کو بھی بولنا سکھا دیا، گونگوں کو خطیب بنا دیا اور بے زبانوں کو زبان آوری پر قادر کر دیا، جس کو خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے اپنی مسدس

میں اس طرح بیان کیا ہے:

عرب کی جو دیکھی وہ آتش بیانی ☆ سنی برمحل ان کی شیوا بیانی
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی ☆ وہ خطبوں کی مانند دریا روانی
سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم کا ☆ نہ ڈھپ یاد تھا شرح شادی و غم کا
نہ انداز تلقین وعظ و حِکم کا ☆ خزانہ تھا مدفوں زباں اور قلم کا
وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے ☆ تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے
نواسنجیاں ان سے سیکھیں یہ سب نے ☆ زباں کھول دی سب کی نطق عرب نے

تصانیف کے میدان میں امت مسلمہ کے وفور علم کو دیکھو تو بقول صاحب مواہب علامہ زرقانیؒ کہ: کثرت تصانیف ہی اس امت کی خاصیات کا مابہ الامتیاز تعارف ہے، کتب خانے آباد ہی ان کی تصنیفات وتالیفات سے ہیں، کہ کسی علم کو نہ چھوڑا، کسی فن کو نہ چھوڑا، علم وآگہی کا شاید ہی کوئی مصدر ہو، جس میں بے شمار ذخیرے نہ جمع کر دیے گئے ہوں۔ خلافتِ عباسیہ کے دور میں عراق کے عظیم الشان کتب خانے، اموی خلافت کے دور اندلس میں اسپین کے کتنے ہی مکتبے، حجاز و روم کی لائبریریاں، مصر کے بے شمار ذخیرے، ہندوستان کے ہزار ہا ہزار کتب خانے اور محروسہ ہائے اسلامیہ کے سیکڑوں علمی ذخائر باوجودے کہ تباہ و برباد بھی ہوئے اور کیے بھی گئے، دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھے، جلائے بھی گئے، دریا برد بھی کیے گئے، نذر آتش بھی ہوئے اور کروڑ ہا کروڑ کتابیں کیڑوں کی نذر بھی ہوئیں، ہزار ہا ہزار علمی ذخیرے نااہل اخلاف کی غفلت وکوتاہی کی نظر بھی ہوئے، اس کے علاوہ معاند حکومتوں نے اپنی تمام تر طاقت کے بل بوتے پر پچاس پچاس برس کی مدت میں ان علمی خزینوں کو مٹانے اور نذر آتش کرنے میں صرف بھی کیے، جیسا کہ اندلس میں ہوا۔ فتنۂ تاتار میں بغداد کا عظیم الشان علمی ذخیرہ دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا، جس سے کئی دن تک اس کا پانی رکا رہا اور جب چلا تو گاڑھی روشنائی بن گیا اور مہینوں دواتوں میں استعمال کیا گیا۔ غرض کہ یہ سب ستم ظریفیاں ہوئیں اور ڈھائی

گئیں؛ لیکن ان سب کے باوجود جو ذخیرے آج موجود ہیں اور بلاتوقف زمانی علمائے اسلام کی جو ہزار ہا ہزار تصنیفات وتالیفات منصۂ شہود پر آتی رہی ہیں اور آتی جارہی ہیں، وہ اس مقدار میں ہیں کہ یورپ وایشیا کے مطابع چھاپتے چھاپتے تھک جائیں، مصر وحجاز کی سلطنتیں طبع کرتی کرتی تنگ آجائیں؛ مگر ابھی بھی قدیم تیار شدہ، یا زیر تیاری علمی مواد ومصنفات کا عشر عشیر بھی پریس کے میدان میں نہیں پہونچ سکا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ قوم کی ہمتیں صرف علوم مختلفہ میں تصنیف وتالیف تک محدود رہ گئی ہو؛ بل کہ مستقلاً خود علوم وفنون بھی پیدا کرکے اور اختراعی طور پر قرآن کریم سے استنباط کرکے ان گنت تصانیف کے میدان بھی استوار کیے ہیں، گویا کہ یہ ایک تاریخی تسلسل ہے اور اس بسیط تر علمی کہکشاں کے سلسلے کا مرکز آفتاب وماہتاب نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی ذاتِ اقدس ہے۔ چناں چہ اس تمہیدی سطور اور تاریخی تسلسل کے تناظر میں اگر جائزہ لیا جائے، تو اس علمی کہکشاں کا تکوینی طور پر بہ توفیق بارالٰہ حصہ بنایا جانا انسان کے لیے خوش بختی وسعادت کی بین دلیل ہے۔

بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام الامام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کا شمار تیرہویں صدی ہجری میں اسی تاریخی تسلسل اور علمی کہکشاں کی نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے اور اس حقیقت الامر کی قبولیت عامہ پر گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں تواتر کے ساتھ صادق القول علماء، صلحاء اور اتقیاء کا علی الاتفاق ان کے علمی مقام عظمت واقبال اور آہنی عزم وحوصلہ کا قولاً وعملاً اعتراف بہ ذات خود ایک بین برہان وگواہی کی حیثیت رکھتا ہے، نیز دارالعلوم دیوبند کا قیام، تحریک مدارس کا آغاز، پیش آمدہ احوال سے مستنبط متوقع نتائج سے اندازہ لگا کر امت میں بلند حوصلگی کے جواہر کو بیدار کرنے کی کوشش، جس کو ایمانی فراست کے زیر اثر مستقبل شناسی کے عنوان سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے؛ یہ سب ان کے مقام عظمت ورفعت اور فکر ونظر کی حسی گواہیاں ہی تو ہیں۔ تصنیف وتالیف انسانی شخصیت اور اس کے فکر ونظر، مستویٰ تعلیم وتفہیم، عظمت فکر وتدبر جیسے مقامات کی غماز ہوتی ہے۔ اہل علم جب اس

کسوٹی پر حضرت الامام مولانا نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت کو پرکھتے ہیں، تو ان کے تعمق علم و بصیرت اور وسعتِ فکر و نظر کے حوالے سے ان کے مقام، کمالِ فن، علمی بصیرت اور عظمت اقبال کو ایک مخصوص اور ممتاز مقام پر جگہ دیتے ہیں۔

حضرت الامامؒ کی مصنفات پر عموماً علم کلام کا غلبہ ہے اور علم کلام درحقیقت دو چیزوں کا نام ہے: ایک اثبات کا، دوسرے ابطال کا۔ گویا کہ فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ عقل کے الجھاؤ کا ابطال اور اس کے بالمقابل نقلی و عقلی دلائل کے زور پر اسلامی عقائد کا اثبات، حضرت نانوتویؒ کی تحریرات پر یہی رنگ غالب ہے۔ چناں چہ دورِ حاضر کے فکر و مزاج کے تناظر میں ان کی تحریرات کی توضیح، تشریح، تنقیح اور تسہیل کے لیے علم کلام سے فی الجملہ جس طبعی مناسبت اور اس فن کے جدید اسالیب کے فہم و ادراک کے ساتھ قدیم اصطلاحات و استعارات سے واقفیت کے علی الرغم اپنے اکابر کے علوم و معارف اور بالخصوص حضرت الامام النانوتویؒ کے ژرف نگاہ علوم و معارف سے شعوری وابستگی اور جس گہرے علمی فکر و نظر کی ضرورت ہے، حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے محترم جناب مولانا فخر الاسلام صاحب مظاہری کو اس علم و فن سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ بہ ہر لمحہ تغیر پذیر دورِ حاضر کی سائنسی تحدّیات اور علوم جدیدہ کی راہ سے پیدا ہونے والے، یا کیے جانے والے جدید چیلنجز کا الامام مولانا محمد قاسم النانوتویؒ کے اصول اور افکار کی روشنی میں جائزہ لینا بہ ذات خود مؤلف محترم کی علمی بصیرت، وسعتِ مطالعہ اور موجودہ دور کے فکر و مزاج اور نفسیات پر گہری نظر کی دلیل ہے۔ موصوف محترم کے اس ذوق کو جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کے طبیہ کالج میں تدریسی مشاغل نے بھی جلا بخشی ہے۔

دعا گو ہوں حق تعالیٰ موصوف محترم کی اس بہترین کوشش و کاوش کو شرفِ قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے اس عظیم کام میں جملہ معاونین و متعاونین سمیت دارین میں اجرِ عظیم عطا فرمائیں۔

یقیناً ناسپاسی ہوگی کہ اگر دار العلوم وقف دیو بند کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام

اکیڈمی کے ڈائریکٹر عزیزم ڈاکٹر مولانا محمد شکیب قاسمی سلمہٗ اور ان کے تمام مخلص شرکائے کار کی شبانہ روز محنتوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور ان کے تحقیقی علمی ذوق کا ذکر نہ کیا جائے، جس کی بدولت گزشتہ چار سالوں میں اکیڈمی سے اردو، عربی اور انگریزی میں اپنے اکابر واسلاف کے علوم ومعارف کی اشاعت، نیز تسہیل وتعریب اور تراجم وتخریج پر گراں قدر ولائق تحسین کاموں کی قابل اطمینان پیش رفت کو ملک وبیرون ملک کے حلقۂ علم وعمل اور دوائر علمیہ واجتماعیہ کی جانب سے فرض کفایہ قرار دے کر وقیع تر الفاظ وکلمات میں اعتراف کیا جانا بلاشبہ ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

حق تعالیٰ حجۃ الاسلام اکیڈمی کے اس علمی وعملی دائرے سے وابستہ جملہ افراد کے حوصلوں میں بلندی اور علم وعمل میں ترقیات عطا فرمائیں، نیز اکیڈمی کے بہ ہر نوع معاونین کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمانے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم وقف دیوبند کے لیے نیک نامی کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین! وما توفیقی إلا باللّٰہ

مہر و اخلاص کا پرتوِ دل آویز

(حضرت مولانا قاری محمد قاسم انصاری)

نحمده و نصلّی علی رسوله الکریم وبعده

مخدوم ملت جناب حضرت مولانا سید محمد رابع الحسنی ندوی دامت برکاتہم کے کلمات عالیہ کے بعد بطور سخن اول کسی دوسری تحریر کی چنداں کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، تاہم حضرت مولانا قاری محمد قاسم انصاری صاحب رحمہ اللہ کے مدۃ العمر خانوادۂ قاسمی سے دیرینہ اخلاص و محبت پر مبنی تعلق و مراسم کے حوالے سے مخلص احباب کے اصرار کی نمائندگی کرتے ہوئے برادر عزیز جناب حسن صاحب آمبوری نے راقم سے رابطہ کیا جن کی طلب پر یہ چند سطور بعنوان تقریظ ارسال ہیں۔

واقعاتی حقیقت تو یہ ہے کہ زائد از چہار دہائیوں پر محیط ایک طویل ترین وقت گذر جانے کے باوجود فکر و خیال کے قرطاس پر حضرت مولانا قاری محمد قاسم انصاری صاحب رحمہ اللہ کے حوالے سے میرے بچپن کے ذہن پر ثبت شدہ واقعات میں آج بھی وہی دلکشی وہی تازگی و شادابی کی مہک موجود ہے جیسی کہ جد محترم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کے ہمراہ بطور رفیق سفر جنوبی ہند کے اسفار کے موقع پر حضرت قاری محمد قاسم صاحبؒ سے ملاقات کے وقت محسوس ہوتی تھی، علم و آگہی کی ابتدائی منازل میں قلب و ذہن انکی شخصیت کی کشش کو تو محسوس کرسکتا تھا لیکن اس

❁ تقریظ: خطباتِ قاسم بھوپالی

دلآویز کشش کے علل واسباب کے تجزیے سے بچپن کا ناپختہ ونارسا ذہن قاصر تھا، میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کسی مبالغہ آمیز جذبات کو کوئی دخل ہے کہ مدراس کی پریمیٹ مسجد جس کو محض اپنے مرکزی محل وقوع کے نقطہ نظر سے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے پس وپیش میں ملک کے طول وعرض سے آنے والے اصحاب علم وکمال کی بے تکلف آمد ورفت سلسلۂ تقریر وخطابات اور رجوع کثیر میں مرحوم ومغفور قاری صاحبؒ کی علم نواز فطرت، اخلاص و محبت کی اساس پر ملک کے کم وبیش تمام ہی علمی، دینی اور ملی حلقوں میں روابط کی کثرت، طبیعت میں وقار وانکسار کا ایک بہترین متوازن امتزاج، خوش خلقی وانداز مہمان نوازی کی دلآویزی اور علماء سے لیکر عامۃ المسلمین کے قلوب میں ان کے لیے یکساں انداز میں پائی جانے والی محبوبیت وگرویدگی جیسی صفات کو بھی مسجد کی معنوی مرکزیت میں بڑا دخل ہے، اور بحمد اللہ ان کے اہل علم اخلاف ان حسین اور تاریخ ساز روایات کے استمرار کو مزید بہتر و مفید تر اضافات کے ساتھ آج بھی مسجد پریمیٹ میں باقی وجاری رکھے ہوئے ہیں۔

حق تعالیٰ قاری صاحبؒ کے درجات بلند فرمائیں، مرحوم ومغفور نے اپنی حیات مستعار کی غالباً ستر بہاریں بھی پوری نہ کی ہوں لیکن اس متاع قلیل اور حیات عارضی کے ایک ایک لمحے کو اپنے اعمال وافعال اقوال واخلاق اور اپنی جلوت وخلوت کی پاکیزہ جلوہ گری سے ظاہر وخاموش عبادات کے قالب میں ڈھال کر زندگی کے کسی بھی وقت کو بے ہوش نہیں بلکہ باہوش وبامقصد طریق پر گذارا اور حکم حق جل مجدہٗ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۱) کو علماً وعملاً حیات باشعور دورانیہ میں حرزِ جاں بنائے رکھا، ذات حق جل مجدہ کے اس خصوصی فضل واحسان کی علت ثانیہ ان کا مدۃ العمر خدمت قرآن، شغف قرآن، قرأت قران، بیانات قرآن اور علوم قرآن میں انہماک و استغراق کا پایا جانا تھا، چنانچہ ایک عالم باعمل ہونے کی حیثیت سے علوم قرآن کے محور پر

(۱) ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔ (سورۃ الذاریات:۵۶)

ان کے ہفتہ واری خطابات کو اللہ تعالیٰ نے تاثیری مقبولیت کے نقطہ نظر سے بڑا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اہل علم وعمل کے نزدیک یہ ایک تسلیم شدہ مجرب حقیقت ہے کہ صاحب علم کے اقوال کی تاثیر دراصل علم وعمل میں کمال درجہ توافق وتوازن کے ساتھ پابندیٔ اعمال کی ہی مرہون منت ہوتی ہے، اور مرحوم ومغفور قاری صاحب بھی اصحاب علم کی اسی صف سے تعلق رکھتے تھے جو اس بین وروشن ابدی سچائی پر یقین رکھتے ہیں کہ علم محض جانکاری کا نام نہیں ہے بلکہ عمل کی استواری کو علم کے لئے خشت اساس کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور موصوف مرحوم میں اس صفت عالی کا پایا جانا دراصل ان کا خالص اخلاص قلب و نیت کے ساتھ اصحاب علم وعمل کی ہم نشینی، محبت وعقیدت آمیز گرویدگی اور قرار واقعی قدردانی کی ہی نتیجہ آفرینی تھی جس نے ان کے فکر وخیال کو پاکیزگی عطا کرتے ہوئے یہ حقیقت ان کے ذہن صافی میں جاگزیں کردی تھی کہ باطن کی تطہیر کے بغیر علم کا درجہ خبر سے زیادہ کچھ نہیں ہے، علیٰ سبیل المثال سطحی قسم کی عقل وشعور رکھنے والا ایک عام سا مسلمان بھی یہ کلیہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا قابل نفریں اور کریہہ فعل ہے، لیکن اس حقیقت کو جاننے کے باوجود نہ صرف یہ کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں بلکہ بعض تو بانگ دہل کہہ دیتے ہیں کہ کیا کریں جھوٹ بولے بنا گزارا بھی تو نہیں ہے، اور اس کا واحد سبب عدم تطہیر باطن ہی تو ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں مرحوم ومغفور نے تطہیر باطن کی اولیت و ماہیت کے فکر وخیال کی اساس پر اپنی شخصیت کو تعمیر کیا ہے، اسی لئے ذات حق جل مجدہ نے قرآن کریم کی محوریت ومرکزیت کے گرداگرد ان کے ہفتہ واری خطبات کو عامۃ المسلمین میں قبولیت اور ان کی شخصیت کو مقبولیت سے سرفراز فرمایا تھا۔

خطبات قاسم بھوپالی کے مرتب برادرم جناب مولانا محمد فیاض حیدر قاسمی صاحب کی یہ کوشش وکاوش لائق ستائش ہے، دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کی اس مخلصانہ جہود کو ان کے حق میں وسیلۂ نجات بنائیں، نیز علم اور علماء نواز باپ کے لائق قدر صاحبزادے برادر مکرم ومحترم جناب این افضل احمد صاحب کی خصوصی دلچسپی کی بدولت اس علمی کاوش کا

منصۂ شہود پر آنا ان شاء اللہ ان کے حق میں بھی صدقہ جاریہ ہے، دعا ہے کہ حق تعالیٰ تمام شرکائے کار کی مخلصانہ نیتوں کو شرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے مرحوم و مغفور سمیت تمام مخلصین کے حق میں ذخیرہ آخرت بنائیں۔

وما توفيقي إلا بالله العلي العظيم.

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

(جناب مولانا حسیب صدیقی صاحبؒ)

دنیا میں پائی جانے والی ہر ایک قوم وملت کی قیمتی متاع اور حاصل سرمایہ وہ افراد ہوتے ہیں جن کی شخصیت بلند اخلاقی صفات، صفائی معاملات، اعلیٰ کردار، خدا ترسی اور خدمت خلق سے مربوط اپنے مقصد حیات سے ہمہ جہتی مضبوط و بامعنی وابستگی اور محبت و لگن کے ساتھ ہمہ وقتی جھو دومساعی جیسی صفات حمیدہ سے بایں طور گھری ہوتی ہے بقول شخصے کہ مذکورہ اوصاف کا ذکر ہی شخصیت کے تعارف کی شناخت بن جائے، ماضی قریب کے معروف مفسر قرآن جناب مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے کلام اللہ احادیث رسول اللہ اور سیرت مطہرہ کا خلاصہ تین جملوں میں بیان کرتے ہوئے ایسے متبع شخص کو دینی و دنیاوی کامیابی کا معیار قرار دیا ہے جس کے معمولات اس سہہ مکانی جہات کو محیط ہوں، فرماتے ہیں عبادت خدا کی، اطاعت رسول خدا کی، اور خدمت خلق خدا کی۔۔۔معنوی زیبائش کے اس نگار خانہ حیات میں اپنے صلح جویانہ زاویہ فکر، قابل تعریف اوصاف و کمالات اور رنگا رنگ خوبیوں سے مرصع برادر محترم جناب مولانا محمد حسیب صدیقی صاحب رحمہ اللہ کی دلآویز شخصیت مولانا احمد علی کے بیان کردہ اقتباس کی تعبیر وعکاس معلوم ہوتی ہے جن کی حیات کا تمام دورانیہ خدمت خلق، غریب نوازی اور انسانی ہمدردی

سے عبارت ہے، مثل مشہور ہے کہ خدمت سے عظمت ہے حسیب بھائی دیوبند میں اس ضرب المثل کی عملی تفسیر تھے، مخلوق کی فلاح و بہبود سے وابستہ ان کی شخصیت کو اگر محض ایک شخص کی زندگی میں محدود کر کے پیش کیا جائے تو میرے نزدیک یہ ان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی کے مترادف ہوگا کیونکہ وہ اپنے افکار و خیالات اور وظیفۂ حیات کی روشنی میں مکمل ایک عہد کی عملی داستان اور کہن سالہ روشن اقدار و روایات کے امانتدار اور عہد رواں میں دینی مذہبی سیاسی اور سماجی قدروں کے پاسبان کی حیثیت سے ہر ایک حلقۂ فکر میں یکساں طور پر عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، اگرچہ میری ان سے فکری قربت و صحبت کا دورانیہ کوئی بہت زیادہ طویل نہیں تھا لیکن عزت و توقیر کے عمومی جذبات کے ساتھ باتکلف رسمی و سماجی تعلق تو ہمیشہ ہی قائم رہا، جماعتی صلح میں مرکزی کردار کے حوالے سے پیدا ہونے والی قربت و بے تکلفی کے رابطے بڑھے اور ان کو جاننے سمجھنے اور احوال و واقعات کے دوطرفہ حقائق کا تجزیاتی سطح پر جانچنے پرکھنے کے بے تکلف مواقعوں نے نزدیک فکر و نظر کو قربتوں کی لذت سے روشناس کرایا تو بہت سی لاحاصل دوطرفہ غلط فہمیاں پامال ہوئیں جس کے سبب ان کے لیے دل میں پائے جانے والے احترام میں دو چند اضافہ ہوگیا اور تجزیاتی فکر و نظر کے آئینہ خانے میں ان کی شخصیت کے نکھرے ہوئے خد و خال کو فرض شناسی، اصول پسندی، ایمانداری، امانتداری، جفاکشی، صلح جوئی، ہمدردی، قدر شناسی، روایت پسندی متحمل مزاجی وغیرہ جیسے کتنے ہی لعل و جواہر سے مصفی ومجلی پایا جوان کے تعارف کا سرنامہ اور شخصیت کے اجزائے ترکیبی کے عناوین کہلائے جانے کے لائق تھے، دارالعلوم دیوبند کے مقتدر اصحاب علم اکابر و اسلاف کی صحبت نشینی کے فیض نے ان کے معنوی اوصاف کے ارتقائی مراحل اور مزاجی ساخت و پرداخت کی نشو نما اور پختگی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، بلاتفریق فکر و نظر شہر اور اطراف کے ہر ایک حلقہ اثر میں ان کی توقیر و مقبولیت کی بنیادی وجہ مرض نفاق اور دورخی بات سے مدۃ العمر اپنے آپ کو دور رکھنا تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید

حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ سے نہ صرف شرف تلمذ کا ہی رشتہ تھا بلکہ ان کے بعد حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی رحمہ اللہ بعدازاں برادر مکرم جناب مولانا سید محمود مدنی صاحب زید مجدہ کے ساتھ استواری بشرط وفاداری کی اعلیٰ اقدار کے ساتھ احوال کے ہر ایک سرد و گرم موقعہ مدۃ العمر قدم بہ قدم مکمل نیک نیتی اور ایمانداری سے صرف ایک معتمد ہمراہی کا فریضہ ہی ادا نہیں کیا بلکہ تمام اہل خاندان سے عقیدت محبت ارادت اور بے لوث وفاداری کے بیحد مضبوط و مستحکم تعلق کو مثل روز اول قائم رکھا جس کو انہوں نے مکمل ایمانداری اور اپنی اعتدال پسندانہ مزاج کے ساتھ تاوقت رخصت بایں طور نبھایا کہ اپنے فکری موقف کا ہمہ جہت دفاع کرتے ہوئے اجتماعی دوائر میں خاندان مدنی سے مختلف فکرونظر رکھنے والے طبقات میں بھی اشرافیہ کے معروف معیار عظمت کو بہ لحاظ قائم رکھتے ہوئے ہمیشہ ایک باوقار توازن اس طرح قائم رکھا کہ اپنے اور پرائے ہر ہم نشیں نے ان کو اپنا مقرب سمجھا، اگرچہ عمومی سطح پر ہر ایک طبقہ ملت میں عموم سے خصوص تک دو رخی ذوق ومزاج کے موجودہ دور انحطاط میں یہ خوبی شاذ میں شمار ہوتی ہے، معاشرے میں ان کی سربلندی احترام واکرام، عزت وتوقیر، محبت ومروت اسی وصف خاص کا مرہون منت تھا، اسی کے ساتھ وہ ہر ایک طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے افرا کو مطمئن کرنے کے فن سے واقف تھے یہی وجہ ہے کہ برادران وطن کے حلقوں میں بھی ان کی مقبولیت اور احترام کے مظاہر سامنے آتے رہتے تھے،

بزبان خواجہ الطاف حسین حالی ؔ

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

شمس وقمر ضیا کی پاش نورانیت سے کہیں زیادہ روشن تر حقیقت یہ ہے اس دنیا میں دوام کسی کو نہیں ہے، البتہ گذرے لوگوں کا نقش کف پا آنے والی نسلوں کے لیے تعمیر شخصیت کی اساس چھوڑ جاتے ہیں، حسیب بھائی بھی قید ہستی سے رہا ہوکر بارگاہ رب

کریم کی بیحد و کنار رحمتوں کے سمندر میں اپنی مہلت حیات پوری کر کے بحکم علیم وخبیر آسودہ ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون

بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں حق تعالی ان کے اوصاف حمیدہ سے ان کے اولاد واحفاد کو بہرہ ور فرمائیں، آمین۔

وماعلینا الاالبلاغ المبین

گردوپیش

سخن درسخن

یوپی اور دیگر بعض صوبوں میں صوبائی الیکشن کے اعلان کے ساتھ ہی ملک کا سیاسی درجۂ حرارت نہایت تیزی وسرعت کے ساتھ رو بہ عروج ہو چکا ہے۔ خالص عوامی سطح پر فکروفہم اور عقل وخرد کو جھلسا دینے والی اس سیاسی حدت کے دھونکانے والے باستثنائے ضد مخلصین غالب اکثریت کے شاطر تجربہ کاراور ماہر نفسیات سیاسی بازیگر ستر سال سے ایک ہی لے میں رٹی رٹائی کذب بیانیوں، جھوٹے وعدوں، طفل تسلیوں اور خالص مکارانہ ہمدردیوں کے ڈھونگ کے ساتھ میدان میں آچکے ہیں۔ یوں تو سال کے ۳۶۵ دنوں میں کسی مخصوص وقت یا حالات کی کوئی قیداور کوئی تخصیص نہیں ہے جبکہ سیاست کا درجۂ حرارت کسی نہ کسی موضوع کو لے کر حدت وشدت اختیار نہ کئے رہے، کیوں کہ سیاسی بازیگراس ہنر کوخوب جانتے ہیں کہ عوامی سطح پر انتشار و بے چینی کو برقرار رکھنے میں ہی وہ تمام مفید مطلب راز پوشیدہ ہیں جوان کواپنے طے شدہ سیاسی اہداف ومفادات اور اغراض ومقاصدتک پہنچانے اوراُن کے بآسانی حصول میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ بقول کسی ظرافت نگار کے کہ آج کے دور میں کامیاب سیاست داں وہی کہلاتا ہے جوعوام کے وسائل کوعوام کے لئے مسائل بنادے اورعوام کے مسائل کواپنے لئے وسائل بنالے، جو یہ حربہ جتنی کامیابی، چابک دستی وہوشیاری کے ساتھ انجام دے لے، وہ اتنا ہی مہان لیڈر! ۸؍نومبر ۲۰۱۶ء کا نادرشاہی اور سیاسی افلاس زدہ اعلان اوراس کے نتیجہ میں تادم

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (جمادی الاولیٰ ۱۴۳۸ھ مطابق فروری ۲۰۱۷ء، جلد: ۷، شمارہ: ۸۳)

تحریر بینکوں کے سامنے پریشان حال لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں بھی تو آخر اسی وسائل و مسائل کے کھیل کا ہی ایک حصہ ہے۔ سوال کرنے والے سوال کرتے ہیں کہ اشراف وطن کی سیاست سے کنارہ کشی ہی دراصل رزائل وطن کے عروج کا باعث بنی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے درست ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے سر سلامت رہنا تو بہر حال ضروری ہے۔ سیاسی گلیاروں سے لیکر گلیوں اور چوپالوں تک پیش آنے والے واقعات آئے دن کے اندوہناک واقعات اخبارات میں آتے ہی رہتے ہیں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ بلاتفریق مذہب وملت شرفائے وطن آج کی خالص مفاد پرستانہ وخودغرضانہ سیاست پر خون کے آنسو روتے ہوئے اپنی عزتوں، اپنی شرافتوں، اپنی تہذیبی اقدار اور اپنے بڑوں سے ملی شریفانہ روایات کو سینے سے لگائے اس طوفان بلاخیز سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے محو حیرت ہیں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ آج کی سیاست کے انداز واطوار، زبان و بیان، طور وطریق، سب وشتم اور انتہائی شرمناک اور ناقابل تصور وخیال قسم کے الزامات کے اس دور سیاست میں شرفائے وطن کی کنارہ کشی کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط، اس کو بھی طے کرنے کے الگ الگ پیمانے اور کسوٹیاں ہیں جو کہ ایک الگ مستقل بحث ہے، البتہ رہا سوال اس کا کہ شرفاء نے کیونکہ جگہ چھوڑ دی ہے، اس لئے ''غیروں'' کو موقع مل گیا ہے۔ لہٰذا وہ بھی قصوروار اور موردِ الزام ٹھرائے جائیں گے، گویا کہ ع کیوں ہوئے قتل ہم پہ یہ الزام ہے۔ میری نظر میں صورت حال واقعۂ مذکور کے بین السطور میں بانداز دیگر سہی مگر قدرے مماثل اور اشارۃً قابل انطباق ہے۔

مہمان کے لئے میزبانی کا جذبۂ اعزاز واکرام یکساں سہی مگر انداز میزبانی اور طریقۂ اعزاز میں علاقائی روایات کو بڑا دخل ہوتا ہے، جنوبی ہند میں میزبان بلاطلب و اشتہاء مہمان کی پلیٹ میں اشیائے خوردنی ڈالتے رہنا اپنا فرائض میزبانی تصور کرتا ہے۔ کسی دعوت کے موقع پر حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے میزبان جوش محبت وعقیدت میں اپنا فرض میزبانی اسی طرح ادا کر رہے تھے کہ پلیٹ میں

سالن ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس میں مزید ڈال دیا جاتا، ابھی وہ پورا نہیں ہوا کہ مزید حاضر، تکلف برطرف حضرتؒ نے ایک دو مرتبہ کے بعد ہاتھ روک لیا اور تھوڑا سالن بدستور پلیٹ میں رہ گیا، شریک طعام کسی صاحب نے ازراہِ اعتراض یا ازراہِ تفنن کہا کہ حضرت سنا ہے پلیٹ صاف کرنا سنت ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بالکل درست سنا ہے پلیٹ صاف کرنا سنت ہے لیکن جان بچانا بہرحال اولین فرض ہے۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ یہاں بھی ہے کہ بے شک شرفائے وطن کو سیاست میں رہنا چاہئے لیکن بہرکیف اس کے لئے سروں کی سلامتی اور عزتوں کی بحالی فرض کے درجے میں ہے، اس پہلو کا باندازِ دیگر فکری پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے۔

بہرحال اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ نفس سیاست یا لفظِ سیاست اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے دورِ حاضر کے نفسِ سیاست اور لفظ سیاست میں اس قدر بُعد کا واقع ہو چکا ہے کہ سوائے لفظی مناسبت کے دور کا بھی تو واسطہ برقرار نہیں رہا ہے، کیوں کہ ریاست اور سیاست (بمعنی تدبیر) ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، اس موقع پر یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مسلمانوں کا تصور سیاست گویا اصول ریاست و تدبیر حکمرانی اپنے خاص ماحول سے ابھرا ہے اور دین کے سرچشموں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور تعامل صحابۂ کبار سے سیراب ہوا ہے۔ اہلِ مغرب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کہ تدبیر ریاست کے اصول حکمائے یونان افلاطون وارسطو کے تصورات پر مبنی ہیں اور یہ غلط توجیہ ہے کہ یہ تصور ساسانی روشن نظریات کا مرہون منت ہے، البتہ بعض معاملات میں باعُرف استفادہ کے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن مملکت اور تمدن کی روح کے اعتبار سے اس کا سارا ڈھانچہ بہرکیف مختلف ہے۔ امت اسلامیہ کی تاریخ میں سیاست (یعنی تدبیر ملک داری) کے تصورات اور اس کے نہج کا تو آغاز خود قرآن کریم سے ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں تفصیلی تشکیل نہیں ملتی ہے، البتہ مجمل اور جامع اشارات ہیں جن سے تدبیر کی تشکیل کے اسلامی اصول مرتب ہیں۔ چنانچہ نبی کریم علیہ

الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ میں جس معاشرے کی تشکیل کی اس سے ایک ریاست بھی وجود میں آئی، اس کے مجمل اصول یا رہنما اصول حجۃ الوداع کے خطبے میں موجود ہیں، اس میں بنیادی حقوق، انفرادی واجتماعی فرائض کے بارے میں واضح اشارات آگئے ہیں، گویا سیاست بمعنی اصل علی منہاج النبوۃ ہی اصل الاصول ہے، خواہ وہ افلاطون وارسطو کا نظریۂ سیاست ہو یا موجودہ دور کا فکر سیاست، وہ نہایت محدود ہے، اس میں اسلام کا عالمگیر نصب العین کہاں؟ بقول جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم کے منجملہ دیگر امور کے اسلام کا قانونِ سیر، یعنی بین الاقوامی قانون، یورپ جس کی ایجاد کا غلط دعویدار ہے اتنا ممتاز ہے کہ یہی ایک شے کسی اگلے پچھلے قانون ریاست سے اسے جدا، ممتاز اور منفرد رکھنے کے لئے کافی ہے۔(۱)

اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے اصول ریاست کی غایت، اس کی وسعت، اس کی بنیاد میں ربوبیت وخیر اور عام نوع انسانی کے تعلق سے قسط و عدل، اخوت ومساوات، رضائے الٰہی پر مشتمل ہے جب کہ موجودہ دور کی سیاست اور مذکورہ مفاہیم میں مثل حق وباطل اس قدر عظیم الشان بُعد ہے کہ لفظی تماثل کا انطباق بھی ماورائے تصور وخیال ہے۔

بہرحال اسلامی ریاست اور تدبیر ملکی ایک الگ مستقل وسیع ترین موضوع ہے۔ ضمنی، ذیلی تذکرہ سے نہ موضوع کا حق ادا ہوسکتا ہے اور نہ منشاء ومفاہیم اور حکمت و مصالح کی بنیاد ہوسکتی ہے۔

ہر لمحہ تغیر پذیر بد سے بدتر ملکی وعلاقائی احوال وخدشات کے زیر اثر منتشر خیالات ہیں جو صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوگئے۔ اب آپ خرد کو جنوں سمجھیں یا جنوں کو خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

(۱) بحوالہ The Muslim Conduct of state

یہودی سازشیں اور مسلم قیادت کی ذمہ داریاں

عباسی خلیفہ مامون رشید نے ایک موقع پر کہا تھا کہ آدمی تین قسم کے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کی ہر وقت ضرورت ہے، بعض بہ منزلہ دوا کے ہیں کہ خاص وقتوں میں ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بعض تو ایسے ہیں کہ بیماری کی طرح کسی حال میں پسندیدہ نہیں۔ مامون جو اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی حکومت وریاست کا فرماں روا تھا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے علوم وفنون کا نکتہ داں بھی۔ ظاہر ہے اس کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ ہرگز بے معنی و بے مطلب نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ جملہ نہ صرف اس کے وفورِ علم پر دلالت کرتا ہے بلکہ اپنے اندر بہت سے مشاہدات و تجربات بھی رکھتا ہے، اس نے یہ بات اگرچہ عمومی پس منظر میں کہی ہے جس میں کسی ملک ومنطقہ، رنگ و نسل اور قوم و مذہب کی تخصیص نہیں کی گئی، البتہ اگر ہم یہودی قوم کی تاریخ اور اس کی جعل سازیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیز عصر حاضر میں اقوام عالم کے درمیان برپا ملکی و سیاسی اور دینی و مذہبی کشمکش کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس جملے پر غور کریں تو ہمیں بڑی حد تک یہ تقسیم بامعنی نظر آتی ہے، مثلاً یہودی لوگ غیر یہودی قوموں کے درمیان بغض و کینہ کے جذبات ابھارنے اور آپسی تعلقات میں غلط فہمیاں پیدا کرنے میں ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں۔ جس کے سبب اقوام و ملل میں رقابت کی فضا بنتی گئی اور پھر اس کے

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (از صفر المظفر ۱۴۳۶ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۴ء تا ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ مطابق فروری ۲۰۱۵، جلد: ۵، شمارہ: ۵۶، ۵۷، ۵۸)

برے اثرات نے اپنا کام کیا، لیکن ایسا وقت بھی آیا کہ لوگوں کو یہود کی در پردہ سازشوں کا علم ہوا اور انہیں ان سے نفرت ہوتی چلی گئی جو آگے چل کر خوف ناک شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ اب تک کی معلوم انسانی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ یہودیوں کو ان کی خفیہ سازشوں اور ان کی دیگر بداعمالیوں کی بھرپور سزائیں دی گئیں، انہیں دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور ہونا پڑا، ان کے نوجوانوں کو قتل اور ان کی املاک کو غنیمت جان کر لوٹ لیا گیا۔ مثال کے طور پر یہود کی اسی طرز روش سے نفرت کی بنا پر فرانس میں یہودیوں کا قتل عام ہوا۔ برطانیہ میں شدید عوامی نفرت کے باعث انہیں بھاری جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا، برطانیہ ہی میں ۱۲۵۷ء اور ۱۲۶۷ء کی خانہ جنگیوں میں لندن، لنکن اور کیمرج سمیت سات شہروں کے یہودی خاندانوں کا کلیۃً خاتمہ کردیا گیا، جو یہودی ہلاک ہونے سے بچ گئے ان کے گھر لوٹ لئے گئے اور انہیں پائی پائی کا محتاج بنا دیا گیا، مزید یہ کہ برطانیہ میں ۱۱۴۴ء سے قبل یہودیوں کو زمینیں حاصل کرنے اور ان پر کاشت کرنے کی اجازت نہ تھی۔

اسی طرح ایک اور یورپی ملک جرمنی میں کہیں بھی یہودیوں کو عیسائیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی، نہ وہ کھیتوں میں کام کر سکتے تھے اور نہ کارخانوں میں انہیں برداشت کیا جاتا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صرف سود پر قرضے دے سکتے تھے اور اس کے لئے بھی انہیں اپنے علاقہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی، چوں کہ ساہوکاری ان کا اصل ذریعۂ آمدنی تھا اس لئے وہ سود کی شرح زیادہ رکھتے تھے، چنانچہ اسی واسطے انہیں عوام نے ضرورت مندوں کا خون چوسنے والا قرار دیا، اس طرح عوام کے اندر یہودیوں کے خلاف نفرت اور غیض وغضب کے جذبات پروان چڑھتے رہے اور پھر غیض وغضب کا یہ لاوا جب پھٹا تو پورے جرمنی میں یہودیوں کی لاشیں بکھر گئی تھیں اور ان کی سازشیں، عیاریاں اور ساری خفیہ تدبیریں یکسر ناکام ہو کر رہ گئیں، یہی حالات ان کے ساتھ پولینڈ میں بھی پیش آئے کہ جب وہ اس ملک میں داخل ہوئے تو ان کا حال یہ

تھا کہ سابقہ ہولناک صورت حال سے انہوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی تھی، چنانچہ اپنی قدیم روش پر قائم رہے اور ملک میں فتنہ وفساد برپا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی گاڑھی کمائی ہڑپ کرنی شروع کردی۔ نتیجے کے طور پر اس چیز نے انہیں ایسی تلخ اور عبرت انگیز سزا سے دوچار کردیا کہ جس نے ان کے ساتھ ہونے والی سابقہ تمام کارروائیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، غرض اب سے ہزاروں برس قبل کی تاریخ ہو یا جرمنی میں یہودی مخالف خونیں کارروائی کے بعد سے قیام اسرائیل تک کا زمانہ، یہ قوم دنیا کے مختلف علاقوں میں سرگرداں ہوکر گھومتی رہی اور ہر جگہ اسے ذلت وحقارت کا ہی سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ اس قوم کے عقیدے کی بنیاد اس غیر معقول مفروضہ پر کھڑی کی گئی ہے کہ یہود اور صرف یہود ہی خدا کے برگزیدہ بندے ہیں، باقی تمام انسانیت ہیچ ہے۔ قرآن کریم نے بھی ان کے ان بے بنیاد دعووں کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ، قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ. يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ. وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ. (۱)

''اور یہود ونصاریٰ (دونوں فریق) نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، آپؐ (ان سے) پوچھیے کہ اچھا پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض (آخرت میں) عذاب کیوں دیں گے؟ بلکہ تم بھی منجملہ دوسری مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے، جس کو چاہیں گے سزا دیں گے اور اللہ ہی کی ہے سب حکومت آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان میں بھی اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے (اس کے سوا کوئی پناہ نہیں)''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ. ذٰلِكَ**

(۱) سورۃ المائدۃ: ۱۸

بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ وَّ غَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ. (۱)

''(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (سماوی یعنی توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا (کہ اگر ہدایت کے طالب ہوتے تو وہ حصہ اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی تھا) اور اسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے ان کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان (مذہبی اختلاف کا) فیصلہ کردے، پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی کرتے ہوئے (اور) یہ (بے اعتنائی) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں (اور یہی ان کا اعتقاد ہے) کہ ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی (پھر مغفرت ہوجائے گی) اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، ان کی تراشی ہوئی باتوں نے سو (ان احوال وافعال واقوال کفریہ کے سبب) ان کا کیا (برا) حال ہوگا، جب کہ ہم ان کو اس تاریخ میں جمع کرلیں گے جس (کے آنے) میں ذرا شبہ نہیں اور (اس تاریخ میں) پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔''

اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (۲)

''اور یہود ونصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ تو یہود کا قول ہے) یا ان لوگوں کے جو نصرانی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے، حق تعالیٰ ان کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپؐ (ان سے یہ تو) کہئے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو۔''

غرض ان جھوٹے دعووں کی وجہ سے پوری یہودی قوم کے اندر ایک قسم کی بے جا تعلّی اور غرور وتکبر کی کیفیت پیدا ہوگئی اور وہ ان تمام لوگوں کو جو غیر یہودی ہیں کمتر خیال

(۱) سورۃ آل عمران: ۲۳-۲۴ (۲) سورۃ البقرۃ: ۱۱۱

کرنے لگے، اس چیز نے انہیں بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ ان کی پوری قوم مغالطہ کا شکار ہوگئی اور اپنی اصلاح سے یکسر غافل، ان کی بے راہ روی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ دنیا میں ایسا اقتدار بھی چاہتے ہیں جو انہیں پوری دنیا پر نا قابل تسخیر غلبہ وقوت عطا کرنے والا ہو، اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے ایسا جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ اگر انہیں کسی کے بارے میں یہ گمان بھی ہوگیا کہ وہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے تو اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں، ان کی یہ سخت مزاجی اور طبیعت کی افتاد دراصل ان کی اس فطری کجی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس نے ان کو صراطِ مستقیم سے کھینچ کر شیطان کے نقشِ قدم پر گامزن کر دیا ہے۔

یہود خدا کی باغی قوم

یوں تو یہودی فتنہ انگیزی پوری دنیا کے لئے یکساں طور پر پریشانی، ذہنی الجھن اور تکلیف کا سبب ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ ان کی دشمنی بدترین درجہ کو پہنچی ہوئی ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے خدائی فیصلوں کے برخلاف یہ خواہش کی کہ آخری پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت یہ شرف بنی اسماعیل کو عطا کر دیا گیا اور پیغمبر آخرالزماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اولادِ اسماعیل میں تشریف لے آئے تو انہوں نے آپ کو جانتے پہنچانتے ہوئے بھی محض حسد وعناد، بے جا تعلّی اور اپنے نسلی غرور وتکبر کی وجہ سے نبی برحق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اہل کتاب کی اس ہٹ دھرمی کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ. اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ. (۱)

”جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات وانجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ

(۱) سورۃ البقرۃ:۱۴۶-۱۴۷

علیہ وسلم کو (تورات وانجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بنا پر بحیثیت رسالت) ایسا (بے شک وشبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور بعضے ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفا کرتے ہیں (حالاں کہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا ہے) سو ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا''۔

اس سلسلہ میں ایک دوسری شہادت خود ان کی مذہبی کتابوں کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے یوسف ظفر لکھتے ہیں کہ

''واقعہ یہ تھا کہ یہود تورات کی ان آیات کی رو سے جو انہوں نے حذف کر دی تھیں، جانتے تھے کہ اولاد اسماعیل سے نبی آخر الزماں کا ظہور ہوگا، چنانچہ انہوں نے پیش بندی کے طور پر حضرت ہاجرہ پر بہتان باندھا (کہ وہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باندی تھیں) اور حضرت اسحاق کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی، اس سب کے باوجود قریش کو حضرت اسماعیل کی اولاد اور حضرت اسماعیل کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا ہونے کے تعلق سے منکر نہیں تھے، چنانچہ قریش سے وہ ایک خاص تعلق کے حامل تھے، اس کے علاوہ جس مسیح کے ظہور کا وقت آن پہنچا تھا اس کی آمد کی خبر بھی انہوں نے اپنے گردوپیش میں پہنچا رکھی تھی، ان کے ستارہ شناس اور احبار حضور کی ولادت کے زمانے میں بالخصوص منتظر تھے کہ اس ذاتِ اطہر کا ظہور ہونے والا ہے۔ (۱)

مقدس کتابوں کے ان حوالوں کے باوجود یہود اور نصاریٰ نے حضورؐ کے پیغام پر توجہ نہ دی اور اپنی مرضی کے مسیح کی طلب کرتے رہے۔''(۲)

(۱) تورات ...... استثناء باب ۱۸، فقرہ ۱۵ تا ۱۹ اور اناجیل ...... متی ...... باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یوحنا ...... باب ایک، آیت ۱۹ تا ۲۱، باب ۱۴، آیت ۱۵ تا ۳۰، باب ۱۵، آیات ۳۵، ۳۶، باب ۱۶ آیت ۷ تا ۱۵

(۲) یہودیت: ص ۱۳۱، مصنف یوسف ظفر، مطبوعہ احمد پبلیکیشنز، لاہور

یہاں اس جانب بھی توجہ کی جانی چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہودی ستارہ شناس اور احبار یہ پیشین گوئی کیا کرتے تھے کہ نبی آخرالزماں کی بعثت کا زمانہ نزدیک آچکا ہے اور عنقریب وہ تشریف لانے والے ہیں اور ہم ان کے منتظر ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اگر نعوذ باللہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم وہی مسیح منتظر یا نبی آخرالزماں نہیں ہیں تو پھر وہ نبی منتظر جس کا اہل کتاب بے صبری سے انتظار کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی بعثت کا زمانہ نزدیک آچکا ہے، اب تک ظاہر کیوں نہ ہوئے؟ جب کہ چودہ سو برس کا طویل زمانہ گذر چکا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں جن کا اہل کتاب انتظار کیا کرتے تھے، لیکن جب وہ بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں پیدا ہوئے تو اہل کتاب نے محض اپنے نسلی غرور و تکبر اور حسد و جلن کی وجہ سے ان کی نبوت کا انکار کیا اور اس طرح انہوں نے اپنی دنیا بھی تباہ کی اور آخرت بھی۔ اسی طرح یہ واقعہ مشہور ہے کہ صلیبی جنگوں کے دور میں یہودیوں نے ایک نہایت مکروہ سازش کی وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر کو روضۂ مبارک سے نکال کر کہیں دوسری جگہ پہنچا دیا جائے یا وہ کوئی اور ایسی حرکت کرنا چاہتے تھے جس سے مسلمانوں کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچ سکتی ہو۔ یہ نورالدین زنگیؒ کا دورِ حکومت تھا، مسلمان فوج جرمنی کے شہنشاہ کانرڈ کی ۹ رلاکھ افراد پر مشتمل فوج کے خلاف یروشلم میں نبرد آزما تھی کہ دو مسکین صورت باریش یہودی مدینہ منورہ کے نواح میں وارد ہوئے، ان کی وضع قطع دیکھ کر ہرگز کسی کو یہ شبہ نہیں ہوسکتا تھا کہ عبادت و ریاضت کے سوا بھی ان کا کوئی مقصد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ دن بھر یہ لوگ اللہ اللہ کرتے اور راتوں کو اپنے حجرے میں سرنگ کھودتے رہتے تاکہ روضۂ نبوی تک پہنچ سکیں، یہاں تک کہ ان کی سرنگ روضہ کے بالکل نزدیک جا پہنچی۔ ایک رات نورالدین زنگیؒ کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم نے اس کی اطلاع دی، وہ اگلے روز بہت پریشان رہا، دوسرا دن بھی پریشانی میں گزرا، تیسری رات اسے پھر یہی خواب آیا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے شدت

کے ساتھ عملی اقدام کرنے کا حکم دیا، اس نے بیدار ہوتے ہی مدینہ منورہ کا رخ کیا، وہاں پہنچ کر اس نے شہر کا جائزہ لیا، لیکن ہر چیز کو معمول پر پایا، اس دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان یہودیوں کی شکلیں بھی اسے ذہن نشین کروادیں، اگلے روز نورالدین زنگی نے شہر مدینہ کے باشندوں کی عمومی دعوت طعام کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ کوئی شخص بھی دعوت میں شرکت کے بغیر نہ رہے۔

حکم کے مطابق لوگ آتے گئے اور کھا کر جاتے رہے مگر لوگوں میں وہ شیطان صفت دو یہودی نظر نہ آئے، نورالدین زنگی بہت پریشان ہوا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہودی آتے بھی کیسے؟ انہیں تو دعوت کی خبر بھی نہ تھی کیوں کہ ایک کدال لے کر سرنگ میں اتر جاتا اور دوسرا پہرہ دیتا اور بظاہر عبادت کرتا رہتا تھا۔ غرض نورالدین زنگی نے منتظمین دعوت سے استفسار کیا کہ کوئی شخص شرکت سے رہ تو نہیں گیا؟ ایک اہل کار نے کہا: آقا! پورا شہر تو آ گیا ہے البتہ دو عابد وزاہد افراد شامل نہیں ہو سکے کیوں کہ وہ ہر وقت عبادت وریاضت میں مصروف رہتے ہیں، انہیں کوئی دعوت ذکر الٰہی سے روک نہیں سکتی۔ سلطان نے کہا: سبحان اللہ کیا شان ہے ان کی، ہم خود ان کی زیارت کریں گے۔ چنانچہ ملازمین کے سروں پر کھانوں کے دستر خوان اٹھوائے سلطان ان کی طرف روانہ ہوا۔ پہرے دار یہودی نے دیکھا کہ دور ایک چھوٹا سا قافلہ ہماری کٹیا کی طرف چلا آ رہا ہے، تو اس نے اپنے ساتھی کو جلدی سے اوپر بلا لیا کہ دیکھو اتنے لوگ ہماری جانب کیوں آ رہے ہیں؟ اتنے میں سلطان ان کے سر پر جا پہنچا، شکلیں وہی تھیں جو خواب میں دکھائی گئی تھیں، دونوں کی مشکیں کسوا دی گئیں، لوگ سناٹے میں آ گئے، اولاً جب ان کی کٹیا کی تلاشی لی گئی تو بظاہر کچھ دکھائی نہ دیا، لیکن جب ان کا مصلیٰ اٹھا کر دیکھا گیا تو اس کے نیچے سرنگ کا دروازہ تھا، ان کے رنگ جو پہلے ہی فق ہو چکے تھے اب مزید پیلے ہو گئے اور اقرارِ جرم کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ سلطان نے سیسہ پگھلوا کر ان کے حلق میں انڈیلنے کا حکم دیا۔ یوں وہ کیفر کردار کو پہنچے، آئندہ ایسی صورت حال کی پیش بندی کے طور پر سلطان نے روضۂ اقدس کے گرد سات دھاتوں کی دیوار تعمیر

کرادی جو آج تک اپنی اسی حالت پر برقرار ہے۔

اس مشہور واقعہ کو ذکر کرنے کا بنیادی مقصد اس حقیقت کو اجاگر کرنا ہے کہ اہل کتاب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر چہ بہ زبانِ قال نبی تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں جس کے پیچھے ان کا نسلی غرور و تکبر اور حسد وغیرہ جیسے جذبات کارفرما ہیں لیکن مذکورہ واقعہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ بہ زبان حال آپ ؐ کو نبی برحق تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ روضۂ نبوی سے آپ کے جسم اطہر کو نکالنے کی کوشش نہ کرتے، اس لئے کہ اہل کتاب انبیاء کی اس خصوصیت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کے اجسام ان کی قبروں میں صحیح سلامت موجود رہتے ہیں۔

قوم یہود کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت ورسالت کے سلسلہ میں بخوبی علم تھا، اوران کی مذہبی کتابیں ان کے ربیین (علماء ومشائخ) اوراس طبقہ کے ستارہ شناس افراد انھیں آپ ﷺ کے ظہور اوراس کی علامات ونشانیوں سے بہ تسلسل باخبر کرتے چلے آرہے تھے، چناں چہ دیگر مذاہب سے وابستہ افراد سے قوم یہود اس حقیقت کا برملا اظہار بھی کیا کرتے تھے، کہ ایک نہایت رفیع القدر پیغمبر کے ظہور کا زمانہ قریب آچکا ہے اور وہ بہت جلد تشریف لانے والے ہیں، ابن ہشام کی نقل کردہ روایت کے مطابق، ایک انصاری صحابی بیان کرتے ہیں کہ جب ہم قبل از اسلام قوم یہود کو شکست سے دوچار کرتے تو وہ کہا کرتے تھے، کہ ذرا ٹھہر جاؤ عنقریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے جو ہمارے معاون و مددگار ہوں گے اور ہم ان کے ساتھ مل کر تم سے اس شکست وریخت کا بدلہ لیں گے۔(۱)

ان کے اسی طرز عمل کو قرآن کریم نے ایک دوسرے مضمون کے ضمن میں ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ

(۱) سیرت ابن ہشام، باب ۳۵، یہودیوں کا اعتقاد وعمل، ج:۱،ص:۲۴۹

اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ.(۱)

"اور جب ان کو ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو منجانب اللہ ہے (اور) اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے، جو (پہلے سے) ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ) حالاں کہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے کفار سے (یعنی مشرکین عرب سے کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں؛ مگر) پھر جب وہ چیز آ پہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب انکار کریں)۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (متوفی: ۹۱۱ھ) نے مذکورہ آیت کی تفسیر اپنے مخصوص انداز میں کی ہے جس سے بات اور واضح ہو جاتی ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ من التوراة هو القرآن وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ قبل مجيئه يَسْتَفْتِحُوْنَ يستنصرون عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يقولون أللهم انصرنا عليهم بالنبى المبعوث آخر الزمان فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَا عَرَفُوْا من الحق و هو بعثة النبى صلى الله عليه وسلم كَفَرُوْا بِهٖ حسداً و خوفاً على الرياسة فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ.(۲)

"اور جب ان کے پاس اللہ کی کتاب آ پہنچی جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس موجود ہے (یعنی توراۃ کی اور وہ کتاب مصدق قرآن کریم ہے) حالاں کہ وہ لوگ اس سے پہلے (یعنی اس کے آنے سے پہلے) کافروں پر فتح (و نصرت) کی دعا کیا کرتے تھے (اور کہا کرتے تھے کہ اے خدا! تو ہمیں کافروں پر نبی آخر الزماں کے طفیل میں غلبہ عطا فرما پھر جب (وہ حق) جس کو وہ پہچانتے تھے ان کے پاس آ پہنچا (اور وہ رسول اکرم ﷺ کی بعثت ہے) تو (حسد اور زوال ریاست کے

(۱) سورۃ البقرۃ: ۸۹

(۲) تفسیر جلالین، ج ۱، ص ۱۴، مطبوعہ مکتبہ محمودیہ سہارنپور، یوپی

خوف سے) اس کا انکار کر بیٹھے، پس اللہ کی پھٹکار ہو کافروں پر۔

یہ اور اس طرح کی دیگر بے شمار شہادات اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ قوم یہود نے اپنی تعلّی، زعم، غرور و تکبر اور اپنی افتراء پرداز طبیعتوں کے سبب کس طرح ہدایت سے منھ پھیر لیا اور صریح طور پر گمراہی کا شکار ہو گئے، مزید برآں ان کے گمراہ رہنے اور اسلام قبول نہ کرنے اور عناد کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر نسلی تفاخر کا شکار ہیں، اسی لیے جب نبی کریم ﷺ کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوئی تو وہ اس نسلی تفاخر اور تعلّی و حسد کا شکار ہو گئے، کیوں کہ وہ یہ گمان ہی نہیں بلکہ ایک عقیدے کی حد تک یقین رکھتے تھے کہ ایک دراز ترین عرصہ سے نبوت و رسالت کا مبارک سلسلہ چوں کہ بنی اسرائیل میں چلتا آ رہا ہے لہٰذا پیغمبر آخر الزماں کی بھی تشریف آوری بنی اسرائیل ہی میں ہوگی، لیکن جب حقیقت واقعہ ان کی مزعومہ خواہشات اور خود ساختہ یقین و عقیدے کے برخلاف سامنے آئی تو حسد و دشمنی نے ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے برخلاف شعلہ جوالہ بنا دیا اور وہ اس حقیقت کا بخوبی علم رکھتے ہوئے کہ یہی پیغمبر آخر الزماں ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی رسالت کے منکر ہو گئے بلکہ سازشوں اور افترا پردازیوں کے منصوبے روبہ عمل لانے کے لیے سرگرم ہو گئے، حق تعالیٰ نے ان کی اسی ہٹ دھرمی اور تعصب کی قلعی کھول دی اور ارشاد فرمایا کہ:

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ج فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (۱)

"بری چیز ہے وہ جس کے بدلے بیچا انھوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ تعالیٰ نے، اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو کما لائے غصہ پر غصہ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا۔"

(۱) سورۃ البقرۃ: ۹۰

حالاں کہ بندگی کی اصل حقیقت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ انسان خدائی فیصلوں کے آگے سرِتسلیم خم کردے، ابلیس لعین کو حق تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے راندۂ درگاہ اس لیے کردیا تھا کہ اس نے یہ تو دیکھا کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے، وہی آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام جن کی تخلیق مٹی سے ہوئی جو اپنے فطری مزاج پستی و درماندگی کا مظہر ہے اور اس کی اپنی تخلیق آگ سے ہوئی جس کا مزاج تعلّی و کبر ہے چناں چہ اس حقیقت کے صرف ایک ظاہری پہلو کا ادراک کرتے ہوئے کہ حضرت آدمؑ سے وہ مادۂ تخلیق کی بنیاد پر برتر ہے نیز اس بے بنیاد تخیل کے علاوہ عنصرِ تعلّی کے غلبہ کے سبب سجدہ تعظیمی بجالانے سے یکسر محروم رہا اور اسے اس بات کی توفیق میسر نہ آسکی، گویا ابلیس نے آگ وخاک کی ظاہری حقیقت پر توجہ دی لیکن بوجہ حسد اس حقیقت کا ادراک نہیں کرسکا کہ حکم دینے والی ذات کون ہے؟ اور اس حکم کی حقیقت کیا ہے؟

کیوں کہ سجدہ کی علت اصل قرآن کریم نے "فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ"(۱) اور "وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ"(۲) کے الفاظ سے واضح کی ہے گویا سجدہ انسان کے مادۂ تخلیق کو نہیں بلکہ امرِ رب چوں کہ روح کی شکل میں انسان میں پھونکا گیا تھا اس لیے حقیقۃً سجدہ انسان کو نہیں بلکہ بالواسطہ اس امرِ رب کو تھا جو روح کی حقیقت میں آدمؑ کے اندر بطور شرف وکرامت وخلافت عطا کیا گیا تھا، چناں چہ ابلیس آدمیت کے تئیں شدید حسد وبغض وعناد رکھنے کے سبب خالق کائنات کے حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا اور نتیجہ کے طور پر ہمیشہ کے لیے ملعون ومردود قرار دے

(۱) ترجمہ: لہٰذا جب میں اس کو پوری طرح بنالوں، اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گرجانا۔ (سورۃ الحجر: ۲۹)

(۲) ترجمہ: اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، چناں چہ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور متکبرانہ رویہ اختیار کیا اور کافروں میں شامل ہوگیا۔ (سورۃ البقرۃ: ۳۴)

دیا گیا، الغرض بنی اسرائیل نے بھی یہی ابلیسی اور شیطانی طرز عمل اختیار کیا اور اللہ رب العزت اور اس کے احکام و مرضیات کے برخلاف محض اپنی خواہش کے بندے بن کر اس غیر معقول ضد پر جم گئے کہ وہ اسی کتاب کو کتاب اللہ تسلیم کریں گے جو ان پر یعنی انبیاء بنی اسرائیل میں سے کسی نبی پر نازل ہوئی ہو اور نبی آخر الزماں اسی کو تسلیم کریں گے جس کا ظہور بنی اسرائیل میں سے ہو۔

گویا انھوں نے اپنے طرز عمل کے ذریعہ ہمیشہ یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس معاملہ میں اپنی خواہش بے جا سے دست بردار نہیں ہو سکتے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تو خالق کائنات کی بندگی کرتے ہیں اور نہ ہی مالک ارض وسماں کی رضا جوئی کے طلب گار، نہ مذہبی تعلیمات ان کے نزدیک کسی اہمیت کی حامل ہیں اور نہ پیغمبران خدا اور خاصان خدا کی رہنمائی و قیادت ان کے لیے کوئی وقعت رکھتی ہے، وہ خدائی قوانین اور شرعی اصول وضوابط کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن بس اس حد تک جب کہ وہ ان کی خواہش اور ان کی مرضی سے نہ ٹکرائیں، چناں چہ جب شرعی اصول وضوابط اور الٰہی احکام ان کے شخصی مفادات اور ذاتی دلچسپیوں نیز قلبی خواہشوں سے ٹکرانے لگتے تو وہ فوراً اپنی خواہشات کی طرف مائل ہو جاتے اور الٰہی احکام اور انبیاء کی پرخلوص رہنمائی کو نظر انداز کر ڈالتے، مختصر یہ کہ دنیوی زندگی میں ان کا طور طریق اور رنگ ڈھنگ بالکل ویسا ہی تھا کہ جیسا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ: ”الهوى إله يُعبَد من دون الله.“ ”خواہش نفس بھی دراصل ایک معبود ہے اللہ کو چھوڑ کر جس کی بندگی کی جاتی ہے“۔

یعنی جو لوگ خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر نگاہ نہیں کرتے، تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی خواہش ہی کو گویا اپنا معبود سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خلاف چلنا ان کو پسند نہیں، پھر حضرت ابن عباسؓ نے سورۂ جاثیہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

”أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَ أَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ

وَ قَلْبِہٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ أَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ"(۱)

"سو کیا آپ نے اس شخص کی حالت دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (کہ جو دل میں آتا ہے اس کے پیچھے چلتا رہتا ہے) اور خدا تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے (کہ حق کو سنا اور سمجھا بھی مگر نفسانی خواہش کی پیروی سے گمراہ ہو گیا) اور (خدا تعالیٰ نے) اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے (یعنی نفس پرستی کی بدولت قبول حق کی صلاحیت نہایت کمزور ہو گئی) سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے؟ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔"(۲)

غور کیا جائے تو یہودیوں کی زندگی پر یہی مذکورہ رنگ غالب نظر آتا ہے، ظاہر ہے یہ خواہش نفس ہی کی تو بندگی ہے کہ یہود نے اللہ کے حکموں اور اس کے پیغمبروں کی رہنمائی کو پس پشت ڈال دینا تو گوارا کر لیا؛ لیکن اپنی خواہش نفس کو قابو میں رکھنا گوارا نہ کیا چناں چہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس روش کے بارے میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ وَ أَرْسَلْنَآ إِلَیْھِمْ رُسُلاً کُلَّمَا جَآءَ ھُمْ رَسُوْلٌ بِّمَا لَا تَھْوٰٓی أَنْفُسُھُمْ فَرِیْقاً کَذَّبُوْا وَ فَرِیْقاً یَقْتُلُوْنَ، وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا کَثِیْرٌ مِّنْھُمْ وَ اللّٰہُ بَصِیْرٌ بِّمَا یَعْمَلُوْنَ.(۳)

"ہم نے بنی اسرائیل سے اول توریت میں تمام پیغمبروں کی تصدیق و اطاعت کا عہد لیا اور (اس عہد کے یاد دلانے کو) ہم نے ان کے پاس بہت پیغمبر بھیجے (لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ) جب کبھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا

(۱) سورۃ الجاثیہ:۲۳

(۲) کتاب أدب الدنیا والدین:۳۸

(۳) سورۃ المائدۃ:۷۰-۷۱.

(تب ہی اس کے ساتھ مخالفت سے پیش آئے) سو بعضوں کو (تو) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے اور (ہمیشہ شرارت پر جب چند روزہ سزا مہلت دی گئی) یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی اس (گمان) سے اور بھی اندھے اور بہرے (کی طرح) بن گئے (کہ نہ دلائل صدق انبیاء کو دیکھا نہ ان کے کلام کو سنا) پھر (ایک مدت کے بعد) اللہ تعالیٰ نے ان پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائی (کہ اور کسی پیغمبر کو بھیجا کہ اب بھی راہ پر آویں مگر) پھر بھی (اسی طرح) اندھے اور بہرے بنے رہے (یعنی سب تو نہیں؛ مگر ان میں کے بہتیرے) اور اللہ تعالیٰ ان کے (ان) اعمال کو خوب دیکھنے والے ہیں"۔

اسی طرح یہود کی یہ خواہش کہ وہ اسی کتاب کو کتاب الٰہی مانیں گے جو انبیاء بنی اسرائیل میں سے کسی نبی پر نازل ہوئی ہو اور نبی آخرالزماں کو کہ جن کا وہ بے صبری اور شدت کے ساتھ انتظار کیا کرتے تھے، اسی وقت تسلیم کریں گے جب کہ ان کا ظہور بنی اسرائیل میں ہو، ظاہر ہے یہ آخری درجہ کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے جس کا بطلان ظاہر ہے، اس واسطے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ضد پر رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ أَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِّمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ. (۱)

"اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو جہاں بھیجے اپنے پیغام عنقریب پہنچے گی گنہگاروں کو ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے"۔

اس قوم کی عملی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد آدمی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس قوم کی عملی زندگی کا پورا ڈھانچہ خدا اور دین خداوندی کے مقابلہ میں ایک باغیانہ و انتہا پسندانہ طرز روش پر مبنی ہے، کیوں کہ اس کے افراد ایک طرف اپنے آپ کو خدا کے منتخب و پسندیدہ ہونے کا پرزور دعویٰ کرتے ہیں، تو دوسری طرف خدائی احکام کی صریح خلاف ورزیاں کرتے ہیں، انھیں اس بات پر بڑا ناز رہا ہے اور آج بھی ہے کہ وہ اپنے

(۱) سورۃ الانعام: ۱۲۴

آبائی دین پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ حسب خواہش دین میں تغیرو تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ انبیاء جو اللہ کی سرزمین پر سب سے زیادہ باعزت ومحترم شخصیات ہوتی ہیں، یہودیوں نے انھیں محض اس واسطے بے دریغ قتل کردیا کہ وہ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے ایسے پاکیزہ احکام بیان فرماتے تھے جو ان کی نازیبا حرکات اور مذموم خواہشات سے میل نہ کھاتے تھے۔

چنانچہ یہ چیز اس بدنصیب قوم کا شعار بن گئی کہ اس نے ہمیشہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبروں کو اذیتیں پہنچائیں، شرعی احکام کو تسلیم کرنے اور روبہ عمل لانے میں خدا سے شوخیاں کیں، اس پر مستزاد یہ کہ نسلی غرور وتکبر اور فخر ومباہات میں ایسا آگے بڑھے کہ اپنے آگے سب کو ہیچ جانا، سرکشی وتعدی اور ظلم وعصیان کو اپنا خصوصی شعار بنایا، غرض انھوں نے خدا کی جانب سے عطا کردہ مذہبی تعلیمات کو ایسا مسخ کیا کہ وہ بجائے ایک آسمانی مذہب کے محض ان کی خام خیالیوں اور بے جا خواہشوں کا تختۂ مشق بن کر رہ گیا، اس سلسلہ میں ایک نامور عیسائی محقق اور یہودیت پر گہری نگاہ کے حامل دانشور (William Gri Mstad) اپنی کتاب (Antizion) اینٹی زیون میں رقمطراز ہیں۔

”مذہبی تعصب، تنگ نظری، قومی تفاخر، نسلی غرور اور برتری کے پندار میں مبتلا یہودی دیگر مذاہب اور دنیا کی دوسری قوموں کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا بخوبی اندازہ محض اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مختلف اخلاقی اور تمدنی احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان فرق کرتے تھے، ایک ہی برتاؤ اسرائیلی کے ساتھ ناجائز مگر غیر اسرائیلی کے ساتھ جائز تھا، مثلاً خود بائبل میں صراحت ہے کہ اگر ایک شخص نے دوسرے کو قرض دیا ہو تو سات سال گزر جانے پر اسے معاف کردے، البتہ وہ پردیسی سے اس کا مطالبہ کرسکتا ہے، اسی طرح اس میں یہ حکم بھی ہے کہ ”تو پردیسی کو سود پر قرض دیدے، باپ بھائی کو سود پر قرض نہ دینا“، یہودیوں کی مذہبی کتاب ”تالمود“ (The Talmud) میں اس قسم کی تعلیمات ملتی ہیں مثلاً:

۱- جوفرق انسان اور حیوان میں پایا جاتا ہے ویسا ہی فرق یہود اور دیگر قوموں کے درمیان ہے۔

۲- یہود کے علاوہ دیگر لوگ بدجانوروں کی طرح سے ہیں اور ان کی روحیں ناپاک ہیں۔

۳- غیر یہودی کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں، انھیں دھوکہ دینا، ان سے جھوٹ بولنا، ان کے ساتھ منافقت کا برتاؤ کرنا یہود کے لیے جائز ہے اس لیے کہ وہ اللہ کے بھی دشمن ہیں اور ان کے بھی۔

۴- دنیا اور اس کی تمام چیزیں یہود کی ملکیت ہیں اللہ نے انھیں ان پر تسلط بخشا ہے اور تصرفانہ حقوق عطا کیے ہیں۔

۵- غیر یہودیوں کے مال کی حیثیت متروک (مال گمشدہ) کی ہے، یہود میں سے جس کے بھی ہاتھ لگے وہ اس کا مالک ہے۔

۶- یہود کے اموال کو چرانا جائز نہیں، جہاں تک غیر یہود کے اموال کا تعلق ہے ان کی چوری کی جاسکتی ہے۔

۷- یہودی کے ساتھ خرید وفروخت میں دھوکہ دینا جائز نہیں البتہ غیر یہودی کو دھوکہ دینے اور اسے دیئے گئے قرض پر بھاری سود وصول کرنے کی اجازت ہے۔

۸- اگر کسی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا مقدمہ تمہارے پاس آئے تو اگر اسرائیلی شریعت کے مطابق تم اپنے اسرائیلی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتے ہو تو ویسا ہی کرو اور کہہ دو کہ یہ ہمارا قانون ہے اور اگر ایسا غیر یہودی قانون کے ذریعہ کر سکتے ہو تو اسی طرح اسے فائدہ پہنچاؤ اور غیر اسرائیلی سے کہہ دو کہ یہ تو تمہارا قانون ہے اور اگر دونوں قوانین سے اسرائیلی کو فائدہ پہنچانا ممکن نہ ہو تو پھر حیلے اور فریب سے کام لو تا کہ بہر حال مقدمے کا فیصلہ اسرائیلی کے حق میں ہو۔"(۱)

مختصر یہ کہ بنی اسرائیل نے اس طرح خدائی دین کے اندر اپنی من مانی تحریفات سے اس کی شکل کو غیر معمولی طور پر مسخ کر دیا، جس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کی آنے

(۱) (Williom Grimstad Antizion) بحوالہ: اسرائیل آغاز سے انجام کی طرف: ۲۵-۲۶، راحیل پبلی کیشنز اردو بازار کراچی)

والی نسلیں اپنے بارے میں ایک طرح کی خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہوگئیں جو آگے چل کر ایک خوفناک شکل اختیار کرتے ہوئے نسلی غرور و تکبر، دوسری اقوام کے مقابلہ میں اپنی قوم کے برتر و فائق ہونے کا غیر معقول تصور اور شدید نسلی و آبائی تعصب جیسی چیزوں میں تبدیل ہوگئیں۔

قوم یہود کی مسلمانوں کے تئیں بغض و عداوت اور دین اسلام کے سلسلہ میں ان کا شدید عناد میں مبتلا ہونا، دراصل کئی وجوہات کی بناء پر ہے، ان میں سے ایک اہم ترین وجہ یہ ہے کہ جب مسلمان مدینہ منورہ پہنچے اور انہوں نے اپنے دینی اعمال و افعال اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انجام دینے شروع کئے اور دعوت الی الاسلام پر کاربند ہوکر مدینہ و اطراف مدینہ میں دینی، اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں مصروف ہوگئے جس کے سبب اسلام کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا اور لوگ اسلام قبول کرنے لگے اس وقت یہود نے دیکھا کہ یہ دین ان کے دین سے مشابہت رکھتا ہے اور اس دین کے داعی حضرات ملت ابراہیمی پر عمل پیرا ہونے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ لائے ہوئے دین وملت کی تجدید کئے جانے کی بات کرتے ہیں، تو یہ دیکھ کر یہود نے یہی اندازہ قائم کیا کہ یہ محض ایک چھوٹی سی تحریک ہے اس کے سوا کچھ نہیں، اگر یہ کامیاب ہوگئی تو ملت ابراہیمی سے قربت کی وجہ سے خود یہودیوں میں ضم ہوجائے گی اور اگر ناکام رہی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے اور آپ نے تقریباً ١٧ ماہینوں تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں تو یہود کو دین اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے مزید اطمینان ہوگیا کہ ان حضرات کا تو قبلہ بھی وہی ہے جو ہمارا ہے، اس واسطے انہوں نے کھل کر اس دین کی مخالفت نہیں کی۔ چنانچہ اس سے ایک بڑا فائدہ مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اندر ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور اس ریاست کی بقاء وتحفظ کے لئے نیز مدینہ واطراف مدینہ میں ریاست کے فیصلوں کو قابل

قبول بنانے کے لیے جن قبائل سے معاہدے کیئے تھے ان معاہد قبائل میں یہودی قبیلے بھی شامل تھے، یہ لوگ مسلمانوں سے بہت زیادہ مطمئن تو نہ تھے، لیکن نئے دین کو اپنے دین سے مشابہ دیکھنے کی وجہ سے کچھ حد تک اطمینان کا اظہار کر رہے تھے اور غالبًا یہ چیز بھی ان کے پیش نگاہ ضرور رہی ہوگی کہ لوگوں میں اسلام کے تعلق سے کافی جوش و خروش ہے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو رہے ہیں حتی کہ اوس وخزرج جیسے بڑے قبائل کی بھی خاطر خواہ جمعیت قبول اسلام کر چکی ہے، اس لئے ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے معاہدوں پر حامی بھر لینے میں ہی اپنا فائدہ خیال کیا چنانچہ اس پوری صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے یوسف ظفر نے لکھا ہے کہ ''یہود نے اسلام کو ابتداءً ایک نئے مذہب کے طور پر سمجھا ہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنے انبیاء اور الہامی کتابوں کی روشنی میں اسی دین کی ایک کڑی سمجھتے رہے جسے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور موسیٰؑ لے کر آئے تھے، ان کا خیال تھا کہ قریش مکہ اور دیگر عرب قبائل میں اس دین کی مقبولیت سے ان کی فضیلت مزید اجاگر ہوگی اور وہ اپنے مذہب کی مرکزیت کے سبب اس شاخ کو اپنے زیر اثر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے، غرض انہوں نے اس معاملہ کو سمجھنے میں وہی ٹھوکر پھر کھائی جو عیسائیت کی ترویج کے وقت انہیں لگی تھی، چوں کہ وہ اپنی ذاتی عظمت (جو پیغمبر زادگی اور یہوداہ کے عہد کا حاصل تھی) برقرار رکھنے کے لئے اپنے دین کو مزید پھیلانا نہیں چاہتے تھے، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ دوسرے درجے کے ایسے مذاہب فروغ پائیں جن میں انہیں مرکزیت حاصل ہو، اسی فلسفے کے تحت انہوں نے عیسائیت کو اپنا مخصوص رنگ دے کر عام کرنا چاہا اور جب وہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر ایک نئے مذہب کی حیثیت سے قریہ قریہ پھیل چکی اور اسے سلطنت روما کی پشت پناہی بھی حاصل ہوگئی تو ان کی آنکھیں کھلیں۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اسلام کے بنیادی ارکان واضح کیئے تو یہ سمجھ بیٹھے کہ اب انہیں دوسرے درجے کا مذہب اور قوم ضرور حاصل ہوگی جو ان کے زیر سایہ

چل کر کم از کم یہودیہ کو دوبارہ زیر کرنے کے لیے ان کا ساتھ دے گی اور یوں وہ اپنے منصوبے پالیں گے پھر مدینہ منورہ میں حضور کی تشریف آوری کے سترہ ماہ بعد تک مسلمان بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے تو یہود نے یہ چرچا عام کر دیا کہ یہ نبی جو خود کو نبی آخرالزماں کہتے ہیں ہمارے ہی قبلہ کو سجدہ کرتے ہیں پس آخر کار یہ ہمارا ہی دین اختیار کریں گے اور اپنی جمعیت کے ساتھ ہماری ہی تقلید کریں گے اس لیے انہوں نے معاہدے کی شرائط قبول کرنے میں دیر نہ کی۔

لیکن جب تبدیلی قبلہ کی آیت نازل ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ اسلام اپنی مرکزیت پا کر ان سے بالکل ممیز ہو گیا ہے اور اب اس کی جداگانہ حیثیت واضح ہو گئی ہے تو اب انہوں نے نومسلموں کو دوسرے طریقوں سے بہکانا شروع کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے (نعوذ باللہ) تمام نبیوں کے قبلہ کو چھوڑ کر اللہ سے بغاوت کی ہے، کوئی سچا نبی اپنے پیش روؤں کے قبلہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سیاست کی یوں تردید فرمائی کہ یہ قبلہ نیا نہیں ہے یہ تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے مقرر ہے اور ابراہیم علیہ السلام یہود و نصاریٰ دونوں کے پیشوا ہیں، پس ان کا مقرر کیا ہوا قبلہ دونوں کے لیے باعث احترام ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ.[1]

''اور جس سمت قبلہ پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون ہٹتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے، اس امتحان کے لیے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا)۔''

(۱) سورۃ البقرۃ:۱۴۳

گویا قبلہ کا تعین تھا ہی یہود سے امت محمدیؐ کو جدا کرنے کے لئے ،حکمت اس تفاوت میں یہ بھی تھی کہ اگر یہود و مسلمان دونوں کا قبلہ ایک ہی رہتا تو یہودی انہیں ہمیشہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے اور مطعون کرتے کہ تم وہ ہو جنہیں اپنا قبلہ تک نصیب نہ ہوا، یا تم ہمارے جس قبلے کو سجدہ کرتے ہو ہم نے اسے تم سے کئی ہزار برس قبل اپنایا تھا اس ذہنیت کا علاج یہی تھا کہ مسلمانوں کو ان فتنہ پروروں کی زد سے محفوظ کیا جائے۔''(۱)

تحویل قبلہ کے وقت یہود نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے تعلق سے جو کچھ بھی غیض و غضب کا اظہار کیا وہ تو خیر کیا ہی لیکن آج بھی جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں مسلمان اطراف عالم سے خانۂ خدا کا طواف و زیارت کرنے اور موسم حج میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے والہانہ و عاشقانہ جذبات کے ساتھ شہر مقدس مکہ المکرّمہ کا رخ کر رہے ہیں اور جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہوتے اور اس پر نثار ہوتے رہتے ہیں ٹھیک اسی طرح امت محمدیہ سے وابستہ افراد و اشخاص خانۂ خدا کے گرد جمع ہوتے اور پروانہ وار طواف کرتے رہتے ہیں، اور یہ طواف کا عمل کسی ایک دن کے لیے بھی موقوف نہیں کیا جاتا بلکہ ہمیشہ اور شب و روز جاری رہتا ہے تو یہود کے دلوں میں حسد کی آگ مزید بھڑکنے لگتی ہے کیوں کہ جو حرم یعنی بیت اللہ (مکہ) ان کے خیال کے مطابق بالکل نیا ہے اس کا حال یہ دیکھ رہے ہیں کہ پوری دنیا سے لوگ اس کی طرف کھنچ کھنچ کر آ رہے ہیں اور اپنی عبادتوں و ریاضتوں اور مناجات کے ذریعہ سے (جو عمرہ و حج کے دوران انجام دی جاتی ہیں) حرم کعبہ کو آباد کرتے ہیں، جب کہ وہ حرم جس کو وہ اپنے خیال کے مطابق زیادہ مقدس سمجھتے تھے یعنی بیت المقدس ،تو وہ خود اسے مسلسل ویران اور اس کے زیر زمین سرنگیں کھود کر کمزور کرتے جا رہے ہیں، عقل و انصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ اس صورت حال سے عبرت حاصل کرتے ہوئے اپنی انتہا پسندانہ کارروائیوں سے باز آ جاتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ان حقائق کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرنے کے باوجود مزید

(۱) یہودیت :۱۳۶

بغض وعناد میں مبتلا ہوئے جاتے ہیں، بہرحال ان تمام وجوہات کے علاوہ مہاجرین اور انصار کی باہمی محبت بھی یہود کے لئے تکلیف کا باعث تھی، انصار میں سے جو یہود کے مقروض تھے اور اس اقتصادی جکڑ بند کے باعث ان کا سامنا نہ کر سکتے تھے، مہاجرین کی امداد پاکر اس عذاب سے نجات حاصل کر گئے اور پھر جب دونوں نے مل کر تجارت کو سنت نبوی کی حیثیت سے اپنایا تو دیکھتے ہی دیکھتے یہودی تسلط عملی طور پر برائے نام ہی رہ گیا چناں چہ تاجرانہ رقابت نے بھی انہیں مسلمانوں کے خلاف اکسایا اور وہ سینے کی آگ لے کر کفار مکہ کو بھڑکانے نکل کھڑے ہوئے۔

بہرحال یہود دنیا کی مختلف قوموں کے ذریعہ بری طرح کچلے جانے کے بعد شدت کے ساتھ اس جانب غور وخوض کر رہے تھے کہ انہیں دنیا میں کوئی ایسی محفوظ و مامون جگہ حاصل کرنی چاہیے جہاں بیٹھ کر وہ اطمینان کے ساتھ اپنے ان عزائم و مقاصد پر توجہ کے ساتھ کام کر سکیں جو انہیں پوری دنیا پر غلبہ قائم کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں اور سارے عالم پر اقتدار عطا کرنے کا بڑا ذریعہ بن سکتے ہیں جس کے اندر یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ پوری دنیا کے ذہن و دماغ کو اپنے حقیقی دشمن کی خفیہ کارروائیوں سے موڑ کر بعض ایسی چیزوں میں الجھادیں جو انہیں کسی قطعی نتیجے پر پہنچانے کے بجائے محض انتشار ذہنی اور تذبذب کا شکار بنائے رکھیں۔

جیسا کہ انہوں نے خود ایک موقعہ پر اس راز سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم غیر یہودی اقوام کے تعلیمی شعبے کو خاص طور پر نشانہ بنائیں گے، ان کے نصاب تعلیم کو ایسے انداز میں مرتب کریں گے کہ ان کی نئی نسل دل جمعی اور یکسوئی سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے، کبھی کسی قطعی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور ہمیشہ تناؤ اور کشیدگی سے دوچار رہے، ان تمام طریقوں سے ہم غیر یہود کو اتنا زچ کر دیں گے کہ وہ ہمیں بین الاقوامی اقتدار پیش کر دیں گے اور باہمی اختلافات میں ہمیں ہی ثالث بنانے لگیں گے، اس طرح ایک سپر گورنمنٹ (Super Government) معرض وجود میں آجائے گی اور آج

کے حکمرانوں کی جگہ ہم ایک ایسے ادارے کی تشکیل کریں گے جو اعلیٰ نظامت کہلائے گی۔[1] (راقم کا خیال یہ ہے کہ مراد غالباً اقوامِ متحدہ ہے)''

چنانچہ جب اس بابت پیش رفت ہوئی تو انہیں اس کے نتیجے میں امریکہ جیسی جگہ مل گئی، انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس ریاست کے ساتھ ہمدردی و بہی خواہی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سربراہوں کو اس بات کی نہ صرف یقین دہانی کروائی بلکہ انہیں قائل کرلیا کہ اگر یہودی اس ملک کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو چند دنوں میں یہ ملک دنیا کا نمبر ایک ملک بن جائے گا، چنانچہ یہود نے اپنے خفیہ مینوفیسٹو (ایجنڈے) کے اندر اس ملک کو اولین بنیادوں پر مضبوط بنانے، پوری دنیا میں اسے سیاسی غلبہ عطا کرنے اور اس کی معیشت کو مضبوط کرتے ہوئے تعلیم و تعلّم اور سائنس وٹیکنالوجی میں فائق کردینے کے لئے کام شروع کیا اور نہ صرف اس میں کامیاب ہوئے بلکہ پورے مغرب کو غیر معمولی طور پر متأثر کردیا اور اس ریاست کو پوری دنیا کے لیے ایسا پرکشش بنادیا کہ دنیا کے بیشتر ممالک اس کو اپنا آئیڈیل (Ideal) بنا کر کام کررہے ہیں، اور اب حالت یہ ہے کہ ایک روح دو قالب کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ امریکی حکومت پر اسرائیلی و یہودی لابی کے اثرات کے سلسلہ میں لوگ تجزیہ کرتے رہتے ہیں اور دنیا پر یہ باور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہودی لوگ امریکی نظم ونسق پر فقط اپنا ایک اثر رکھتے ہیں جس کی کچھ وجوہات ہیں منجملہ ان میں سے ایک ملک کے معاشی نظام کا استحکام اور ایک خاص دائرے میں دولت کا ارتکاز ہے، یعنی ایک نظام کے تحت اس کا جائزہ لیا جاتا رہتا ہے اور باریکی و دقتِ نظری کے ساتھ دنیا کے بازاروں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور مصالح و مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے دولت کو گردش میں لایا جاتا ہے، غرض اس قسم کی معلومات فراہم کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے باشعور لوگوں کی نگاہ کو محدود کردیا جائے تاکہ ان کے ذہن فراہم کردہ معلومات کے اردگرد ہی گھومتے رہیں اور آگے

(۱) وثائق یہودیت: ۱۲۸ اردو ترجمہ (The protocols of the Learned elders of Zion)

بڑھ کر مزید کچھ جاننے کی کوشش نہ کریں، ورنہ حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی، اس مقدمہ کو ذہن میں رکھنے کے بعد اب مناسب ہے کہ اسرائیلی لابی کے اثرات کی ایک جھلک دیکھ لی جائے مثلاً ''۱۹۸۷ء میں نیویارک ٹائمز نے لکھا تھا کہ (AIPAC) یعنی America and Israel public Affairs Committee مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی بنانے میں ایک بڑی مؤثر قوت بن چکی ہے، یہ تنظیم صدارتی امیدوار کے اسٹاف ممبران چننے میں اثر انداز ہونے کی قوت رکھتی ہے یہ کسی بھی عرب ملک کو اسلحہ کی فروختگی رکوانے پر قادر ہے اور یہ پنٹاگن (امریکی دفاعی ہیڈکوارٹر) اور اسرائیلی افواج کے درمیان گہرے فوجی دوستانہ تعاون کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے، اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اور وائٹ ہاؤس کے پالیسی ساز اہل کار اس کے اعلیٰ عہدیداروں سے صلاح و مشورہ طلب کرتے ہیں، جرنیل اور سینیٹرز بھی مشورہ کرتے ہیں، ٹائمز کی رپورٹ سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ (AIPAC) مسابقانہ لابیوں کے لیے قابل رشک بن چکی ہے اور مشرق وسطیٰ کے ماہرین کے لئے ایک دردسر جو مغرب نواز عربوں کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کرنے کے خواہاں ہیں، سال بھر بعد ایک آزاد صحافی ایریل آلٹر مین بھی اس تنظیم کا معائنہ کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا، بقول اس کے ''اس میں کچھ شک نہیں کہ حالیہ امریکی تاریخ میں (AIPAC) سے زیادہ طاقت رکھنے والی اور کوئی نسلی لابی نہیں ابھری، یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ درحقیقت واشنگٹن میں قائم شدہ ہر قسم کی لابی سے زیادہ طاقتور ہے، اس کا اثر ونفوذ صرف دارالحکومت میں ہی نہیں بلکہ وائٹ ہاؤس، پنٹاگن، اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ، وزارت خزانہ اور ان سب کے مابین واقع بہت سی دیگر عمارتوں میں بھی عیاں ہے اور یہ اثر ونفوذ ایک دوستانہ انتظامیہ کی مدد پر منحصر نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس کے برعکس ہے۔ ''سی، آئی، اے'' کی ایک سابقہ تجزیہ نگار کیتھلین کرسٹی سن نے ۱۹۸۸ء میں لکھا تھا ''صدر ریگن کے عہد میں (AIPAC) پالیسی سازی میں حصہ دار بن چکی تھی، یہ وائٹ ہاؤس اور کانگریس میں اس قدر اثر ونفوذ کی حامل ہے کہ یہ اندازہ لگانا اب ممکن نہیں رہا کہ لابی

کا دباؤ کہاں ختم ہوتا ہے اور کہاں سے آزادانہ صدارتی سوچ بچار کی حد شروع ہوتی ہے۔"(۱)

اب ہم تفصیل کے ساتھ کچھ ایسے حقائق آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جو ثابت کریں گے کہ یہود اور امریکہ کے تعلقات کس قدر گہرے ہیں اور ان کی پالیسیاں عالم اسلام کے سلسلہ میں کس درجہ مشترک ہیں، یہی وجہ ہے کہ امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی کے لیے ہٹ دھرمی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرنے سے بھی نہیں چوکتا اور ہر ایسا موقع جہاں دنیا کے مختلف ممالک اسرائیل کو اس کے مجرمانہ کردار پر باز پرس کرنے کے لیے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں، امریکہ اسے صاف بچالے جاتا ہے۔

امریکہ کی اسرائیل نوازی ایک نظر میں

"اقوام متحدہ" دنیا کا مضبوط ترین ادارہ ہے جسے دنیا کے 180 ممالک کا اعتماد حاصل ہے، اقوام متحدہ کی قرارداد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ 180 ممالک یہ چاہتے ہیں لیکن اسرائیل نے کبھی 180 ممالک کی رائے کا احترام نہ کیا، سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ وہ کون سی طاقت ہے جو اسرائیل کو اقوام متحدہ کے خلاف اعتماد اور قوت فراہم کرتی ہے اور جو اسے سزا سے بچاتی ہے؟ ظاہر ہے وہ طاقت امریکہ ہے۔

امریکہ ایک ایسی طاقت ہے جو اسرائیل کی پشت پر کھڑی رہتی ہے، یہی وہ قوت ہے جو اسے اقوام متحدہ اور اقوام عالم کے عتاب سے بچاتی ہے، اقوام متحدہ نے اب تک 39 مرتبہ اسرائیل کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کیا لیکن عین وقت پر امریکہ نے اقوام متحدہ کے فیصلے کو ویٹو کردیا، امریکہ نے اقوام متحدہ کی تاریخ میں کل 69 مرتبہ ویٹو کا حق استعمال کیا جس میں سے 39 مرتبہ یہ استحقاق اسرائیل کو بچانے کے لے استعمال کیا گیا، 32 مرتبہ تو امریکہ دنیا کا واحد ملک تھا جس نے اسرائیل کی حمایت میں اقوام متحدہ میں ووٹ دیا۔

یہ کھلم کھلا جمہوری دہشت گردی ہے، اس دہشت گردی میں مزید دلچسپ بات

(۱) (اسرائیل کی دیدہ ودانستہ فریب کاریاں، ترجمہ Deliberat Deception ۱۱۴-۱۱۵)

ملاحظہ کیجئے، اس وقت میں امریکہ اور برطانیہ دو ممالک ہیں جو اسرائیل کے پوری طرح حامی ہیں لیکن جب بھی اقوام متحدہ میں ویٹو کا استحقاق استعمال کرنے کا وقت آیا برطانیہ کو شرم آ گئی اور اس کا نمائندہ ایوان سے غائب ہو گیا لیکن امریکہ نے نہایت ڈھٹائی سے ڈٹ کر اسرائیل کو ووٹ دیا، آپ اسرائیل کے حق میں امریکی ویٹو کی تاریخ ملاحظہ فرمائیں، یہ تاریخ آپ کی آنکھیں کھول دے گی۔

1972 میں شام اور لبنان نے اسرائیلی جارحیت کے خلاف سلامتی کونسل میں شکایت دائر کی، سلامتی کونسل کے 15 ارکان میں سے 13 نے شام اور لبنان کی حمایت کی اور اسرائیل پر پابندیاں لگانے کی درخواست کی، اسرائیل کے حق میں صرف ایک ووٹ پڑا۔ لیکن 2 اکتوبر 1972 کو امریکہ نے اسرائیل کے حق میں ویٹو کر دیا۔ 1973 میں مشرق وسطیٰ کی صورت حال پر 8 ممالک نے اسرائیل کے خلاف قرارداد پیش کی، ایوان کے 15 میں سے 13 ارکان نے اسرائیل کے خلاف ووٹ دیئے ایک ممبر ملک ''چین'' غیر حاضر تھا، لیکن امریکہ نے 7 فروری 1973 کو اسے ویٹو کر دیا۔

1975ء میں مصر اور لبنان نے اسرائیل پر پابندیاں لگانے کی درخواست کی، 13 ممالک نے حمایت اور ایک نے مخالفت میں ووٹ دیا، 12 اگست 1975ء کو امریکہ نے اسے بھی ویٹو کر دیا۔ 1976ء میں 6 بڑی اقوام نے فلسطینی ایشو اور مشرق وسطیٰ کی صورت حال پر اقوام متحدہ میں اپیل دائر کی، چین اور لیبیا اس اجلاس میں شامل نہ ہوئے۔ 9 ممالک نے اسرائیل پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جب کہ 3 ممالک نے اسرائیل کی حمایت کی، اس قرارداد کو بھی امریکہ نے 26 جنوری 1976 کو ویٹو کر دیا۔ 11 مارچ 1976 میں 5 ممالک نے عرب علاقوں میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف قرارداد پیش کی، 15 ارکان میں سے 14 نے اس قرارداد کی حمایت کی لیکن 25 مارچ 1976 کو امریکہ نے اسے ویٹو کر دیا۔ جون میں حقوق انسانی کی کمیٹی نے فلسطینی عوام پر جاری اسرائیلی مظالم کو بنیاد بنا کر اسرائیل کے خلاف کارروائی کی درخواست کی،

10 ممالک نے اس درخواست کی حمایت کی اور 4 نے مخالفت، امریکہ نے 29 جون 1976 کو اسے ویٹو کردیا۔ اپریل 1980ء میں تیونس نے فلسطینی عوام کے حقوق کیلئے درخواست دی، اس درخواست کے 150 ممالک حامی تھے اور 40 مخالف، امریکہ نے 30 اپریل 1980 کو اسے ویٹو کردیا، اردن نے گولان کی پہاڑیوں پر قبضے کے خلاف جنوری 1982ء کو اسرائیل کے خلاف درخواست دی، 9 ممبر اس درخواست کے حامی تھے اور 5 مخالف، امریکہ نے 20 جنوری 1982ء کو اسے ویٹو کردیا، اردن نے مقبوضہ علاقوں کی دگرگوں صورت حال پر فروری 1982ء میں اسرائیل کے خلاف قرارداد پیش کی، 13 ارکان نے اس ایشو پر اردن کی حمایت کی، اسرائیل کو صرف ایک ووٹ ملا، امریکہ نے 2 اپریل 1982 کو اسے ویٹو کردیا۔ اپریل 1982ء ہی میں مسجد اقصیٰ پر حملے کے خلاف 4 ممالک نے قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد کو 14 ووٹ ملے، مخالفت کوئی نہیں تھی، لیکن 20 اپریل 1982 کو امریکہ نے اسے بھی ویٹو کردیا، جون 1982ء میں لبنان کے مسئلہ پر اسپین نے قرارداد پیش کی، 14 ممالک نے اس قرارداد کی حمایت کی اور صرف ایک ملک مخالف تھا، امریکہ نے 8 جون 1982ء کو اسے بھی ویٹو کردیا، جون ہی میں فرانس نے قرارداد پیش کی، فرانس کو 14 ووٹ ملے لیکن امریکہ نے 26 جون 1982ء کو اسے بھی ویٹو کردیا، اگست 1982ء میں سویت یونین نے لبنان ایشو پر قرارداد پیش کی، سلامتی کونسل کے 15 ارکان میں سے 11 ارکان نے روس کی حمایت کی اور اس قراراداد کی مخالفت میں 3 ووٹ پڑے، امریکہ نے 6 اگست 1982ء کو اسے بھی ویٹو کردیا اور اگست 1983ء میں 20 ممالک نے مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف سلامتی کونسل میں قرارداد پیش کی، 13 ممالک نے فلسطینیوں اور ایک ملک نے اسرائیل کی حمایت کی، 2/ اگست 1983ء کو امریکہ نے اسے بھی ویٹو کردیا۔

یہ تو وہ قراردادیں تھیں جنہیں امریکہ نے ویٹو کیا، ان کے علاوہ ایسے 25 مواقع

ہیں جب اسرائیل نے عالمی قوانین کی خلاف ورزی کی، معاملہ سلامتی کونسل کی نوٹس میں آیا، سلامتی کونسل کے ارکان کا اجلاس بلایا گیا، ارکان نے اسرائیل کے خلاف کاروائی کا فیصلہ کیا لیکن امریکہ نے اس فیصلے کے خلاف ویٹو کر کے اسرائیل کو سفارتی فتح دلا دی، اس قسم کے ویٹو کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1983ء میں سلامتی کونسل نے مقبوضہ عرب علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری کے منصوبے کی مخالفت کی، امریکہ نے احتجاج کو کاروائی کا حصہ ہی نہیں بننے دیا، اس کے علاوہ 6 ستمبر 1984ء، 13 ستمبر 1985ء، 12 مارچ 1985ء، 30 جنوری 1986ء 17/ جنوری 1986ء، 6 فروری 1986ء، 18 جنوری 1988ء، 10 مئی 1988ء، 14 دسمبر 1988ء، 1988ء ہی میں دوبارہ امریکہ نے کارروائی نہیں ہونے دی، 17 فروری 1989ء، 9 جون 1989ء، 7 نومبر 1989ء، 31 مئی 1989، مئی 1990ء، 17 مئی 1995ء، 7 مارچ 1997ء، 21 مارچ 1997ء، 27 مارچ 2001 15 دسمبر 2001ء 20 دسمبر 2002ء 16 ستمبر 2003ء اور 14/ اکتوبر 2003ء کو امریکہ نے اسرائیل کے حق میں ویٹو پاور استعمال کی۔

مارچ 2004ء میں ایریل شیرون کے حکم پر شیخ احمد یاسین کو میزائل حملے میں شہید کر دیا گیا، سلامتی کونسل نے اس کھلی جارحیت کا نوٹس لیا، سلامتی کونسل کے 15 ارکان میں سے 11/ ارکان نے اسرائیل کی اس کارروائی کو ظلم قرار دیا جب کہ برطانیہ، جرمنی اور رومانیہ ووٹنگ میں شامل نہیں ہوئے.........لیکن 25 مارچ 2004ء کو امریکہ نے اسے بھی ویٹو کر دیا، اسرائیل نے فلسطین کے اہم رہنماؤں کو قتل کروایا اور پھر اس کا اعتراف بھی کیا مگر اقوام متحدہ صرف مذمتی قراردادوں کے علاوہ کچھ نہ کر سکی، 2007ء میں غزہ کے اوپر جارحیت میں ہزاروں بے گناہ فلسطینیوں پر فاسفورس بم گرائے گئے، ہسپتالوں، اسکولوں اور گھروں پر بمباری کی گئی، اسرائیل نے باقاعدہ فلسطینیوں کی

نسل کشی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے آج بھی غزہ میں 15 لاکھ انسان محصور ہیں، خوراک، پانی، بجلی ادویات کی عدم دست یابی کی وجہ سے شہید ہو رہے ہیں، انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزی کی جارہی ہے مگر انسانی حقوق کے چمپئن خاموش ہیں۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہودی لابی نہ صرف امریکہ پر اپنے اثرات رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی جملہ خارجہ پالیسیاں اسی لابی کے زیر اثر ترتیب دی جاتی ہیں، مزید یہ چیز بھی محسوس کی جاسکتی ہے کہ یہودی لابی اپنے عزائم و مقاصد کی تکمیل کے لئے امریکہ اور اس کے اثر ونفوذ کا بھرپور استعمال کرتی رہی ہے اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہائٹ ہاؤس کو یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کا استعمال کیا جارہا ہے؟ ظاہر ہے کہ امریکہ جیسے ملک سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوئی لابی مسلسل اس کا استعمال کرتی رہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ مسلسل غلط استعمال کرتی رہے اور امریکہ اس سے بے خبر رہے۔ جواب وہی ہے جو ہم اوپر عرض کر چکے اور اب اختصار کے ساتھ اس کا جواب پھر عرض ہے کہ یہودی لابی اور امریکی حکومت میں ’’عموم خصوص مطلق کی نسبت‘‘ پائی جاتی ہے۔ اگر اس جملہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کیا جائے تو اس جملہ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ طشت از بام ہو جائے گی۔ (انشاء اللہ)

(۱) اسرائیل آغاز سے انجام کی طرف: ۱۳۹/ ۱۴۸

ایں خیال است ومحال است وجنوں

اقوام وملل میں مذہب کی بنیاد پرخیر وشر اورلذت والم کا نظریہ کلیدی اور اساسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، فطری طور پر انسان خیر کا طلب گار ہوتا ہے اور شرور وفتن سے وحشت زدہ ہوتا ہے، مشہور فلسفی سقراط کا نظریۂ خیر وشر یہ تھا کہ دنیا کا کوئی انسان برائی اور بدی کو برائی جان کر اس کا مرتکب نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر قسم کی بدی کو کسی نہ کسی طرح کی بھلائی سمجھ کر کرتا ہے، اور بدی کو بھلائی سمجھنا ہی دراصل ہر قسم کی غلط کاری کی بنیاد ہے، جہاں ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ برائی کا ارتکاب فکر وخیال کے صحیح اور واضح نہ ہونے کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے وہیں یہ بھی اک حقیقت ہے کہ ہر قسم کی ذہنی وفکری بدخلقی جہالت کا نتیجہ ہے کیوں کہ نیکی علم کا خاصہ ہے تو بدی جہالت کی خصوصیت ہے، ٹھیک اسی طرح لذت اور تسکین کی خواہش بھی فطرت انسانی کا مطلوب ہے، ایک نیکوکار بھی آرزو کی تسکین چاہتا ہے اور ایک چور بھی لذت پانے کا خواہش مند ہے/ تاہم انسانوں میں فرق صرف اس سے پیدا ہوتا ہے کہ کون کس چیز سے تسکین حاصل کرتا ہے، عادل کو عدل سے تسکین ہوتی ہے، رحیم کو رحم کرنے میں مزہ آتا ہے، عالم علم سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ظالم ظلم کر کے سکون وفرحت محسوس کرتا ہے، اور ایک جاہل اپنی جاہلانہ حماقتوں کو ہی لذت وسرور کا چشمہ سمجھتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس

❁ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ مطابق مارچ ۲۰۱۵ء، جلد: ۵، شمارہ: ۵۹)

چنگیز خان کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے فوجی سرداروں اور درباری امراء سے سوال کیا کہ بتاؤ دنیا میں انسان کے دل کو موہ لینے والا لذت آفریں نغمہ کونسا ہے اور کس موقع پر کون سی چیز انسان کو سرور وانبساط کے سامان بہم پہنچاتی ہے؟ اپنے اپنے ذوق ومزاج کے مطابق مختلف سرداروں نے اس کے مختلف جوابات دیئے، کسی نے سیم وزر کو آرزؤں کی تسکین کا ذریعہ قرار دیا تو کسی نے اس میں اقتدار وغلبہ کو اس کے ساتھ جزو لازم بتایا، کسی نے نشۂ فتوحات کا ذکر کیا تو کسی نے جسمانی لذتوں کا تذکرہ کیا۔

سب کے جوابات سن کر چنگیز خان نے کہا کہ تم لوگوں نے جتنے بھی اسباب بیان کیے ہیں وہ سب کے سب ادنیٰ درجے کے ہیں اور کسی میں بھی سرور وانبساط کی وہ کیفیت اور شدت نہیں ہے جو کہ اس موقعہ پر پیدا ہوتی ہے جب کہ دشمن کا کٹا ہوا سر تمہارے قدموں میں سامنے پڑا ہوا ہو اور اس کے بیوی بچے گریہ وآہ وزاری اور نالہ وفغاں کر رہے ہوں، یہ وہ دلکش وسحر آفریں نغمۂ حیات ہے جو کہ انسان پر سرور وانبساط کی وجد آفریں کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانوں کے خیر وشر اور لذت والم کے کس قدر مختلف ومتضاد معیارات ہوتے ہیں، لہٰذا کسی بھی مذہب کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں خیر وشر کا کیا مفہوم ہے اور کسی فرد وجماعت کا نظریۂ حیات بھی درحقیقت اسی چیز کا نام ہے کہ وہ کس بات کو خیر سمجھتا ہے اور کس بات کو شر کہتا ہے، اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی اجتماعیت میں راست فکر رکھنے والے معقول پسندوں کی تعداد ہمیشہ معتد بہ ہوتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ تفاوت عقلی کے سبب کوئی زود فہم ہوتا ہے تو کوئی نیکی کے عناوین میں ملفوف شر کا ادراک دیر سے کرتا ہے اور اتنی ہی دیر میں شر پسند طبقہ معاشرہ کی روایات خیر کو خاکستر کر چکا ہوتا ہے، عقلمند وہی ہے جو سیاہ بادلوں کے مرغولے دیکھ کر اس کے پس پردہ طوفان کا اندازہ کر لے۔

ٹھیک ایسی ہی کچھ کیفیت ملک میں جاری مختلف انداز کی شر انگیزیوں کے سبب پیدا

ہورہی ہے، اوراس کوانجام دینے والے جاہل سیاست داں اپنی ان جاہلانہ کارروائیوں سے ملک اوراپنے ہی مذہب کے لیے رسوائی وبدنامی کا موجب اورننگ وعار کا باعث بنے ہوئے ہیں، آیئے ان اجمالی تمہیدی سطور کے تناظر میں ’’فتنۂ گھرواپسی‘‘ کا تحلیل و تجزیہ کرلیا جائے۔آج کل ہندوؤں کی بعض شدت پسند تنظیموں کی جانب سے ’’گھرواپسی‘‘ کے عنوان کے زیرعمل تبدیلی مذہب کا اک فتنہ برپا کیا جارہا ہے جس کی حقیقت ذہنی فسطائیت کے علاوہ اورکچھ نہیں ہے کل تک جومقاصد پس پردہ تھے بزعم طاقت ان کو بروئے عمل لانے کی ایک مذموم کوشش ہورہی ہے، اس عاقبت نااندیشانہ اقدام سے وہ طبقہ اس حقیقت کوفراموش کررہا ہے کہ اس قسم کے پروپیگنڈے سے جہاں ایک طرف ملک بدامنی کی طرف بڑھ رہا ہے وہیں یہ مارآستین موجودہ برسراقتدار سرکار کے ترقی کے ایجنڈے کوبھی شدید نقصان پہنچارہے ہیں کیوں کہ ترقی اور بدامنی بالکل دومتضاد راستے ہیں، ملک کی دوسری بڑی اکثریت کوساتھ لئے بغیرترقی یافتہ بھارت کاتصور مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

رائے بے قوت ہمہ فکر و فسوں
قوت بے رائے جہل است و جنوں

اس تعلق سے زورعمل صرف کرنے والوں کو یادرکھنا چاہیے کہ دنیا میں پیش آمدہ حالات وواقعات جوکہ بنی نوع انسانی کی تاریخ پارینہ کا ایک حصہ ہیں، اس میں کہیں نہ کہیں کوئی مثبت پہلوضرورہوتا ہے اس کا ادراک کرکے ہی اجتماعی سطح پراس کوکارآمد بنادینے کا نام حکمت ہے، اوراس حقیقت کو بلاتفریق مذہب وملت اقوام عالم کا سنجیدہ اور خواندہ طبقہ خوب سمجھتا ہے، اگرایسانہ ہوتا تواسی مذہب کے پڑھے لکھے طبقہ کے لوگوں کی اکثریت کا بیشترسنجیدہ طبقہ اس جاہلانہ اقدام کی پرزور مذمت نہ کرتا اورفکر وسوچ سے عاری وتہی داماں طبقہ کے بودے اورغیرمتوازن دلائل کومضحکہ خیز وفتنہ انگیز قرارنہ دیتا جس میں بطوردلیل کہا جارہا ہے کہ ’’گھرواپسی‘‘ کا عنوان تواس لیے دیا جارہا ہے کہ عہد کہن میں مکہ میں بھی شرک تھا اوراس لیے ماضی بعید میں قبل از اسلام اس کے تانے

بانے عہد ابراہیم میں آزر سے بھی ملتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کا قدیم ترین مذہب بت پرستی ہی تھا، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہد رفتہ کی تاریخ آزر پر جا کر ختم ہو جاتی ہے یا اس کے ماقبل بھی عہد انسانی کا دور پایا جاتا ہے؟ جس کے آغاز میں وحدانیت ہی بنی نوع انسانی کا اصل مذہب تھا، لہٰذا اس عہد رفتہ کے سفر کو درمیان میں ہی کیوں ختم کیا جا رہا ہے، لہٰذا اس نقطۂ نظر سے تو اپنے اصل گھر سے کرائے پر غیر کے گھر واپسی ہی ثابت ہوتی ہے جو کسی بھی ذی شعور انسان کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی، اپنی بداعمالیوں، بدعقیدگیوں اور خود تراشیدہ فلسفوں کے سبب جب جب انسانیت بیمار ہوئی اور بھٹک کر اپنا اصل اور مانوس گھر چھوڑ کر غیر کے گھر میں جا بیٹھی تب تب حق تعالیٰ نے رہنمائی کے لیے اور اپنے اصل گھر کا پتہ بتانے اپنے اصل گھر واپسی کے نشان منزل کی رہنمائی کے لیے اپنے برگزیدہ بندے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا جس کے نتیجہ میں دو رویے سامنے آئے جس کو قرآن کریم نے اپنے بلیغ اور معجزنما انداز میں بیان فرمایا: لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ. (۱)

ایک طبقہ وہ تھا جس کی فطرت اس غیر فطری نظام کو کسی بھی صورت میں قبول کرنے کو تیار نہیں تھی؛ لیکن چوطرفہ ظلمت آشوب ماحول کے سبب خود سے نشان منزل کا پتہ بھی نہیں مل رہا ہے، لیکن دروں خانہ طبیعت کا شدید اضطراب کسی رہنما کی آمد و تلاش کا متقاضی تھا، چناں چہ راہنما کے ملتے ہی فطرت سلیم نے آمنت و صدقت کی گواہی دی، دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے دوطرفہ حالات و واقعات، دلائل و براہین کا تحلیل و تجزیہ کیا، غور و فکر، تدبر و تفکر کو بروئے عمل لائے اور عقل سلیم صراط مستقیم کی گواہ بن گئی، تیسرا طبقہ وہ تھا جس کی قوت فکر پر بغض و عناد کا اس قدر شدید غلبہ تھا کہ نہ تو وہ فکر راست کے دلائل سننے اور تصدیق کرنے کو تیار تھا اور نہ ہی ان کی قوت فکر و عقل تحلیل و تجزیہ کرنے کی متحمل رہی، لہٰذا اسی کو قرآن کریم نے بیان فرمایا کہ روز جزاء یہ محروم فکر و نظر طبقہ باحسرت و یاس

(۱) ترجمہ: (اور کہیں گے کہ) اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے۔ (سورۃ الملک: ۱۰)

یہی کہے گا کہ: لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ. کاش یا تو سن کر قبول کر لیتے، یا غور وفکر کر کے اصل حقیقت پا لیتے، لیکن بہر دوصورت گریز نے ہمیں آج اصحاب السعیر میں پہونچا دیا ہے، تاریخ کے تمام عہدوں میں اصحاب السعیر کا یہ طبقہ اسلام کی بیخ کنی کی کوششوں میں مصروف نظر آتا ہے، لیکن اہل توحید از روئے قرآن اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ". (۱)

یہ عہد رفتہ سے لے کر تا حال اور قیامت تک یہ تینوں طبقات رہیں گے، اسی حقیقت کی جانب قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ مشیر ہے: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۲) لہٰذا انسانیت کو اپنے اصل گھر سے نکال کر غیر کے شکستہ گھر میں منتقل کرنے کی کوشش کرنے والے ان اصحاب السعیر کی ازلی معاندانہ فکر و نظر کے تحلیل وتجزیہ کی ضرورت ہے۔

(۱) ترجمہ: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ بات کتنی بری لگے۔ (سورۃ الصّف:۸)

(۲) جس نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔ (سورۃ الملک:۲)

امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

مرحوم ومغفور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کی شخصیت مختلف طبقاتی علمی دوائر و اجتماعیات سے لے کر بین الاقوامی سطح تک محتاج تعارف نہیں ہے، مرحوم اپنی مرتب و مسجع انداز گفتگو، منفرد انداز بیان اور زیر موضوع گفتگو کی دل نشین ودل آویز اور عقلی ونقلی دلائل سے آراستہ و پیراستہ تشریحات ووضاحت کے حوالے سے نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم اور باذوق علمی حضرات میں بالخصوص اور برصغیر کے سنجیدہ اور راست فکر رکھنے والے ذی علم اور عوام الناس میں بالعموم پسند کئے جاتے ہیں، بہمہ جہت گلہائے رنگارنگ سے ارتقائے کائنات کے ارتباط کا مسلمہ اصول تمام علمی دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے؛ چنانچہ بایں طور اس سے قطع نظر کہ خلاف اور اختلاف کے درمیان واضح اور بین فرق کو اور اختلاف رائے کی گنجائش کی شرعی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی کی بھی رائے سے دلائل شرعیہ کی بنیاد پر اختلاف رائے کی گنجائش کا حق ہر ایک صاحب علم کے پاس ہر وقت محفوظ ہے، تاہم یہ حقیقت واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہردل عزیزی میری نظر میں اپنی زیر گفتگو موضوع کا ہمہ جہت مرتب احاطہ اور حتی الامکان وسیع تناظر میں مطالعہ اور موضوع پر بھرپور نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ پیش آمدہ معاصر مسائل اور واقعات و حوادث سے واقفیت، مقارنہ اور تجزیاتی رائے ان کے تفردات کا حصہ نیز اہم اور کلیدی اجزاء ہیں، اور اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہے کہ حق تعالیٰ نے ان سے دین کا بہت

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (صفر المظفر ۱۴۳۹ھ مطابق نومبر ۲۰۱۷ء جلد: ۹، شمارہ: ۹۲)

کام لیا ہے، دنیا کے مختلف ممالک میں متنوع مضامین پر مشتمل ان کی تقاریر و محاضرات اور تفسیری بیانات آج بھی اسی دلچسپی کے ساتھ سنے جاتے ہیں جیسا کہ ان کی حیات میں مقبول تھے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کہا کرتے تھے کہ جیسا کہ تمام ہی عصری فنی علوم کا منتہائے مقصود حصول زر اور اضافۂ سیم و زر ہوتا ہے، میری میڈیکل تعلیم کا منتہائے مقصود بھی اس سے مختلف نہیں تھا، لیکن حق تعالیٰ نے اپنا خصوصی فضل فرمایا کہ زمانۂ طالب علمی سے ہی میری دلچسپی ہمیشہ دینی، اسلامی اور اصلاحی موضوعات سے رہی اور اسی کی برکت ہے کہ ایک وقت زندگی میں ایسا آیا کہ زندگی کا مقصد ہی خدمت قرآن قرار پا گیا اور پھر مدت العمر اسی خدمت سے وابستہ رہا لیکن مثل مشہور ہے کہ دین سے دنیا بھاری، لیکن مرحوم و مغفور جناب ڈاکٹر صاحب کا معاملہ بھی ایسا رہا جس کا وہ اکثر اظہار کیا کرتے تھے کہ علماء دین نے اپنی صف میں شامل نہ ہونے دیا اور ڈاکٹروں نے اپنی صف سے باہر کر دیا؛ لیکن علیٰ کل حال ڈاکٹر صاحبؒ کے مزاج و ذوق کی یہ تبدیلی کیوں کہ ایمانی اور الہامی بنیاد پر تھی اس لئے ان کا دل ہمیشہ مطمئن رہا، بہر حال اس تمہید کی خبر جس کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ذکر آیا اس کا انشاء یہ ہے کہ اسباب و عوامل کی نظریاتی اساسات میں سلبی و منفی اور ظالمانہ حد تک مفاد پرستانہ عناصر کا فروغ اور حوصلہ افزائی نیز دنیا کی مہذب و متمدن اقوام و ملل کے درمیان شرمندہ کر دینے والی جاہلانہ فکر و سوچ اور ملک کے جمہوری مزاج کے برخلاف تقریباً بالجبر تسلط نے عہد حاضر میں وطن عزیز کے وحشت زدہ ماحول اور ایک خاص سوچ رکھنے والے طبقے کی طرف سے غیر مہذب طرز عمل کے سازشی رجحان نے جس کے سبب بلا تفریق مذہب و ملت تمام ملک کا سنجیدہ، باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ پراگندگی فکر کا ہی نہیں بلکہ تشویش و توحش کا شکار ہے جس کی صدائے بازگشت مختلف سطحوں پر سنائی دے رہی ہے، ارباب بست و کشاد کی بعض انتہائی اہم اور حساس معاملات پر خاموشی کی پالیسی اور اس منحرفانہ طرز عمل نے انسانی عظمت اور ہندوستان کی مشترکہ روایتی و تہذیبی اقدار کو شدید نقصان پہنچایا ہے،

دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ ایک خاص طبقے کی طرف سے منصوبہ بند خوف اور وحشت کے ماحول کو برقرار رکھنے کی مسلسل مساعی کے زیر اثر ذہنی دباؤ اور اعصابی تناؤ کے ساتھ آج کل کم وبیش تمام ہی طبقات ملت کی سنجیدہ مجالس کا موضوع گفت وشنید ملک میں امن کے فقدان کے گرد ہی رہتا ہے، ایسی ہی ایک مجلس تھی اور موضوع گفتگو فقدان امن، اسباب وعوامل، عواقب ونتائج ہی تھے اور حاضرین مجلس کے جذباتی ومتوحش اور معتدل ملے جلے تبصروں سے مجلس کا ماحول بھی نرم گرم تھا، اسی درمیان مجلس میں ایک سنجیدہ فکر صاحب نے ڈاکٹر اسرار صاحب مرحوم کے حوالے سے محاضرۂ قرآنی اور امن عالم کے ایک اقتباس کا انطباق موجودہ احوال پر کرتے ہوئے سنایا جو کہ زیر نظر تحریر کا محرک ہوا، تجزیاتی نقطۂ نظر سے امن کے حوالے سے اس محاضرہ کا ابتدائی اقتباس اپنے اندر دعوت غور وفکر کے مختلف پہلو لئے ہوئے ہے اور خاص طور پر اس اقتباس کی نفسیاتی جہت ایک بڑی گہری فکری اساس ہے، اس سبق آموز اقتباس کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ علاقائی ہو، ملکی ہو یا عالمی ہو بہر کیف امن کے قیام میں اصل فیصلہ کن عامل افراد نسل انسانی کا انفرادی سکون واطمینان ہی ہے کیونکہ پورے عالم انسانی کی اصل اکائی تو بہرحال فرد ہی ہے، جس طرح کہ فصیل چاہے کتنی ہی لمبی چوڑی اور بلند وبالا ہی کیوں نہ ہو، بنی ہوئی تو بہرحال اینٹوں سے ہی ہوتی ہے اور اس کی مضبوطی وپختگی اور استحکام کا سارا دار ومدار اینٹوں کی پختگی پر ہی منحصر ہوتا ہے، اسی فکری زاویے پر امن عالم یا انتشار عالم کا تصور بھی افراد انسانی کے داخلی سکون واطمینان یا عدم اطمینان کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے، اور اس تمثیل کی دلیل یہ ہے کہ انسان عالم اصغر ہے، اس کے باطن میں نہ صرف عالم ارضی ہی بلکہ پوری کائنات کی خاصیات کا خلاصہ موجود ہے، اور اس حقیقت کو عام طور پر انسانی نفسیات شناس اور اس فن کے سب سے بڑے ماہر علماء یعنی صوفیائے اسلام نے خوب سمجھا ہے اس کے علاوہ اس حقیقت سے تو عام آدمی بھی واقف ہے کہ انسان کے باطن پر خارج کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور کائنات ارضی وسماوی کے تمام واقعات وحوادث،

موسمی تغیرات، آفات و مصائب، سکون وراحت غرض کہ ہمہ نوع اقسام تغیرات انسان کی داخلی کیفیات پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں؛ لیکن اس امر واقعہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں یا ان کی توجہ ادھر کم جاتی ہے کہ بالعکس اس عالم اصغر یعنی انسان کا باطن بھی ٹھیک اسی طرح اور انہی بنیادوں پر عالم اکبر یعنی کائنات پر اثر انداز ہوتا ہے اور خارج کی وسعتوں، بلندیوں اور پنہائیوں اور گہرائیوں پر اپنا اور بہت گہرا دیرپا اور دوررس اثر ڈالتا ہے جس کے نتائج و اثرات بسا اوقات صدیوں اور نسلوں کو محیط ہوتے ہیں۔ اور بہت واضح طور پر اس کے مرئی و غیر مرئی اثرات ٹھیک اسی نہج اور ترتیب کے ساتھ عالم اکبر یعنی کائنات پر مرتب ہوتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ نسل انسانی کے افراد کے باطن میں اگر سکون واطمینان موجود ہوگا تو لامحالہ کائنات ارضی وسماوی پر بھی اس کا عکس ضرور پڑے گا اور امن عالم کا قیام ممکن ہوسکے گا اور بالعکس بھی یہی نتائج برآمد ہوں گے؛ چنانچہ اس حقیقت واقعہ کا وسیع تر یا محدود تر تناظر میں ان بنیادوں پر تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہی سامنے آتا ہے، چنانچہ تاریخ عالم پر اس پس منظر میں ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو بھی یہ حقیقت صاف نظر آتی ہے کہ اسباب وعوامل کی بحث سے قطع نظر بسا اوقات محض چند افراد کے داخلی انتشار وفساد کی وجہ سے بڑی عظیم خوں ریزیاں ہوئیں، لاکھوں کروڑوں افراد لقمۂ اجل ہوگئے، تباہیوں و بربادیوں کی ایسی ہولناک داستانیں رقم ہوئیں الامان والحفیظ! بستیوں کی بستیاں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں، اس قسم کی داستانیں شدت وخفت کے ساتھ ماضی بعید سے لے کر حال تک رقم ہوتی رہی ہیں اور ہورہی ہیں، اور آج بھی ہلاکو خان، چنگیز خان، ہٹلر، میسولینی اور جارج بش سے لے کر موجودہ دور کی شخصیات تک ذرا دقت نظر کے ساتھ انسانی نفسیات کے اصول کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان قوت واقتدار کے جذبات واحساسات کے اختلال اور ذہنی وقلبی انتشار کے نتیجہ میں پورے عالم ارضی کا امن وامان اور چین وسکون غارت ہوکر لرزہ خیز قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوسکتا ہے، اس خونچکاں احوال کا لازمی اور منطقی آخری انجام

بہرحال یہی ہے کہ نتیجہ کسی کے ہاتھ لگے کہ نہ لگے لیکن شرم سار انسانیت کی شکست و ریخت میں بہر کیف سب کی برابر کی حصہ داری ہے۔ اور اس حوالے سے موجودہ عالمی منظرنامہ بذات خود اس حقیقت کی شاہد ہے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ دنیا کے بہت سے ممالک جوہری توانائی سے آراستہ اور ناقابل تصور حد تک مہلک اور تباہ کن ہتھیاروں سے پیراستہ ہیں اس منظرنامے کی حقیقت کی سنگینی و ہولناکی کو ذہن میں رکھتے ہوئے افکار و خیالات اور جسم و جاں پر کپکپی اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے کہ دنیا کے اقتدار و اختیار پر قابض معدودے چند لوگوں کے ذہنی اختلال ہی نہیں بلکہ محض ذہنی و اعصابی تناؤ کی بدولت دنیا میں کس قدر ہلاکت خیز اور تباہ کن ماحول بن سکتا ہے اور کیا یہ دنیا اس ہلاکت خیزی اور اس کے نتائج مابعد کے مرتب ہونے والے مہلک ترین اثرات کی متحمل ہو سکتی ہے؟ یہ مسئلہ بذات خود عہد حاضر کا ایک بڑا ہی لرزہ خیز سوال ہے۔

بخوف طوالت تفصیلات و جزئیات سے قطع نظر اس کا جوہر اور کلید یہ ہے کہ قیام امن کے تعلق سے اسلام نے جو ٹھوس اور غیر متزلزل بنیادیں فراہم کی ہیں، اس سے زیادہ مضبوط اور مستحکم اساسات ہو ہی نہیں سکتی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تعامل فرد اور اصول و قوانین دو علیحدہ علیحدہ ماہیتیں ہیں، لہٰذا کسی بھی حقیقت میں تاثیری کیفیت اور نتیجہ خیزی کا رنگ بہر دو حقائق کے باہم لازمی امتزاج سے ہی پیدا ہوتا ہے اور فرد کے عدم تعامل سے اصول و قوانین کی تاثیری ماہیت اور اس کے اسرار و حکم کسی بھی طور پر متاثر نہیں ہوتے ہیں، مثلاً حکم ہے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (۱) اب اگر فرد کا تعامل اس حکم کے برخلاف ہے تو اس کے اسرار و حکم اور اس کے ظاہری و معنوی فوائد پر کیا اثر پڑے گا، علیٰ ہذا القیاس قیام امن کے تعلق سے بھی اسلام کے مسلمہ اصول و قوانین اور رہنمائی و ہدایات کی بھی بعینہٖ یہی نوعیت ہے۔ چنانچہ ہماری

(۱) ترجمہ: نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ (سورۃ البقرۃ: ۴۳)

اپنی صفوں میں بر بنائے غفلت یا اغیار کی صفوں میں بر بنائے مخالفت عدم تعامل کی وجہ سے نیز دنیا کے اندر عہد حاضر میں اسباب وعوامل کی بے حد کثرت وفراوانی اور تمام تر آسانیوں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقیات حاصل ہونے کے باوجود انسانی معاشرہ امن وامان اور سکون واطمینان کی لازوال اور بے بہا نعمت سے محروم ہے، گویا کہ انسان کے دعوے کے مطابق سائنس کی ظاہری ترقیات روبہ کمال ہیں جب کہ اسی رفتار کے اس کے معنوی نتائج روبہ زوال ہیں۔

لہٰذا جہاں ایک طرف بحیثیت امت مسلمہ قیام امن کے حوالے سے ذہنی وقلبی سکون کے لئے حق تعالیٰ کی عطا کردہ لازوال کلید سکون اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱) اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کی طرف رجوع کی ضرورت ہے، وہیں دوسری طرف اپنے اردگرد سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کے منظرنامے کو مدنظر رکھتے ہوئے درپیش معاصر مسائل کی گہرائی اور باریک بینی کے ساتھ ہمہ جہت مطالعاتی نتائج کی روشنی میں لاحاصل جذباتیت سے بالاتر اسلام کے قیام امن کی اساس واصول پر تیار کئے جانے والا لائحہ عمل ہی اس جہت میں مؤثر اور حقیقی کردار ادا کرسکتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ علمائے کرام کی ذمہ داریاں مختلف مصالح کے زیر اثر دو چند ہوجاتی ہیں، علاوہ ازیں اس تعلق سے غور وفکر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ برسرپیکار مسائل کی تمام تر ذمہ داری اغیار کے سرڈال کر خود احتسابی کے عمل سے روگرداں ہوکر مطمئن ہو بیٹھنا بھی ہمارے حق میں سم قاتل ہے۔ لہٰذا پھر ایک بار حاصل تحریر بات بطور تاکید دوہرا رہا ہوں کہ آج کے ان سنگین چیلنجز کا مثبت ومسکت اور مؤثر جواب دینے کے لئے اولین ضرورت داخلی سکون کی تلاش ہے جس کی روشن ترین اور اکمل ترین رہنمائی قرآن کی آیت کریمہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کے الفاظ پر باعمل یقین میں ہی مضمر ہے، گویا کہ بحالات موجودہ ہمارے پیش نظر سنگل نکاتی اساسی ایجنڈہ جو ہے وہ

(۱) ترجمہ: یادرکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ (سورۃ الرعد: ۲۸)

اپنے قلب و ذہن میں سکون و اطمینان کے فروغ پر محنت کرنا ہے اور یہ ایک تجربہ شدہ حقیقت ہے کہ از قسم درپیش جملہ مسائل کا مستحکم حل ہمیشہ پرسکون و پرامن فکر و ذہن کا ہی مرہون منت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ:

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

وما علینا الا البلاغ

ہے سلسلہ احوال کا ہر لحظہ دگرگوں

انجام کار ہندوستان کی شدت پسند حکومت وقت نے مسلمانوں کے جذبات و احساسات اور تمام تر احتجاجات کے باوجود جو کہ صدا بصحرا ثابت ہوئے طلاقِ ثلاثہ کو جرم وسزا کے قوانین کا وہ مجموعہ جو کہ تعزیراتِ ہند کے نام موسوم ہے، اس میں رکھتے ہوئے قابل جرم سزا شمار کیا جانے والا بل ناانصافی وعناد اور آئین ہند میں اقلیتوں کو حاصل شدہ آزادی سے صرف نظر کرتے ہوئے صریح مداخلت فی الدین پر مبنی یہ بل ۲۸/دسمبر ۲۰۱۷ء کو پارلیمنٹ میں پیش کیا اور طے شدہ منصوبے اور ایجنڈے کے تحت منظور کرلیا گیا، پیچ در پیچ ابہام، الجھاؤ اور قانونی تشریحات سے مکمل طور پر عاری اس بل کو ایوان بالا میں رکھے جانے اور پاس کرائے جانے کا مقصد اس قدر واضح ہے کہ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا ایک عام انسان بھی یہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ ۲۰۱۹ء کے عام لوک سبھا انتخابات میں سب کا ساتھ سب کا وکاس جیسے پرفریب وعدوں، نعروں اور دروغ گوئیوں سے عوامی ذہن کو بھٹکا کر پھر ایک مرتبہ نئی دروغ بافیوں کے سہارے اپنی کامیابی کو یقینی بنائے جانے والے اسی چکرویو کا ایک حصہ یہ سازشی بل بھی ہے۔ نہایت عجلت پسندانہ فیصلوں اور پہلے سے طے شدہ منصوبہ بند اور نمائشی مشوروں کے زیر اثر تیار کئے جانے والا یہ سیاہ بل تو بہر حال پاس ہونا ہی تھا، کیوں کہ جہاں صورتِ حال اس شعر کی مصداق تو وہاں کون سا امر مانع ہوسکتا ہے۔

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (جمادی الاولی ۱۴۳۹ھ مطابق فروری ۲۰۱۸ء جلد: ۹، شمارہ: ۹۵)

وہی قاتل، وہی منصف، وہی مخبر ٹھہرے
اقرباء میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

شاطر حریف بخوبی واقف ہے کہ عام مسلمان کچھ وقت کے لئے تبصروں، تذکروں اور مرثیوں میں الجھا رہے گا، اور پھر رفتہ رفتہ اس وقت کی شدت کو بھی بھول جائے گا اور شریعت مطہرہ کے مسلّم اصولوں پر شب خون مارے جانے کی تکلیف اور احساس بھی اس وقت تک کے لئے زائل ہو جائے گا جب تک کہ کوئی دوسری ایسی ضربِ کاری نہیں پڑتی ہے۔ گذشتہ ستر سال میں نہ جانے ایسے کتنے ہمہ نوع مظاہر و نظائر ہیں جس نے ہمارے فکر و خیال میں ایک قیامت برپا کی اور تموج بلاخیز کی اس کیفیت کو خوشنما تحفظات کی فریب کاریوں کے ذریعہ سکون و اطمینان کی چادر اوڑھا دی گئی اور رفتہ رفتہ معاملہ نسیاً منسیا ہو گیا۔ ہم نے نہ عبرت پکڑی، نہ سبق حاصل کیا، نہ تعاملات میں کوئی بدلاؤ اور فرق واقع ہوا۔ پھر وہی جمود، پھر وہی فکری تعطل، پھر وہی غفلت و بے حسی۔ لیجئے جناب پیش آمدہ طوفان اور اس کے جلو میں پوشیدہ بلاخیزی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تمام تر ذمہ داری مادی اسباب و علل اور محرکات پر ڈال کر ایسے دل کو مطمئن کر لیا جیسے کہ اس سے آگے نہ ہم کچھ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری کوئی ذمہ داری ہے۔ قرآن و سنت کے واشگاف اور واضح ترین اصولِ حیات انسانی کے علی الرغم چشم کشا تاریخی عبرت انگیز حقائق بھی بطور اصلاح احوال جا بجا موجود ہیں حصول عبرت کے لئے تاریخی واقعات بڑے مؤثر ثابت ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں گذشتہ اقوام و ملل کے واقعات کو مختلف انداز میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ. (۱) کہ کسی قوم کے زوال پذیر احوال کے بنیادی اور اساسی محرکات میں منافقت، تفریق، انتشار، آپس کی لعن کارانہ روش ایسے اسباب و عوامل ہیں جو کہ ایک

(۱) ترجمہ: یقیناً ان کے واقعات میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے بڑا عبرت کا سامان ہے۔ (سورۃ یوسف: ۱۱۱)

طرف معاندین کو مواقع فراہم کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف قوم کے فکر و عمل کو دیمک زدہ اشیاء کی طرح ختم کر دیتے ہیں اور نفسیاتی سطح پر ایک مسلمان بایں طور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں اور یہ حوصلہ شکن خیال اس میں جمود اور تعطل پیدا کر دیتا ہے حالاں کہ قرآن کریم نے لَا تَقْنَطُوْا مِن رَّحْمَةِ اللّٰه (۱) کی نوید اجتماعی سطح کے لئے نہیں سنائی بلکہ ایک ایک مسلمان کا ہر ایک چھوٹا بڑا عمل ہی نہیں بلکہ بشرط ایمان و یقین بہ نیت اخلاص کیا گیا ارادہ بھی اس آیت نوید سے مربوط ہے۔ یقین جانئے کہ ہماری اپنی بداعمالیوں کے نتیجہ میں حق تعالیٰ کی طرف سے مسلط شدہ اس عذابی کیفیت سے نجات کا راز اپنے اعمال و معاملات کا مخلصانہ محاسبہ، اس میں تبدیلی کی نیت، عزم میں پختگی اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مطہرہ کے مطالعہ اور اتباع میں مضمر ہے، روز نت نئے انداز میں پیش آنے والے واقعات مسلسل ہمیں اپنے اعمال کی اصلاح اور خود احتسابی پر متنبہ کر رہے ہیں۔ اصلاح احوال، تنبہ اور احساس محاسبہ کے نقطۂ نظر سے مخدوم ملّت گرامی قدر جناب حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب الاعظمی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک مضمون ''ہماری زندگی میں مصائب وآلام کا راز'' کا ایک اقتباس اس حوالے سے بیحد مفید لائق توجہ اور قابل عمل ہے، لکھتے ہیں کہ ''آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ ہم ہر پیش آنے والے حادثے، واقعے اور مصیبت کے پیچھے مادی اسباب و محرکات کی تلاش وجستجو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اگرچہ بعض دفعہ ہم اس کا اظہار زبان سے نہیں کر پاتے، اکثر ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان عام طور پر ہر آفت و پریشانی کا کوئی نہ کوئی خارجی سبب ڈھونڈتے ہیں اور واقعات وحوادث کا محرک مادی حقائق و واقعات کو قرار دیتے ہیں، پھر اس کے بعد آہ وفغاں اور نوحہ خوانی کرتے ہیں اور اس واقعہ کے ذمہ داروں کو لعنت وملامت کا ہدف بناتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان واقعات کے اسباب وعلل کو اپنی سیرت

(۱) ترجمہ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ (سورۃ الزمر:۵۳)

وکردار میں اپنی سرگرمیوں میں اور روزانہ پروگراموں میں، اپنی گونا گوں مصروفیات میں، جادۂ حق سے ہٹی ہوئی غلط طریقۂ زندگی میں تلاش کرنے کی فرصت نہیں ملتی اور ان چیزوں میں اپنی تباہ کاریوں کے اسباب معلوم کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا، اس پہلو پر توجہ دینے میں ہم بالکل غافل ہو بیٹھے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں تمام مشکلات ومصائب کو اس ماحول کی روشنی میں سمجھنا ہوگا جس میں ہم اس وقت زندگی بسر کررہے ہیں، خاص طور پر معاملات کے حوالے سے جس کا تعلق ہمارے اخلاق واعمال سے ہے، جس کو منافقانہ اور دروغ بافیوں کی بنیاد پر بے خوف وخطر ہم اپنائے ہوئے ہیں، فکر ونظر کے اس زاویے سے کہا جا سکتا ہے کہ آج ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں اور عمومی سطح پر معاملات کی راہ میں اسلام کے ساتھ ہمارا تعلق محض رسمی رہ گیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ معلوم اور بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے اپنی مثالی شخصیت کھودی ہے اور دنیا کی رہنمائی سے خود کنارہ کش ہوگئے ہیں، چنانچہ اسلامی زندگی مادی تہذیبوں اور فضائل وآداب سے عاری تمدّنوں میں جذب ہوکر اپنا تشخص کھو بیٹھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام اخلاقی برائیوں کو یکجا طور پر دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو سب سے واضح اور نمایاں مثال مسلمانوں کی زندگی میں ملے گی۔ وہ مقامِ بلند جہاں سے قوموں اور ملتوں کو خطاب کیا کرتے تھے علم وادب اور دین واخلاق کا درس دیتے تھے، تہذیب وثقافت اور اجتماع ومعاشرت کے آداب سکھاتے تھے، لوگوں کو جہالت وبدبختی کے قعرِ مذلت سے نکال کر علم وہدایت کی روشنی میں لا کھڑا کیا کرتے تھے آج وہ مقام بلند ہماری دسترس سے باہر ہے اور آج ہم پستی وخواری کے تحت الثریٰ میں پہنچے ہوئے ہیں جہاں ہمیں پامال کیا جارہا ہے، ہمارے ساتھ ذلت ورسوائی کا معاملہ کیا جاتا ہے، بزورِ طاقت صرف اپنے دنیاوی حقوق سے ہی نہیں، بلکہ اب تو نوبت بہ ایں جا رسید کہ شرعی معاملات سے بھی دستبردار ہوجانے کا مطالبہ کیا جانے لگا ہے۔

طلاقِ ثلاثہ کا بل اور بغیر محرم کے سفر حج پر جانے جیسے معاملات انہی ابتدائیات کا حصہ ہے۔ ضروری ہے کہ ان مصائب وآلام کے اسباب ہم اپنے اعمال ومعاملات میں تلاش کریں اور اصلاح احوال کی طرف توجہ کریں، نصرت خداوندی کے لئے قرآنی قانون ہے: **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ**۔ (۱)

توبہ واستغفار کے دروازے کھلے ہیں، رحمت خداوندی منتظر ہے۔ فانی بدایونی نے کہا تھا:

یا رب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے

دراصل رحمت کی یہ تاخیر ہمارے عزم وارادے میں سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ ہمارے اعمال میں تبدیلی واصلاحِ احوال کی منتظر ہے۔

(۱) ترجمہ: یقین جانو کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات میں تبدیلی نہ لے آئے۔ (سورۃ الرعد: ۱۱)

انتخابات، ذمہ داریاں اور ووٹ کی شرعی حیثیت

ملک میں اقتدار و حکمرانی کے نئے سورج کی کرنیں پھوٹ چلی ہیں، سورج طلوع ہوا چاہتا ہے، وطن عزیز کے طول و عرض میں نئے پارلیمانی انتخابات کی دھمک و آہٹ نے دستک دے دی ہے، فریب نظر کے طور پر مختلف سطح پر خس و خاشاک کے عنوان سے کتر بیونت اور دجل ساز اصلاحات سے معنون نئ آبیاری میں تیزی کے رجحان نے رفتار پکڑ لی ہے، رام مندر کے مسئلے کو لے کر سیاست تیز اور ماضی کے آزمودہ تجربوں کی بنیاد پر شورش جنوں اس سے زیادہ تند و تیز ہوچکی ہے، ایوان بالا کی غلام گردشوں میں ۲۰۱۹ء کے الیکشن کے نتیجہ میں حکمرانی کس کے ہاتھ آتی ہے کے عنوان پر گرما گرم بحث و مباحثے جاری ہیں اور روپیہ، آنہ پائی سے لے کر مُکّہ ہاتھا پائی تک کی خبریں حسب معمول سننے میں آرہی ہیں۔ عوام کی نگاہیں آنے والے انتخابات کے موہوم و متوقع نتائج پر لگی ہوئی ہیں، کہیں امیدیں تو کہیں اندیشے، کہیں توقعات ہیں تو کہیں تحفظات، کہیں خوش گمانیاں رو بہ پرواز ہیں تو کہیں خدشات سے دل کی دھڑکنیں تیز، غرض کہ شاطر سیاسی نبّاض اور ملّت کے مزاج شناس کہن سالہ تجربات کی بنیاد پر سنجیدہ فکر و نظر رکھنے والے زعمائے ملّت اور حالات حاضرہ پر ناقدانہ اور بالغ نظر رکھنے والے طبقۂ اشرافیہ سے لے کر خالص عوامی و سطحی زاویۂ فکر و نظر رکھنے والے افراد کار کی مجالس و محافل سمیت گلی نکڑ اور

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ مطابق جنوری ۲۰۱۹ء، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱۰۶)

محلّہ جاتی سطح کے خود ساختہ دانشوران امت اپنی اپنی فکر اور سیاسی و مفاداتی وابستگیوں کی بنیاد پر کسی کو کرسی پر بٹھانے اور کسی کو اتارنے میں سرگرم ہیں جو کہ جمہوری روایات یا بالفاظ دیگر اس کے پس پردہ برپا کی جانے والی سیاسیات کا خاصہ ہے، ان سب کے بیچ بلا تفریق مذہب و ملّت اہل فکر و دانش اور ملک کے مقتدر طبقات کے علماء اور مفکرین و مشاہیر اس حقیقت واقعہ پر متفق الرائے ہیں کہ انتخابات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہیں بلکہ کسی بھی ملک کی زندگی میں انتخابات ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے کہ قوموں اور طبقات کی تقدیرات وابستہ ہوتی ہیں اور اس انقلابی تبدیلی کے واضح اور مشاہد اثرات وزاویۂ فکرونظر سے لے کر ہر سطح کے کارزار عمل میں محسوس کئے جاتے ہیں خواہ تجارت ہو کہ معیشت ہو، زراعت ہو کہ ملازمت، آبگینوں کے محلّات کے مکیں ہوں کہ ناپختہ وشکستہ مکانوں میں رہنے والے غرباء و مساکین ہوں، غرض کہ ملک اور گردوپیش کے احوال کے تناظر میں ہر ایک کے زاویۂ فکرونظر، آراء وسوچ پر اس کے مثبت و منفی اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں جس سے کہ ملک کا اجتماعی مزاج بنتا ہے جس کے نتیجہ میں کبھی مذہب کی بنیاد پر تو کبھی طبقات کی بنیاد پر، کبھی ظالمانہ مفاد پرستانہ وخود غرضانہ سیاست کی بنیاد پر تو کبھی فریب نظر خوشنما منصوبہ سازیوں کے عنوان پر قوموں اور طبقات کے عروج وزوال کی نت نئی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ تمثیلاً کل تک جو بروئے فلک بیٹھ کر اپنے حریفوں کو پستی کے مکین سمجھنے اور جاننے کے مغالطے میں ہر ظلم روا رکھے ہوئے تھا، وہ آج اسی زمین کی پستیوں میں ذلیل وخوار نظر آیا ہے، گویا کہ ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

بلند و پست کے معیار اور پیمانے سب ہی کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں، بقول کسی طنز نگار ادیب کے آج کے جمہوری طرز حکمرانی میں کامیاب سیاست داں وہی سمجھا جاتا ہے جو کہ عوام کے وسائل کو عوام کے لئے مسائل بنادے اور عوام کے مسائل کو اپنے لئے وسائل بنا لے۔ غرض کہ انتخابات کی انقلابی تبدیلیوں کے اثرات کا یہ ایک سرسری سا جائزہ ہے۔

انتخابی انقلاب کا یہ مرحلہ کس قدر نازک، کس قدر خطرناک یا کس قدر بہتر اور کس قدر خوش آئند ہوسکتا ہے اس کا اندازہ بلاتفریق مذہب وملّت وطن عزیز کے باشعور افراد کو ہونا چاہیئے، گذرے دور حکومت میں ملک نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور اس منظر نامے کے تناظر میں ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں مکمل کشادہ دلی اور فکری وسعت کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے ستّر سالوں پر محیط ماضی میں اپنے بیش قیمت ووٹ کے استعمال میں کہاں کہاں غلطیاں کی ہیں اور اس کے نتائج نے ہماری رو بہ تنزل فکری پستی اور طبقۂ اشرافیہ سے لے کر عام سطح تک کے آپسی انتشار اور لعن کاریوں ومخالفتوں نے آج ہمیں کس حد تک حاشیہ پر پہنچا دیا ہے اور منجملہ دیگرے اس کا ایک بین اور واضح ثبوت یہ ہے کہ ہمارے آج کے حکمراں جو کہ درحقیقت ہمارے اپنے کردار وعمل کے ہی آئینہ دار ہیں، وہ کس زاویۂ فکر ونظر کے حامل لوگ ہیں اور کیا ان کے عزائم ومنصوبے ہیں اور اس میں ہمارے صحیح یا غلط فیصلوں کو کتنا دخل ہے اور ستّر سال سے محض ہماری ''ایک بھول'' اور ''ایک غلطی'' کے استمرار نے ہمیں بھی ان کے سیاسی جرائم میں کس حد تک ان کا شریک کار بنایا ہے؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کا جواب کسی اور سے نہیں بلکہ خود اپنے دل سے، اپنے ضمیر سے لئے جانے کی ضرورت ہے۔ خرابی بسیار کے بعد بھی اگر سنجیدہ غور وفکر کے نتیجہ میں ہم صحیح فیصلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں تو خود احتسابی سے ہی اس کا آغاز کرنا ہوگا کیوں کہ موجودہ پارلیمانی نظام حکومت میں جو حکومت بھی برسر اقتدار آتی ہے وہ انتخابات کے ذریعہ ہمارے اور آپ کے ووٹوں کے وسیلے سے ہی ایوان اقتدار کے مناصب تک پہنچتی ہے اور حکومت کے اعمال وافعال اس کے منتخب کرنے والے عوام کے صحیح یا غلط فیصلوں کی طرف ہی اس کا انتساب ہوتا ہے۔ اس منظر نامے میں ہمارے ووٹ کے استعمال کی دینی ودنیاوی اعتبار سے ہم پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسی روشنی میں حقیقت پسندانہ سنجیدہ غور وفکر کی طرف توجہ دلانا آج کی تحریر کا موضوع اور مقصد ہے کیوں کہ یہ انتخابات کوئی کھیل

تماشہ نہیں ہیں کہ جسے لاپرواہی یا غفلت سے گذار دیا جائے، تجربات شاہد ہیں کہ لمحوں کی خطاء صدیوں کی آزمائش ثابت ہوتی ہیں، یہ دنیاوی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ دینی نقطۂ نظر سے بھی انتہائی ذمہ داری کا معاملہ ہے اور بحیثیت ایک مسلمان کے ہر فرد و بشر کا یہ فرض ہے کہ اس ذمہ دارانہ مرحلے کو مکمل دیانت و امانت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ طے کرے اور اپنے بیش قیمت ووٹ کی اہمیت و افادیت اور اس کے دوررس اجتماعی مفادات و نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے دینی ذمہ داری اور تقاضائے وقت کی اہمیت کے تناظر میں محسوس کرے۔

اگر چہ عملی سیاست سے ہمارا کوئی تعلق نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے لیکن اسلام نے کیوں کہ دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح اس شعبۂ تدبیر و سیاست سے بھی ہمیں واضح اور اصولی ہدایات اور رہنمائی عطاء فرمائی ہے جس کی روشنی میں چند اہم نکات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کیوں کہ ایمان کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بدیہی اور اظہر من الشّمس حقیقت ہے کہ جلی و خفی، آشکارا و پوشیدہ ہمیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب ایک روز بارگاہ خداوندی میں دینا ہے، جس میں اجتماعی اور ملّی ذمہ داریوں کی جواب دہی سے لے کر راہ میں پڑے ہوئے پتھر کو اس خیال سے ہٹا دینا بھی شامل ہے کہ اس سے کسی راہ گیر کو ٹھوکر لگ کر کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شہادت و گواہی کو پوشیدہ رکھنے یا اس کے غلط استعمال پر سوال نہیں ہوگا، چنانچہ ووٹ جیسی بیش قیمت طاقت کے استعمال کا شرعی اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو بات مزید منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے اور پابند شریعت ایک مسلمان کو اپنا موقف طے کرنے میں مزید سہولت اور آسانی میسر آجاتی ہے۔

شرعی اعتبار سے ووٹ ایک شہادت اور گواہی ہے، ہم اور آپ جس شخص کو اپنا ووٹ دیتے ہیں گویا کہ اس کے بارے میں گواہی اور شہادت دیتے ہیں کہ ووٹ پانے والا شخص ہماری نظر میں قوم کے نمائندے کی حیثیت سے ایوان حکومت میں قیادت کرنے کا اہل ہے اور ہمارے نزدیک ہمارے حلقۂ انتخاب سے اس اہم ترین اور ذمہ دارانہ

منصب کے لئے اس شخص سے زیادہ لائق و فائق اور موزوں دوسرا کوئی نہیں ہے، لہٰذا اس تناظر میں ووٹ پر شرعی نقطۂ نظر سے وہ تمام احکام جاری ہوتے ہیں جو کہ شہادت پر لاگو ہیں، اس شہادت کے بعد بارگاہِ رب العزت میں ہم پر ہماری ذمہ داری اسی طرح عائد ہو جاتی ہے جیسا کہ اسلام کے دیگر نظام عبادات و معاملات کی جواب دہی ہم پر واجب ہے۔

بعض لوگوں نے اپنی کم مائیگی علم کی بنیاد پر دین کو صرف بنیادی اور اساسی عبادات نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ تک محدود تصور کرتے ہوئے فرائض ،اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات اور کاروبار تجارت جیسے بہت سے شعبہ جات حیات کو دین کی گرفت سے بالکل آزاد سمجھتے ہوئے لائق اعتناء نہیں جانا ہے، بہت سے لوگ اپنے نجی زندگی میں صوم و صلوٰۃ اور وظائف و نوافل کی ادائیگی کی قابل صد رشک متقیانہ پابندی کے باوجود معاملات کی دنیا میں دانستہ یا نادانستہ طور پر غافل ولا پرواہ نظر آتے ہیں، نہ خرید و فروخت کے معاملات میں حلال و حرام کی فکر اور جستجو ہوتی ہے، نہ ہی نکاح و طلاق اور برادریوں کے درمیان متوازن تعلّقات میں دین کے احکام کی پابندی کرتے نظر آتے ہیں، ایسے ہی انتخابات میں اپنے بیش بہا قیمت ووٹ اور شہادت کو بھی ایک خاص دنیاوی سودا سمجھتے ہوئے اس کے استعمال کرنے کو یا تو خلاف دین گردانتے ہوئے اجتناب کرتے ہیں یا اس کے عدم استعمال سے نادانستہ طور پر کسی بددیانت اور نااہل شخص کے لئے تعاون کی راہ ہموار کرنے کے مرتکب ہو جاتے ہیں یا اس کو خالص دنیاداری کا معاملہ سمجھتے ہوئے اس میں مختلف قسم کی بدعنوانیوں کو گوارا کر لیتے ہیں اور یہ بھی خیال نہیں گذرتا کہ ان سے شہادت کو چھپانے یا غلط گواہی دینے کا گناہ سرزد ہوا ہے یا اپنا ووٹ اپنی دیانت دارانہ رائے کے بجائے محض بے قیمت اور حقیر مفادات کی بنیاد پر کسی نالائق و ناموزوں امیدوار کو دیدیتے ہیں اگرچہ شاید وہ دل میں خود بھی جانتے ہوں کہ جس شخص کو اپنا ووٹ جیسا قیمتی حق دیا جا رہا ہے وہ ایوان حکومت میں اجتماعیت کی نمائندگی کرنے کا اہل نہیں ہے لیکن محض وقتی مفادات یا بے شعوری اور اجتماعی احوال کے اثرات سے ناواقفیت اور

بے خبری کے سبب اپنے ایک نہایت قیمتی حق کو ضائع کر بیٹھتے ہیں اور اس کے نتیجے میں نا اہل اور جاہل قسم کے لوگ برسر اقتدار آتے ہیں تو اس کی مکمل ذمہ داری ووٹ کے ذریعہ شہادت دینے والے شخص پر عائد ہوتی ہے اور عالم تکوین میں حکام کے اعمال کے تمام تر عذاب وثواب کے حصے دار قرار پاتے ہیں، محض زبانی کلامی نہیں بلکہ جب تک اپنے کردار وعمل اور قول وفعل کی یکسانیت سے دنیا کو ہم یہ باور نہیں کرائیں گے کہ ہم ایک مکمل ترین دین اور مستحکم ترین نظام حیات کی حامل امت خیر ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت نہ سختی سے نہ زور زبردستی سے، نہ ہی لالچ وطمع سے نہ جعل سازیوں اور فریب سے ہمیں اپنے دین وعقائد سے نہیں پھیر سکتی ہے تو اس وقت تک یہی ذلت وخواری ہمارا مقدر بنی رہے گی اور دنیا کی تمام طاقت ور قومیں یونہی ہم پر غالب رہیں گی اور یونہی ہمیں قابل فروخت مال سمجھ کر یا ازکار رفتہ اور بے قیمت وبے مول سمجھ کر ہمارے قومی تشخص عزت و آبرو اور آزادی فکر کو بازار سیاست میں نیلام کرتی رہیں گی، لیکن اگر ایک مرتبہ بھی ہم نے اپنے عمل سے اپنے کردار سے اپنی دینی حمیت اور قومی غیرت سے دنیا کو یہ بتا دیا کہ کسی دنیوی مصیبت کا خوف یا کسی دنیاوی آسائش کا لالچ ہمیں اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنے یا قدم اٹھانے پر آمادہ ومجبور نہیں کر سکتا ہے تو یہ خارجی طاقتیں ہماری فکری وعملی صلاحیتوں کو کبھی زنگ آلود نہیں کر سکتی ہیں، خود احتسابی کی پہلی منزل یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے ایمان میں مضبوطی اور ارادوں میں پختگی اور اپنے اقوال اعمال افعال میں رحمت حق جلّ مجدہٗ کو متوجہ کرنے والی صفات پیدا کریں اور بے شک اللہ کی نصرت ومدد دین اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہی مضمر ہیں، **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِم** [1] (الآیۃ) (بے شک اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے آپ کو خود نہ بدلے) ہمارے قومی وجود اور ملیّ تشخص کے بقاوفنا کا مدار ہمارے اپنے فکر وعمل کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

(۱) سورۃ الرعد:۱۱

صاحب کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات اس صورت مسئلہ کو مزید منقح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کو جمع الفوائد کے زیر عنوان ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَأَوْا الظَّالِمَ فَلم یأخُذوا علٰی یدیه أو شَكَ أن یعُمَّهم اللّٰه بِعِقابٍ منه (۱) اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمادیں۔ اگر ہم اور آپ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے اور انتخابات میں اپنے فرائض کے بقدر حصہ لے کر اپنے ووٹ کے حق کا صحیح استعمال کرکے اس ظلم کو مقدور بھر کسی نہ کسی درجے میں ہٹانا ہماری اور آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے ہم پر یہ واجب ہے کہ حتی الامکان اپنے حلقۂ اثر میں اپنے ووٹ کی طاقت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کئے جانے کی جدوجہد کریں، اسی ذیل میں مزید رقم طراز ہیں کہ بہت سے دین دار لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا فرق پڑے گا یا کیا نقصان ہوگا؟ لیکن جان لیجئے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے جو کہ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ہے من اَذَلّ عندہٗ مومنٌ فلم ینصُرہ وھو یقدِر علی أن ینصُرَہ اَذلّہ اللّٰہُ یومَ القیامةِ علٰی رؤوسِ الْخلائقِ (۲) جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جارہا ہو اور وہ اس کی نصرت کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ برسر عام اسے ذلیل و رسوا کرے گا۔

لمحۂ فکر یہ یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے ووٹ کی حیثیت کیوں کہ شہادت اور گواہی کی

(۱) جامع الترمذي، أبواب الفتن، باب نزول العذاب إذا لم یغیر المنکر، ج:۲،ص:۳۹، رقم:۲۱۶۸

(۲) شعب الإیمان للبیھقی، الثالث والخمسون من شعب الإیمان، ج۶،ص:۱۱۰

سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی از روئے کلام اللہ حرام اور ناجائز ہے۔ نہایت واضح ترین الفاظ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ. (۱) اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہے۔ اسی ضمن میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مَن كتَم شهادةً اِذا دُعِي اِليها كان كمن شهِد بالزُّور. (۲) جس کسی کو شہادت کے لئے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا۔

چنانچہ قرآن وسنت کی رو سے ووٹ پر شہادت اور گواہی کے تمام احکامات جاری ہوتے ہیں، لہٰذا اس زاویۂ فکر سے غور کیا جائے تو ووٹ کو محفوظ رکھنا اور اس کا استعمال نہ کرنا دین داری کا تقاضہ نہیں ہے بلکہ اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا دینی نقطۂ نظر اور اجتماعی مفاد عامہ کے لحاظ سے ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ اسی حقیقت کا دوسرا زاویۂ فکر یہ بھی ہے کہ شرفائے ملّت دین دار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات سے بالکل یکسو یا لاپرواہ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو اس کا نتیجہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں نکل سکتا ہے، گویا کہ یہ پورا میدان عمل ارذل اور فتنہ پردازوں کے ہاتھوں سونپنے میں ہم بھی شعوری یا لاشعوری طور پر شریک عمل ہو رہے ہیں۔

اس تعلق سے انتخابات کے نتائج کی خوشگواری وسنگینی پر سنجیدہ غور وفکر درست موقف اور مضبوط لائحہ عمل کی ناگزیریت پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ جھوٹی گواہی کے تعلق سے قرآن کریم نے نہایت شدت کے ساتھ مذمت کی ہے اور اس کی شدت و سنگینی کا اندازہ اس آیت کریمہ سے ہو سکتا ہے جس میں جھوٹی گواہی دینے کو بت پرستی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۳). پس تم پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے، اس

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۸۳ (۲) جمع الفوائد بحوالہ طبرانی، ص ۶۲ (۳) سورۃ الحج: ۳۰

کے علاوہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبرالکبائر یعنی بڑے گناہوں کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے اس پر سخت ترین وعیدات ارشاد فرمائی ہیں۔ ''ألا أُنبِّئُکُمْ بِأکْبرِ الْکبائِرِ، ثلاثًا؟ قَالُوا:..... یا رسولَ اللّٰہ، قَال: الإِشْرَاكُ باللّٰهِ و عُقوقُ الوالدَین و شهادةُ الزُّور أو قولُ الزُّور''[۱] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تمہیں اکبرالکبائر (یعنی بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤں؟ صحابہ کرامؓ نے کہا: اے اللہ کے نبی! ضرور بتائیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور خوب اچھی طرح سن لو جھوٹی بات یا جھوٹی گواہی دینا۔ صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس وقت تکیہ سے ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ''جھوٹی گواہی'' کے لفظ کو بار بار ارشاد فرماتے رہے۔ دراں حالیکہ ہم اپنے دلوں میں کہنے لگے کہ کاش آپ خاموش ہوجائیں۔

عموماً یہ مغالطہ بھی لوگوں کے ذہنوں میں رہتا ہے کہ لاکھوں ووٹ میں مجھ ایک شخص کے ووٹ کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ استعمال کیا نہیں کیا اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور اگر غلط استعمال ہو بھی گیا تو اس سے ملک وقوم کے مستقبل پر کیا اثر ہوگا۔ یہ نقطۂ نظر بایں معنی غلط ہے کہ اگر ہر شخص یہی سوچ لے تو پوری آبادی میں کسی ایک ووٹ کا بھی صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے رائج الوقت جمہوری نظام انتخابات میں بسا اوقات ایک ووٹ بھی ملک وملّت کی تقدیر بدل دینے کے لئے کافی ہوجاتا ہے، اسی طرح بسا اوقات محض ایک ووٹ کا شعوری یا لاشعوری طور پر غلط استعمال ملک وقوم کو ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کردینے کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور وہ ایک ووٹ میرا یا آپ کا کسی کا بھی ہوسکتا ہے، اس لئے مروجہ نظام میں ایک ایک ووٹ بیش قیمت ہے اور یہ تمام

(۱) صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب ما قيل في شهادة الزور، ج:۱ص:۳۶۲، رقم:۵۵۴۶

افرادِ امت کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملّی فریضہ ہے کہ ہر شخص اپنے ووٹ کو بھرپور توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا فی الواقعہ مستحق ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

اب آخر میں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اپنے ووٹ کا استعمال کس قسم کے افراد کے لئے کیا جائے، اس کے لئے رو بہ زوال سیاسی فکر و ماحول کے تناظر میں کوئی ایک ایسا پیمانہ متعین کرنا جو کہ سب پر منطبق ہو سکتا ہو یا سب کے لئے یکساں طور پر قابل قبول فارمولہ ہو دشوار گزار ہے، اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ علاقائی احوال و کوائف کی روشنی میں امیدواران کا تجزیہ کر لیا جائے اور قومی و ملّی خدمات اور راست فکر و نظر کے تناظر میں نسبتاً جو کسی بھی درجہ میں ان سب میں ممتاز نظر آئے اس کا انتخاب کر لیا جائے کیوں کہ اسلامی اصول و معیار کی کسوٹی پر رائج نظام میں کسی دین دار شخص کو اس میدان میں تلاش کرنا، اگر ناممکن نہ صحیح تو بہر حال انتہائی دشوار گزار ضرور ہے۔

بہر کیف حاصل کلام یہ ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں اپنی شہادت اور گواہی کی اہمیت اور حیثیت کا علم ہونا ضروری ہے تا کہ کل بروز محشر بارگاہ رب العزت میں جواب دہی کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکیں۔

وما توفیقی الا باللّٰہ

ہیں کواکب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ

دورِ قدیم کے صدر مقامات میں سلطان یا والی سلطنت کی طرف سے جو عہدیدار مقرر ہوتے تھے ان میں ایک بڑا اہم عہدہ ''صاحب الخبر'' کے نام سے معروف ہوا کرتا تھا۔ شعبہ کے مرکزی عہدے پر فائز کئے جانے والے شخص کی جہاں مختلف زاویوں سے جانچ کا عمل ہوتا تھا، اس میں سب سے اہم ترین پہلو کا تعلق معیّن شخص کی دیانت وامانت کے امتحان اور اس کے کردار وگفتار سے ہوتا تھا جو اس کے چال چلن کے جائزے کی روشنی میں طے کئے جانے کے ساتھ ساتھ گرداگرد مختلف طبقات کی گواہیوں کا اس عہدے کی تقرری پر بڑا گہرا دخل واثر ہوا کرتا تھا اور مرکزی منصب سے لے کر نچلے درجے تک جانچ کے عمل کا پیمانہ ایک ہی ہوتا تھا۔ اس محکمہ کا فرض تھا کہ وہ والی سلطنت اور ارکانِ حکومت کو ہر دم پیش آنے والے واقعات اور اس کے اسباب واثرات کی صحیح صحیح اور بروقت خبریں پہنچائے۔ اس زمانے میں مرکزی عہدیدار کی ہی نہیں بلکہ پورے محکمہ کے لوگوں کی تنخواہیں عام سرکاری شرح وظائف سے خاصی زائد ہوتی تھیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ غضب کا توازن برقرار رکھا جاتا تھا۔ اس سلسلے کے قوانین نہ صرف نہایت سخت گیر تھے بلکہ سریع النفاذ بھی تھے۔ اس سلسلے میں قانون کی سختی کا عالم یہ تھا کہ والی سلطنت کو پہنچائی جانے والی خبر اگر کسی بھی درجہ میں جھوٹی ثابت ہوئی یا غلط پائی گئی یا سازش والزام ثابت ہوگیا تو کم سے کم درجہ میں حبسِ دوام کی سزا یا پھر سیدھے

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ مطابق جنوری ۲۰۱۷ء جلد: ۷، شمارہ: ۸۲)

سزائے موت تھی، کیوں کہ محکمہ کی ہی فراہم کردہ خبروں پر حکومت کی پالیسیوں اور فیصلوں کا انحصار ہوتا تھا، انہی خبروں پر سلطنت کے فیصلوں کا استوار و اختلال منحصر ہوتا تھا، گویا کہ ایک غلط خبر کے نتیجے میں بسا اوقات بڑے بڑے طوفان برپا ہو جایا کرتے تھے۔ دو ملکوں میں ہولناک جنگیں برپا ہو جایا کرتی تھیں، ماضی سے حال تک مختلف تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ خوارزم شاہ کے دربار میں چنگیزی سفیر کے تعلق سے محض ایک شخص کے ذاتی جذبۂ غضب و عناد کے زیر اثر جھوٹی اور بے بنیاد خبر کے نتیجہ میں بھرے دربار میں سفیر کو قتل کئے جانے کے سنگین ترین جرم کے سبب ایک ایسا ہلاکت خیز طوفان آیا الامان والحفیظ!!! اپنے دور کی دو عظیم سلطنتیں ایسی تاخت و تاراج ہوئیں کہ آنے والے ہر دور میں نشان عبرت کے طور پر یاد کی جانے لگی، لاکھوں بے گناہ انسان تہہ تیغ کر دیئے گئے اور لاکھوں لاکھ خانماں برداد ہو گئے۔ صرف یہ ایک ہی مثال نہیں بلکہ ہر دور میں مختلف علاقوں اور مختلف اقوام و ملل کے تاریخی وقائع ان حقائق پر شاہد عدل اور تاریخ کے صفحات پر قوموں کی آبادی و بربادی، عروج و زوال کی بے شمار دل خراش داستانیں رقم ہیں۔

بالفاظ مختصر ذرائع ابلاغ کو حدود و قیود اور سخت قسم کے قانون کی جکڑ بندیوں اور ضابطۂ اخلاق کے دوائر میں رکھنا بقائے امن کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ جیسے کسی خونخوار شیر کو پابہ زنجیر رکھنا۔ جب جب اس شعبہ کو آزاد چھوڑا گیا تب تب امن عامہ میں اختلال کی روز بروز نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں، جس سے ثابت ہوا کہ ابلاغ میں دروغ گوئی کے سبب انسانیت کو اکثر اوقات انتہائی سنگین نتائج بھگتنے پڑ جاتے ہیں جس کے نقصانات اور خوں آشام مضرتوں کا سلسلہ بسا اوقات نسلوں اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے اور لمحوں کی خطا کی سزا صدیوں کو جھیلنی پڑتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے تاریخ کا بغور مطالعہ اور اپنے ہی ارد گرد ہر پل نت نئے پیش آنے والے واقعات کا بصیرت کے ساتھ مشاہدہ ہی کافی ہے۔ اقوام و ملل کی تاریخ میں واقعات شاہد عدل ہیں۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر، لمحہ بہ لمحہ "پیش آنے

والے'' یا ''پیش کیئے جانے والے'' واقعات اصول شرافت و دیانت سے عاری ابلاغ وصحافت کی دروغ گوئیوں کا ایسا گورکھ دھندہ ہیں اور منظر نامہ کچھ یوں ہے ع

ہیں کواکب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ

گذرے دور میں مثل مشہور تھی کہ کانوں سنے کا یقین نہ کرے بلکہ آنکھوں دیکھے پر اعتماد کرے، لیکن عہد حاضر میں متنوع ذرائع ابلاغ کے ہلاکت خیز ارتقاء اور اس کے دروغ باف استعمال نے اس مثل کو بھی فرسودہ کیا ہے، قطعاً ضروری نہیں کہ آج کے دور میں جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں یا دکھایا جا رہا ہے وہ سب کچھ صحیح ہو، پیش نظر کی حقیقت کا بسا اوقات پس منظر نوعیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے، اسی دجل آمیز ہنر کو اصول صحافت کے سرنامے سے سجا کر رکھا گیا ہے۔

اس طویل ترین موضوع کے مختصر ترین اقتباساتی بالائی سطور کی روشنی میں دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ ہی دراصل مقصد تحریر کی کلید ہے۔ حیات بنی نوع انسانی کے اس بے انتہا اہم اور حساس موضوع پر دین اسلام میں بہت ہی روشن اور واضح تعلیم و ہدایات موجود ہیں۔ اگر صحافت و ابلاغ میں ان زرّیں اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دیانت کے ساتھ اپنے فریضہ کو انجام دیا جائے تو آج کے اس دورِ انحطاط میں بھی دنیا کو امن وسکون کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے اگرچہ یہ بات دیگر ہے کہ اخلاص و دیانت اور امن و امان کے دشمنوں کے تمام تر کاروبار کی بنیاد ہی انتشار و افتراق پر رکھی ہے اور خالص مفاد پرستانہ ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے بظاہر اسباب حقیقت کی دنیا میں اس خواب کی تعبیر کے معرض شہود پر آ جانے کی آرزو اگرچہ دیوانے کے خواب یا نقار خانے میں طوطی کی آواز کے ہی مترادف ہے لیکن ''ایک پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' کم از کم دل کی خلش کو کسی درجے میں یک گونہ سکون تو۔۔۔۔ کی سعی کا تو عنوان دیا جا سکتا ہے، کوئی بھی ہوش مند انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ صحافت کسی قوم کی تعمیر و ترقی، تخریب و تنزلی، بلندی فکر و شعور، پستی و ابدا منی، اک روشن و تابناک خواب کا شرمندۂ تعبیر کرنے

میں مؤثر کردار اور قوم کی اجتماعی محنتوں کے نتیجے میں روشن منصوبوں کو لمحوں میں تیرہ و تاریک کردینا، غرضیکہ صحافت وابلاغ میں تعمیر وتخریب دونوں کی بھرپور صلاحیت اور اس کی اثر انگیزیوں کے رموز پوشیدہ ہیں اور آج کے گلوبلائزیشن کے دور میں اصول، دیانت وامانت کے تمام مذہبی و اخلاقی، معاشرتی وسماجی اصولوں سے آزاد خالص تاجرانہ بنیادوں پر برسرِعمل میڈیا سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کی ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گیا جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحافت کا بنیادی نقطہ اور محورِعمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، بالفاظ دیگر اچھائی کے فروغ اور برائی کی روک تھام کے لئے قلمی، فکری، علمی اور عملی صلاحیتوں کے ذریعہ مثبت سوچ کے فروغ کی اور ذرائع ابلاغ کے استعمال کی جدوجہد کرنا ہی صحافت کا بنیادی فریضہ ہے اور واقعتاً یہ اس قدر عظیم الشان اور رفیع المرتبت فریضہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریحات وتشریحات کے مطابق فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بجا آوری ہی تمام انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بنیادی مقاصد کے اہم ترین اجزائے ترکیبی کا جزوکلید ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحافت کس قدر مقدس میدان عمل ہے اور چوں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی اسلامی صحافت کا بنیادی مقصد ہے اس لئے ایک داعی حق کی جو صفات قرآن وسنت سے معلوم ہوتی ہیں وہ تمام صفات ایک مسلم صحافی میں پائی جانی چاہئیں۔

بنیادی طور پر یہاں ایک سوال کا پیدا ہونا ایک فطری تقاضہ ہے کہ صحافت کا بنیادی مقصد محض اچھائیوں کا فروغ اور برائی کی روک تھام نہیں ہے بلکہ بروقت صحیح معلومات فراہم کرنا اور تازہ ترین سچی خبریں مہیا کرنا صحافت کا بنیادی رکن ہے۔ یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ صحیح معلومات اور خبروں سے قارئین وناظرین کو آگاہ وباخبر کرنا ہی صحافت کا بنیادی مقصد وفریضہ ہے لیکن بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہر خبر اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے خبر ہو لیکن اس کا مقصد حقیقت میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی ترغیب ہوتا ہے۔ علیٰ سبیل المثال اگر میڈیا آپ کو خبر

دیتا ہے کہ آپ کے پڑوسی ملک نے فلاں فلاں اہم ترین ٹیکنالوجی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے تو یہ محض ایک خبر یا اطلاع نہیں بلکہ بنیادی طور پر آپ کے لئے پیغام ہے کہ آپ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس جیسی یا اس سے اعلیٰ ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ بصورت دیگر علاقائی طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور اسی فریضہ کی ادائیگی کا نام امر بالمعروف ہے کہ اس خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لئے آپ کو مناسب انتظام کرلینا چاہئے۔ لہٰذا سچی خبریں بروقت فراہم کرنے اور صحیح معلومات بہم پہنچانے سے بھی مآل کار امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان صحافی کو ان تمام اوصاف وکمالات کا نمونہ ہونا چاہئے کہ قرآن و سنت میں داعیٔ حق کے لئے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان میں بنیادی بات یہ ہے کہ داعیٔ حق کو ناسازگار حالات سے دل گیر و مایوس ہوکر اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ حق بات کو کہنے اور پھیلانے کی کوشش انتہائی مایوس کن ماحول میں بھی جاری رکھنی چاہئے، کیوں کہ اچھائی کے فروغ کے لئے کی جانے والی جدوجہد رائیگاں نہیں جاتی ہے، جلد یا بہ دیر اس کا اثر ہوکر رہتا ہے، بشرطیکہ اس عظیم ذمہ داری کی تمام نزاکتوں کا خیال رکھا جائے۔

انقلابِ شام
خوں آشامی سے تشکیل نو کا آغاز

اسلام ایک زندہ، تابندہ آفاقی اور ہمہ گیر مذہب ہے، یہ انسانوں کی ابدی سعادت، دنیا و آخرت کی سرفرازی، اور خوش انجامی کا ضامن، روحانی، جسمانی، فکری، عملی، ہر قسم کی طمانیت، وسکینت کا وہ آب حیات ہے کہ جس سے تشنہ لب انسانیت کو سیرابی، اور نیم جان بشریت کو زندگی ملتی رہی ہے یہ وہ دین فطرت ہے کہ جو تمام غیر فطری اور خود ساختہ ادیان پر غالب آ کر رہے گا خواہ پوری کائنات انسانی بدنصیبی سے اس کا راستہ روکنے اور اس کی برکات وخیرات اور پاکیزہ اثرات کو کم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لے۔

یہ حقیقت میں خدائی دین ہے، جو اپنے ساتھ خدائی طاقت اور خدائی نصرت لے کر آیا ہے کوئی شیطانی حکومت کوئی فرعونی سلطنت اور کوئی طاغوتی طاقت اس کا بال بانکا نہیں کرسکتی، جس طرح یہ ممکن ہی نہیں کہ غیر خدائی دین کو اپنے پھولنے پھلنے اور پنپنے پھیلانے میں خدائی نصرت حاصل ہو اسی طرح سے یہ بھی ممکن نہیں کہ خدائی دین ہو اور خدائی نصرت سے محروم ہو۔

ہاں یہ عین ممکن ہے کہ خدائی دین کے ماننے والوں میں ایسی خرابیاں اور مفاسد پیدا ہو جائیں کہ ماننے والے اس خدائی نصرت سے محروم ہو جائیں جو دین کو صحیح معنی میں

۞ تقریظ: ''انقلابِ شام، عالم اسلام کی تشکیل نو کا آغاز'' از: ابوتراب ندوی

اور مکمل طور پر قبول کرنے میں حاصل ہوتی ہے اور غیر خدائی نظام کو قبول کرنے والوں میں وہ سچائیاں اور وہ صفات پیدا ہو جائیں کہ جو حقیقت میں خدا کے دین کو ماننے والوں میں ہونی چاہئیں، اور ان کی وجہ سے غیر خدائی نظام کے ماننے والے، بڑھتے اور چڑھتے ہی چلے جائیں، آج پوری دنیا میں اسلام کے ماننے والے کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں: شام جو قبلہ اول کی اور اکثر انبیاء کی سرزمین ہے:

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں سرزمین شام کے مغرب ومشرق کو بابرکت کہا ہے سورہ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ". (۱)

اور جن لوگوں کو کمزور سمجھا جاتا تھا، ہم نے انہیں اس سرزمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنادیا جس پر ہم نے برکتیں نازل کی تھیں۔ اور بنی اسرائیل کے حق میں تمہارے رب کا کلمہ خیر پورا ہوا، کیوں کہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم جو کچھ بناتی چڑھاتی رہی تھی، اس سب کو ہم نے ملیامیٹ کردیا۔

ابن کثیر آیت کریمہ کے اس حصہ کی "اس سرزمین کے مشرق ومغرب کا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا ہے" تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: قتادہؒ اور حسن بصریؒ کے نزدیک روئے زمین کا وہ حصہ جس کے مشرق ومغرب سب بابرکت بنائے گئے ہیں سے مراد "شام" ہے۔

سورہ "اسراء" میں ارشاد ہوتا ہے:

"سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ

(۱) سورۃ الاعراف: ۱۳۷

الْبَصِیْر"۔[۱]

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے۔"

قرآن کریم نے اسراء ومعراج کے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بیت المقدس اور اس کے گرد ونواح کے علاقہ کو بابرکت کہا ہے، یہی سرزمین ابراہیم ولوط علیہما السلام کی منزل ہجرت تھی، سورہ انبیاء میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ،وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا لِلْعَالَمِيْنَ"۔[۲]

ان لوگوں نے ابراہیم کے لیے برائی کا منصوبہ بنایا تھا، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے انہی کو بری طرح ناکام کردیا۔ اور ہم انہیں اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے دنیا جہان کے لوگوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔

ابن کثیر بیان کرتے ہیں:

"يقول تعالى مخبرا عن إبراهيم أنه سلمه الله من نار قومه و أخرجه من بين أظهرهم مهاجرا إلى بلاد الشام إلى الأرض المقدسة منها".

اللہ تبارک وتعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ اللہ نے انہیں اپنی قوم کی آگ سے بچالیا اور انہیں ان کے بیچ سے نکال کر شام کو ہجرت کرایا، اس کی مقدس سرزمین کی طرف۔

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ "إلى الأرض التى باركنا فيها للعالمين" اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں،

(۱) سورۃ الاسراء:۱

(۲) سورۃ الانبیاء:۷۰-۷۱

سے مراد شام ہے۔ (۱)

”وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ، وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ، وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ“. (۲)

قسم ہے انجیر اور زیتون کی، صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی۔ اور اس امن وامان والے شہر کی۔

بعض علماء تفسیر، کے نزدیک ”التین“ (انجیر) سے مراد دمشق (سیریا) کی راجدھانی ہے اور ”الزیتون“ سے بیت المقدس، اس لیے کہ دمشق انجیر کے لیے جانا جاتا ہے تو بیت المقدس زیتون کے لیے مشہور رہے، ان دونوں پھلوں سے دومقامات کی طرف اشارہ اس آیت سے نکلتا ہے، جس میں دیگر دو مقامات کا ذکر آتا ہے، وہ ہیں طور سینا جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملی اور بلد الامین ”مکہ“ جو قبلہ اسلام ہے۔

پھر مختلف احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کرۂ ارضی پر مکہ و مدینہ کے بعد سب سے زیادہ فضیلت اللہ نے اسی خطہ کو بخشی ہے، حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”یا طوبی للشام، یا طوبی للشام، قالوا: یا رسول الله! و بم ذلك؟ قال: تلك ملائكة الله باسطو أجنحتها على الشام“. (۳)

عبداللہ بن حوالہ ازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”ستجندون أجنادا، جندا بالشام، و جندا بالعراق، و جندا باليمن“، قال عبدالله: فقمت، قلت: خِر لي يا رسول الله! فقال: و عليكم بالشام، فمن أبى فليلحق بيمنه، و ليستق من غدره، فإن الله -عز وجل- قد تكفل

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، ج۵، ص:۳۵۳

(۲) سورۃ التین: ۱-۴

(۳) فضائل الشام و دمشق، ج۱، ص:۴

لی بالشام و أهله“.(۱)

(آخری زمانہ میں) تمہاری مختلف فوجیں ہوں گیں، ایک شام میں، ایک عراق میں اور ایک یمن میں، تو حضرت عبداللہ نے پوچھا: یارسول اللہ مجھے کس فوج کو اختیار کرنا چاہیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ شام کی فوج میں شامل ہونا، اور جو یہ نہ کر سکے تو وہ یمن کی فوج سے جا ملے، اور ان کے چشموں کا پانی پیئے، (ان کے ساتھ بودو باش اختیار کرے) ویسے اللہ نے میرے لیے (یعنی دین اسلام کے لیے) اہل شام (کے اخلاص ووفا) کی گارنٹی دی ہے، ابوداؤد اور احمد کی روایت میں صحیح سند کے ساتھ یہ اضافہ ہے:

علیك بالشام، فإنها خیرة اللّٰه من أرضه، یجتبي إلیها خیرته من عباده.(۲)

تم شام کی فوج میں شامل ہوجانا، اس لیے کہ شام اللہ کی اس روئے زمین کا بہترین حصہ ہے، جہاں اللہ کے نیک بندے سمٹ کر جمع ہوجائیں گے۔

ربیعہ کہتے ہیں کہ ابوادریس نے اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اللہ نے جس کی گارنٹی دی ہو، وہ ضائع نہیں ہوسکتا۔

العزابن عبدالسلام کہتے ہیں کہ یہ گواہی ہے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شام اور اہالیان شام کے شرف وفضیلت اور اس خطہ میں جا کر بسنے پر۔

حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”الشام أرض المحشر و المنشر“ (۳) شام محشر ومنشر (نشرگاہ) کی سرزمین ہے۔ یعنی قیامت سے پہلے لوگ اسی ملک میں جمع ہونے کی کوشش کریں گے، یا مجبور ہوں

(۱) ملتقی أهل اللغة، ج۱۰، ص۸۹۱

(۲) سنن أبي داؤد، کتاب الجهاد، باب في سکنی الشام، ج۱، ص:۳۳۶، رقم:۲۴۸۳

(۳) فضائل الشام و دمشق ج۱، ص:۶

گے، اہل ایمان اس لیے کہ یہی سرزمین حق و باطل کے بیچ معرکہ آرائی کی رزم گاہ ہوگی اوراہل باطل حضرموت کی آگ کی وجہ سے، جو قیامت سے قبل نمودار ہوگی اورلوگوں کا پیچھا کرے گی یہاں تک کہ لوگ صرف شام کی طرف ہی جائے پناہ پائیں گے جیسا کہ دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک مشہور روایت ہے کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”إني رأيت الملائكة في المنام أخذوا عمود الكتاب، فعمدوا به إلى الشام، فإذا وقعت الفتن فإن الإيمان بالشام“.(۱)

میں نے خواب میں دیکھا کہ فرشتے عمودالکتاب (یعنی ایمان) کو میرے تکیہ کے نیچے سے نکال کر لے گئے اور اسے شام میں ڈال دیا، جب فتنوں کا ظہور ہوگا تو ایسے وقت میں ایمان شام میں ہوگا۔

علماء کہتے ہیں کہ جب فتنے سر اٹھائیں گے اور مسلمان ان فتنوں کا شکار ہونے لگیں گے،تو اہل شام حقیقی ایمان پر قائم ہوں گے،اس مضمون کی ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

”إذا فسد أهل الشام فلا خير فيكم، لا تزال طائفة من أمتي منصورين، لا يضرهم من خذلهم حتى تقوم الساعة“۔(۲)

اگر اہل شام بگڑ گئے تو پھر تم میں کوئی خیر باقی نہ رہے گا، وہاں ہمیشہ ہی ایک گروپ برسرپیکار رہے گا، اللہ کی فتح ونصرت ان کے ساتھ ہوگی، انہیں کسی کی پروانہ ہوگی کہ انہیں کون رسوا کرتا ہے یہاں تک کہ قیامت برپا ہوگی۔

(۱)فضائل الشام و دمشق ج۱،ص:۱۳

(۲) جامع الترمذي، أبواب الفتن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الشام، ج۲،ص۴۳،رقم:۲۱۹۲

ملک شام اس وقت جن خون آشام معرکہ آرائیوں سے گزر رہا ہے دنیا کے سامنے کی جو صورت حال ہے، آج کسی سے بھی مخفی نہیں۔ ''**انقلاب شام عالم اسلام کی تشکیل نو کا آغاز**''، سرزمین شام کے انقلاب کے مذہبی و تاریخی جائزہ، احادیث صحیحہ میں شام کی فضیلت اخیر زمانہ میں رونما ہونے والے حادثات، مسجد اقصیٰ، صہیونی سازشیں، صلیبی معرکہ آرائیاں، اور بہت سے اہم موضوعات پر تحقیقی و تاریخی مباحث کے تعلق سے اپنے آپ میں ایک اہم علمی و تحقیقی کتاب ہے۔

فاضل مرتب مولانا ابوتراب ندوی صاحب نے بڑے سلیقہ اور صلاحیت سے ہر موضوع پر معتبر مصادر کے حوالوں سے بحث کی ہے، جس کی وجہ سے کتاب ہذا اپنے موضوع پر انفرادی اور دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

کتاب کا مقدمہ جناب محترم پروفیسر محسن عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے موصوف کو شام کے احوال پر تحقیقی آگہی حاصل ہے اس لیے جو کچھ بھی لکھتے ہیں پوری آگہی اور بصیرت کے ساتھ لکھتے ہیں اس سے بھی کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

بحیثیت مسلمان، ہر مسلمان کا اولین فریضہ تو یہ ہے کہ روئے زمین پر جہاں کہیں بھی مسلمان کسی آزمائش اور کلفت سے دوچار ہوں، ان کے درد میں شریک ہوں ظاہر ہے کہ ہر ایک کے لیے عملاً یہ صورت ممکن نہیں، کم از کم یہ تو ہر ایک کے لیے ممکن ہے کہ اس درد کو محسوس کرے اور دعاء گو ہو کہ اہل اسلام جہاں کہیں، جس قسم کی آزمائش سے دوچار ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کی نصرت فرمائے، اور سربلندی نصیب کرے۔

شام کے موجودہ احوال سے ہر مسلمان اپنے دل میں ایک درد قلق اور کسک محسوس کرتا ہے۔ جو اس ایمانی حرارت اور اسلامی حس کا خاصہ ہے جو ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ ایمانی حرارت اور اسلامی حس قلب کی حرکت اور خون کی گردش کو تیز کر دیتی ہے، یہ کتاب حقیقت میں شام کے خون آشام اوضاع و احوال کو دیکھنے کے لیے ایک شفاف آئینہ کا کام کرتی ہے، جو دھندلی روشنی میں بھی

چہرے کے مدہم نشانات اور خدوخال کو نمایاں کرنے کا کام کرتا ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ سرزمین شام اور اہل شام کو اعدائے اسلام کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ فرمائے، مؤلف کتاب کو اجر جزیل اور تالیف کو قبولیت عامہ نصیب کرے۔ (آمین)

مومن ہے تو دامانِ محمد میں پناہ لے

گذرتے عہد کے منظرنامے کا اگر عالمی سطح پر ہمہ جہت اور تیز رفتار تبدیلیوں کے تناظر میں بصیرت افروز اور مدبرانہ جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار ارتقائی پرواز اور اس کے نتیجہ میں کمپیوٹر اور سیٹلائٹ کے وسائل سے پیدا کردہ گلوبل ویلیج میں ایک نئے اور منصوبہ بند رجحان کے زیر اثر ایک نئے استعمار کو جنم دیا جارہا ہے اور یہ کالونائزیشن (Colonisation) جس کے تشویش انگیز حد تک نہایت گہرے فکری اور منطقی نتائج نے نوجوانوں کے فکر و اثر اور ان کے نظریۂ تہذیب کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے جس کو میڈیا کی حد درجہ اثر انگیز اور زبردست ابلاغی قوت و وسعت کی مکمل حمایت و سرپرستی حاصل ہے اور اسی کے ذریعہ نوجوان سوچ کو جس طرف چاہتے ہیں موڑ دیا جاتا ہے، جس قاتل کو جب چاہتے ہیں امن کا سفیر بنا کر پیش کردیا جاتا ہے اور جس کو چاہتے ہیں نت نئے سرٹیفکٹ جاری کر کے بنیاد پرست متعصب دہشت گرد انتہا پسند جیسی من گھڑت فرضی اور بے اصل اصطلاحات چسپاں کر کے دنیا میں نہ صرف بدنام بلکہ الگ تھلگ کردینے کی کوششوں میں اپنی تمام تر ذہنی فکری اور جسمانی قوت لگادی جاتی ہیں، انسانیت کی نگہبانی کا خوشنما عنوان لگا کر انسانیت نوازی کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی یہ سیاہ رو قوتیں جس نئے استعماری اور دجالی نظام سے عالم کو روشناس کرا رہی ہیں اس کا

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دارالعلوم وقف (شوال المکرّم / ذیقعدہ ۱۴۴۳ھ مطابق مئی / جون ۲۰۲۲ء، جلد: ۱۳، شمارہ: ۱۳۶ / ۱۳۷)

منتہائے مقصود دراصل عالمی سطح پر ایک ایسی حکمرانی اور غلبہ کا خواب ہے جس میں طویل مدتی منصوبہ بندیوں کی جد و جہد کی عملی تکمیل کی خواہش اور اہداف تک جلد سے جلد رسائی کے لیے گذشتہ چار صدیوں کی تعمیری محنتوں اور تخریبی کوششوں کا رنگ شامل ہے، اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کو اس میں اساسی حیثیت حاصل ہونے کے ساتھ مقصدی اہمیت کے تناظر میں جنگ عظیم اول جنگ عظیم دوم کے علاوہ اس دورانیہ میں دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں تسلسل کے ساتھ کہیں مذہب کی بنیاد پر تو کہیں قومیت کی اساس پر، کہیں لسانی و تہذیبی اختلاف اور ٹکراؤ کو بہانہ بنا کر دنیا کو جنگوں میں مصروف رکھنا اور خون آلود انسانیت پر زبردست کاروباری منفعتوں کے ایمپائر کھڑے کرنے کے ساتھ دنیا میں آبادی کے تناسب کو اپنے مقررہ پیمانوں کے مطابق متوازن رکھنا اور اس خون آلود سسکتی تڑپتی انسانیت پر نظام دجالیت کی بنیادوں کو استوار اور مستحکم کرنے جیسے متعدد مقاصد کے نفاذ کی مساعی دراصل اسی پلاننگ کا حصہ ہیں اور اس خوں آشام نظام فکر و عمل اور عالمی سطح پر جگ روشن نتائج و مظاہر کی اگر بات کی جائے تو قول و عمل کے دوہرے معیارات، انسانیت سوز اقدامات، خود ساختہ بیماریوں کا پھیلاؤ، اور اس سے وابستہ مختلف الانواع نیز دور رس نتائج کو محیط ناقابل تصور منفعتیں، دراصل اسی استعماری سوچ اور نیو ورلڈ آرڈر (New World Order) کے زیر اثر ایک نظام فکر و عمل کے تحت ایک عالمی حکمرانی کی منصوبہ سازیوں کے ہی ترکیبی عناصر کے مختلف رنگ و آہنگ ہیں، اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ان سیاہ رو شیطانی قوتوں اور ان کے اہداف کے درمیان اگر کوئی سد راہ ہے تو وہ اسلام ہی ہے جس کے دامن میں دنیا کے ہر عہد و قرن کے تمام مسائل کے منصفانہ اور سہل العمل حل کی قوتیں موجود ہیں، معاشرت، معیشت، ریاست، سیاست، اقدار و روایات، تہذیب و تمدن، حرب و ضرب، امن و جنگ غرض دنیا کا کوئی اہم و غیر اہم مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے حوالے سے اسلام میں راہنما اصول نہ پائے جاتے ہوں، ایسے کامل و مکمل مبنی بر انصاف اور فطرت انسانی سے مطابقت رکھنے والے منزل من اللہ نظام عمل کی موجودگی اولیاء

الشیطان کی نظروں میں ہمیشہ خار اور اہداف کے حصول اور ظالمانہ اغراض میں رکاوٹ سمجھی جاتی رہی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ حیات انسانی کے ہر گوشۂ عمل کو محیط اور بلا قید عہد و قرن فطرت انسانی کے تقاضوں سے ہم آہنگ اسلامی نظام کے عالمی نفاذ کے خطرات سے خوف زدہ ہیں جو ان کے عالمی حکمرانی کے قیام میں رکاوٹ کا باعث ہے، اور اسلام کے برخلاف جنوں خیز کاروائیوں کی بنیادی علت دراصل لاشعوری طور پر ان کی خوفزدگی اور اس کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے برخلاف منصوبہ بند شدت پسندانہ پے درپے اقدامات اور ردعمل کے طور عالمی سطح پر قبولیت اسلام کے رجحانات میں اضافہ کے تکوینی اسباب حقائق بھی اسی عالمی کشمکش میں پوشیدہ ہیں، نائن الیون برپا کیے جانے کے تخریبی مقاصد کے علی الرغم یورپ امریکہ آسٹریلیا کے علاوہ دنیا کے متعدد ممالک میں علی رؤوس الاشہاد رجوع الی الاسلام کا شعوری اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے جس میں اکثریت کا تعلق نوجوان نسل سے ہے، اطلاعات کے مطابق مذکورہ ممالک میں کلام اللہ اور کتب سیرت مطہرہ کی طلب میں حیرت انگیز اضافہ درج کیا گیا ہے جس کا تسلسل آج بھی باقی ہے۔

حاصل یہ کہ اسلام اور باطل قوتوں کی یہ آویزش کوئی نئی نہیں ہے بلکہ اس کا آغاز تو طلوع اسلام کے لحظۂ اول سے ہی ہو چکا تھا جب کہ رسول آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ کوہ صفا سے توحید خالص کی بنیاد پر اسلام کے نظام عمل کی خشت اساس کو اقراء سے متعارف کرایا تھا تو طبقۂ اولیاء الشیطان کے اس دور کے سرخیل ابوجہل وابولہب اور ان کے ہمنواؤں نے مکہ میں اپنی جابرانہ اور ظالمانہ عملداری کے من چاہے نظام واہداف کے لیے خطرے کی بو کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ ہر گذرتے عہد کے ساتھ وقت یہ ثابت کرتا رہا کہ باطل نظام کے مقابل اسلام کا منصفانہ نظام ان کے لیے زلزلہ انگیز ہے جس کی براہ راست زد ان کے مفادات پر پڑتی ہے، یہ ضرور ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ شکل وعمل اور طریقے بدلتے رہے لیکن نظام اسلام اور شعائر اسلام کو کسی بھی طور تباہ و برباد کر دینے کی خواہش و جذبات اور کوششوں میں کبھی کوئی فرق واقع نہیں ہوا، صرف وقت اور عہد بدلے ہیں

مطالبات ہمیشہ اپنی مکمل یکسانیت کے ساتھ اسی طرح قائم رہے ہے، اللہ کے رسول حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے قرآن کریم شہادت پیش کرتا ہے: وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا. (۱) اور کہا ان لوگوں نے جو کافر ہوئے تھے اپنے رسولوں سے ہم لازماً نکال باہر کریں گے تمہیں اپنی زمین سے یا تمہیں لوٹنا ہوگا ہمارے دین میں، کیا فرق ہے شدھی کرن کا یہی مطالبہ تو آج بھی ہے گھر واپسی کرلو یا ہمارے ملک سے نکل جاؤ، بہرحال تبدیلیٔ وقت کے ماسوا عمل اور ردعمل میں کبھی کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے، مثلاً کسی بھی تحریک کو فنا کرنے کے لیے اولین ہتھیار تضحیک وتذلیل اور استہزاء اور عدم توجہ کا ہے، دوسرا لالچ وطمع کے وسائل کو بروئے عمل لانے کا ہے، تیسرا سازشیں رچنے بدنام کرنے اور خوف ودہشت میں مبتلا کردینے کی کوششوں کا ہے اور چوتھا ہجوم وحملہ آوری کا ہے، اسلام کے لمحۂ اول کے آغاز میں رسول آخرالزماں مصطفیٰ ومجتبیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوہ صفا سے توحید ربانی کے پہلے اعلان کا ردعمل اس دور کے اولیاء الشیطان بوجہل و بولہب اور ہمنواؤں کی جانب سے تضحیک وتمسخر اور تذلیل و مذاق و دل لگی کی صورت میں سامنے آیا، کسی نے العیاذ باللہ جنات کا سایہ تجویز کیا تو کسی نے علامات جنوں اور مرگی کا دورہ قرار دے کر علاج کا مشورہ دیا، تحریک اسلام کے بال و پر مؤثر انداز میں نمایاں ہونے پر دوسرا ردعمل طمع و لالچ کے بشری تقاضوں کے زیر اثر حسب خواہش مال وزر، اقتدار ومناصب اور قبیلۂ قریش یا دیگر قبائل کی حسب منشاء وپسند کسی بھی خوبرو خاتون سے نکاح کی پیشکش اور اس کے جواب داہنے ہاتھ پر چاند اور بائیں ہاتھ پر سورج رکھ دینے جیسے مسکت جواب کے ساتھ سنگ وآہن سے مضبوط عزم وپختگی کے ساتھ نظام الٰہی کے قیام کے لیے عزم بالجزم کا اظہار، تیسرا مرحلہ مختلف سازشوں کے ساتھ ساتھ ان کے اعوان وانصار پر ہیبت ناک تشدد وبربریت کے مظاہرے سماجی ومعاشرتی بائیکاٹ، شمشیر بدست تلاش اور جان سے ماردینے کی تدابیر اور اس کے ردعمل میں بحکم علیم وخبیر

(۱) سورۃ ابراہیم: ۱۳

ہجرت کے لیے پا بہ رکاب ہو جانا، اور پھر چوتھا ردعمل غزوات وسرایا اور ہجوم وحملہ آوری سے عبارت تاریخ کا تسلسل ہے، غرض کہ عہد ووقت کوئی بھی رہا ہو مد مقابل باطل قوتوں کے نہ حق کو فنا کر دینے کے جذبے خواہش اور کوششوں میں کبھی کوئی فرق آیا اور نہ مذکوہ طریقۂ عمل کی ترتیب ہی بدلی، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں اسلام کی متعدد ومختلف محسن شخصیات کے احوال وسوانح اس حقیقت کی صداقت پر شاہد ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی ایک سچائی ہے جس کو امام الہجرۃ حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ کے معروف قول لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا کی روشنی میں اس مختصر تعبیر سے مفصل انداز میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر اسی طریقے پر جس پر کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی، چنانچہ عہد رواں میں اسلام کے آفاقی پیغام کو عملا برپا کرنے کے لیے لامحالہ اولاً ہمیں پہلے خود کو نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی سیرت اور حیات طیبہ کے سنجیدہ اور شعوری مطالعہ کی طرف التزاما رجوع کرنا ہوگا اور تمام تر قوتوں کو اسی منبع وسوت سے فکری اور دفاعی قوت حاصل کرنا ہوگا بعدازاں اپنی نوجوان ونوخیز نسل کی تربیت سیرت النبی کی پاکیزہ روایات اور انہی پاک خطوط کی روشنی میں انجام دینے کے عزم وارادے کی پختگی کو عملی قوت فراہم کرنے کے حوالے سے زندگی کا اولین اور ترجیحی مقصد وفریضہ قرار دے کر عہد حاضر کی ہجوم انگیز یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر ومصابرت کے نہج سے آغاز کرنا ہوگا، چنانچہ آج ہمارا معاشرہ جن شدائد اور عناد ومسائل سے دوچار ہے اس کے لیے جہاں ایک طرف حل کی تحقیق کرنی ہوگی وہیں اس کے نفاذ کے عملی راستوں کو ہموار کرنے کے لیے ترجیحی بنیاد پر اولا اپنی ذات کے نقائص کا خود احتسابی کے ساتھ ادراک بھی کرنا ہوگا اور اصلاح ذات کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پھر قرآنی اصولِ اصلاح وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الاقربین کی طرف قدم بڑھانا ہوگا، مختصر یہ کہ حیات انسانی کا کون سا اہم وغیر اہم پہلو ایسا ہے جس کی عملی تطبیق کا نمونہ ہمیں سیرت میں نہ ملتا ہو کیونکہ ازروئے شہادت قرآن وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۱)

(۱) سورۃ القلم: ۴

ی بنے جس نے کہ قرآن کے
م کو عزت بخشی۔
ر باراس اہم اور قابل ذکر پہلو کا
والے دوررس نتائج کے لحاظ سے
ہے کہ اس کی تعلیمات اور اصول و
سطہ نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس
نسانی مسائل کا معتدل بامعنی اور
یم ایک ایسے صلح جو اور امن پسند
ائی اور باہم میل جول اور الفت و
و مختلف انداز و پیرائے میں بیان
، یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنا
ات قرآنی اور اس کی عملی تفسیر نبیؐ
تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ
رِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱) اور

زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے دعا کرو، بے شک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں سے قریب ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۱)

اورلوگوں کی چیزیں کم نہ کرواور زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے حد سے تجاوز نہ کرو۔

واللّٰہ لایحب المفسدین. اور اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

لب لباب یہ ہے کہ سیرت طیبہ کا شعوری مطالعہ جہاں ایک طرف ہمیں معاشرتی زندگی میں ہر طرح کے تعصب اور انتشار سے پاک ماحول بنانے کی راہنمائی فراہم کرتا ہے ساتھ ہی ایسے ہر عمل سے اجتناب کرنے کی ترغیب دیتا ہے جس سے معاشرے میں انتہا پسندی کو جگہ مل سکے لہٰذا انسانیت کا دین ہونے کے ناطے اسلام تمام انسانوں کو اجتماعیت میں پرونا چاہتا ہے اور اسی تناظر میں عدل اجتماعی کو اسلام کی روح قرار دیا گیا ہے، حاصل کلام یہ ہے تعلیمات قرآنی سے غفلت اور درخشاں سیرت مطہرہ سے لاعلمی کے نتیجہ میں موجودہ دور کے ذہنی انتشار، فکری پراگندگی اور پریشاں حالی کے موجودہ ماحول میں شعائر اسلام کی عملی حفاظت میں ہی سکون قلب مضمر ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین

---

(۱) سورۃ الشعراء:۱۸۳

حکمت و فلسفہ

فتنۂ ہم رنگ زمیں

کتنی حقیقت-کتنا فسانہ؟

ہندوستان کے ہمہ رنگ معاشرے میں آج بھی بلا تفریق مذاہب ومسالک باشندگان وطن کی اکثریت وہ ہے جو کہ اجتماعی شعور کی سطح پر عصر حاضر میں ملک کے لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر سیاسی احوال، اس کے مفاسد ومضرات، مسائل وعزائم اور دوررس نتائج کو لے کر فکر مند ہے، اس تہذیبی کشمکش کو بنیاد بنا کر اپنے مذموم سیاسی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے والے اگرچہ اقلیت میں ہیں تاہم وسائل کی کثرت کے سبب بہرحال کسی نہ کسی طور اثر انداز ہو رہے ہیں، اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منفی سوچ اجتماعی سطح پر نہ ہی تو زیادہ دیر تک مؤثر ہوتی ہے اور نہ ہی زندگی کے رخ پر کوئی فیصلہ کن اثر مرتب کر پاتی ہے۔ اگرچہ وقتی طور پر کامیاب ہی کیوں نہ نظر آ رہی ہو، تاہم ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ معاشرے میں نفرت وتفریق کے جو بیج بوئے جا رہے ہیں اس کے پس پردہ عزائم ومقاصد کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے، اپنی اپنی سطح و قدرت کے بقدر ملت اور برادرانِ وطن کو پیش آمدہ اور متوقع خطرات سے باخبر کرنے کے فرض کو محسوس کیا جائے، یہ دینی حمیت، ملی غیرت اور حب وطن کا بھی تقاضا ہے کہ مذہبی، تہذیبی اور لسانی اختلافات کو فکر ونظر کے اختلاف کے دائرے میں ہی محدود رکھا جائے تاکہ ان اختلافات کو آڑ بنا کر مذموم سیاسی مقاصد حاصل کرنے والوں کی سوچ و

۞ اداریہ: ماہ نامہ ندائے دار العلوم وقف (جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ مطابق اپریل ۲۰۱۶ء، جلد: ۷، شمارہ: ۲)

عمل پر قدغن لگ سکے۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک کلمہ پر ایمان رکھنے والے بہرحال ایک امت ہیں، ظاہر ہے کہ اتنی مضبوط اقدار کے بعد فقہی و مسلکی اختلافات کو فکر و نظر کے اختلاف تک محدود رکھنا وقت اور دورِ حاضر کے احوال کا بھی تقاضہ ہے اور دانش مندی کا بھی مطالبہ ہے۔

دوسرے یہ کہ امت کا اندرونی مسئلہ ہے، بیرونی طاقتیں جو اتحاد امت کی ان بنیادوں کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہیں، اس کے مضرات کو دوطرفہ اہل فکر و نظر علماء و مشاہیر خوب سمجھ رہے ہیں، اسی ضمن میں پرانے شکاریوں نے نیا جال صوفیت اور اسلام کے عنوان سے تیار کیا ہے، غیر اسلامی و غیر شرعی آمیزے سے تیار شدہ تصوف کو اصل اسلام باور کرا کے اسلامی تعلیمات اور صوفیائے کرام کے کردار و عمل کو داغ دار کرنے کی سازش اور شیرازۂ امت کو سبوتاژ اور تفریق بین المسلمین کے علاوہ اس کے پس پردہ اور کوئی مقصد نہیں ہے، تاکہ ان کے لیے اپنے اہداف تک پہنچنے کی راہیں ہموار ہوسکیں، اس فکر اور مقاصد کو باریک بینی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تصوف کی وہ صورت جس کو اصل بنا کر پیش کیا جارہا ہے اس کا اسلام سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، بلکہ اگر اس کو مختلف اقوام کے فلسفوں کی غلاظت کہا جائے تو غلط نہیں ہے، اس میں لفظ تصوف کے علاوہ کوئی چیز بھی قدرے مشترک نہیں ہے جسے عقل کی کسوٹی پر بھی اگر پرکھا جائے تو سوائے کھوٹ کے اور کچھ نہیں نکلے گا، یہ دراصل اسلامی تعلیمات اور اس کی تابندہ و روشن روایات کو مسخ کرنے کی سازش ہے، جب کہ ذات حق جل مجدہٗ سے محبت و نسبت حاصل کرنا اور رذائل نفس کی اصلاح اور نفس امارہ کو سنت و شریعت کا تابع بنا کر نفس مطمئنہ بنانے کا جلی عنوان اور مقصود طریقت ہے اور یہی اس کی غرض و غایت ہے اور اسی راستے سے بصیرت حاصل ہوتی ہے اور حقیقت الامر منکشف ہو کر لائحہ عمل متعین ہو جاتا ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ سب سے پہلے تصوف و طریقت کی اصل اور اس کی تاریخی واقعیت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھا جائے تاکہ سونا اور کھوٹ دونوں الگ الگ ہو جائیں اور تصوف

یا صوفیت کے لفظی اشتراک سے جو دھوکہ دیا جارہا ہے اس کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے فرمایا کہ ’’شریعت بغیر طریقت یعنی تصوف کے نرا فلسفہ ہے اور طریقت بغیر شریعت کے زندقہ اور الحاد ہے‘‘۔اس ایک جملے نے ان تمام علوم وفنون کی حقیقت کھول کے رکھ دی ہے کہ شریعت یعنی ظاہری اعمال و احکام کا علم تو بہت سے منافقین کو بھی تھا اور آج بھی سینکڑوں یہودی، نصرانی، لا مذہب دہریئے اور مستشرقین ان علوم اسلامیہ کے بڑے محقق اور جاننے والے موجود ہیں مگر وہ نرا فلسفہ ہے دین نہیں ہے، دین جب ہوتا ہے جب کہ اس کے احکام کے حق ہونے کا اعتقاد بھی ہو اور احکام ظاہرہ و باطنہ پر عمل بھی ہو۔اس لئے صرف علوم ظاہرہ کی فن دانی اور تحقیقی مباحث نہ کوئی دینی کمال ہے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت ہے، اسی طرح طریقت وتصوف کا نام لے کر جو کوئی احکام شریعت کے خلاف چلتا ہے وہ ایک زندقہ اور الحاد ہے اور قرآن وسنت کی تحریف ہے۔سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض جہلاء کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے طریقت اور ہے، یہ محض ان کی کم فہمی ہے۔طریقت بے شریعت خدا کے یہاں مقبول نہیں ہے۔صفائی قلب تو مشرکین کو بھی حاصل ہوجاتی ہے کیوں کہ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے۔آئینہ زنگ آلود ہو تو عرق گلاب سے بھی صاف ہوجاتا ہے اور پیشاب سے بھی صاف ہوجاتا ہے لیکن فرق طہارت ونجاست کا ہے۔لہٰذا ولی اللہ کو پہچاننے کے لئے کسوٹی اتباعِ سنت ہے۔دراصل گمراہی طبقۂ صوفیاء کے ان افراد سے پھیلی ہے جس نے بزرگوں کی بے داغ نسبتوں کو اپنے حق میں بطور لاحقہ استعمال کر کے ہوائے نفس کی پیروی کی اور اس طریق کے نام پر خلافِ شرع امور کے خود بھی مرتکب ہوئے اور دوسروں کے سامنے تصوف کے نام سے غیر شرعی اعمال اور جاہلانہ اقوال کو تصوف بتا کر پیش کیا۔ہمارے اکابر واسلاف جس تصوف کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو باصطلاح اصل شریعت میں احسان کہا جاتا ہے جس کی بنیاد واساس حدیث

جبرئیل کے یہ الفاظ ہیں **قال: ما الإحسانُ؟ قال: أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك.**(۱)

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بقول فقیہ امت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ: ''ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر وناظر جان کر حیا اور شرم کے ساتھ بندے کا مطیع رہنا ہی مقصد اصلی ہے اور اسی کا نام لسان شرع میں احسان ہے اور یہی نسبت معتبرہ ہے۔''

چوتھی صدی ہجری کے مشہور عالم اور شیخ صوفیاء امام ابوالقاسم قشیریؒ نے اپنے زمانے کے مشائخ صوفیاء کے لئے جو ایک مفصل پیغام ''رسالہ قشیریہ'' میں لکھا ہے جو کہ بعد کے تمام مصنفین کی کتابوں کے لئے مدار اور متن قرار پائی ہے، اس میں فرمایا ہے کہ طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ شریعت وسنت پر پوری طرح عمل کا نام ہی طریقت ہے۔ اس پیغام کے بابِ اول میں فرمایا کہ اسلام میں نبوت ورسالت کے بعد سب سے بڑی فضیلت صحبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھی گئی ہے، اس لئے جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل کیا، ان کی سب سے بڑی فضیلت اور سب سے اعلیٰ لقب ان کا صحابی ہونا ہے۔ ان کے بعد جن لوگوں نے صحابہ کرامؓ کی صحبت سے علم وعمل حاصل کیا ان کا سب سے بڑا تعظیمی لقب تابعی اور ان کے بعد کے لوگوں کے لئے وصفی نام تبع تابعی قرار پایا، یہ سب حضرات شریعت وسنت پر مکمل عمل کرنے والے، کتاب وسنت کے تمام اعمالِ ظاہرہ وباطنہ سے پوری طرح آراستہ اور شریعت وطریقت کے جامع حضرات تھے، ان کے طبقات القاب علوم وفنون کی تخصیصات کے

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب سؤال جبرئيل النبي صلى الله عليه وسلم عن الإيمان، ج:۱،ص:۱۲،رقم:۵۰

بجائے صحابی، تابعی اور تبع تابعی کے عنوان سے تھے، ان کی اسی جامعیت کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زمانوں کے حوالے سے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا: **خیرُ القرونِ قرنی ثم الذین یلُونهم ثم الذین یلونهم.** [1] زمانوں میں سب سے زیادہ خیر کا زمانہ میرا ہے، پھر اس کے بعد کا، پھر اس کے بعد کا زمانہ، ان کے رخصت ہو جانے کے بعد لوگوں کے طریقے مختلف ہوئے۔ بعض کا اشتغال تعلیم و تعلّم، تصنیف و تالیف میں زیادہ رہا، اگرچہ باطنی علوم و اعمال میں بھی ان کو کمال حاصل تھا مگر اشتغال اس میں کم تھا۔ وہ علوم ظاہرہ کے محقق ہو کر عالم، مفسر، محدث اور فقیہ کہلائے اور بعض حضرات جن کا رخ اعمال دین کے مکمل اہتمام کی طرف زیادہ رہا وہ عبّاد و زہّاد کہلائے مگر علوم ظاہرہ شرعیہ میں بھی ان کے یہاں کوئی کمی نہ تھی۔

مگر ان عبّاد و زہاد میں پھر کچھ ایسے لوگ داخل ہو گئے جو طریق سنت سے منحرف ہو کر بدعات میں مبتلا ہو گئے کیوں کہ بدعت جب بھی آتی ہے وہ سنت کو تبدیل کر کے آتی ہے، جیسا کہ اس حدیث پاک کے الفاظ سے متبادر ہے: **قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ما ابتَدع قومٌ بدعةً إلا نزع اللّٰهُ من سنّتهم مثلَها** [2] کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی لامحالہ وہاں سے کوئی نہ کوئی سنت رخصت ہو جائے گی کیوں کہ ہر بدعت قاطع سنت ہے اور وہ لازماً کسی سنت کا ازالہ کرے گی، جیسے تصوف کی اصطلاح نے احسان کی خالص دینی اصطلاح کی جگہ لی ہے۔ اسی لئے اس کو بدعت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح مسلمانوں میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقہ میں کچھ لوگ عبّاد و زہّاد کے نام سے معروف ہو گئے۔ اس وقت وہ لوگ جو اہل سنت والجماعت کے عقیدے پر قائم شریعت و سنت کے مکمل اتباع کے دلدادہ ہونے کے ساتھ عبادات و زہادات اور اعمال باطنہ کی تکمیل کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے وہ اہل تصوف کے نام سے موسوم ہوئے اور دوسری صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے ہی یہ اکابر مشائخ اہل تصوف

---

(۱) مسند بزار، ج:۲، ص:۱۴۹ (۲) مسند الصحابہ، ج:۵۱، ص:۴۹۲

کے نام سے معروف ہو گئے جو ظاہر شریعت پر مکمل ہونے کے ساتھ انہوں نے ایک ایک سانس کی حفاظت اور ذکر اللہ میں مشغول رہنے کا اہتمام کیا اور وہ غفلت کے ہر خطرے سے بچنے والے تھے، امام قشیری رحمہ اللہ کے ان کے بارے میں الفاظ یہ ہیں:

”ثم ظهرت البدع وحصل التداعی بين الفرق فكل فريق أدعو ان بينهم زهّاداً فانفرد خواص اهل السنة المراعون أنفاسهم مع اللّٰه تعالیٰ الحافظون قلوبهم من طوارق الغفلة باسم التصوف واشتهر هذا الاسم لهٰؤلاء الاكابر قبل المئتين من الهجرة“ (۱)

پھر اس کے بعد مسلمانوں میں بھی کچھ بدعات نکل آئیں اور ہر فرقہ اپنی طرف یہ کہہ کر بلانے لگا کہ ہم میں بھی درویش ہیں ان کی طرف رجوع کرو، اس وقت امتیاز کے لئے ان خواص اہل سنت کو تصوف کے نام سے ممتاز کر دیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے ایک ایک سانس کی حفاظت کرتے تھے اور تصوف کے نام کے ساتھ ان کے نام کی شہرت دوسری صدی ہجری سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔

امام قشیری رحمہ اللہ کی اس تشریح سے ثابت ہوا کہ اہل تصوف اور صوفی کے نام سے سلف کے زمانے میں صرف وہی لوگ معروف ہوئے جو شریعت اور سنت کے پیرو تھے اور بدعت سے مکمل اجتناب کرنے والے تھے، خالی زہد و ریاضت کرنے والے جو متبع سنت نہ تھے وہ اس نام سے موسوم نہ تھے بلکہ ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے یہ نام اختیار کیا گیا تھا اور علماء وصوفیاء کے اوصاف میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں تھا کہ زمانۂ نبوت کے بعد ضعف قویٰ کے سبب اعمال ظاہرہ و باطنہ میں یکساں کمال اور بیک وقت دونوں میں اشتغال ممکن نہ رہا، تو علماء نے تعلیم و تعلّم، تصنیف و تالیف، اور علمی موشگافیوں کو اپنے عمل کا موضوع بنایا اور اس کے لئے مدارس قائم کئے اور صوفیاء کرام نے باطنی احوال و اعمال کی درستگی کے لئے اس پہلو سے مسلمانوں کی اصلاح اور رشد و ہدایت کو اپنا

(۱) رسالہ قشیریہ، ص:۸

دائرۂ عمل بنایا اور اس کے لئے خانقاہیں آباد ہوئیں، یہ صرف ایک تقسیم کار کا اصول تھا، اس میں باہمی اختلاف کا کوئی پہلو نہیں تھا، کیوں کہ نہ اہل مدارس اپنے باطنی اعمال و احوال سے غافل تھے اور نہ اہل خانقاہ احکام شرعیہ سے ناواقف یا ان کی حیثیت کو کم کرنے والے تھے۔

لیکن زمانے کی نیرنگیاں کیا کیا گل کھلاتی ہیں، دونوں طبقات کے محقق ماہرین کی کمی شروع ہوئی اور ایک طرف علماء میں ذکر اللہ اور فکر آخرت سے غفلت کے جراثیم آئے اور حق تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ سے انتہائی محبت کا جو مقام ایمان کامل کے لئے ضروری ہے، اس میں کمی آئی تو دوسری طرف صوفیاء میں علوم شریعت سے ناواقفیت یا کم علمی کی بنیاد پر جراثیم پھیلے اور سنت وشریعت کے اہتمام میں کمی واقع ہونے لگی، اس دو طرفہ علمی وعملی انحطاط اور فکری پستی کے سبب سے مدارس وخانقاہوں کے ادارے ایک دوسرے کے حریف بن کر ایک دوسرے پر الزام تراشی میں لگ گئے، مدارس میں محض مسائل کے جان لینے کو کمال تصور کیا جانے لگا اور خانقاہوں میں چند تسبیحات ونوافل کو کاملیت سمجھا جانے لگا اور مدارس میں اعمالِ باطنہ کا فقدان ہوتا چلا گیا اور خانقاہوں میں شریعت وسنت کا، ''نوبت بایں جا رسید'' کہ تصوف محض چند رسوم کا نام بن کر رہ گیا، جن کی شریعت وسنت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ بقول حکیم الامتؒ خانقاہ خواہ مخواہ بن گیا۔

چنانچہ اس دو طرفہ انحطاط علمی کا اثر وضرر امت کو پہنچا، اول تو یہی دو طبقے امت میں اصلاح احوال کے کفیل تھے، خود ان کا مجروح ہوجانا ایک بہت بڑا المیہ تھا، دوسرے ان دونوں طبقات میں اختلاف کی شدت اور ایک دوسرے کو گرانے اور نیچا دکھانے کی کوششوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کردیا۔ اس سے زیادہ اشد افتاد یہ پڑی کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ان دونوں طبقوں سے بیزار اور دونوں سے برسر پیکار ہوگئے، ان کے پاس خود اتنی علمی یا عملی صلاحیت نہ تھی کہ ان دونوں طبقات سے آزاد ہوکر براہِ راست قرآن وسنت کی تعلیمات کو صحیح سمجھتے اور صحیح عمل کر لیتے اور جن کے

ذریعہ یہ دولت حاصل ہوتی ان سے بیزاری پیدا ہو کر ان کی مثال اس بیمار کی سی ہو گئی جو نہ خود اپنے مرض کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے علاج پر قادر، مستزاد یہ کہ سارے حکیموں اور اطباء سے بیزار، ایسے حضرات نے علم دین کے محقق اور ماہر اساتذہ سے بیزاری کے نتیجے میں علم دین حاصل کرنے کے لئے صرف دینی کتابوں کے مطالعہ پر اعتماد کیا اور بہت سے قرآنی مسائل میں ایسی راہوں پر نکل گئے جو جمہور امت کی راہ سے مختلف اور متضاد تھے، اس طرح دین میں ترمیم کا ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا اور حقیقت افسانوں میں تبدیل ہو کر گم ہو گئی۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہبانیت، شعبدے بازیاں، غیر شرعی و غیر اسلامی اقوال و اعمال اور افعال کو تصوف کہہ کر پیش کیا جانے لگا۔ اصل اہل علم و عمل علماء و صوفیاء کو بنیاد پرست دقیانوسی جیسے الفاظ کے ذریعہ ان کو استہزاء و تمسخر کا نشانہ بنا کر عوام کو ورغلانے اور بدگمان کرنے کی دشمنانِ اسلام کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں، وہیں دوسری طرف اس قسم کی شعبدے بازیوں کو تصوف کا عنوان دے کر یہ باور کرانے کی کوششیں جاری ہیں کہ ہم اسلام دشمن نہیں ہیں۔ اگر ہم اسلام دشمن ہوتے تو کیسے ہم صوفی ازم کی حوصلہ افزائی کرتے، جس کی محض دھوکہ، تلبیس، فریب اور دام تزویر کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں ہے، معاندین کی اس شاطرانہ چال کے تحلیل و تجزیہ کی ضرورت ہے کہ انہوں نے مذکورہ بالا علمی و عملی اسباب و عوامل سے کس طرح اپنے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مواقع ہم نے ہی فراہم کئے ہیں۔ بہرکیف حاصل تحریر یہ ہے کہ جب فتنے سر اٹھاتے ہیں تو بہت سے امور مشتبہ کر دیتے ہیں اور جب فتنوں کا طوفان خاموش ہو جاتا ہے تب حقائق آشکارا ہوتے ہیں، مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ استعمال ہونے والے ہو چکے ہوتے ہیں اور استعمال کرنے والے استعمال کر چکے ہوتے ہیں۔ فتنوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خطرات کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہوتی ہے کہ اس وقت تمام چیزیں مشتبہ کر دی جاتی ہیں اور فتنہ

پروری کے سرپرست حضرات جو کہ سماج کے نمایاں اور ممتاز وسفید پوش لوگ ہوتے ہیں وہ اپنی شاطرانہ کذب بیانیوں سے ذرائع ابلاغ پر قبضہ جما کر فضاء کو اپنے حق میں کر لیتے ہیں اور اپنی تلبیس سے حق و باطل کو آپس میں اس طور پر خلط ملط کر دیتے ہیں کہ کذب بیانیوں کی گھٹا ٹوپ ظلمتوں میں حق و باطل کا امتیاز ایک عام آدمی کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

فاللّٰہ خیرٌ حافظاً وھو اَرحمُ الراحمین

شانِ تقدیس کے رموز ہائے سربستہ

ذات حق جل مجدہ نے اس کائنات کی تمام مخلوقات کو خواہ وہ بہ لحاظ حجم مقام عظمت و رفعت سے عقل وخرد کو خیرہ کر دینے والے مرتبۂ بلند پر پیدا کی گئی ہو یا بہ چشم سر برہنہ آنکھوں کے مشاہدہ سے عاجز مخلوق ہو، عظیم سے عظیم تر ہو یا خفیف سے خفیف تر ہو اپنے مقصد تخلیق میں کوئی نہ کوئی جامعیت اور نافعیت کی شان لیے ہوئے ہے اور اس کی یہ شان جامعیت و نافعیت جہاں ایک طرف حق تعالیٰ کی تخلیق کائنات میں اجزائے تکمیل و اتمام کا مظہر ہے وہیں بنی نوع انسانی کی خدمت و بقائے حیات اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں اپنی جامعیت کے لحاظ سے اپنے آپ میں ایک اہم ترین کلید و بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، اگرچہ بادی النظر میں وہ کتنی ہی عظیم ترین یا حقیر ترین ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، علیٰ سبیل المثال شمس و قمر اور خلائے بسیط میں محو گردش عظیم الجثہ سیارات کے اثرات کا حیات انسانی سے مجموعۂ صفات اور نافعیت کی بنیاد پر مربوط ہونا یا بدن انسانی کے داخل سے لیکر اجزائے آب و گل اور فضاؤں میں پائے جانے والے دیدہ و نادیدہ جرثومات کا حیات انسانی سے ناگزیر عملی ربط، یہ سب ذات حق جل مجدہ کی حکمت بالغہ کے تحت قائم فرمودہ نظام ارتباط باہم کے ہی مظاہر ہیں، مثلاً آپ کسی ایسی جگہ بیٹھ جائیں جہاں سکوت و سناٹا آپ کے وجود کو بایں طور گھیرے ہوئے ہو کہ اگر معمولی سوئی یا تنکا بھی

۞ مقدمہ: تعریب ''مقاماتِ مقدسہ'' از: حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

زمین پر گرے تو اس کی آواز بھی صاف سنائی دے، ایسے خاموش ترین اور سکوت افزا ماحول میں بھی آپ کو لمحہ ولحظہ کے انقطاع کے بغیر ما فوق البصر جرثومات اور حشرات الارض کا ایک شور وغل مکمل شعوری احساس کے ساتھ سنائی دیتا ہے جس سے آپ سات پردوں میں چھپ کر بھی چاہیں تو نجات حاصل نہیں کر سکتے ہیں، یہ فضا کے اندر نا قابل تصوران گنت تعداد میں موجود جرثومات کا ایک ایسا جم غفیر ہے جس نے ہمارے وجود کو بہر شش جہت گھیرا ہوا ہے یا تعبیراً کہہ سکتے ہیں کہ مقید کیا ہوا ہے جن کا مقصد تخلیق ہی بلاانقطاع پوری فضا کو ہمہ وقت اپنی آوازوں کے شور وغل سے معمور رکھنا ہے، ایک سائنسی تحقیق کے لحاظ سے فضاء کے اندر اس شور وغوغا کی مسلسل موجودگی انسان کی بقائے سماعت کے لیے اس قدر لازمی اور ناگزیر ہے کہ اگر یہ سلسلہ لمحہ ولحظہ کے بقدر بھی منقطع ہو جائے یا کسی طور کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ انسان کے سننے کی طاقت ہی زائل ہو جائے گی بلکہ اس انقطاعِ شور کے سبب بدن انسانی میں مختلف قسم کے داخلی اور خارجی تغیرات واقع ہو کر متعدد مہلک اور جان لیوا بیماریوں کو جنم دینے کا باعث بن سکتے ہیں، اسی مقصد کی تکمیل کے لیے خالق کائنات نے ماورائے شمار وکنار حشرات الارض کو پیدا فرما کر انسان کی مہمات حیات میں سے اس خدمت پر مامور فرما دیا ہے، یہ تو صرف ایک مقصد کی تفہیم کے لئے بطور مثال ذکر ہے جس کا تحقیق وریسرچ کے نتائج کے ضمن میں عقل انسانی نے اذن رب سے احاطہ کر لیا ہے، ورنہ حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے لامتنہی علم ازلی میں اور نہ جانے کتنی ہی حکمتیں اور حقائق اس کے پس پردہ کارفرما ہوں گی، گویا گھاس کا ایک معمولی تنکا ہو یا داخل بدن یا خارج بدن نادیدہ جرثومات ہوں، بحر وبر میں پائی جانے والی عظیم وخفیف مختلف الانواع مخلوقات ہوں یا اس عالم کون ومکاں سے لیکر خلاء وفضاء تک میں پائی جانے والی از قسم جمادات ونباتات، حیوانات وحشرات، جرثومات وسیارات ہمہ اقسام مخلوقات ہوں اسکی پیدائش اور اس کا وجود حق تعالیٰ کی کسی نہ کسی حکمت بالغہ کے مظہر کا ہی مرہون لطف وکرم ہے، علماء وحکماء سے لیکر عام فکری سطح

تک یہ امر متفق علیہ ہے کہ عالم عناصر کی ہر شے منفرد تاثیرات کے ساتھ اپنے جز و اصل سے لیکر مقصد تخلیق تک ایک نہایت ہی حکیمانہ ترتیب کے ساتھ مربوط ہوتی ہے، البتہ حکماء کے نزدیک یہ تاثیرات ان خاصیات کے ساتھ مرکب ہوتی ہے جو ذات حق جل مجدہ نے ہر شے میں ودیعت کی ہیں جیسے آگ میں حرارت اور پانی میں برودت کا پایا جانا، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً (۱)، رب کریم نے کوئی بھی شے بے سبب پیدا نہیں کی ہے، پھر ایک مستحکم ترین نظام ارتباط باہمی کے زیر انتظام اپنے عظیم ترین سلسلۂ حکم و علل کے ذریعہ تمام کائنات اور اس میں پائی جانے والی بلا تخصیص عظیم ترین و کمترین اشیاء و مخلوقات کو باہم دگر ایک دوسرے کے لیے ایسا ناگزیر بنادیا ہے کہ ایک دوسرے سے ربط کے بغیر نا تمام و نامکمل ہیں، اس نظام ارتباط میں ادنیٰ ترین فرق و خلل واقع نہیں ہوسکتا ہے اور اگر ہوگا تو فنائیت و تباہی پر ہی منتج ہوگا، اور اس تمام سلسلۂ تخلیقات میں مقصدی لحاظ سے عروج و ارتقاء کا منصب فضیلت تخلیق بنی نوع انسانی کو قرار دیکر تمام کائنات کو اس کے لیے مسخر کردیا گیا، یہ تو گویا صرف ایک مثال ہے؛ ورنہ حیات، شعور، بقاء، ضروریات، غرض انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جسکا ربط باہم کے تناظر میں حق تعالیٰ نے حسب حال انتظام نہ فرمایا ہو، اور یہ انتظام و انصرام بہر دو اجزائے حیات روح و بدن کی ضروریات اور اس کی بقاء کو محیط ہے، اسی ضمن و ذیل میں اگر غور کیا جائے تو حد عقل و خرد سے آگے وحی الٰہی کی روشنی میں باہم دگر نظام ارتباط کے اور بھی بہت سے حقائق نہ صرف یہ کہ اس تکوینی نظام عمل کے بہت سے سر بستہ رازوں سے معجز عقل واقفیت کا پتہ ہی دیتے ہیں بلکہ افادۂ فیضان فطرت کی حقیقت کے مظاہر، نیز کارخانۂ ہستی کے تمام اعمال و قوانین میں موجزن ایسے حِکم الٰہیہ کے ادراک سے بھی روشناسی کے مواقع فراہم کرتے ہیں جو بقائے حیات انسانی کے لیے ناگزیر حیثیت کے حامل ہیں، علیٰ سبیل المثال یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ثابتہ ہے کہ انسان کے عناصر تخلیق

(۱) ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ (سورۃ آل عمران: ۱۹۱)

اور بقائے حیات میں روح و بدن کے اتصال کو ہی کلیدی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے، ایک عنصر روح ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے جبکہ دوسرا عنصر جسم ہے جس کا تعلق عالم خلق سے ہے اور بہر دو عالم کے عناصر کے امتزاج و اتصال میں ہی حیات انسانی کی تنوعات کے بقاء کا راز سر بستہ ہے، اور اس نظام ارتباط میں روح کو جسم کے بمقابل تفوق اور تقدس کا درجہ حاصل ہے جسکی حسی دلیل بوسیلۂ موت روح کا بدن سے رشتۂ اتصال و ارتباط ختم ہو جانے پر جسم انسانی کا مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جانا ہے، اور جسم پر روح کی یہ برتری اور یہ تفوق و تقدس جمادات وحیوانات سمیت دیگر بہت سی مخلوقات تک پر بالہام ربانی روشن اور عیاں ہے، مثلاً بوجہ ضعف یا بحالت خوابیدگی انسان کا بدن حرکت و جنبش سے کتنا ہی عاری کیوں نہ ہو جائے لیکن اگر اس کے اندر روح کا جوہر جس کا تعلق امر رب کی رو سے عالم امر سے ہے، اور وہ اسکے اندر باقی ہے تو دنیا کی کوئی بھی شے اس پر حملہ آور نہیں ہو سکتی ہے، نہ ہی تو حشرات الارض اس کے پاس آئیں گے، نہ ہی کوے اور گدھ اس کا گوشت نوچنے کے لیے اس پر ہجوم کریں گے، نہ ہی ذرات زمین اس کو نقصان پہنچائیں گے، نہ ہی سورج کی تپش وتمازت اس کا کچھ بگاڑے گی، لیکن جیسے ہی بذریعہ موت جسم و جاں کا یہ رشتۂ امتزاج وارتباط انفصال میں تبدیل ہوتا ہے تو عالم خلق کے عنصر جسم کے اجزاء کو زمین کے ذرات نابود کر دینے کے درپے ہو جاتے ہیں، دھوپ کی سوزش وتپش نہ صرف اس کے بدن کو ہی بدبودار کر دیتی ہے بلکہ ارد گرد کی فضا تک کو ناقابل برداشت حد تک متعفن کر دیتی ہے، کیڑے مکوڑے اس کے ناک اور منہ میں الگ گھسنا شروع کر دیتے ہیں، مردار خور جانور اس کا گوشت نوچ لے جانے کے لیے حملہ آور ہو جاتے ہیں، گویا کہ یہ ساری چیزیں جو کہ تھوڑی دیر پہلے تک امتزاج روح و بدن کے سبب انسان سے مغلوب اور اس کے لیے مسخر تھیں موت کے ساتھ وہ اس پر غالب آجاتی ہیں کیونکہ بالہام ربانی وہ یہ حقیقت جان لیتی ہیں کہ انسان میں قوت و غلبے اور تسخیر کی علّت تفوق روح سے قائم تھی، چنانچہ بذریعہ موت جب روح بدن سے جدا ہوئی

تو اب اس کا مجرد جسم غالب نہیں رہا بلکہ تمام مخلوقات عالم سے مغلوب ہوگیا ہے حالانکہ انفصال روح وبدن سے پہلے وہ نہ ہی تو کائنات پر حاکم تھا اور نہ ہی محکوم تھا لیکن بحکم رب کریم وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۱) کے تحت مسخّر کائنات کی حیثیت سے اس کی حیات کو بقاء اور دوسری ناگزیر نافعیت فراہم کیے جانے کے لیے ارض وسموات کے یہی عناصر کائنات اس کی خدمت پر مامور تھے، عالم امر وخلق کے عناصر کا یہ مؤقت اتصال ثابت کرتا ہے روح عظیم ہے اور جسم خسیس ہے، اگرچہ اس عالم کے قانون فطرت وحکمت کے تناظر میں اسی عظیم وخسیس کے امتزاج سے اعمال وافعال کا صدور مربوط ہے، چنانچہ اسی فرق مراتب کے علی الرغم حق تعالیٰ نے جسم وجاں کے نظام بقاء کے قوانین کو اس کے اصل جز وخلق سے مربوط کرکے اپنی حکمت کے تحت الگ الگ رکھا ہے، جسم کی تمام ضروریات حیات عالم خلق میں اس کے بنیادی عنصر مٹی سے پیدا ہوکر اس کا تکفل کررہی ہیں جبکہ روح کی تازگی وبقاء کا سامان عالم امر سے نازل ہورہا ہے، اسی نظام ارتباط باہمی کے زیراثر جسم انسانی کی بقاء کے لیے تمام کائنات کی مخلوقات کو حق تعالیٰ نے فرائض سپرد کرکے انسان کے لیے مسخّر کردیا ہے، علیٰ سبیل المثال دانۂ گندم اس جسم کی بقاء کے لیے جوہر اصل کی حیثیت رکھتا ہے، غور کیا جائے تو اس دانۂ گندم کی تخم ریزی سے لیکر اس کی تکمیل تک کے جملہ مراحل میں اس وسیع ترین کائنات کی عظیم ترین وکم ترین بے شمار مخلوقات بحکم رب کریم اپنے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتی ہیں تاکہ سلسلۂ تخلیقات کے جز وعظیم انسان کے جسم کو بقائے حیات کے جواہر فراہم ہوسکیں جس کا بنیادی ذریعہ یہ دانۂ گندم ہے، جس کی حفاظت ونمو کے لیے زمین اپنی تمام افزائش وبالیدگی کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی آغوش میں ایک وقت معین تک اس تخم گندم کی پرورش کرتی اور اس کو مرحلہ بہ مرحلہ پروان

---

(۱) ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ (سورۃ الجاثیہ:۱۳)

چڑھاتی ہے، ہواؤں کی اتھل پتھل اور چاند کی گردش سے سمندروں میں پیدا ہونے والے مدوجزر کے ذریعہ اٹھنے والے بخارات بادلوں کی شکل میں دنیا میں ہر جگہ پر آب رسانی کا حکم بجالانے پر مامور کردیے جاتے ہیں، بعدازاں سورج کی ایک متعین حدت کے سبب فضاء میں محوِ گردش پانی کے یہ عظیم ترین ذخائر بارش و باراں کی صورت میں روئے زمین کے ہر خطہ و منطقہ پر آب پاشی کا فریضہ انجام دینے پر لگ جاتے ہیں، اپنے اپنے وقت پر سرد و گرم بادسحر گاہی اور بادنسیم اس تخم گندم کو ہر روز تر و تازگی کی نوید سناتی ہے، ستاروں کی کشش اس کے نشو نما کو جلا بخشنے پر مامور کردی جاتی ہے، گردش قمر کے محوری اثرات اس کے ذائقہ کو مدد فراہم کرنے کی خدمات انجام دیتے ہیں، اور سورج اپنی روشنی و تمازت کے واسطے سے اس کی قوت و غذائیت کے عناصر کو افزونی بخشتا ہے، زیرِ زمین اور بالائے زمین دیدہ و نادیدہ حشرات الارض و جرثومات اسکی ظاہری نشونما کی صحت افزائی پر نگراں مقرر کردیئے جاتے ہیں۔ غرض اس طرح وسیع تر کارخانۂ ہستی کے تمام اجزاء اپنے خالق کے حکم پر مفوضہ فرائض کے ذریعہ بنی نوع انسانی کے کم تر حصۂ جسم کو بقاء و استقرار فراہم کرتے ہیں جبکہ امرِ رب عنصر باعظمت روح کی بقاء و تازگی کا نظام اس کی اصل عالم امر سے مربوط رکھا گیا ہے، کلام اللہ، سنت رسول اللہ، احکامات الٰہیہ سے عملی ارتباط ہی روح کی بالیدگی و تازگی کے لئے جو ہر اصل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ اللہ تعالی کے نظام ارتباط باہم کی مثال کی صرف ایک سمت و گوشہ ہے، ماورائے عقل و فہم اور کتنی بے شمار مصالح مصروف عمل ہیں اس کا علم تو ذات حق جل مجدہ کے علم ازلی میں ہی محفوظ ہے، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ہمارے رب کریم نے کوئی شے بھی بے سبب پیدا نہیں کی ہے اور اشیائے کائنات کی اکملیت کا سرنہاں اجزائے شے کے متفاوت کار پرداز عمل میں منحصر رکھا گیا ہے، جیسا کہ بدن انسانی میں قلب و دماغ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے باقی دیگر تمام اجزائے بدن اعضاء و جوارح اس کے تابع ہونے کے باوجود اپنے اپنے دائرۂ عمل میں متفاوت کارپردازی کے علی الرغم اپنی اپنی جگہ پر مستقل بالذات

شان جامعیت کا مظہر ہیں جس سے کہ ان کی اپنی عملی انفرادیت جامعیت کے ساتھ قائم رہنے کے ساتھ تابع قلب و دماغ بھی ہیں اور تمام اجزائے بدن کی حیات سے لیکر حرکات وسکنات تک اپنے مرکز سے بایں طور مربوط بھی ہیں کہ اپنے عمل میں آزاد ہونے کے ساتھ تحریک عمل میں تابع حکم ہیں، حواس انسانی میں بصیرت کے فرائض آنکھ سے متعلق ہیں لیکن اگر قلب و دماغ متوجہ نہیں ہیں تو بڑے سے بڑا واقعہ نظر کے سامنے سے گذر جانے کے باوجود آنکھ اس کو دیکھنے سے قاصر رہے گی، سماعت کا فریضہ کانوں سے وابستہ ہے لیکن اگر کان گوش بہ دل نہیں ہے تو کتنا ہی شور وشغب کیوں نہ ہو کان اپنی صفت سماعت میں جامعیت کے باوجود اپنا فرض ادا کرنے سے محروم ہی رہے گا، یہی حال دوسرے تمام اعضاء و جوارح کا ہے کہ اگر مرکز کی جانب سے آنے والی ہدایات کا سلسلہ منقطع ہے تو اپنی جامعیت کے علی الرغم اپنی جگہ پر جامد رہیں گے، بنابریں اوصاف عظمت کے لحاظ سے قلب و دماغ کو نہ صرف تمام اعضائے بدن پر تفوق و برتری ہی حاصل ہے بلکہ بلحاظ علویت درجۂ تقدس کا پہلو بھی نمایاں ہے، اسی لئے نماز جو کہ اپنی ظاہری ہیئت وعمل کے لحاظ اپنے رب کے سامنے اپنے تذلل کے اظہار کا مظہر ہے اس میں رکوع وسجود اسی عضو معظم کو زمیں بوس کردینا اظہار تذلل پر منتہی ہوتا ہے جبکہ بدن انسانی کا سب سے محترم اور مقدس حصۂ پیشانی وسر کو اپنے رب کے سامنے زمین بوس کر کے اظہار تذلل کی انتہاء سے ہمکنار کیا جاتا ہے، بالفاظ مختصر کہا جاسکتا ہے کہ فرمان رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَۃ (۱) کی عملی تفسیر کا اجمال اور خلاصہ بھی یہی ہے، یا ایسے ہی تمام اعضاء و جوارح پر قلب کے تفوق کا معاملہ ہے کہ انسان کے صلاح وفساد کا مدار اپنی جامعیت اور تقدیس کے لحاظ سے قلب پر منحصر ہے، جس کو حدیث میں فرمایا گیا ہے: اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ، او کما

(۱) شعب الایمان، رقم: ۱۰۵۸۱، ناشر: دار الکتب العلمیہ، بیروت ج: ۷، ص: ۳۶۰

قال علیه الصلوة و السلام [1]، جس کا حاصل یہ ہے کہ بیشک ہمارے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جس پر انسان کی صلاح وموزونیت اور خلل وفساد کا مدار ہے، اگر یہ حصۂ جسم درست ہے تو تمام اعضائے بدن میں درستگی کو تفوق حاصل رہے گا اور اگر یہ خرابی و تباہی کے زیر اثر ہے تو افکار و اعمال، افعال و اقوال اور تمام تحریکات انسانی پر تباہی و بربادی کا ظہور و غلبہ رہے گا اور یہ عضو بدن قلب ہی ہے، لہٰذا اگر اس ناحیہ سے غور کیا جائے تو بین الاعضائے انسانی میں بلحاظ مرکزیت اس میں بھی تقدس کی شان بایں طور نمایاں نظر آئے گی کہ اس حصۂ جسم یعنی قلب کو ارتباط عالم امر و خلق سے بیک وقت یکساں انداز میں مرتبط رکھا گیا ہے، عالم امر کا ربط اس میں شان تقدیس کا مظہر ہے جبکہ عالم خلق کا تعلق نفس کو ابھارتا ہے اور دل کو خواہشاتِ نفس کی جانب مائل کرتا ہے، چنانچہ جب اس پہلو سے غور کیا جائے گا تو اللہ تعالی کی حکمت تخلیق کے معجز عقل پہلو سامنے آئیں گے، ان الحکم الا للّٰہ قانون بنانا صرف اللہ تعالی کا کام ہے، چنانچہ یہی اسرار وحکم اور قانون تکوین تمام مخلوقات عالم میں رائج و رواں نظر آتے ہیں کہ شان جامعیت کے ساتھ اس مضبوط ترین باہم دگر حکمت ارتباط میں ہی اشیائے کائنات کے تمام اجزاء میں پہلو بہ پہلو سلسلۂ تقدیس وتفوق بھی قائم ہے خواہ اس کا تعلق عناصر اربعہ بادوخاک آب و نار سے ہو یا پھر موالید ثلاثہ نباتات جمادات حیوانات سے ہو یا ہمہ انواع مخلوقات عالم میں کسی بھی شے سے ہو، گویا ذرۂ زمین سے لیکر خلائے بسیط کی تمام مخلوقات کائنات کو ذات حق جل مجدہ نے اپنی شان خلاقی اور حکمت معجز عقل کے زیر اثر اسی نظام علویت وسلفیت کے ارتباط سے مرصع کیا ہے، اور اس سلسلۂ تخلیق عالم کا نقطۂ عروج تخلیق بنی آدم کو قرار دیکر اعلان کیا گیا: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ [2] کہ ارض وسموات میں پوشیدہ وافشاں تمام مخلوقات عالم کو حیات بنی نوع انسانی کو بقاء وتحفظ فراہم کیے

(۱) الصحیح لمسلم، کتاب المساقاة، باب أخذ الحلال و ترك الشبهات، ج۲،ص۲۸،رقم:۱۵۹۹

(۲) سورۃ الجاثیہ:۱۳

جانے کے لیے مسخر کردیا گیا، متضاد و متحارب اور متفاوت عناصر سے مرکب یہ مخلوق انسانی اپنی کج روطبیعت کی بنیاد پر حقائق الٰہیہ سے کتنا ہی اعراض کیوں نہ کرلے لیکن دیدنی و شنیدنی دلائل لیکر حواس خمسہ سے محسوس کئے جانے والے الہامی براہین کی وسعت و کثرت کا یہ حال ہے وہ اپنے نفس و ذات اور اطراف و اکناف کے ایک ذرۂ حقیر سے لیکر چہار دانگ عالم تک جہاں جہاں اور جس جس شے پر بھی نظر دوڑائے گا تو اپنے رب کے نظام ربوبیت کی معجز عقل و خرد حکمتوں، کارسازیوں اور جلوہ آفرینیوں کے بے حدو کنار سمندر اپنی وسعت بصر، قوت نظر، حدود عقل و فہم کے بقدر فضائے بسیط کے ایک ایک ذرۂ قابل بصر اور نا قابل نظر میں حیرت انگیز طور پر نظام ارتباط سے یکسانیت و موزونیت کے ساتھ مربوط پائے گا، چنانچہ رفعت فکر کے ساتھ دقت نظر سے اگر کام لیا جائے تو افادۂ فیضان فطرت کی حقیقت کے مظاہر کارخانۂ ہستی کے تمام اعمال و افعال اور قوانین میں ربط باہم کے ساتھ موجزن نظر آئیں گے جو حیات انسانی کی ارتقاء کے لیے تدریج و تسلسل کے علی الرغم ناگزیر اہمیت و ضرورت کے حامل ہیں۔

بوجہ طوالت مضمون فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْض (۱) کی مفصل و مطول تشریحات سے گریز کرتے ہوئے مختصراً عرض گزار ہوں کہ عالم امر ہو یا عالم خلق؛ بہر دو عالموں میں جاری اعمال و افعال اور قوانین فطرت کے اس نظام ارتباط باہم کے درمیان سلسلہ بہ سلسلہ اور پہلو بہ پہلو عظمت و فضیلت اور تقدیس کا ایک تکوینی تسلسل ملتا ہے جو اپنے مرکز تخلیق سے بلحاظ نسبت مربوط ہے کہ کائنات کی انواع ہوں، اصناف ہوں کہ اجناس ہوں، افراد ہوں یا مقامات ہوں، فضیلت و عظمت اور تقدیس کی شان اس میں اسی وقت پیدا ہوگی جبکہ ذات حق جل مجدہ کی ذات و صفات کی تجلیات کا کوئی عکس وصف اس میں نمایاں ہو اور وہی مظہر تجلّی علّت تقدیس قرار پاتی ہے، انسان کا مٹی سے تخلیق کردہ مجرد جسم مسجود ملائک قرار نہیں پایا، تاوقتیکہ حق تعالیٰ نے وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۲) کہہ

(۱) ترجمہ: اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ (سورۃ النساء: ۳۴)

(۲) ترجمہ: اور میں اس میں روح پھونک دوں۔ (سورۃ الحجر: ۲۹)

کر اپنی روح اس میں نہ پھونک دی اور فرمایا کہ میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی ہے اور اب میں حکم دیتا ہوں کہ اس کو سجدہ کرو فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ (۱) یہ سجدہ جسم انسانی کو نہیں تھا بلکہ حق تعالیٰ کی جانب سے پھونکی جانے والی اس کی روح (روحی) کے واسطے سے ذات حق جل مجدہ ہی کو تھا لیکن روح حق کے ذریعہ بدن انسانی سے نسبت قائم ہو جانے کے سبب وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۲) کے حوالے سے دیگر بہت سی مخلوقات عالم پر درجۂ فضیلت وتقدس سے سرفراز فرما کر اشرف المخلوقات کے منصب جلیل پر فائز کر دیا گیا، روح رب سے نسبت قائم ہونا ہی کائنات میں انسان کی اشرفیت کی علت اصل ہے، ورنہ قائم بالذت ہستی سے نسبت قائم ہوئے بغیر بشمول انسان فی نفسہ کائنات کی کوئی بھی شے بذات خود شان تقدس کی حامل نہیں ہو سکتی ہے، بجز اس حقیقت کے کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی کوئی نسبت اس کو مقام تقدس پر لے جاتی ہے، کعبۃ اللہ میں لگے ہوئے پتھروں میں بذات خود کوئی شان تقدیس نہیں ہے لیکن وہ خطۂ ارض جہاں پر کعبۃ اللہ کی بناء رکھی گئی فلک پر قائم بیت المعمور کی عین سیدھ میں مہبط تجلیات ربانی قرار پایا تو اس عظیم ترین نسبت نے نہ صرف کعبۃ اللہ کی عمارت کو ہی مقام تقدس بخشا ہے بلکہ درجہ بہ درجہ اس سے مس ہونے والے یا اس سے نسبت رکھنے والی ہر شے میں تقدیس کی شان پیدا کر دی ہے، نہ صرف وہ پتھر جس سے کہ کعبۃ اللہ تعمیر ہوا وہ بھی نہ صرف بواسطۂ نسبت کعبۃ اللہ مقدس ہو گئے بلکہ ہر وہ شے جس کو جس درجہ میں بھی کعبۃ اللہ سے نسبت قائم ہو گئی وہ اسی درجہ میں محترم ومعظم ہو گئی، اگر چہ وہ عالم خلق کا حصہ ہیں لیکن عالم امر سے حق تعالیٰ کی تجلیات کے نزول کا مظہر ہونے کے سبب ونسبت سے کعبۃ اللہ کی ایک ایک شے قابل تعظیم و تقدیس ہو گئی ہے، غلاف کعبہ جس کو ہم خود اپنے کارخانوں میں اپنے ہاتھوں سے بناتے

(۱) ترجمہ: چناں چہ سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ (سورۃ الحجر: ۳۰،۳۱)

(۲) ترجمہ: اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔ (سورۃ الاسراء: ۷۰)

ہیں جب تک وہ کارخانے میں تیاری کے مراحل سے گذر رہا ہے اس وقت تک اس میں تقدیس کی کوئی شان نہیں، محض ایک کالے رنگ کا کپڑا ہے جس پر زردوزی سے کام ہو رہا ہے، البتہ مقصد استعمال کے تصور کے زیر اثر اس کو لاشعوری طور پر محترم سمجھا جانا یہ الگ بات ہے لیکن جیسے ہی اس غلاف کو کعبۃ اللہ سے مس ہونے کا شرف اور اس کی نسبت حاصل ہوئی معاً اس میں تقدس کی شان پیدا ہوگئی، اب اس کو فرط محبت الٰہی میں چومنا ہاتھوں اور چہرے کو مس کر کے دعائیں مانگنا، اسکی محبت وعقیدت کا دلوں میں جاگزیں ہوجانا اسی نسبت کے تقدس کی دلیل ہے، پھر درجہ بہ درجہ وہ مسجد بھی جس میں کعبۃ اللہ قائم ہے اسقدر محترم قرار پائی کہ وہاں پر پڑھی جانے والی ایک نماز کو دوسری مساجد کے بمقابل ایک لاکھ گنا زیادہ فضیلت حاصل ہوگئی، تمام دنیا کے شہروں میں شہر مکہ کی افضلیت کی علت اس شہر میں مسجد الحرام کا وقوع ہے، دنیا کی تمام مساجد کے محترم ہونے کی علت کو دیکھا جائے تو بجز سمت کعبہ کے دوسری کوئی وجہ تقدیس نہیں ہے، سمت میں فرق آجائے یا بدل جائے تو وہ مجرد ایک عمارت کے کچھ بھی نہیں ہے، اس سے احترام اور تقدس کی تمام شان رخصت ہوجائے گی جو نسبت سمت سے قائم تھی۔ معلوم ہوا کہ درجہ بہ درجہ اللہ تعالی کی ذات وصفات سے نسبت کے اتصال میں ہی اشیائے کائنات کی شان تقدیس کے راز ہائے سربستہ پنہاں ہیں خواہ اس کا تعلق اشیاء سے ہو افراد سے ہو کہ مقامات سے ہو، اپنے مرکز تخلیق یعنی ذات حق جل مجدہ کی ذات واوصاف سے نسبت جس قدر قوی ہوگی شان عظمت وتقدیس میں بھی اسی قدر کمال رفعت پائی جائے گی، تاہم اگر نسبت کمزور ہے تو اپنے آثار خلق سے نسبت کی مشیر ہوگی لیکن اس میں تقدیس کا پہلو محو ہوگا، مثلاً انسان کا جسم بھی اللہ تعالیٰ کے نظام ارتباط باہم کے ذیل میں سلسلۂ نسبت وتقدس کی ایک مثال ہے، انسان کو عالم اکبر یعنی کائنات کے مثل صفات سے مرکب تخلیق کیا گیا ہے، جس طرح کائنات میں اشیائے کائنات کا ارتباط باہم کا ایک مضبوط ومستحکم نظام کارفرما ہے، اسی طرح بدن انسانی میں دماغ کے ناقابل دید اجزائے خلیات سے لیکر پیر کے انگوٹھے کے آخری

گوشۂ رگ تک کوئی جزیہ بھی اس ربط ونسبت باہمی کے نظام سے خارج نہیں ہے۔

اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ امر رب اور ذات حق جل مجدہ سے صفاتی نسبت و مطابقت ہونے کے سبب مافوق البصر عنصر روح کی موجودگی سے ہی بدن قائم ہے، اور تمام اجزا وذرات بدن سے نسبت ہی بقائے حیات کی دلیل ہے، لیکن روح و بدن کا یہ نسبت باہمی یکساں نہیں ہے کہیں شدت کے ساتھ ہے تو کہیں معتدل تو کہیں خفیف ہے، قلب و دماغ سے اس نسبت میں اگر شدت پائی جارہی ہے تو بال و ناخن میں جاکر یہی نسبت اسقدر خفیف ہوگئی کہ کٹ جانے کی تکلیف واحساس سے بھی عاری ہونے کے باوجود اپنی قوت نمو سے اس نسبت سے اپنے ربط کی معلن ہے، اور اسی حقیقت کے علی الرغم قلب ودماغ سے روح کی یہی قوی ترین نسبت بدن انسانی کے دیگر تمام اعضاء پر ان کے تفوق واحترام کی علت قرار پاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح حق تعالی کی صفت ربوبیت کے ذیل میں ارض وسموات کے ایک ایک ذرہ میں نفوذ وعمل کے زیر اثر نسبت تو ہر شے سے قائم ہے، مؤثرات نسبت بمعنی توجہات ربانی قوت وشدت اور اعتدال وقلت کے ساتھ ایک ایک ذرۂ کائنات میں بھی اسی کے مثل کارفرما ہیں، لیکن یہاں بھی تقدیس وفضیلت کے جملہ راز ہائے سر بستہ اسی نسبت الٰہیہ سے قوت وشدت کے بقدر مناسبت سے ہی مربوط ہیں، چنانچہ نظام ربط ونسبت کے ذیل میں یہی سلسلۂ تقدیس اقویٰ ترین نسبت کے ساتھ کائنات میں درجہ بہ درجہ تین مقامات کو ایک ایسی فضیلت سے مربوط کرتا ہے جس کا مثل دنیا میں دوسرا کوئی مقام نہیں ہے، بلد امین مکۃ المکرّمہ، شہر قدس اور کوہ طور سینا اور ان مقامات کی عظمت وتقدیس اور سر بلندی کا اندازہ تو صرف اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ ذات حق جل مجدہ نے کائنات میں صرف انہی تین مقامات کو وہ شرف عطاء فرمایا ہے جن کی قسم کھا کر گواہ قرار دیکر احسن تقویم مخلوق بنی نوع انسان کو وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ [1] کے الفاظ

(۱) سورۃ التین: ۱-۵

سے مخلوقات عالم میں سند افضیلت واشرفیت سے نوازتے ہوئے انسان کی پاکیزہ صورت وسیرت پر استدلال اس لیے فرمایا تاکہ واضح ہوجائے کہ جب ان مقامات سے نوع انسان کو کمال مناسبت ہے اور بالفاظ دیگر کمال تأثر بھی ہے تو پورا عالم ان سے کیسے متأثر نہیں ہوگا اور دنیا پر ان کے کتنے گہرے اثرات مرتب ہوں گے جس سے کہ ان مقامات کی عظمت و شان اور بھی نمایاں ہوجائے گی، اس ضمن میں ہر سہ مقامات کی تقدیس کا شرعی تعارف کراتے ہوئے زیر نظر کتاب ''مقامات مقدسہ'' کے مصنف محترم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند رقم طراز ہیں کہ ''اسلام کے مرکزی شہر مكة المكرّمہ جس کے منجملہ بے شمار فضائل وامتیازات کے لیے سب سے بڑی تقدیسی خصوصیت ایک یہ ہی کافی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے عالم گیر قبلہ کے لیے اس شہر مقدس کا انتخاب فرما کر اس کو بلد امین فرمایا ہے: وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (۱) جو کہ اس آیت کریمہ کے زیب عنوان سے ظاہر ہے، پھر اس کی قسم کھائی جیسا کہ سورۃ التین اور سورۃ البلد لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۲) سے ظاہر ہے، پھر رسول امین سید المرسلین ﷺ نے اسے اپنا اور حق تعالیٰ کا محبوب ترین شہر ظاہر فرمایا اور دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہونے کی دعاء فرمائی جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کردیے گئے تو آپ تشریف لے جاتے ہوئے مکہ شہر کو خطاب فرماتے ہوئے باحسرت ویاس فرماتے جارہے تھے:

قد علِمتُ أن أحبّ البلادَ اِلی اللّٰہ عزوجل مکة ولولا أن قومي أخرجوني ما خرجت، اللّٰھم اجعل في قلوبنا من حب المدینة مثل ما جعلت في قلوبنا من حب مکة. (۳)

(۱) ترجمہ: قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی اور اس امن وامان والے شہر کی۔ (سورۃ التین: ۱-۳)
(۲) ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ (سورۃ البلد: ۱)
(۳) المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۲، ص: ۳۶۱، رقم: ۱۳۳۸۱، ناشر مکتبۃ العلوم والحکم، الموصل

میں جانتا ہوں کہ خدا کا محبوب ترین شہر مکہ ہے اور اگر میری قوم مجھے مکہ سے نہ نکال دیتی تو میں کبھی مکہ کو نہ چھوڑتا، اے اللہ ہمارے دلوں میں مکہ کی محبت پیدا فرمادے۔ قرآن نے اس دعاء کی قبولیت ظاہر کرتے ہوئے اسے مَثَابَةً لِّلنَّاس فرما کرلوگوں کا عشق ومحبت کے ساتھ اس کی طرف دوڑنا اور اس میں جمع ہونا بتلایا ہے جس سے کہ اس کی محبوبیت عندالناس بھی نمایاں ہے جو بغیر تقدیس کے نہیں ہوسکتی، حضرت عبدالرحمٰن ابن حارث رضی اللہ عنہ کی روایت واللّٰہ إنك لخیر أرض اللّٰہ، (۱)" خدا کی قسم! اے مکہ کے شہر تو خدا کی زمین کا (سب سے بہتر حصہ) ہے" مکہ کو خیر ارض فرمایا گیا جس سے کہ اس کی قرآنی تقدیس اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے، حسن ابن سفیان کی روایت میں اسے مغفرت گاہ قرار دیا گیا ہے، من دخل مکة فتواضع للّٰہ و اثر رضاءہ علی جمیع أمورہ لم یخرج منھا حتی یغفر اللّٰہ لہ(۲) جو بھی مکہ میں داخل ہوا اور اللہ کے لیے جھک گیا (یعنی وہاں رہ کر نیازمندی اور خاکساری اختیار کرلی) اور اس کی رضامندی کو (جس میں اس کے باشندوں کی رضامندی بھی شامل ہے) اپنے تمام مرضیات پر ترجیح دی تو مکہ سے نکلنے نہ پائے گا کہ اس کی مغفرت ہوجائے گی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس میں عبادت کرنے پر غیر معمولی اور اضعاف مضاعف اجر وثواب اور اسے شفاعت کا گہوارہ فرمایا گیا ہے جو اعلیٰ ترین تقدس کی نشانی ہے فرماتے ہیں کہ من أدرك شھر رمضان بمکة من أولہ الی آخرہ صیامہ و قیامہ کتب لہ مائة ألف شھر رمضان فی غیرھا و کان لہ بکل یوم مغفرة و شفاعة وبکل لیلة مغفرة و شفاعة و بکل یوم حملان فرس فی سبیل اللّٰہ ولہ بکل یوم دعوة مستجابة(۳) جس نے رمضان شریف مکہ میں

---

(۱) شرح معانی الآثار، باب دخول الحرم، ھل یصلح بغیر إحرام ج:۲،ص:۳۶۱،رقم:۴۱۶۱
(۲) کنز العمال، مکة و ماحولھا زادھا اللّٰہ شرفاً و تعظیماً ج:۱۲،ص:۳۸۰،رقم:۳۴۷۰۷
(۳) ایضاً ج:۱۲،ص:۳۸۱،رقم:۳۴۷۰۹

پایا اور سے آخر تک (یعنی پورا رمضان گذارا) روزوں اور تراویح کے ساتھ تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک لاکھ رمضان لکھے جائیں گے جو غیر مکہ میں اس پر گذرتے (یعنی جتنی روحانی ترقی وہ ایک رمضان کے روزے اور تراویح سے پاتا اس سے سو گنا زیادہ وہ مکہ میں ایک ہی رمضان گذارنے سے حاصل ہو جائیں گی) اور اس کے لیے ہر دن میں ایک مغفرت اور ایک شفاعت ہوگی اور ہر رات میں ایک مغفرت اور ایک شفاعت اور ہر دن میں ایک گھوڑے کے دوہرے بوجھ کے برابر صدقہ کرنے کا ثواب اور ہر دن میں ایک دعاء کی قبولیت ہوگی۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اسے روحانی عروج کا ایک عظیم ذریعہ قرار دیا گیا ہے جسے تقدیس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ روحانی عروج اور کمال روحانیت کا واحد ذریعہ بنا دیا گیا ہے، فرماتے ہیں: **من مات بمكة فكأنما مات في السماء** ،[۱] جس کا مکہ میں انتقال ہو گیا گویا آسمان دنیا میں اس کا انتقال ہوا یعنی مرنے کے بعد روح کو جو وقت آسمان دنیا تک پہونچنے اور اس کے بلند مقامات ملائکہ کے ساتھ طے کرنے میں لگتا وہ سارے عروجی مقامات مکہ میں انتقال ہو جانے کے سبب بیک دم طے ہو جاتے ہیں، جو اس کی عظیم ترین تقدیس ہے، جبکہ اسی مضمون کی دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے: **من مات في أحد الحرمين بعثه الله في الأمنين يوم القيامة**[۲] جس کا انتقال مکہ یا مدینہ میں ہوا اللہ تعالی اسے قیامت کے دن امن والوں میں اٹھائیں گے (جن کے لیے اس دن کوئی خوف و دہشت اور گھبراہٹ نہ ہوگی)۔ تفسیر فتح العزیز میں حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ مکہ میں ایک روزہ عام جگہوں کے ایک لاکھ روزوں کے برابر ہے یعنی نفس کا جو تزکیہ ایک لاکھ روزے رکھنے سے ہوتا ہے وہ مکہ میں ایک دن کے روزے سے حاصل ہو جاتا ہے جو کہ بلا شک وشبہ اس شہر کی تقدیس کی عظیم ترین شہادت ہے، قرآن کریم نے اس شہر مقدس

(۱) جامع الكبير للسيوطي، ج:۱، ص:۴۵۲۷، رقم:۲۱۷۰۹، المصدر موقع ملتقی اہل الحدیث

(۲) كنز العمال، فضل الحرمين و المسجد الاقصىٰ، ج:۵، ص:۲۲۴، رقم:۳۵۰۰۶

کی قسم کھا کر کہ **لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَد**[1] اور **وَ ھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْن**[2] اس کی ان ساری تقدیسات پر مہر تصدیق ثبت فرما دی ہے بلکہ ان کی عظمتوں کا ایک مستقل ماخذ اور اس کی ایک مستحکم حجت قائم فرما دی ہے۔

بہر حال مکہ کے مقدس ہونے کے لیے آیات وروایات کی روشنی میں یہ خلاصہ کافی ہوگا کہ وہ اللہ تعالی کا محبوب ترین شہر ہے، زمین کا بہترین حصہ ہے، حرم خداوندی ہے، مقام امن وسلامتی ہے، بلد امین ہے، مغفرت گاہ بنی آدم ہے، محبوب خلائق ہے کہ از آدم تا ایں دم ہر سال لاکھوں لاکھ انسان دنیا کے ہر خطے سے اس کی محبت لیے ہوئے اس کی طرف پروانہ وار دوڑتے اور جمع ہوتے ہیں، عباتوں کا محور ومرکز ہے، عالمینی قبلہ کا ظرف ہے، امام الناس حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا مقام اخلاص، مرکز توحید اور ان کی تاسیس کا مرکز توجہ ہے، سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مؤلد ومنشاء اور بعثت گاہ ہے، آخری وحی الٰہی کا مہبط ومرکز ہے جو اکمل ترین دین خداوندی کا مادہ تھی، ایک نیکی کو ایک لاکھ بنا دینے کی معنوی قوتوں کا حامل ہے، حق تعالی کا قسم خوردہ شہر ہے، اور بالآخر امن آخرت کا ضامن ہے وغیرہ وغیرہ جس سے کہ اس کا مقام مقدس ہونا آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور نمایاں ہے۔

اب اسی طرح سے شہر قدس ہے جو کہ بیت المقدس کے نام سے معروف ہے بے شمار تقدیسی خصوصیات کا حامل ہے جن سے احادیث نبوی بھری ہوئی ہیں، مکۃ المکرّمہ میں مرنے کا جو درجہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے وہی بیت المقدس کے بارے میں بھی بعنوان مختلفہ وارد ہے، حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے **من مات في بيت المقدس فكأنما مات في السماء**[3] جو بیت المقدس

(۱) ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ (سورۃ البلد:۱)

(۲) ترجمہ: اور اس امن وامان والے شہر کی قسم۔ (سورۃ التین:۳)

(۳) کنز العمال، فضل الحرمين و المسجد الاقصىٰ، ج:۱۲،ص:۵۱۲،رقم:۳۵۰۷۵

میں انتقال کر گیا وہ گویا آسمان دنیا میں پہونچ کر مرا۔ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ اس ایلیا کے شہر (بیت المقدس) کی یہ خصوصیت ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کے باشندے بہ نسبت اور مقامات کے دینی اور لا مذہبی فتنوں سے زیادہ محفوظ رہیں گے، گویا کلیۃً دہریت والحاد کا وہاں دور دورہ نہیں ہونے پائے گا، جو اس کے مقدس ہونے کی واضح دلیل ہے، اور اس کے باشندوں کے دلوں میں دینی حرارت اور ملی غیرت ہمیشہ مشتعل رہے گی جو بلا شبہ اس مقدس شہر کی برکات میں سے ایک اہم ترین برکت ہے اور بالآخر قرآن کریم نے اسے ارض مقدسہ کہہ کر اس کی تقدیس کو قطعی بنا دیا ہے جس سے کہ اسکی ممتاز فضیلت سے انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، چنانچہ حسب نص قرآنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے فرمایا: يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (۱)۔ ایسے ہی آیت معراج میں سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۲) مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیان اس آیت کریمہ کے بموجب یہ ربط مباشر تقدیسی مماثلت کے متعدد پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جو کہ بنص قرآنی اس خطۂ پاک کی تقدیس کو روز روشن سے بھی زیادہ نمایاں کرتا ہے۔"

اسی سلسلۂ باعظمت و تقدیس کے ضمن میں طور سنین کے حوالے سے مصنف علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں کہ " طور سینا بھی اپنی خصوصی برکات کے لحاظ سے ایک پر عظمت و مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے جس کو بعض احادیث میں جنت کا پہاڑ قرار دیا گیا ہے، اگر چہ روایت سند کے اعتبار سے قدرے ضعیف ہے مگر اول تو باب فضائل کا ہے جس

(۱) ترجمہ: اے میری قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے واسطے لکھ دی ہے۔ (سورۃ المائدۃ:۲۱)

(۲) ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ (محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب کے وقت مسجد حرام سے اقصیٰ (بیت المقدس) تک جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں تاکہ ہم ان کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک اللہ تعالیٰ ہر بات سننے والے اور دیکھنے والے ہیں)۔ (سورۃ الاسراء:۱)

میں توسع سے بھی کام لیا جاتا ہے، دوسرے حدیث ضعیف ایک مستند تاریخی روایت سے کم درجہ نہیں رکھتی، تیسرے یہ کہ جب اس طور سینا کی فضیلت و منقبت پر کلام اللہ شاہد تو یہ ضعیف روایت قرآن کریم کی مؤید بن کر معنی کے اعتبار سے قوی ہو جاتی ہے اگرچہ سند کے اعتبار سے کچھ ضعف بھی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ پہلی فضیلت و برکت تو اس کی یہ ہے قرآن حکیم کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب بنانے کے لیے طور کی جانب ایمن (دائیں) جانب کو اس ندائے حق کے لیے منتخب فرمایا جو کہ اس کے تقدیس کی نشانی اور دلیل ہے، وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ.[1] پھر یہی طور محل نداء الٰہی ہونے کے ساتھ مقام کلام خداوندی بھی بنایا گیا جس کی فضاؤں میں کلام خداوندی گونجا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رتبۂ کلیمی کوہ طور کی اسی جانب ایمن سے ملا جو اس کے تقدس کی مضبوط حجت ہے، دوسری جگہ فرمایا وَلَمَّا جَاءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ[2]۔ علاوہ ازیں نہ صرف صفت کلام کا محل بنانے سے ہی اسے نوازا گیا بلکہ جلوہ گاہ خداوندی ہونے کا بھی شرف بخشا گیا اور رَبِّ اَرِنِی[3] کی صدائے شوق و نیاز کے جواب میں باوجود لَنْ تَرَانِیْ[4] کے جواب میں عظمت و محبوبیت کے اس پہاڑ کو جلوہ گاہ ربانی بنا دیا گیا، اگرچہ کوہ طور اس کو برداشت نہ کر سکا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا اور نہ صرف پہاڑ ہی پارہ پارہ ہوا ہوا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تحمل نہ فرما سکے اور بے ہوش ہو گر پڑے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا،[5]، نیز اسی مقدس پہاڑ پر حضرت موسی علیہ السلام نے

---

(۱) ترجمہ: اور ہم نے اسے (موسیٰ کو) طور کی جانب سے آواز دی۔ (سورۃ مریم:۵۲)

(۲) ترجمہ: اور جب آئے موسی ہماری مقرر کردہ جگہ (یعنی طور کی جانب ایمن پر) اور کلام فرمایا ان سے ان کے رب نے۔ (سورۃ الاعراف:۱۴۳)

(۳) ترجمہ: اے پروردگار! مجھے اپنی زیارت کرا دیجیے۔ (۴) ترجمہ: تم مجھے (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔

(۵) ترجمہ: پس جب تجلی کی موسی کے پروردگار نے پہاڑ پر تو کر دیا اسے ریزہ ریزہ اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر۔ (سورۃ الاعراف:۱۴۳)

چلہ کشی فرمائی اور اسی پہاڑ پر انہیں کتاب مقدس توراۃ عطاء ہوئی، ظاہر ہے کہ نبی کی جائے عبادت اور جائے نزول وحی و کتاب بھی اگر مقدس نہ ہو تو تقدیس اور کہاں تلاش کی جائے گی؟ بہرحال از روئے کلام اللہ کوہ طور کی یہ خصوصیت بیان کرتے ہوئے اس کی عظمت و تقدیس پر مہر تصدیق ثبت فرمائی گئی، اب اگر اسی عظمت و نسبت اور تقدیس کی شرح اور تفسیر و توضیح کچھ احادیث بھی کرتی ہیں اور ان میں کوئی حدیث سنداً ضعیف بھی ہو تو وہ سنداً ہی ضعیف ہو گی معناً ضعیف نہ رہے گی جس کو قبول کرنے میں کوئی تأمل یا پس و پیش سدِ راہ نہ ہونی چاہیے۔ بہرکیف اس ساری بحث سے یہ حقیقت واشگاف ہو کر سامنے آتی ہے کہ شہر مکہ، شہر قدس اور کوہ طور اپنی اپنی نوعیت و نسبت کے اعتبار سے از روئے کلام اللہ و سنت رسول اللہ برگزیدہ و مقدس، باعظمت و بانسبت اور مبارک مقامات قرار دیے گئے ہیں جس کے لیے نفس موضوع کے لیے بطور تمثیل یہ چند مذکورہ آیات و روایات کفایت کرتی ہیں ورنہ اس بارے میں نصوص شرعیہ کا ذخیرہ بہت کافی اور کثیر مقدار میں موجود ہے جس کو طوالت کے خیال سے اس موقع پر جمع نہیں کیا گیا ہے کیونکہ حجت کے اتمام کے لیے اتنا بھی بہت کافی ہے۔“

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ”ان تین مقدس مقامات سے تین مقدس شخصیتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھریں، پھر ان سے تین ملتوں کا ظہور ہوا، اور ان تین ملتوں سے تین امتیں بنیں جو اپنے اپنے دور میں صاحب الزماں ثابت ہوئیں، اور اس طرح ان آراضیٔ مقدسہ سے تقدیس و برگزیدگی کے آثار قوم بہ قوم، مکاں بہ مکاں اور زمان بہ زمان گذرتے ہوئے دنیا میں پھیلتے رہے جنہوں نے چاروں جہات مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے ہزاروں خطوں اور لاکھوں شخصیتوں کو مقدس بنا دیا، اس لیے یہ تین مقامات اپنی اپنی نوعت سے صرف مقدس ہی نہیں بلکہ مقدس ساز بھی ثابت ہوتے ہیں جنہیں حقیقی اور اصلی مقامات مقدسہ اور دوسرے تمام مقامات مقدسہ کی اصل کہنا چاہیے، اسی لیے قرآن

کریم نے ان تین مقامات کی قسم کھا کر گواہ بنا کر ان کے مقدس ہونے کو قطعی بنا دیا ہے جس سے صاف نمایاں ہو جاتا ہے کہ تمام مقامات مقدسہ میں ان مقامات کا تقدس اصلی ہے خواہ وہ ان میں سے کسی مقام کی ذات ہی میں بدءِ فطرت سے پیوست کر دیا گیا ہو اور قدرت نے براہ راست روزِ اول ہی سے اس میں تقدس کی روح ڈال دی ہو اور خواہ کسی مقام میں اس کے تقدس کے لیے کوئی خاص واقعہ یا خاص سانحہ سبب بنا ہو اور تقدس کی روح اس میں پھونک دی گئی ہو، بہرصورت ان تینوں مقامات میں تقدس کے آنے کی کوئی بھی نوعیت ہو خواہ ازلی ہو کہ بدءِ فطرت ہی سے تقدیس آئی ہو، یا غیر ازلی ہو کہ بعد میں کسی خاص سبب سے تقدس کی شان پیدا کی گئی ہو اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ تقدس اصلی اور متعدی ہے جو روزِ ابد تک فعلاً چلے گا جس طرح کہ روزِ اول سے خلقۃً چلتا آ رہا ہے، جیسا کہ تاریخ اور واقعات اس پر شاہد ہیں، بالخصوص جبکہ عالم کی تین عظیم شخصیات اور ان کی بنائی ہوئی تین امتوں کے راستے سے ان مقامات کی اندرونی برکات کے ابھرنے کے تقاضے بھی پورے کرائے جانے ہوں اور انہی سے دنیا کے آخری دور کی تاریخ بنائی گئی ہو جس میں ان مقامات کا خاص دخل ہے تو قدرتی طور پر انہی کا تقدس آخری تقدس ثابت ہوگا اور آخری ہونے کے سلسلے سے دوسرے مقامات کے تقدس کی نسبت سے ان ہی کو اصل اور برتر مانا جائے گا کہ وہی سارے سابقہ تقدسات کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور وہی بعد کے تقدسات کی بنیاد ہیں، اس لیے انہیں کے تقدس کو تقدسات کا منتہا اور خاتم تقدسات کہا جائے گا اور ظاہر ہے کہ کسی دائرہ کا خاتم ہی اس دائرہ کی اصل ہوتی ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے انہی مقامات کو اصل کی حیثیت سے منتخب فرما کر ان کی ہی قسم کھا کر ان سے انسان کی احسن تقویم کی جامعیت اور افضلیت پر استدلال فرمایا ہے کہ انہی مقامات میں اپنی اپنی نوع کی جامعیتیں اور فضیلتیں ودیعت تھیں جن سے وہ عظیم ترین مقدس انسانی ہستیاں اور ان کی امتیں اٹھائی گئیں، تاکہ انہیں سے دنیا کے آخری دور کی تاریخ پوری کر دی جائے، پس اس آیت وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ

وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْن، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ [۱] کی روشنی میں اگر ان تینوں مقامات حجاز مقدسہ میں مکۃ المکرّمہ، (اصل اور قدیم نقشۂ دنیا کی رو سے) شام میں بیت المقدس اور مصر میں طور مقدس کو اصل اور بنیادی طور پر مقامات مقدسہ کہا جائے تو بلاشبہ یہ ان کا حق ہے"

کائنات کے نظام ارتباط باہمی کے پہلو بہ پہلو ذات حق جل مجدہ کی ذات وصفات سے نسبت کے حوالے سے نظام تقدیس وعظمت کا یہ سلسلہ مقامات وموجودات اور اشیائے کائنات سے ہوتا ہوا بحیثیت اشرف المخلوقات بنی نوع انسانی کے کائنات پر تفوق کی شان کے ساتھ عموماً اور انسانوں میں افضل ترین طبقۂ انبیاء علیہم السلام کی تکوینی فضیلت پر خصوصاً اور از روئے فرمان نبی آخرالزماں اوتیتُ علم الاولین والآخرین کے زیر اثر آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کو اخص الخاص فضیلت وعظمت اور ان کے تقدس کو گواہ بناتا ہوا جملہ فضائل وتقدیسات کے منبع اصل ذات حق جل مجدہ کی ذات والا صفات پر منتج ہوتا ہے، گویا کہ کائنات کے تمام سلسلے انہی کی ذات سے شروع ہو کر ہمہ جہت باہم دگر ارتباط کے انداز میں چلتے ہوئے انہی کی ذات پر مختتم ہو جاتے ہیں، ھُوَ الْاَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ [۲] اور از آغاز تا اختتام ان سلسلوں میں بے حد وکنار ماورائے عقل وادراک اور معجز شمار علل وحکم اور رموز واسرار پردۂ ایزدی میں پنہاں ہیں۔

مقامات مقدسہ حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کی آخری تصنیف ہے، جس میں مذکورہ بالا ہر سہ مقامات مقدسہ جن کو بوجوہ شرعی، تاریخی، عقلی اور جغرافیائی اور سیاسی حقائق کے اعتبار سے اسلامی مراکز کا درجہ حاصل ہے قرآن کریم کی

---

(۱) ترجمہ: قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی، اور اس امن وامان والے شہر کی کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔ (سورۃ التین: ۱-۴)

(۲) ترجمہ: وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی اور چھپا ہوا بھی۔ (سورۃ الحدید: ۳)

مختصر سورۃ والتین کی پہلی آیت اور اس کے حسن سیاق وسباق، اعجازی بیان اور اس کے معجزانہ نظم عبارت کے تناظر میں ایک نہایت مفید و مدلل بحث کا سرنامہ ہے، موضوع مذکور پر تحقیق و تدقیق کا مکمل حق ادا کرتے ہوئے نہایت مدلل و مفصل انداز میں ترتیب مواد کی یکجا فراہمی اور اس سے حقائق و وثائق اور معارف و لطائف سے استنباط و استدلال میرے اپنے علم نارسا کے اعتبار سے یکجائی انداز میں کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہے، لہٰذا بوجوہ اصحاب علم و فضل نے کتاب زیر نظر کو علمی ذخائر میں ایک نہایت ہی لائق ذکر و قدر اضافہ قرار دیا ہے، قرب مکان سمیت دیگر مختلف اعتبارات سے ساکنان ممالک عربیہ کے لیے بالعموم اور ان ہر سہ مقامات مقدسہ اور اس کے اطراف واکناف سے وطنی تعلق رکھنے والوں کے لیے بالخصوص یہ موضوع بحث علمی دلچسپی کے ساتھ ایک خاص کشش کا بھی موجب ہے، لہٰذا اس ناحیہ سے اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کتاب مذکور کا رائج الوقت عربی زبان میں ترجمہ شائع کیا جائے اور بحمد اللہ و بفضلہٖ حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر انتظام کتاب مذکور کا بلند معیار عربی ترجمہ اور اس کی اشاعت جملہ خدام ادارہ کے لیے وجہ افتخار ہونے کے ساتھ ادارہ کی اہم ترین علمی پیش رفت کے سرنامہ کا ایک مستقل عنوان بھی ہے۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے مقصد قیام، مستقبل کے عزائم و منصوبے اور اہداف کی بنیاد اس حقیقت واقعہ پر قائم ہے کہ ہمہ انواع علوم و معارف پر چہار دانگ عالم میں موجود جماعت علمائے دیوبند کی من حیث المجموع نادر المثال اور عظیم الشان علمی خدمات کے باوجود علمائے عرب اور علمائے یورپ میں ناواقفیت کی بنیاد پر علمائے دیوبند کو وہ مقام حاصل نہیں جس کے حقیقتاً وہ حقدار ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے، علمی ذخائر میں علمائے دیوبند کا یہ عظیم ترین ہمہ جہت علمی اضافہ جو کہ ڈیڑھ صدی سے تاحال تسلسل کے ساتھ جاری ہے اس کی تعریب وتراجم کی ناگزیر ضرورت اور بالخصوص عصر حاضر میں اس کی اہمیت کو کما حقہ محسوس نہ کرتے ہوئے اس

پیمانے پر بروئے عمل نہیں لایا گیا جس کا عہد رواں خاص طور پر متقاضی ہے، اگرچہ اقل قلیل مقدار میں بعض باذوق اصحاب علم نے انفرادی سطح پر اس جانب توجہ فرماتے ہوئے بلا شبہ لائق قدر کام کیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس کی وسیع تر افادیت کا راز عالمی سطح پر معروف اداروں سے کلی وابستگی سے ہی مربوط ہوتا ہے، اور بالخصوص جبکہ اس کا تعلق دیوبند کے مرکزی ادارہ سے وابستہ ہو، بحمد اللہ دارالعلوم وقف دیوبند اپنے روز قیام سے اس اہم ترین ضرورت و جہت کے حوالے سے فکرمند تھا کہ عہد رواں میں نوجوان نسل کے قابل قبول فکری رنگ و آہنگ کو سامنے رکھتے ہوئے علمائے دیوبند کے نادرالوجود علمی ذخائر کو بالعموم اور سرخیل جماعت بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی مصنفات، علوم و معارف اور ان کے آفاقی و عالمی فکر نانوتویؒ کو بالخصوص عربی، انگریزی اور دیگر بڑی زبانوں میں تراجم کے ذریعہ منتقل کیا جانا وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے، چنانچہ دارالعلوم وقف دیوبند کا یہ شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی اپنے روز قیام ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰۱۳ عیسوی سے اپنے اس اہم ترین ہدف کی جانب گامزن ہے، وہ ذات ذوالکرم والفضل جس کے بے حد وحساب فضل واحسان اور توفیق کے زیر اثر تاحال اکیڈمی کو زمانی اعتبار سے اپنے اس مختصر سفر میں زائد از پچیس کتابوں پر اکیڈمی سے مربوط اصحاب علم ومترجمین کے ذریعہ اردو اشاعت سمیت تحقیق وتدقیق کے عصر حاضر میں عالمی مسلمہ اصولوں کے تقاضوں کے تناظر میں عربی اور انگریزی زبانوں پر کام پیش کر کے دنیا کے مختلف ممالک میں موجود علمی دوائر و اجتماعیات سے منسلک اصحاب علم ونظر سے سند اعتراف وتوثیق کی سعادت حاصل ہے، نیز علمی میدان میں وطن عزیز سے لیکر عالمی سطح تک دارالعلوم وقف دیوبند کے حسن تعارف اور حسن عمل میں ایک مؤثر کردار دارالعلوم وقف دیوبند کے زیر اہتمام اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر انتظام شائع ہونے والے عربی مجلّہ محکمہ ''وحدۃ الامۃ'' کو بھی ایک مؤثر اور مرکزی حیثیت حاصل ہے، جو کہ حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور

دارالعلوم وقف دیوبند کے نائب مہتمم جواں سال عالم دین جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب کی زیر ادارت ہندوستان سمیت دنیا کے مختلف ممالک کے ممتاز ترین اصحاب علم وفضل پر مشتمل ایڈوائزری باڈی کے علمی وفکری تعاون کے زیر تو جہات شش ماہی عربی مجلة محكمة ہے جس کو عربی زبان میں ہندوستان سے شائع ہونے والے اولین مجلة محكمة کا اعزاز حاصل ہے، دارالعلوم وقف دیوبند سے اپنے اپنے دوائر میں عالمی شہرت کے حامل علمائے عرب کی ادارہ سے عملی سطح پر مضبوط ارتباط کی اگر بات کی جائے تو وحدة الامة میں محکمة کے عالمی مسلمہ اصولوں اور معیار پر قبولیت کا اعزاز پانے والے بلند فکر اور وقیع تر مباحث کی اشاعت کو بھی ایک مؤثر محرک کا درجہ منجملہ دیگر امتیازات و اختصاصات کے بایں طور بھی حاصل ہے کہ مملكة عربية السعودیہ کے دارالخلافة ریاض میں قائم پوری دنیا سے شائع ہونے والے ہمہ جہت بلند معیاری مجلّات کی Indexing (اشاریہ کاری) کرنے والی علمی وعالمی تنظیم ''المنهل'' نے بھی نے اپنی اشاریہ کاری میں ''وحدة الامة'' کو ایک ممتاز درجہ دیا ہے جو کہ دنیا کے تمام جدید و قدیم علمی دوائر واجتماعیات میں مجلّہ کی علمی حیثیت کو متعین کرتا ہے اور کسی بھی مجلّہ کی اس میں شمولیت علمی دنیا اور اصحاب علم وآگہی کے درمیان ایک بڑا اعزاز تصور کیا جاتا ہے ''وحدة الامة'' کی المنهل میں موجودگی کو علمی حلقوں میں فکری توسعات کے علی الرغم ادارہ کی حسن کارکردگی اور ہمہ جہت عظیم تر خدمات کے بلند معیاری کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے، جبکہ ملک وبیرون ملک انگریزی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے وسیع تر حلقۂ ارباب علم ادارہ سے شائع ہونے والے عہد رواں کے تقاضوں کے مطابق بلند معیار سہ ماہی انگلش میگزین Voice of Darul Uloom کے ذریعہ ادارے کی علمی وتعلیمی، انتظامی وتعمیراتی نیز دیگر جملہ سرگرمیوں سے واقفیت سمیت ادارہ کی حسن کارکردگی کے احساس واعتراف کے حوالے سے بحمد اللہ مربوط رہتے ہیں، علاوہ ازیں ادارہ کے روز اول سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم'' کو قلم برداشتہ

بلند معیار مضامین اپنے علمی و دینی اور معاشرتی، نیز عہد بہ عہد مسائل کے بدلتے منظرناموں کی تشریحات وتوضیحات پر مشتمل متنوع مباحث کی جدت و ندرت، موجودہ دور کے قابل قبول ظاہری حسن طباعت، اور بہ سلسلۂ اشاعت پابندی اوقات کے سبب ملک و بیرون ملک کے اردوداں طبقۂ علم اور عامۃ الناس کی توجہات اور دلچسپیاں بصد شوق اپنی جانب مبذول کیے رکھنے کا اعزاز رکھتا ہے۔ **فللّٰہ الحمد و الشکر**

کام کی نوعیت کوئی بھی ہو اس میں قابلیت کے ساتھ قبولیت کو بہ ہر کیف درجۂ تفوق حاصل ہوتا ہے کیونکہ قبولیت کا تعلق بارگاہ رب کریم کی جانب سے ملنے والی توفیق سے مربوط ہوتا ہے، چنانچہ جس کام میں بہ نیت اخلاص وایثار اور عنداللہ قبولیت کے جذبۂ بے لوث کی شمولیت ہو اور کام میں اجتماعیت کی شان اور اجتماعی جہود کاوشوں کو دخل ہو تو عنداللہ قبولیت اور بالہام رب عندالناس مقبولیت کے آثار دلیل قبولیت قرار پاتے ہیں، بحمداللہ حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر انتظام ہمہ جہت و ہمہ انواع منصۂ شہود پر آنے والے کاموں پر جہود مسلسل کے ساتھ شان اجتماعیت کا ہی غلبہ ہے اور ڈائریکٹر اکیڈمی محترم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب کی وسعت فکر ونظر کے ساتھ بیدار مغز قیادت میں مخلص وفعال وجواں سال جملہ رفقائے کار کی شبانہ روز محنتوں، کاوشوں، جہود وایثار اور جذبۂ عمل کا اگر قبولیت ومقبولیت کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو اصحاب علم وفضل سے لیکر عمومی سطح تک ہر طبقۂ ملت کی جانب سے اعترافات بلاشبہ قبولیت کے آثار وشواہد کی دلیل قرار پاتے ہیں جو کہ ان کی تدریسی اور دیگر اداراتی اہم ذمہ داریوں کے علی الرغم انتظام وانصرام نیز تعمیرات سمیت سال بہ سال متنوع علمی کاوشوں کی صورت میں منصۂ شہود پر آنے کے تسلسل کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے لیے رب ذوالکرم کے اس بیکراں فضل واحسان پر ہم جملہ خدام ادارہ اس کی بارگاہ عالی مقام میں سر بہ سجود شکر گزار ہیں جس کی رحمتیں ادارہ پر سایہ فگن ہیں اور جس میں بانی اور رفقائے بانیٔ ادارہ اس کی علمی وعملی روایات کو استقلال

واستقامت کے ساتھ مدۃ العمر قائم رکھتے ہوئے اور اپنے جذبۂ اخلاص وایثار کے زیر اثر اپنے سے اگلی نسل کو منتقل کرتے ہوئے آسودۂ رحمت ہوجانے والے اکابرین ادارہ سمیت سابق وموجود مخلص ترین اسلاف امت کی مستجاب دعاؤں اور توجہات ظاہری وباطنی کی تاثیرات کو ایک قوی اور مؤثر ترین محرک حیثیت حاصل ہے۔

وما توفیقی إلا باللّٰہ العلی العظیم

رہنما جادۂ تسلیم ورضا چھوڑ گئے

اس حقیقت واقعہ پر ڈیڑھ صدی پر مشتمل قافلۂ علمائے حق کے تمام ہی منصف مزاج اور ممتاز اصحاب علم وفضل کی تحریری شہادتیں شاہد عدل ہیں کہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی حیثیت محض ایک فرد فرید کی نہیں بلکہ ترفع علم وعمل ہو یا تعمق فکر ونظر ہو ان کی متفق علیہ شخصیت غلبۂ دین کی جدوجہد، تزکیۂ نفس، تعمیر انسانیت، تحریک حریت، استخلاص وطن میں سرگرم عمل حصہ داری، متفرق علوم ومعارف کے حقائق تک رسائی اور مختلف باطل نظریات اور اس کے پس پردہ مقاصد کی گہرائی میں جا کر ایک دردمند مصلح کی حیثیت سے عقل ونقل کے ناقابل تردید دلائل و حقائق کی بنیاد پر مصلحانہ ومتوازن نقد وتبصرہ اور رد کے ساتھ اسباب سعادت وشقاوت کو بلیغ اور مدلل ومسکت انداز میں بایں طور مشرح کر دینا کہ مخاطب پر صراط مستقیم واضح ہو جائے، امت مسلمہ کے دینی واسلامی اور معاشرتی رو بہ زوال پیش آمدہ احوال کے تناظر میں تحریک قیام مدارس کے زیر اثر دارالعلوم دیوبند کی بناء اور تعلیم دین کی اساس پر ہندوستان میں بسنے والی ملت اسلامیہ کے عقیدۂ توحید و دیگر اسلامی عقائد اور علوم دینیہ کے تحفظات اور اس کے علی الرغم فکری وسعتوں کے ساتھ متوازن اصلاحی تحریکات کا مسلم نسل میں ذوق ومزاج پیدا کرنا جیسے اختصاصات سے حضرت الامام النانوتویؒ کی فرصت حیات کا ہر لحظہ ولمحہ عبارت ہے، ان کے فکر ونظریات کے یہ قوس وقزح مختلف عناوین کی

❁ مقدمہ: موقف الإمام النانوتوی من القضايا الخلافية بين السنة والشيعة

از: محمد نوشاد نوری القاسمی، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

صورت میں ان کی پوری زندگی پر محیط نظر آئیں گے خواہ اس کا تعلق تحریکات سے ہو کہ مصنفات سے، حیات انفرادی سے ہو کہ ہمہ انواع تعلقات سے، ہر مقام پر فکر کی وسعت و بلندی میں انفرادیت کی شان نمایاں نظر آئے گی اور یہ اختصاص فکر ونظر ہی ان کی شخصیت کے امتیازات کا وہ روشن پہلو ہے جس کے اس گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ دورانیہ میں اقارب و اجانب یکساں انداز میں معترف نظر آتے ہیں، چنانچہ دل آزار وگراں بار روش سے دور اس منفرد مصلحانہ ذوق ومزاج کی جھلک حضرت الامام النانوتویؒ کی تصنیف کے عنوان "ھدیة الشیعة" سے بھی بایں طور نمایاں ہے باوجود یہ کہ اس میں فرقۂ شیعہ کے مستدلات کو عقلی ونقلی استدلال و براہین سے رد کرتے ہوئے اہل حق کے موقف اور دعوت حق کو اصلاح کے دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن اول وہلہ میں نام وعنوان ہی ہوتا ہے جو کہ تعارف کا سب سے پہلا مرحلہ ہے اس میں دل افگاری ودل آزاری کا کوئی بھی رنگ وآہنگ دور دور تک بھی نظر نہیں آئے گا بلکہ اس کے بجائے دعوت وقربت کے پہلو کو نمایاں رکھا گیا ہے، کیونکہ ان کے پیش نظر مخالف کی بات کو محض رد کر کے اپنی بات کو اونچا کر دینا کوئی حاصل مقصد نہیں ہے بلکہ مخاطب کے لیے مدلل ومبرہن دعوت فکر اور اصلاح حال کے مواقع فراہم کیے جائیں، جن کی روشنی میں حقیقت کی بازیافت بایں طور آسان وسہل ہو جائے کہ جبر و اکراہ کا الزام بھی عائد نہ ہو اور داعیۂ عمل کا محرک پیش کردہ فکر کی معقولیت از خود بن جائے۔ علم التصوف اور علم النفسیات میں بھی اس پہلو کو بے حد وقعت حاصل ہے لہٰذا ایک داعی اور مصلح کے لیے یہ ناحیہ کس قدر اہمیت اور دوررس نتائج کا حامل ہوتا ہے وہ "ھدیة الشیعة" عنوان سے ہی متبادر ہے، کتاب کا مقصد تصنیف کیونکہ اصلاح حال ہے اس لیے بادی النظر میں سب سے نمایاں خوبی جو سامنے آتی ہے وہ مصنف کے مخصوص ذوق ومزاج کے علاوہ تحریر میں سوز وگداز اس درجہ نظر آتا ہے، گویا کہ قلب وذہن مضطرب ہے کہ موضوع تحریر کے حوالے سے اس قدر روشن اور ضیاء پاش حقائق سامنے ہونے کے باوجود مخاطبین حق کو کیوں نہیں قبول کرتے اور ایک ایک جملے سے یہ تڑپ متبادر ہو رہی ہے کہ کسی طرح سے یہ

نورِ حقیقت مخاطبین کے قلوب میں منتقل کردیں، نہ کہ واشگاف و دل خراش لب ولہجہ میں رد و نقد کرتے ہوئے باطل پرست قرار دے کر ایک فرقہ کو اپنے سے دور کر کے افہام و تفہیم اور صلاح و اصلاح کے تمام دروازوں کو مقفل کر دینا، علوم عالیہ کی اس رفعت کے باوجود بوجہِ انکسار طبعی وفطری تنزل کا یہ حال کہ علمی رفعتوں سے بمشکل نزول فرماتے ہوئے ایک ایک بات کو سادگی کے ساتھ عام فہم پیرائے میں پیش فرمارہے ہیں، دوسری طرف مضامین کی آمد گویا ہاتھ باندھے قرطاس ذہن پر منجانب اللہ ملہم ہورہے ہوں اور بات سے بات پیدا ہورہی ہو، مگر اس اعلیٰ علمی شرف کے باوجود کوئی مقام ایسا نہیں جہاں تعلّی و جذبۂ خودنمائی کے واہمہ وشاہبہ سے دور پرے تواضع اور انکسار میں ادنیٰ درجے کا فرق واقع ہو، اصحاب اہل بیت اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے متعلق جملہ مباحث میں عقیدت ومحبت اور واجب ادب واحترام کے جیسے دریا موجزن ہوں، قلم کی جولانیوں اور جوش وخروش میں اعتدال وتوازن کی یکساں خوبیاں تحریر کے متوازی انداز میں قاری کے فکر ونظر کو متاثر کرتی نظر آتی ہیں، البتہ ایک شبہ کے ازالے کے طور پر یہاں اس ایک اقتباس کا نقل کرنا نہایت ضروری اور اہمیت کا حامل ہے جس کو مصنفؒ نے کتاب کے ابتدائیہ میں اندیشۂ نافہمیدہ کے ضمن میں بایں طور ضبط تحریر کیا ہے، ”اگر بہ نسبت انبیاء ومرسلین یا بزرگان اہل بیت و اصحاب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس رسالے میں العیاذ باللہ کوئی حرف نامناسب دیکھ کر الجھیں تو مجھے اس سے بری الذمہ سمجھیں، ایسا مذکور کہیں کہیں ناچار ہی بغرض الزام شیعہ آیا ہے، اس کا بار انہی کی گردن پر ہے (جیسا کہ مثل مشہور ہے نقل کفر کفر نہ باشد) خدا شاہد ہے کہ ایسے تمام عقائد سے میں بہزار جان و ہزار زبان بیزار ہوں بلکہ محبت بزرگان مذکور کو اپنی سعادت اور ان کے حسن اعتقاد کو ذریعۂ نجات سمجھتا ہوں مگر عالمان فہمید سے یوں امید ہے کہ میرے عذر سے پیشتر ہی بشہادت مذہب مجھے معذور سمجھیں گے“۔

موضوع زیر بحث کو دوسرے ناحیہ سے دیکھا جائے تو اسکے پس پردہ امام نانوتویؒ کی وسعت فکر ونظر کی اساس کے ساتھ مصلحانہ تقدیم وحل مسئلہ میں کارفرما حکمت کا بھی ایک

رخ سامنے آتا ہے جو ان کی مصنفات کے محتویات سے جھلکتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عہد ماضی میں عوام کی گمراہی کا باعث بعض مرتبہ خود اہل حق کا تعصب بن گیا ہے، انہوں نے حق کی حمایت میں ناحق جماعت کو بنظر حقارت ونفرت دیکھا تو جہلاء نے محض ان کی ضد میں اپنے جہل وعناد کے زیر اثر مزید تر تشدد اختیار کرلیا، مرور زمانہ سے شدہ شدہ یہ وقتی ضد دائمی عقائد کی اساس بن گئے، مثلاً کلام اللہ کے حدوث وقدم کے مباحث میں اس درجہ مبالغہ آرائیاں ہوئیں کہ نوبت بایں جا رسید کہ جو آواز انسان کے حلقوم سے نکلتی ہے اس کو بھی قدیم کا عنوان دیدیا گیا تھا، کاش یہ مقابلے اور مناظرے نہ ہوتے تو اس قسم کے بے معنی کلمات جو بعد میں عقائد بن گئے شاید کسی مجنون کی زبان سے بھی نہ نکلتے۔ (۱)

علیٰ ھذا القیاس تاریخ میں درج وقائع پر نظر ڈالیں تو شیعیت کی ابتدائی بنیاد و اساس میں قدرے اختلاف احوال کے ساتھ اسی قسم کے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں، سازش کاروں کے مفادات ومقاصد کی بحث سے قطع نظر جب سبائی فرقے نے اپنے منصوبہ بند فاسد افکار ونظریات کو عوامی حلقوں میں پہنچایا اور استعمال کرنے والوں نے استعمال کیا اور استعمال ہونے والے سادہ لوح مسلمان استعمال ہوئے تو اس کے بہت دوررس نتائج مستقل ایک فرقے کی صورت میں وجود پر منتج ہوئے، اس حقیقت واقعہ کے سلبی پہلو کے علی الرغم اس کا دوسرا ایجابی پہلو بھی ہے، جس کو حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ نفس اختلاف کے باب میں ترجمان السنہ کی جلد اول میں مفصل ومدلل انداز میں ذکر فرماتے ہوئے حسب ذیل اقتباس میں رقمطراز ہیں، ”امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الاعتصام میں ایک باب قائم کرکے لاتزال طائفة (الخ) (۲) کی حدیث نقل کی

---

(۱) ترجمان السنۃ، ج:۱،ص:۶۹، مولانا بدر عالم میرٹھی، ادارہ اسلامیات، لاہور

(۲) صحيح البخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبی ﷺ لا تزال طائفة من امتي، ج:۲،ص:۱۰۸۷

ہے کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی، اس کے بعد دوسرا باب قائم کیا اور یہ آیت تحریر فرمائی اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا (۱) کہ حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ کہ وہ تمہاری پارٹیاں بنادے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، بہر دو ابواب کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت میں آئندہ اختلاف ہوگا، حتی کہ حق پر قائم رہنے والا صرف ایک طائفہ رہ جائے گا، جبکہ اگلے باب میں اس اختلاف کی توجیہ بیان کی جارہی ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انواع عذاب میں اختیار دیا تو آپ نے تمام اقسام عذاب میں سے افتراق کو اختیار فرمالیا تھا کیونکہ اس میں امم سابقہ کی طرح سے عذابِ استیصال تو نہ تھا، پس معلوم ہوا کہ اختلاف وتشتت یہ ایک عذاب ہے اور اہل باطل کی نشانی ہے''۔ (۲)

حاصل یہ ہے کہ مختلف الخیال افراد ہوں، مختلف النظریات جماعتیں ہوں یا مختلف العقائد فرقے ہوں، ہر ایک کے مابین بموقعۂ اختلاف تأدب واعتدال کی ہی روش انجام کار مؤثر ثابت ہوتی ہے، چنانچہ غور کیا جائے تو ''ھدیۃ الشیعۃ'' میں حضرت الامام النانوتویؒ بعض بے حد الجھے ہوئے نازک ترین مراحل سے اپنے سنجیدہ ومؤثر طرز استدلال اور اپنے اعتدال پسند ذوق ومزاج سے خلق کریم کا سہارا لیتے ہوئے نکل گئے اور منجملہ دیگر خصوصیات کے یہ بھی اس کتاب کا وصف خاص ہے کہ باطل نظریات کا طاقتور لب ولہجے میں بھرپور اور مدلل مگر سنجیدہ ومعتدل رد بھی فرمادیا اور مصلحانہ ومصالحانہ طرز بیان سے مقابل کو صراط مستقیم کی نشاندہی بھی فرمادی گئی اور مابین بُعد میں مزید کوئی ناخوشگوار اضافہ بھی نہیں ہوا۔

چنانچہ اسی فکر ونظر کے تناظر میں ضرورت اس بات کی محسوس کی جارہی تھی اور اس پر مستزاد مختلف علمی شخصیات واجتماعیات کی جانب سے تقاضا بھی تھا کہ حضرت الامامؒ کے

(۱) ترجمہ: یا تمہیں مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے بھڑادے۔ (سورۃ الانعام: ۶۵)

(۲) ترجمان السنۃ، ج:۱، ص:۲۷۰، مولانا بدرعالم میرٹھی، ادارہ اسلامیات، لاہور

مصنفات ''ہدیۃ الشیعہ'' اور ''اجوبۂ اربعین'' پر عصر حاضر کے معیار فہم وقبول کے تناظر میں مذکورہ بہر دو مصنفات پر دراسہ کرایا جائے، جس کا مقصد اشاعت شیعہ عقائد ونظریات کے ان مباحث کے علمی جائزہ ودراسہ کو محیط ہے جو کہ ہدیۃ الشیعہ اور اجوبۂ اربعین جیسی تصانیف کے حوالے سے حضرت الامام النانوتویؒ کے افکار ونظریات پر مشتمل اُس مرقع علم کو منصۂ شہود پر لانا ہے جو کہ عصر حاضر کے مشہور محقق حضرت مولانا نورالحسن راشد صاحب کاندھلوی مدظلہ کے بقول'' یہ تصنیف علوم ولی اللّٰہی کے افادات کے ساتھ ساتھ ان اضافات وتوضیحات کو بھی محیط ہے جو کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے سلسلۂ تلمذ سے وابستہ اکابر علماء نے فرمائی ہے اور منجملہ ان افادات و اضافات کے ایک نہایت اہم اضافہ اور قیمتی و مدلل بحث وہ ہے جو کہ حضرت الامام النانوتویؒ نے اپنی کتاب ھدیۃ الشیعۃ (شیعہ مجتہدین کے ایک اعتراض کے جواب میں) تحریر فرمائی ہے، مگر افسوس کہ اس قیمتی بحث کی ویسی اشاعت اور استفادہ نہیں ہوا جو اس کا حق تھا، اور اس بحث کی گمنامی کچھ غیر متوقع بھی نہیں کیونکہ اول تو ھدیۃ الشیعۃ بھی (خاص طور سے اس زمانہ میں) میں بہت زیادہ نہیں پڑھی گئی، دوسرے یہ بحث ضمناً ایسی جگہ پر آتی ہے جہاں اس کی موجودگی کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے بھی اس کی اشاعت وافادیت کا دائرہ وسیع نہیں ہوا'' اسی تعلق سے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے ممدوح مکرم نامور عالم دین حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ'' حضرت الامام النانوتویؒ نے اپنی کتاب ھدیۃ الشیعۃ میں کتب حدیث کے طبقات اور اصول تنقید کو جس خوبی سے بیان فرمایا ہے اس کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اصول تنقید وقواعد تطبیق کو آپ سے بہتر کسی نے نہیں سمجھا، امام نانوتویؒ بڑے دعوے کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اقوال امام ابوحنیفہؒ کو حدیث کے موافق ثابت کرنے کا ذمہ میں لیتا ہوں لیکن تخریجات فقہاء کا میں ذمہ دار نہیں، جنہوں نے ان کی تقریر درس حدیث میں سنی ہے وہ اس کے شاہد ہیں کہ واقعی وہ اقوال ابی حنیفہؒ کی تقریر

ایسی ہی کرتے تھے جس کے بعد وہ بالکل حدیث کے موافق نظر آتے تھے، حدیث کو قول ابی حنیفہؒ کے مطابق نہیں کرتے تھے اس کا خلاف ادب ہونا ظاہر ہے بلکہ قول ابی حنیفہ کو حدیث کے مطابق کردیا کرتے تھے"۔(۱) بہرحال یہ ایک مطول اور مستقل بحث کا موضوع ہے جس کے لیے زیر نظر تحریر کا دائرہ وسعت اجازت نہیں دیتا ہے، حاصل کلام یہ کہ مختلف علمی حلقوں سے اس کی طلب تھی عصر حاضر کے تناظر میں اس بلند ووقیع بحث کا ایک مبسوط دراسہ علمی دوائر واجتماعیات کے علمی ذخیرے میں ایک لائق قدر و قیمت اضافہ شمار ہوگا۔

یہ ایک متفق علیہ اصول ہے کہ کسی بھی شخصیت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے شخصیت کے گرد وپیش کے ہمہ جہت احوال کے جائزے کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور یہ باب دینی، عائلی، تعلیمی، سماجی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی، انفرادی اور اجتماعی ہر قسم کے احوال کے تذکرے کو محیط ہوتا ہے، گرد وپیش کے احوال سے ذوق ومزاج نمو پاتا ہے، یہ خبر حلقۂ منتسبین ادارہ کے لئے باعث مسرت اور ادارہ کے لئے لائق افتخار ہے کہ اس وقیع علمی کام کو دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے جواں سال وفعال ڈائریکٹر واستاذ ادارہ جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کی تحریک پر ادارہ کے جواں سال و لائق قدر استاذ جناب مولانا محمد نوشاد نوری صاحب کی شبانہ روز عرق ریز محنت کے ساتھ یہ علمی کام بایں طور انجام پذیر ہوکر جلد ہی عربی زبان میں حجۃ الاسلام اکیڈمی کی جانب سے منصۂ شہود پر آرہا ہے جس میں مذکورہ بالا محتویات کو تمام ایسے ضروری مباحث سے مزین کیا گیا ہے جس سے کہ قاری کے سامنے شخصیت کے حوالے سے اجمال میں تفصیل آجاتی ہے جو کہ دراسہ کے انداز بیان کا حسن شمار ہوتا ہے۔

---

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، احوال آثار وباقیات ومتعلقات، ص: ۶۳۳، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، ناشر: حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، مظفرنگر

اس موقعہ پر مذکورہ بالا بہر دو شخصیات کے حوالے سے مفکر ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی رحمہ اللہ سابق ناظم ندوۃ العلماء کا یہ قول ذہن میں آتا ہے کہ ذہنی وفکری اس دور انحطاط میں اگر کسی ادارے اور اجتماعیت کو علمی شعور اور وسعت فکر ونظر رکھنے والا مخلص، محنتی، فعال اور دیانتدار رکن میسر آجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس ادارے اور اجتماعیت پر حق تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم سایہ فگن ہونے کی بین دلیل ہے، اس ناحیہ سے میں حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر انتظام علمی وتعلیمی اور انتظامی وتعمیری ارتقاء پذیر گذشتہ چھ سالہ حسن کارکردگی کو مذکورہ قول کی صداقت پر دلیل تصور کرتا ہوں۔

بارگاہ رب العزت میں دعاء ہے کہ حق تعالی بہر دو حضرات نیز اکیڈمی اور ادارہ سے منسلک دیگر تمام فعال رفقائے کار کے علم وعمل کو مزید ترترقیات سے بہرہ ور فرماتے ہوئے جملہ امور کو ظاہری ومعنوی برکات کے ساتھ قبولیت عامہ سے سرفراز فرمائیں۔
آمین یارب العالمین

وما توفیقی إلا باللّٰہ العلی العظیم

اسلام اور سائنس کے مناہج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی اشرف الاَنبیاء المرسلین و خاتم النبیین سیدنا و حبیبنا و نبینا و مولانا محمد النبی الکریم وعلی آلہ و اصحابہ و ازواجہ واتباعہ باحسان الی یوم الدین، امابعد :

ذات حق جل مجدہ نے اس مادی کائنات کو اپنی مشیت وحکمت اور ارادہ سے ایک نہایت ہی مضبوط و مستحکم قواعد وضوابط کے تابع فرمایا ہے جس سے کائنات کی کوئی شے خواہ اپنے حجم و جسامت کے لحاظ سے کتنی ہی عظیم تر ہو یا کتنی ہی خفیف ترین ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے مقصد خلق اور ودیعت شدہ صفات وخصوصیات کے اعتبار سے حق تعالی کی بیحد وکنار قوت تخلیق اور اس کی لا انتہاء عظمتوں کی منادو عکاس ہے، اگرچہ اس کائنات میں پائی جانے والی مخلوقات اپنی عظمت ورفعت اور ثقل وتجاذب اور حجم کے اعتبار سے حیرت بالائے حیرت کا محل ہو یا پھر باعتبار جسامت انسان کی قوت بصر، فہم وشعور اور احساس ووجدان اور قوت ادراک سے بھی وراء الوراء ہو، بروئے زمین ہو یا کرۂ ارض کے جگر کی پنہائیوں میں واقع ہو، سمندروں کی گہرائیوں میں پائی جانے والی ناقابل شمار مخلوقات کی اقسام سے تعلق رکھتی ہو یا فضائے بسیط کی ناقابل تصور مخفیات میں گم ہو ذرات زمین کے قلب میں واقع ہو، یا پھر ہواؤں کی گردشوں میں پوشیدہ ومستور تخلیقات سے متعلق ہو، غرض کہ کوئی بھی شے حق تعالی کے مقرر کردہ تخلیقی اصول وضوابط اور اپنے مقصد تخلیق ودائرۂ کار سے سر موانحراف

❁ مقدمہ: انگریزی ترجمہ "سائنس اور اسلام" از: حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مطبوعہ حجۃ الاسلام اکیڈمی

نہیں کرسکتی ہے، اور بحکم رب کائنات اپنے مقصدوجود کو انجام دینے پر مامور ہے، وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۱) (اور وہ اللہ ہی ہے جس کو آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوقات سجدہ کرتی ہیں، کچھ خوشی سے، کچھ مجبوری سے، اور ان کے سائے بھی صبح وشام اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں) اگرچہ انسان کی نظر میں کتنی ہی ادنی واعلی، اہم وغیر اہم دیدہ یا نادیدہ ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی بھی شے کائنات میں ایسی نہیں ہے جس کا وجود کسی مقصد سے وابستہ نہ ہو اور بہ لحاظ نافعیت یا دافع مضرت وہ کسی نہ کسی نوعیت سے انسان کی خدمت پر مامور نہ ہو، قطعا لازمی اور ضروری نہیں کہ ہر شے کی حکمت تخلیق ہمارے محدود ترین علم اور عقل وحواس میں سما سکے، حضرت موسی علیہ السلام کے حوالے سے اسرائیلی روایات میں ایک حکایت ملتی ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے چھپکلی کی حکمت تخلیق کے بارے میں سوال کیا کہ آپ نے اس کو کیوں پیدا کیا؟ جواب ملا کہ چھپکلی بھی مجھ سے یہی سوال کرتی ہے کہ موسی کی تخلیق سے کیا غرض مقصود ہے، نباتات جمادات سیارات حیوانات حشرات ارض شجر وحجر غرض کہ از زمیں تا فلک کوئی ایک شے بھی ایسی نہیں ہے جو کہ رب العالمین کی حکمت ومشیت کے تحت کسی نہ کسی مقصد تخلیق سے مربوط نہ ہو، اور از روئے قرآن بھی یہی حقیقت ثابتہ متبادر ہے، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲) حق تعالی نے اس کائنات میں کوئی بھی شے ایسی پیدا نہیں فرمائی جو کہ اپنے مقصد تخلیق میں اپنے خالق حقیقی کی مرضیات اور حکمتوں کے اقتضاء کی تکمیل کی پابند نہ ہو، اللہ تعالی کے انواع خلق میں انسان کو عطاء کردہ کلیدی جوہر عقل کی کاملیت کے سبب ایک بلند ترین مقام ہے جس سے کہ کائنات میں انسان کے مقام اشرفیت کو قائم رکھنے میں اس کا وظیفۂ عمل مرکزی کردار سے بایں طور وابستہ ہے کہ عقل انسانی اپنی خلقی فطرت کی وجہ سے تحقیق وجستجو شکوک وشبہات کلیات سے

(۱) سورۃ الرعد: ۱۵

(۲) سورۃ آل عمران: ۱۹۱

جزئیات کو علیحدہ کر کے اس سے مخالف وموافق عناصر میں تطبیق وانطباق کے راستے سے نئے کلیات قائم کرتی ہے نیز نئے نتائج کو تلاش کرنا نئے کلیات قائم کر کے اس کے جزئیات کو از سر نو تحلیل وتجزیات سے گذارنا اور اشیاء عالم کی حقیقت وماہیت اور خاصیات کا پتہ لگا کر اس کی کنہ تک پہنچے کی ہر لحظہ وپل کوشش میں لگے رہنا ہی عقل انسانی کا مقصد تخلیق ہے، ذات حق جل مجدہ کا ملائکہ علیہم السلام کے سامنے بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض بنی نوع انسانی کے اظہار تخلیق کے وقت کیے جانے والے سوال وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱) (اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ کہنے لگے کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے، حالاں کہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد وتقدیس میں لگے ہوئے ہیں، اللہ نے کہا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کے اس جواب میں ہی تخلیق آدم سے لیکر کائنات کی بساط لپیٹے جانے کے آخری لمحے تک اللہ تعالی کی حکمت تکوین کے زیر اثر اس کلیدی اور متلون جوہر عقل کی بوقلمونیوں اور کرشمہ سازیوں کی ہی تو جلوہ آفرینیاں ہیں جس میں انسان کے عہد بہ عہد ارتقائی عروج وکمال کے جملہ رموز ہائے سر بستہ کے تمام جوابات پوشیدہ ہیں جو لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر اس دنیا میں عقل انسانی کی وساطت سے اپنے اپنے الوان واحوال میں اوقات معینہ میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، اور بہ لحاظ کاملیت انسانی عقل اپنے خلقی امتیازات کی روشنی میں اللہ تعالی کا عطاء کردہ وہ حیرت آفریں جوہر بے بدل ہے جو کائنات میں دیگر مخلوقات عالم پر انسان کے شرف وکرامت اور تفوق وبرتری کی بنیادی علت ہے، جو کہ اللہ تعالی کے عطاء کردہ علم کی اساس پر کار پرداز عمل ہے، لیکن دنیا میں امن وعافیت کے حتمی قیام اور منطقی انجام کار کے اخروی

(۱) سورۃ البقرۃ: ۳۰

نتائج اور بہر دو عالموں کو صلاح وفلاح کے حوالے سے ہمکنار ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ عقل انسانی وحی الٰہی کے تابع رہے، مجرد عقل کی یہی تلاش مسلسل از آغاز تا انجام دنیا کے ارتقاء کی خشت اساس ہے، اوج وکمال اور پستی وزوال کے متعدد واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے، بنی نوع انسانی ابتدائے آفرینش کی سنگ وآہن اور نباتات وجمادات سے اپنی بنیادی ومعاشرتی ضروریات نیز موسموں کے سرد وگرم تغیرات اور حریف ورقیب، درند و وحوش سے اپنی دفاعی احتیاجات کو پورا کیے جانے کے آغاز سے لیکر آج کے مدہش وحیرت افزانی کے اس دور ارتقاء اور وقوع قیامت تک لمحہ ولحظہ کے انقطاع کے بغیر خالق کائنات کے کامل واکمل علم واختیار اور ارادے کے عکس وپرتو کے وسیلے سے اپنے تفویض کردہ منصب نیابت کے فرائض کو سرانجام دیتے ہوئے ایک جہود مسلسل سے مربوط ہے اور عہد رواں میں جبکہ انسان زمین کی پنہائیوں کے رموز ہائے سربستہ کے انکشافات سے لیکر فضائے بسیط میں دور دراز اجرام فلکی پر کمند ڈال دینے کی دھن اور مسابقت میں سرگرداں و مصروف عمل ہے تاکہ حقیقت کی اس اکائی تک رسائی حاصل کرسکے جس کے ذریعہ سے دنیا کی ہر ایک شے کسی نہ کسی نوعیت وکیفیت میں باہم دگر ایک دوسرے سے مربوط ہونے کے ساتھ اپنی کچھ منفرد قوتیں، متنوع صفات اور خاصیات وخصوصیات سے اپنی انفرادیت و فردیت قائم رکھے ہوئے ہے تاکہ جان سکے کہ کائنات کے اس اکمل ترین نظام ربانی اور اشیائے عالم میں اس کے متوازن ارتباط وانتفاعات کے بنیادی محرکات کیا ہیں، ظاہر ہے کہ اس حقیقت وماہیت تک راہنمائی اور اشارات کا بنیادی وکلیدی وسیلہ بجز ہدایات ربانی کے دوسرا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا ہے جس کا تذکرہ جابجا قرآن کریم میں احسان واکرام کے ذیل میں مضامین کے سیاق وسباق کے ضمن میں مختلف انداز میں مختلف مقامات پر ملتا ہے، اس زاویہ فکر ونظر سے اشیائے کائنات کی بنیادی علتوں تک رسائی کے اشارات نیز وہ تمام راہ علوم ومعارف جو اس کے ارتقاء کا ذریعہ بنے اس میں کوئی ایک شے اور کوئی ایک علم بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں انسان یہ دعوی کرسکے کہ میں نے اس کو مجرد عقل کے وسیلے

سے بغیر کسی پہلے سے موجود رہنمائی کے اس کا انکشاف کیا ہے، دنیا میں بیماری ہے تو شفا کے اسباب بھی حق تعالی نے جابجا اشیاء کی خاصیات میں موجود رکھے ہیں جو کہ غور وفکر اور تحقیق علم وفن کی راہ سے ظاہر ومنکشف ہوئے اور ہوتے رہیں گے، ذات حق جل مجدہ کی جانب سے علم ومعرفت اور شعور وآ گہی کے اس اہم ترین تحقیقی گوشہ کو ہم علم سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کی عملداری کا میدان طبعیات اور اس کی اساس تدبر وتفکر اور غور و خوض کی راہ سے مشاہدات تجربات تحقیقات ہر دم تلاش وجستجو اور اخذ واستنباط کے عمل سے عبارت ہے، گویا کہ کائنات اور اس میں پائی جانے والی مخلوقات اور عناصر واشیاء اور خاصیات کو عقل کی اساس پر اسباب کے راستے اور طبیعیاتی اصول وقوانین کے حوالے سے حقیقت کی بازیافت کا دوسرا عنوان ہی سائنسی علوم ہے جس کے مقدمات تحقیق وجستجو اور مشاہدات وتجربات پر قائم ہیں جن کا تعلق عالم شہود سے ہے جبکہ مابعد الطبیعیات کے سارے معاملات اس کے برعکس عالم الغیب سے متعلق ہیں جن کے مقدمات کی اساس ایمان ویقین اور اعتماد واعتقاد پر استوار ہے، واقعہ بھی یہی ہے کہ حق تعالی کے فضل کے طفیل اس کے علم ازلی سے اقل قلیل نسبت کی بدولت انسان کو حاصل توسیعی استعداد وصلاحیت سے متصف ہمہ جہت وہمہ نوع علم ارادہ اور اختیار کا پرتو ہی دراصل اس کائنات میں انسان کے امتیاز وتفوق اور ارتقائے مسلسل کی اصل علت ہے جس سے کہ مخلوقات عالم میں مسخر کائنات کی حیثیت سے اس کی منفرد شناخت قائم ہے بلکہ دیکھا جائے تو آدم علیہ السلام علم الاشیاء کی بناء پر ہی مسجود ملائک بھی قرار پائے تھے جس کی واقعاتی صداقت کو کلام اللہ نے بایں طور بیان کیا ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱) (اور آدم کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور (ان سے) کہا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتلاؤ)۔

(۱) سورۃ البقرۃ:۳۱

طبیعیاتی ماہرین فن کے مطابق تقریباً ہر ایجاد و انکشاف کے پیچھے ایک یا ایک سے زیادہ بنیادی دریافتیں ہوتی ہیں، بعض اوقات بنیادی دریافت صدیوں پرانی ہوتی ہے، نیوٹن کے قوانینِ حرکت کو سمجھے بغیر جیٹ انجن یا راکٹ ایجاد کرنا ممکن نہیں تھا، میدان عملداری کے علاوہ نفس سائنس کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ بنیادی طور پر تو سائنس ایک منظّم طریقۂ کار یعنی علمی اسلوب کے تحت کسی بات کو جاننے یا اس کا بایں طور علم حاصل کرنے کو کہا جاتا ہے، کہ اس کے مطالعے کا طریقہ اور اس کے نتائج دونوں ہی بعد میں دہرائے جاسکتے ہوں یا ان کی تصدیق کر سکتے ہوں گویا کہ وہ قابل تکرار ہوں اہل علم کے بقول فی الحال سائنس کا کوئی ایسا ترجمہ کرنے یا اگر کیا گیا ہے تو اس کو عام کرنے کی کوئی باضابطہ کوشش سامنے نہیں ہے کہ جو اس کو دیگر علوم سے الگ کر سکے اس لیے عموماً علم اور سائنس کا متبادل کے طور پر استعمال عام ہے، لہٰذا یوں کہہ سکتے ہیں کہ مطالعہ کردہ کسی چیز کو جان کر اس کی حقیقت و ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کا عنوان ہی دراصل علم سائنس ہے جس کی عمل آوری کا میدان عالم طبیعیات ہے، جبکہ مذہب کے مباحث عالم طبیعیات سے گذر کر مابعدالطبیعیات کے موضوعات سے متعلق ہیں جس کی دنیا مغیبات ظنیات وقیاسات پر اعتماد واعتقاد اور اس پر مکمل یقین وایقان سے قائم ہے جہاں نہ سائنس پہونچ سکتی ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت کو کسی تجرباتی یا مشاہداتی مرحلے سے گذار کر اس کی اصل حقیقت کا ادراک کیا جاسکتا ہے نہ ہی اس کی اصل کیفیت و ماہیت تک تجرباتی راہ سے پہونچا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی سائنٹفک واقعہ کی طرح بصری دلیل و آزمائش سے اس کا کوئی قطعی ویقینی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، غرض کہ حق تعالی نے طبیعیات اور مابعدالطبیعیات یا عالم امر اور عالم خلق کی ہر ایک شے کی عملداری میں اسی کے مطابق کچھ راہنما اصول وضوابط ظاہر و پوشیدہ انداز میں رکھے ہیں جن تک رسائی حاصل کرنے کو تدبر و تفکر تعمق و مطالعہ اور تلاش حقیقت کی متجسسانہ ذوق و مزاج اور صلاحیت سے ایک حد تک مربوط کردیا ہے، سولہویں صدی عیسوی کے نہایت مشہور و معروف سائنٹسٹ آئزک نیوٹن (ISAAC NEWTON) جو کہ طبیعیات دان،

ریاضی دان، ماہر فلکیات، فلسفی، کیمیادان اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن کو تاریخ انسانی میں اپنے میدان عمل کی ایک اہم ترین شخصیت کا درجہ حاصل ہے وہ اپنی مشہور تصنیف Philosophiae Naturalis Principia Mathematica جو کہ تاریخ سائنس کی ایک انتہائی اہم ترین کتاب مانی جاتی ہے جس میں مصنف نے کشش ثقل کا قانون اور اپنے تین استقرائی قوانین حرکت بتائے ہیں اور دونوں کے درمیان مماثلت ثابت کرتے ہوئے کائنات میں زمین کی مرکزیت کے اعتقاد کو مکمل طور پر ختم کرتے ہوئے سائنسی انقلاب کو آگے بڑھانے میں مدد فراہم کی ہے (ویکی پیڈیا) بالآخر اس کتاب کے اختتام پر مصنف یہ کہنے پر عاجز و مجبور نظر آتا ہے کہ عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں کسی ایسی نادیدہ وغیبی انتہائی طاقت کے زیر اثر ہے جس کے ارادہ ومشیت کے علاوہ کسی اور شے سے ظاہر ہی نہیں ہوسکتیں اور وہ ایسی واجب الوجود ہستی وہ قوت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہر جگہ ہر وقت موجود ہے (یعنی خدائے برتر ولامحدود قادر مطلق سمیع وبصیر وہی ہے) جو کائنات میں موجود سیارات کے درمیان برق رفتار توازن کے ساتھ محوری گردش کے معجز عقل عظیم ترین نظام کو سنبھالے ہوئے ہے نیوٹن جس حقیقت وعلت تک تلاش وجستجو اور استقرائی راہ سے تجربات کے ذریعہ پہنچتا ہے اس سے زائد از ایک ہزار برس قبل قرآن کریم کا یہ دعویٰ دنیا کے سامنے موجود تھا سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۱) (ہم انہیں اپنی نشانیاں کائنات میں دکھائیں گے اور خود ان کے اپنے وجود میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ یہی حق ہے۔ کیا تمہارے رب کی یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا گواہ ہے؟) اس آیت میں اللہ رب العزت نے انسان کی داخلی نشانیوں اور کائنات کے اندر جابجا ذرہ ذرہ میں موجود اپنی وحدانیت کی بکھری ہوئی خارجی نشانیوں کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے، جن کے حقائق ومشاہدات کو جان کر بصیرت وبصارت والے تمام

(۱) سورۃ فصلت: ۵۳

انسان یکساں انداز میں اپنی فطرت کی گہرائیوں سے خود ہی گواہی دینے پر مجبور ہو اٹھیں گے کہ جو چیز اللہ تبارک وتعالی نے بتا دی ہے وہ ہی حق ہے، کیونکہ قرآن حکیم کی تعلیم وحکمت اور مقصد انسان کی ہدایت اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کی اصلاح، اور رب کائنات کی بیحد وکنار عظمتوں کی معرفت کے علی الرغم اپنی ہستی کے تذلل کا ادراک ہے تاکہ انسان اس کی عطاء کردہ ناقابل شمار وقطار نعمتوں کے حقائق جان کر اپنے مقصد تخلیق رضائے رب کے لیے کوشاں وسرگرداں رہے، کائنات کے سربستہ رازوں کے حوالے سے قرآنی اشارات پر مشتمل آیات میں دعوت غور وفکر سے مطلوب ومقصود بھی معرفت رب سے الگ کوئی دوسری چیز نہیں ہے، جس کو بالفاظ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ معرفت رب مقصود اصل ہے اور کائنات میں غور وفکر کا تعلق مختلف نوعیّتوں کے وسائل ووسائط کے حوالے سے تلاش معرفت ہے، صوفیائے عارفین کے یہاں پایا جانے والا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب یہ قول بھی اسی حقیقت کی جانب مشیر ہے، **من عرف نفسہ فقد عرف ربہ** [۱] جس نے اپنے نفس کا ادراک کرلیا اس نے رب کی معرفت کو پالیا، اس مرحلے پر فکر کی اس غلطی کا اظہار برمحل ہوگا کہ سائنس کے ذریعہ منکشف حقائق اور اس حوالے سے استقرائی تجربات کو وسائل کے بجائے مقصود سمجھنے والوں کی جانب سے قرآن کی سائنسی تفسیرات کے ضمن میں ایک عام گمراہی کے طور الفاظ قرآنی کی دوراز کار تاویلات کرکے فی زمانہ مروج سائنس کے ہر مشہور نظریئے کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بھی لاعلمی کی بنیاد پر فکر کی غلطی میں شامل ہے، اس موضوع کے حوالے سے شائع زاہد مغل صاحب کی ایک سیر حاصل بحث اگست ۲۰۱۷ء کے علمی میڈیا پورٹل الحاد میں نظر سے گذری تھی جس کا ایک اقتباس جاری مضمون کے اس حصہ کی تشریح کے لیے مفید ہے:

”قرآن کے کائناتی اشارات کو سائنسی انکشافات کا تابع سمجھنے والوں کی اس سعی کے پیچھے یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ قرآن مجید سے کسی سائنسی نظریئے کا ثابت نہ ہوسکنا گویا

(۱) روح المعانی، ج ۷، ص: ۲۹۸

قرآن کے لیے ایک قسم کا عیب ہے۔لہٰذا ڈارون کے حیات انسانی کے نظریہ ارتقاء، کائنات کی ابتداء کی بگ بینگ تھیوری نیز زمین کی حرکت و سورج کی مرکزیت سے لیکر ایٹمی انکشافات تک کے نظریات قرآن سے نکالے جارہے ہیں اور ایسا کرنے میں ہی اسلام کا بھلا سمجھا جارہا ہے، اس قسم کے تفسیری شاہکار خصوصاً مصر کے علامہ طنطاوی کی تفسیر الجواہر میں دیکھے جاسکتے ہیں، جس کے بارے میں متعدد علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب میں سوائے قرآن کی تفسیر کے اور سب کچھ ہے، درحقیقت یہ مفروضہ قرآن کے اصل مقصد و موضوع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مذکورہ تفسیر کے حوالے سے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے شائع شدہ کتاب ذکر وفکر میں قرآن پاک پر مجموعہ انتخابات کے اپنے تنقیدی مقالہ میں جناب ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی صفحہ ۴۵-۴۶ رقم طراز ہیں کہ ’’مرحوم شیخ طنطاوی کے فکر و نظر کا زاویہ یہ ہے کہ امت مسلمہ نے فرائض سے متعلق آیات پر خوب غور وخوض کیا، لیکن قرآن کی ان سات سو آیات پر جو کائنات کے عجائب وغرائب اور علوم جدیدہ کی ترقیات سے متعلق ہیں غور کرنے کی زحمت نہ کی، لیکن یہ دور علوم ونظریات کا دور ہے، یہ نور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، آخر ہم کائناتی علوم سے متعلق آیات پر اسی طرح کیوں غور نہیں کرتے جس طرح ہمارے آباء واجداد نے میراث سے متعلق آیات پر غور کیا تھا؟ آپ اس تفسیر میں علوم کا خلاصہ پڑھنے کی توفیق پائیں گے اور ان کا پڑھنا علم الفرائض کے پڑھنے سے زیادہ افضل ہے اس لیے کہ علم الفرائض تو فرض کفایہ ہیں جبکہ کائناتی علوم کا مطالعہ فرض عین ہے کہ اس سے معرفت الٰہی میں اضافہ ہوتا ہے، جن علوم کو ہم نے قرآن کی اس تفسیر میں داخل کیا ہے انہی سے فقہاء نے تغافل برتا ہے اب یہ انقلاب کا زمانہ ہے حقائق کے ظہور کا دور ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے صحیح راستے کی ہدایت دیتا ہے۔‘‘

عقلیت کو معیار کل بنانے اور جدید ترقیات سے قرآن کریم کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں موصوف نے بسااوقات احادیث نبوی کی بھی پرواہ نہیں کی، انجیل غیر محرف مان کر اس سے قرآن پاک کو مطابق بنانے کی سعی کی اور جدید نظریات پر ایقان اتنا بڑھا کہ

عام مفسرین کی تفاسیر اور آراء وافکار سے بہت دور چلے گئے اسی وجہ سے ہم عصر علماء نے ان کی زبردست مخالفت کی اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اس نقطۂ نظر پر تنقید کی اور اسے قرآن کے مقصد نزول سے دور کردینے والی تفسیر قرار دیا، کچھ لوگوں نے مضامین لکھے اور محققین نے باقاعدہ کتابیں تصنیف کیں اور اس سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کی ان میں شیخ محمد شلتوت، شیخ امین خولی، سید محمد رشید رضا المصری اور شیخ محمد مصطفیٰ المراغی وغیرہ نے اس طرز تفسیر پر کڑی تنقید کی اور انہوں نے کھل کر لکھا کہ قرآن مجید صحیفۂ ہدایت اور منبع نور و حکمت ہے یہ عظیم کتاب نوع انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہے اور اس کا مدعا انسان کو صحیح طرز زندگی کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت وشرارت سے مسخ کردیتا ہے، قرآن زمین وآسمان کی ساخت، آثار کائنات کی نشانیوں اور اقوام بائدہ کے حالات پر گفتگو کرتا ہے اور مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق پر جرح وتنقید کرتا ہے تاکہ انسان کی غلط فہمی دور ہوسکے اور صحیح راہ سامنے آسکے، ان چیزوں کا ذکر وہ اس لیے نہیں کرتا ہے کہ اسے تاریخ طبیعیات یا فلسفہ کی تعلیم دینی ہے۔''

قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ جس میں فزکس، کیمسٹری، حیاتیات وغیرہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہوں بلکہ قرآن کا اصل موضوع نوع انسانیت کی اس راستے کی طرف ہدایت کرنا ہے جس پر عمل پیرا ہوکر وہ اپنے رب کے حضور سرخرو ہوسکے، چنانچہ کسی سائنسی نظریئے کا قرآن میں نہ ہونا کوئی عیب نہیں کیونکہ یہ قرآن کا موضوع ہی نہیں ہے اگر کوئی شخص قانون کی کسی کتاب میں کسی سائنسی ایجاد کی وجہ سے پیدا ہونے والی قانونی پیچیدگیوں کی تفصیلات دیکھ کر یہ طے کرلے کہ وہ سائنس کا ہر نظریہ اس کتاب سے نکالے گا تو ایسے شخص کی عقل پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے اور اس سے یہی کہا جائے گا کہ بھائی یہ قانون کی کتاب ہے نہ کہ سائنس کی دوسرے یہ کہ اس میں اگر کوئی سائنسی بات زیر بحث لائی بھی گئی ہے تو اسے قانون ہی کے موضوع کے تحت سمجھنا چاہئے۔ جس طرح قانون کی کتاب میں طب، فزکس، کیمسٹری کی تفصیلات کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں ایسے ہی قرآن میں سائنسی

بیانات کی تفصیلات کا نہ ہونا بھی کوئی عیب نہیں، نیز جس طرح کسی قانون کی کتاب میں کسی سائنسی ایجاد یا تاریخی واقعے کے درج ہونے سے وہ سائنس یا تاریخ کی کتاب نہیں بن جاتی، بالکل اسی طرح قرآن میں کسی سائنسی حقیقت کی طرف اصولی بات کے سیاق وسباق کے ذیل میں ضمناً اشارہ آ جانے سے قرآن سائنس کی کتاب نہیں بن جاتی ہے، جیسا کہ غور وفکر اور تدبر وتفکر کے ضمن میں کائنات کے حقائق و ماہیات کے حوالے سے چند آیات کا ذیل میں ذکر ہے جن کے ذریعہ سے غور وفکر کرنے والے کائنات کے سربستہ رازوں کے انکشاف تک پہونچے ہیں، چنانچہ ضروری ہے کہ ان کائناتی اشارات پر مشتمل آیات کی صحیح تفہیم کو قرآن کے عمومی موضوع کے تحت ہی سمجھا جائے، یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے قرآن میں ماضی کی کئی امتوں کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، اب اگر کوئی شخص قرآن کو تاریخ کی کتاب سمجھ لے اور اس میں ساری انسانیت کے تاریخی واقعات تلاش کرنا شروع کردے تو وہ سخت غلطی کا مرتکب ہوگا کیونکہ قرآن جب اور جہاں بھی کسی ماضی کے واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے تو بطور تاریخی حوالے کے نہیں بلکہ بطور ہدایت، نصیحت، عبرت، ہمت وصبر وغیرہ کے لیے کرتا ہے اور اس پس منظر میں رہ کر ہی ان واقعات کی درست تفہیم ممکن ہے۔ مثلاً کلام اللہ میں احسن القصص حضرت یوسف علیہ السلام کا طویل قصہ بیان کرنے کے بعد سورہ یوسف کی آخری آیت میں قرآن کہتا ہے لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (۱)، اگلے وقتوں میں غور وفکر کرنے والے ہوش مند لوگوں کے لیے ان واقعات میں عبرت حاصل کرنے کے مقامات ہیں، ایسے ہی کسی سائنسی بیان کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس میں عقل اور ایمان والوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں یا اس میں عقل والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے گویا کہ دوسرے لفظوں میں قرآن کا کسی سائنسی حقیقت کو بیان کرنے کا مقصد ہرگز کسی سائنسی نظریئے کی داغ بیل ڈالنا، یا لوگوں کو سائنس سکھانا یا انسانوں کو تسخیر کائنات پر ابھارنا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس حقیقت کو پا لینے پر انسان کی ابدی

(۱) سورۃ یوسف: ۱۱۱

نجات کا انحصار ہے بلکہ ہدایت انسانی کی خاطر اسے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جس پر غور کر کے وہ اصل حقیقت تک پہنچ کر اپنے خالق و مالک کی لا انتہا عظمتوں اور اس کے بیحد ونہایت فضل واحسانات کا ادراک حاصل کر کے خود کو اپنے رب کے حضور جھکا دے البتہ قرآن مجید رب کائنات کا کلام ہے لہذا اس میں کائنات کی شاہکاری تخلیق و مقاصد اور اشیائے کائنات کے اصولی حقائق اور اس کے اسرار ورموز کے اشارات کا پایا جانا بھی ناگزیر ہے جو کہ مختلف ادوار میں بنی نوع انسانی کے لیے انبیاء علیہم السلام کے دعوؤں کی حقانیت کی طرف توجہ دلانے کا ذریعہ بنیں تاکہ سائنسی نوعیت اور پیش گوئیوں کے قبیل کے معروضی اشارات غیر مسلم اہل علم اور علمائے سائنس کے لیے قرآن حکیم کی طرف توجہ دلانے کا ذریعہ اور ان اشاراتی وسائل کو مشاہداتی دلائل سے ثابت کیے جانے کا وسیلہ بنیں، اسی لیے قرآن نے ان علوم کی طرف جو دعوت دی ہے اس کا مقصد کائنات کے مظاہر میں تفکر وتدبر اور دنیا کی نعمتوں سے افادہ واستفادہ اور خالق کائنات کی وحدانیت کے علی الرغم اس کے بیحد ونہایت فضل واحسان کا تعارف بھی ہے جس کی حقیقت کائنات کی ہر شے میں نہاں و پنہاں ہیں اور ایسے ہی اس کے حقائق کو جان کر اس سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت پر مشتمل ہے، ارشاد باری ہے: اُنْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱) ، (ذرا نظر دوڑاؤ کہ آسمانوں اور زمین کیا کیا چیزیں ہیں) یہ اور اس جیسی متعدد دیگر آیات جس میں ارض و فلک کے مختلف حقائق وعجائب کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔‘‘

اس حوالے سے دوسری ایک اہم بات یہ بھی ہے جس کی طرف اس زاویہء فکر سے بھی غور کرنا ضروری ہے کہ کسی علم کے سائنس کہلانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کبھی حتمی اور قطعی نہ ہو، سائنسی علم وہی ہوتا ہے کہ جس میں ارتقاء کا عمل اور امکان ہمیشہ جاری رہے۔ سائنس کی کوئی بھی صداقت کبھی حتمی نہیں ہوتی بلکہ اس کے تمام تر حقائق عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں یعنی جسے تجربے کی روشنی میں آج جس بات کو حقیقت سمجھ کر مان لیا

(۱) سورۃ یونس: ۱۰۱

گیا ہے، ہوسکتا ہے کل کوئی نیا تجربہ اس کی تردید کردے اور وہ بات جسے اب تک حقیقت سمجھا جاتا تھا بدل کر ماضی کی حکایت اور آج کی گمراہی بن جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس میں حقائق کے انکشافات آج تک کی میسر شدہ معلومات اور مشاہدات اور استنباط و انطباق کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور چونکہ مشاہدات و مدرکات میں تنوع اور وسعت کا امکان بہر لمحہ ولحظہ موجود رہتا ہے، اس لیے سائنس کے ہر اصول وقاعدے میں تبدیلی وتغیر کے امکان کو کسی وقت بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ سائنس کی دریافت کردہ کسی بھی سچائی کو حتمی اور قطعی قرار نہیں دیا جاتا، جبکہ اسلام قطعی حقیقت کا دعویدار ہے کہ اس میں جو بات کہہ دی گئی ہے وہ حتمی، قطعی اور زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے، اگرچہ اس حقیقت کا یہ پہلو باندازِ دگر اپنے ناحیۂ فکر اور اپنی وسعت وگہرائی اور جزئیات وتفصیلات کے اعتبار سے اپنی جگہ مستقل موضوعات کے جامع عنوانات ہیں تاہم بایں طور یہاں پر اجمالا اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اہل سائنس کائنات کی جن صداقتوں تک تجربات و مشاہدات اور استقراء کی راہ سے پہونچے ہیں صوفیائے عارفین نے ان مقامات کو باطنی ریاضات وجہود اور سلوک ومعرفت کی راہ سے اسماء الٰہیہ کے وجدانی ادراک کے زیر اثر حقائق کونیہ کے ذیل میں سر کیا ہے، کیونکہ تصوف وہ علم ہے جس سے ذات کی معرفت تفصیلا حاصل ہوتی ہے اس کو علم حقائق اور علم حکمت سے بھی معنون کیا جاتا ہے، جس طرح حکمائے فلاسفہ حقائق اشیاء سے بحث کرتے ہیں ویسے ہی صوفیائے عارفین بھی حقائق اشیاء کی رسائی حاصل کرتے ہیں البتہ دونوں میں فرق یہ ہے فلاسفہ اپنی عقول جزئیہ سے بلا کسی راہبر کے معلول سے علت کی جانب رجوع کرتے ہیں جبکہ حضرات صوفیہ راہبر حقیقی رب کائنات کی وساطت سے من جملہ علم حاصل کر کے مخلوق سے خالق کی طرف اشیائے عالم کو مظاہر صفات حق جانتے ہوئے سیر کرتے ہیں اور البتہ مقاصد اور وجہات نظر مختلف ومتضاد ہونے کے باوجود رب کی توفیق سے حقائق اشیاء کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جہود و مساعی بہر دو جانب قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے، تاہم اسباب ظاہری اور اسباب

معنوی کے فرق کے ساتھ صوفیائے عارفین ان کائناتی حقائق کو مجملاً اٹھائیس اسماءِ الٰہیہ سے ظاہر کرتے ہیں: (۱) عقلِ کل (۲) نفسِ کل (۳) طبیعتِ کل (۴) جوہر ہبہ (۵) شکلِ کل (۶) جسمِ کل (۷) عرش (۸) کرسی (۹) فلک البروج (۱۰) فلکِ منازل (۱۱) فلکِ زحل (۱۲) فلکِ مشتری (۱۳) فلکِ مریخ (۱۴) فلکِ شمس (۱۵) فلکِ زہرہ (۱۶) فلکِ عطارد (۱۷) فلکِ قمر (۱۸) کرہ نار (۱۹) کرہ ہوا (۲۰) کرہ آب (۲۱) کرہ خاک (۲۲) مرتبۂ جماد (۲۳) مرتبۂ نبات (۲۴) مرتبۂ حیوان (۲۵) مرتبۂ ملک (۲۶) مرتبۂ جن (۲۷) مرتبۂ جامع یعنی (۲۸) انسانِ کامل، (بحوالہ مصباح التعرف لارباب التصوف: صفحہ ۱۳ و۱۰۳) مذکورہ حقائق کونیہ کی مستقل الگ الگ تشریحات گنج معرفت کا ایک عظیم ترین سرمایہ اور اپنی جگہ پر مستقل موضوعات کے عناوین ہیں، اس وقت حوالہ مجھے یاد نہیں تاہم اسی موضوع سے متعلق کسی مضمون کا ایک اقتباس ذہن میں بایں طور محفوظ ہے کہ سائنس کے بعض اصحاب علم مذکورہ حقائق کونیہ کو بذیل اسباب اپنے تحقیق وجستجو اور عمل کا موضوع قرار دیکر کائنات کے بعض راز ہائے سربستہ تک رسائی حاصل کر کے حیرت انگیز حقائق و انکشافات تک پہنچے ہیں۔

آمدم بر سر موضوع، انسان پر کائنات میں موجود اشیاء وعناصر کے اکتشافات و انکشافات کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان ہے، اب وہ سنگ وآہن سے اپنی ابتدائی ضروریات کو پورا کیے جانے کا دور آغاز ہو جبکہ سنگ بر سنگ کے تصادم سے انسان آگ جیسی عظیم قوت سے پہلی مرتبہ متعارف ہوا یا عہد کے رواں کے مدہش عقل انکشافات ہوں جبکہ فضائے بسیط سے لیکر سمندروں کی اتاہ گہرائیوں تک انسان متصرف ہے، کل سے آج تک کی ان دونوں انتہاؤں کے اساسی فلسفہ میں تدریج ارتقاء کا ایک ربط قائم ہے اور اسی ربط باہم کو قدم بہ قدم سائنس کے ارتقائی سفر میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اس پہلو کا اجمالی جائزہ یہ ہے کہ عقل انسانی کا سفر بھی جسم انسانی کی طرح اپنے عہد طفولت عہد بلوغت عہد شباب اور عہد کہولت سے گذر کر یہاں تک پہونچا ہے بحیثیت مجموعی

عالم خلق کی دیگر مخلوقات کے مثل یہ بھی اس دنیا کے فطری مزاج تدریج سے الگ نہیں ہے، آدم علیہ السلام کا دور عقل انسانی کا عہد طفولت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور عقل انسانی کے عہد بلوغت سے عبارت ہے جبکہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کا درمیانی زمانہ دور شباب ہے اور عقل کی پختگی یعنی دور کہولت کا آغاز نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قرن خیر سے ہوتا ہے جبکہ دنیا جدید علوم کی دہلیز سے ارتقاء کے نئے سفر کی پرواز کے لیے پر تول رہی تھی اس لحاظ سے چھٹی صدی عیسوی عقل کی پختگی، علوم وفنون، بصیرت ومعرفت، معلومات وتجربات، شعور وآگہی اور جہاندیدگی کے نئے فکری زاویوں کی جلوہ نمائیوں کا دور آغاز ہے جس کے بعد دنیا متعدد علوم ومعارف کی ہمہ جہت نیرنگیوں سے متعارف ہوئی، اور اس حقیقت واقعہ میں کوئی کلام نہیں کہ دنیا میں کوئی علم بھی تو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کلام اللہ کی انتہائی بنیادی راہنمائی اور ہدایات ایک یا ایک سے زائد اسلوب بیان میں موجود نہ ہوں جس کی اساس پر از ابتداء تا انتہاء دنیا میں پائے جانے والے علوم کے ارتقاء کی یہ عمارت استوار ہے، چنانچہ دنیا میں پائے جانے والے علوم ومعارف آفرینی کا قرآنی ہدایات و رہنمائی کی روشنی میں لیا جانے والا جائزہ ہمیں اس حقیقت تک پہونچنے میں مدد فراہم کرتا ہے کہ سائنسی ترقیات اور علوم کے تنوعات کے ارتقائی سفر کو وسائل ووسائط کے اعتبار سے اساس قرآن کریم ہی فراہم کرتا ہے، اس کا ایک نہایت اجمالی اور مختصر سا نقشہ تفسیری تشریحات کی طوالت سے الگ قرآن کی اشاراتی راہنمائی پر مشتمل یوں سامنے آتا ہے۔

۱۔ علم الاخلاق، **اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ** (۱) (تم برائی کا دفعیہ ایسے طریقے سے کرتے رہو جو بہترین ہو، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ہم خوب جانتے ہیں)۔

۲۔ علم الکائنات (Cosmology) **اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا،** (۲) (جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، کیا انہیں یہ معلوم

(۱) سورۃ فصلت: ۳۴ (۲) سورۃ الانبیاء: ۳۰

نہیں ہے کہ سارے آسمان اور زمین بند تھے، پھر ہم نے انہیں کھول دیا)۔ یا ثُمَّ اسْتَوٰی إِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِیَا طَوْعاً أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَیْنَا طَآئِعِینَ [۱] (پھر وہ آسمان کی طرف متوجّہ ہوا جب کہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے کہا: چلے آؤ چاہے خوشی سے یا زبردستی، دونوں نے کہا: ہم خوشی خوشی آتے ہیں)۔

۳ - علم نباتات (Botany) وَهُوَ الَّذِی مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِیهَا رَوَاسِیَ وَأَنْهٰرًا وَّمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ إِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَتَفَكَّرُونَ [۲]، (اور وہی ذات ہے جس نے یہ زمین پھیلائی، اس میں پہاڑ اور دریا بنائے، اور اس میں ہر قسم کے پھلوں کے دو دو جوڑے پیدا کیے۔ وہ دن کو رات کی چادر اڑھا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ساری باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کریں۔)

۴ - علم آب (Hydrology) وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ أَفَلَا یُؤْمِنُونَ [۳]، (اور (ہم نے) پانی سے ہر جاندار چیز پیدا کی ہے، کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے؟)

۵ - علم الحیوانات (Zoology) وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِی الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِن شَیْءٍ ثُمَّ إِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُونَ [۴]، (اور زمین جتنے جانور چلتے ہیں، اور جتنے پرندے اپنے پروں سے اڑتے ہیں، وہ سب مخلوقات کی تم جیسی ہی اصناف ہیں۔ ہم نے کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر ان سب کو جمع کر کے ان کے پروردگار کی طرف لے جایا جائے گا۔)

۶ - علم الارضیات (Geology) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

(۱) سورۃ فصلت: ۱۱ (۲) سورۃ الرعد: ۳

(۳) سورۃ الانبیاء: ۳۰ (۴) سورۃ الانعام: ۳۸

فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ (۱) (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے رنگ برنگ کے پھل اگائے؟ اور پہاڑوں میں بھی ایسے ٹکڑے ہیں جو رنگ برنگ کے سفید اور سرخ ہیں، اور کالے سیاہ بھی)۔

۷ - علم الحشرات (Entomology)، وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ، ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۲)، (اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں اور درختوں میں اور لوگ جو چھتریاں اٹھاتے ہیں ان میں اپنے گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے اپنی خوراک حاصل کر، پھر ان راستوں پر چل جو تیرے رب نے تیرے لیے آسان بنا دیے ہیں۔ (اسی طرح) اس مکھی کے پیٹ وہ مختلف رنگوں والا مشروب نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ یقیناً ان سب باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سوچتے سمجھتے ہوں۔)

۸ - علم الحیاتیات (Biology) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (۳) (ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا)

۹ - علم النفسیات (Psycology) وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (۴)، (اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) خوف سے اور (کبھی) بھوک سے (کبھی) مال و جان اور پھلوں میں کمی کر کے اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں ان کو خوشخبری سنا دو۔)

(۱) سورۃ فاطر: ۲۷ (۲) سورۃ النحل: ۶۸
(۳) سورۃ الحجر: ۲۶ (۴) سورۃ البقرۃ: ۱۵۵

۱۰ - علم الافلاک وفلکیات (Astronomy)، فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحٰى فِي كُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ [۱] (چناں چہ اس نے دو دن میں اپنے فیصلے کے تحت ان کے سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب حکم بھیج دیا اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو چراغوں سے سجایا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ اس ذات کی نپی تلی منصوبہ بندی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے جس کا علم بھی مکمل۔)

۱۱ - علم ہوابازی، (Aeronotics) أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِي جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ [۲]، (کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ وہ آسمان کی فضا میں اللہ کے حکم کے پابند ہیں؟ انہیں اللہ کے سوا کوئی اور تھامے ہوئے نہیں ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہوں۔)

۱۲ - علم البحریات، أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ أَن تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهٖ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ [۳]، (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے کام میں لگا رکھی ہیں اور وہ کشتیاں بھی جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں؟ اور اس نے آسمان کو اس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر زمین پر نہیں گر سکتا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والا، بڑا مہربان ہے)۔

۱۳ - علم تقویم (نظام شمسی وقمری) هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُورًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُونَ [۴]، (اور اللہ وہی ہے جس نے سورج کو سراپا

---

(۱) سورۃ فصلت: ۱۲
(۲) سورۃ النحل: ۷۹
(۳) سورۃ الحج: ۶۵
(۴) سورۃ یونس: ۵

روشنی بنایا اور چاند کو سراپا نور، اور اس کے (سفر) کے لیے منزلیں مقرر کردیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں کا) حساب معلوم کرسکو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بغیر کسی صحیح مقصد کے پیدا نہیں کر دیا، وہ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے جو سمجھ رکھتے ہیں)۔

۱۴ - علم طبیعیات (Phisical Science): الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [۱] (جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔)

۱۵ - علم اسلحہ سازی (جنگی ودفاعی ہتھیار، آرمری) وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ [۲]، (اور ہم نے انہیں تمہارے فائدے کے لیے ایک جنگی لباس (یعنی زرہ) بنانے کی صنعت سکھائی تاکہ وہ تمہیں لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے بچائیں۔ اب بتاؤ کہ کیا تم شکر گزار ہو؟)

یہ اور اس جیسے دنیا کے تمام متعدد علوم ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے راہنما خطوط سے انسان کو آگاہ کیا اور یہی وہ دستور العمل و رہنما اصول ہیں جن کی اساس پر انسان غور و فکر، تدبر و تفکر اور تجربات و مشاہدات کی راہ سے اپنا طبیعیاتی ارتقائی سفر طے کر رہا ہے، اور انسان حیات کے ابتدائی درجے سے ترقی کرکے بہت سی تبدیلیوں کے بعد موجودہ صورت حال تک پہنچا ہے گویا اس حقیقت کو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی جو کہ نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور بعثت ہے وہ نہ صرف انبیاء اولین و آخرین پر نازل شدہ شرائع کے ہی اتمام کا دور ہے بلکہ دنیا و آخرت کی نعمتوں کے اور بنی نوع انسانی پر اللہ تعالی کے مختلف نوعیّتوں کے انعامات کے اعلان عام سے بھی

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۹۱ (۲) سورۃ الانبیاء: ۸۰

عبارت ہے، اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا[1] (آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو بطور دین پسند کیا ہے) اس مقام پر وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کی وسعت ومعنوی گہرائی دنیا وآخرت کی تمام نعمتوں کو محیط ہے جس میں انسان کے مقصد تخلیق رضائے رب جو کہ منتہی مقصود حیات ہے وہ بھی شامل ہے اور اِنِّی أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ کے ذیل میں بطور وسائط ووسائل کے اس کی حکمت کرم ونوازشات کے اتمام کی جانب بھی اشارہ ہے، گویا کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کا عہد نبوت اور کلام اللہ کا نزول تاریخ بنی نوع انسانی کے لیے سنگ میل کے طور پر ایک نئے ارتقائی دور اور دنیا کے اختتامی عہد کا آغاز ہے، غرض کہ انفس سے لیکر آفاق تک اللہ تعالیٰ کی ایسی صنعت اور حکمت کے کروڑ ہا کروڑ لطائف اور بے شمار عجائبات وغرائبات ارض و سماء اور کائنات وعوالم میں رب العالمین کی قوت قاہرہ کی شہادت وگواہی کے طور پر تفویض کردہ فرائض کی انجام دہی کے لیے موجود ومصروف ہیں، چاند، سورج، ستارے، نباتات و جمادات حیوانات اور عناصر اربع بادونار، ماء وخاک اور خلائے بسیط میں موجود متوازن سرعت رفتار سے گرم سفر نا قابل شمار وقطار بلین ٹریلین کہکشائیں ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص ربط سے مربوط ہونے کے ساتھ ذات حق جل مجدہ کی نا قابل تخیل و خیال قدرت کی لاانتہاء وسعتوں کا اشتہار ہیں، جو کہ قرآن کریم کے نزول سے قبل انسان کی فکری پرواز اور عقل وبصیرت کے لیے غامض ودقیق معمہ تھا، تاریخ بنی نوع انسانی میں اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے انسان کے فکر وخیال میں جمے صدیوں پرانے توہمات پر ضرب لگاتے ہوئے حقائق سے روشناسی کے دعوؤں سے انسانیت کو متعارف کراتے ہوئے راہ ہدایت کی طرف پیش قدمی کی دعوت دی اور انفس وآفاق کی بصیرت افروز سچائیوں کو بصیرت کے راستے بصارت بخشی اور اسلام کے دعاوی کو مشاہداتی دلائل وثبوت فراہم کیے

(۱) سورۃ المائدۃ:۳

جانے کے لیے ایک طبقے کو منتخب و متعین کر دیا، ایک طرف اسلام کے پیش کردہ دعاوی ہیں تو دوسری جانب عالم شہود کے یہ منکشف دلائل ہیں، اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہے کہ محدود ترین مجرد جوہر عقل کی قوت ادراک نا قابل شمار و قطار مخلوقات عالم کے حقائق و ماہیات و کنہ تک دخل یابی اور دسترس سے بصورت علم روشن ہدایات ربانی کے بغیر عاجز ہے اور علم کا بھی اتنا ہی حصہ انسان کے لیے مختص کیا گیا ہے جس کا خالق کائنات کی حکمت و مشیت سے انسان متحمل ہو سکتا تھا، وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱) اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے،، شمس و قمر کی نورانیت سے اربوں کھربوں گنا روشن تر حقیقت یہ ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان اوصاف و صفات میں کسی بھی طرح کی کوئی نسبت قائم کرنا عقلاً امر محال ہی نہیں بلکہ واہمہ و خیال سے بھی وراء الوراء ہے اللہ تعالی کے علم ازلی اور انسان کو عطاء کردہ اقل قلیل علم کو محض فہم انسانی کے لیے قلیل کے لفظ سے تشبیہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن اگر اس نسبت علم کو بھی واقعیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو انسان کی مادی عقل کو مطمئن کرنے کے لیے مادی تمثیل سے یوں سمجھیے کہ تمام کائنات میں ماوراء عقل تعداد میں موجود سمندروں کے پانی کو ایک طرف رکھا جائے اور سوئی کے ناکے پر لگے قطرۂ آب کو دوسری طرف، جس طرح سوئی پر لگے قطرۂ آب اور لامحدود سمندروں کے پانی کی وسعتوں میں کوئی نسبت تساوی قائم نہیں کی جا سکتی ہے اسی طرح خالق و مخلوق کے درمیان علم ازلی اور مخلوق کے عطائی علم میں بھی کسی قسم کے مساواتی تصور کا واہمہ بھی محال اور ناممکن ہے، اب اس کو کائنات کی عروجی مخلوق انسان پر ذات حق جل مجدہ کے بیحد و نہایت فضل و احسان اور کرم و نوازش کے علاوہ کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کائنات کی ہر شے میں کچھ مخصوص صفات ودیعت فرمائیں اور اس میں موجود کارفرما فطرت کے اصول و ضوابط میں گہرائی کے ساتھ غور و فکر اور تدبر و تفکر کی راہ سے اشیاء کے حقائق و خاصیات کے علم تک انسان کے محدود ترین علم کی راہ باریابی کو ہموار فرماتے ہوئے اپنی توفیق و رضا سے

(۱) سورۃ الاسراء:۸۶

ممکن الوقوع بنا دیا جس کا عقل انسانی تحمل بھی کر سکے اور وہ اس کی فطری کارگزاری کے دائرہ میں بایں طور بھی آسکے کہ ایک شے کی خاصیات کو دوسری اشیاء میں موجود خصوصیات پر منطبق کر کے اس کے مثل دیگر جزیات یا اس کی متخالف ومتحارب قوتوں پر تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نئے کلیات دریافت کیے جانے اور ان کے جزیات کو نئے کلیات پر انطباق واستقراء اور تجربات کی راہ سے متنوع نتائج تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جانا دائرۂ ممکنات میں آسکے، عقلی تجربات کی انہی سحر آفرینیوں کے حاصل شدہ نتائج ہی ہیں جس کو ہم علم سائنس کے عنوان سے موسوم کرتے ہیں جو علم کی راہنمائی میں عقل کی جولان گاہ ہے، نظام کائنات کی بقاء واستحکام کے لیے یہ بھی ایک لازمی امر حکمت تھا کہ عقل انسانی میں تساوی نہیں رکھی گئی بلکہ نظام کائنات میں قانون تکوین کے تحت تفاوت قائم رکھا گیا، اور دنیا میں علم وفہم اور شعور وآگہی کے یہ تنوعات اسی حکمت تکوین کے مرہون منت ہیں، مثلاً زمین پر سیب کو گرتے ہر ایک دیکھتا ہے ایک عام آدمی اس کو معمول کا ایک واقعہ جان کر آگے بڑھ جاتا ہے لیکن آئنسٹائن (Einstein) کا ذہن اور فکر وخیال وہیں ٹھہر جاتا ہے اور وہ اس کے زمین پر گرنے کی اصل علت وحقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا متلاشی ہو جاتا ہے، لہذا اس کا ذہن غور وفکر اور تجربات کے نتیجہ میں زمین اور فضائے بسیط میں موجود دیگر سیارات کی کشش ثقل (Gravity) کی دریافت کرنے میں کامیاب ہوا اور وہ اس انکشاف کا موجد کہلایا حالانکہ تحقیق وتفکیر کے راستے سے یا اتفاقی طور پر اشیائے کائنات میں ودیعت شدہ اصول وقوانین کے انکشاف واکتشاف سے انسان میں حقیقی صفت ایجاد پیدا نہیں ہوگئی بلکہ وہ محض ایک دریافت اور انکشاف ہے جو کہ پہلے سے موجود اصول و قوانین اور ضوابط عالم میں گہرے غور وفکر اور تدبر وتفکر کے منطقی نتائج کے طور پر منکشف ہوئے ہیں، کیونکہ وہ قوانین تو اس کے روز تخلیق سے اس میں کارفرما ہیں لیکن اب تک انسان کے دائرۂ عقل سے باہر تھے انسان نے تو صرف اتنا کارنامہ انجام دیا کہ قدرت کے مقررہ قوانین سے آشنائی حاصل کر کے ان کے صغریٰ وکبریٰ کو جان کر اپنے وظیفۂ عقل اور

تدبر و تفکر کی راہ سے اپنی ضرورت کے مطابق مختلف راستوں سے جاری کر دیا یا ایسے ہی موافق و مخالف قوتوں کو آپس میں ٹکرا کر کسی نئی قوت اور اس کے متنوع نتائج کا انکشاف کیا ہے، تقریب فہم کے لیے ایک سادہ سی مثال آگ اور پانی کی ہے کہ دونوں عناصر ایک دوسرے کے لیے اس درجہ متضاد قوتیں ہیں کہ اگر پانی کا زور آگ پر چل جائے تو وہ آگ کے وجود کو فنا کر دینے کے لئے درپۓ آزار ہے یا اس کے برعکس اگر آگ پانی پر زور پکڑ لے تو وہ اس کی خاصیت کو نیست و نابود کر کے ہوا میں تحلیل کر دے، انسان نے ان دونوں قوتوں کے درمیان ایک معدنی شے کو حد فاصل بنا کر دونوں قوتوں کو آپس میں ٹکرا دیا جس سے ایک نئی اور قوی تر عنصر نے جنم لیا جو بھاپ کہلائی جس کی قوت کے بل پر انسان نے اپنے کارخانوں اور فیکٹریوں میں لوہے اور دیگر معدنیات سے بنی بھاری بھرکم مشینوں میں تیز رفتار حرکت پیدا کر کے افادہ و استفادہ کی متنوع شکلیں پیدا کر دیں، دیکھا جائے تو یہ دو مخالف خاصیات دونوں عناصر کی خلقی فطرت کا پہلے سے ہی حصہ ہیں انسان کا کارنامہ ان کی خاصیات سے واقفیت حاصل کرنا اور متصادم تجربہ کی راہ سے اس کے منطقی نتائج کا انکشاف کرنا ہے، علیٰ ہذا القیاس دنیائے علم و معرفت میں اسی فن سائنس کی ہی کرم گستریاں ہیں جو ہوا، فضا، خلا، میدان، سمندر، بستی، جنگل ہر جگہ انسان کے قدم بہ قدم جلوہ نما ہیں اور انہی موافق و متصادم تجربات کی اساس پر حاصل شدہ نتائج کا دوسرا عنوان انسان کے سائنسی سفر کا ارتقاء ہے۔

عالم میں موجود نظام عمل کے صیغوں میں ایک بڑا صیغہ وہ ہے جس کا موضوع حقائق اشیاء کی دریافت سے معنون ہے تاکہ قوانین قدرت تک راہنمائی اور اس کی صداقتوں تک عقل انسانی کو رسائی حاصل ہو سکے، سائنس اور مذہب اور اس میں بھی خاص طور پر دین اسلام اپنے موضوع و مقصد کے اعتبار سے علم و معرفت کے بالکل جدا اور دو مختلف صیغوں کا عنوان ہے اور بہ لحاظ مقصود دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے قطعاً جدا مختلف ہے، گویا کہ سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے مذہب کا وہ نقطۂ آغاز ہے، سائنس کی بحث کا موضوع

طبیعیات سے شروع ہو کر طبیعات پر منتہی ہوتا ہے جبکہ مذہب کے حقائق طبیعیات سے گذر کر مابعد الطبیعیات تک میں نفوذ کرتے ہیں، سائنس کے مباحث وتحقیقات کا تعلق تمام تر فطرت کے واقعات و مشاہدات اور تجربات سے ہے جبکہ مذہب کی اساس کلیۃ فوق الفطرت اور تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے ماورائی حقائق پر ہے مثلاً حق تعالیٰ کی ذات و صفات، ملائکہ، روح، قیامت حشر ونشر، جنت ودوزخ عالم برزخ حیات بعد الممات وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ وہ ازلی حقائق ہیں جس کے قریب سے بھی نہ سائنس کا گذر ہے اور نہ یہ اس کا موضوع ہی ہو سکتے ہیں لہٰذا دعوی اور دلیل کے ربط باہم کے مثل تعلق کے علاوہ اگر سائنس اور اسلام کے مابین مقصدی بنیادوں پر کسی دیگر ربط کی تلاش کرنے کوشش کی جائے گی تو وہ سعی لاحاصل اور بے نتیجہ کوشش ہی ثابت ہوگی، اسی حوالے سے جناب حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ اپنے مضمون مذہب اور عقلیات میں مذہب و سائنس کے درمیان واضح فرق کی توجیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مذہب اور سائنس کی بے تعلقی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے عالم شہود میں پہلے ان کے باہمی فرق اور بعد حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے، مثلاً ریل کی دو گاڑیوں کا آپس میں متصادم ہو جانا عین قرین عقل و قیاس ہے اور عام مشاہدہ ہے کہ دو ٹرینیں ٹکرا جاتی ہیں لیکن ریل اور پانی کے جہاز میں تصادم ممکن نہیں ہوسکتا ہے اس لیے کہ دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے قطعاً جدا اور مختلف ہے ریل پانی میں نہیں چل سکتی اور جہاز خشکی پر نہیں تیر سکتا، بعینہ یہی حال سائنس اور مذہب کا ہے کہ سائنس کا مذہب کے دائرۂ عمل میں دخل اس سے زیادہ محال اور ناممکن ہے جتنا کہ ریل اور جہاز کا ٹکرا جانا البتہ ایک طبقہ وہ ہے جو کہ مذہب کو سائنس کے مدمقابل ہی نہیں بلکہ سائنس کے ارتقائی راستے میں مذہب کو سد راہ جانتے ہوئے دہریت پسندانہ الحادی نظریات کا قائل ہے اور مذہب کو سائنس کے لیے مضرت رساں ہی نہیں بلکہ سم قاتل کے طور پر پیش کرتا ہے، یہ طبقہ جو سائنس کی ترقیات پر آنکھ بند کر کے ایمان رکھتا ہے اور مذہب وعقائد کو سائنس کے ارتقاء میں مانع جاننے کا قائل

ہے دراصل اس کے سامنے یورپ میں کلیسا اور چرچ کی استبدادی حکمرانی کے دور میں کلیسائی ظلم واستبداد کی ظلمت آلود تاریخ ہوتی ہے جب کہ برسر اقتدار مذہبی مقتدا سائنسی دریافت اوراس کے ارتقاء کواپنی حکمرانی کے لیے شدید خطرہ سمجھتے تھے اورانہی اندیشہ ہائے دور دراز اور حکمرانی کے خوف زوال کے زیراثر اس نظام کے مقتدران نے سائنسی بنیاد پر قائم نظریات کی ترویج وتجربات کوانتہائی ناقابل معافی تعزیری جرم قرار دیدیا تھا۔“

یورپ میں مذہب وسائنس کی خوں آشام معرکہ آرائیوں کی بنیاد دراصل وہ خودساختہ مفاد پرستانہ وخودغرضانہ نظریات تھے جن کو چرچ نے بائبل کا حصہ بنا کراس کی تعلیمات میں داخل کیااورعوام الناس پراپنی مذہبی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے دلیل کے طور پر نافذ رکھا، مثلاان کے ایک عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا زمین پر وجود کائنات میں زمین کی مرکزیت کی دلیل قرار پائی جبکہ سورج کی مرکزیت اور زمین کی محوری گردش سورج کے تابع ہونے کے سائنسی انکشاف نے اس عقیدہ پر براہ راست ضرب لگائی جس سے کہ چرچ کے ان نظریات کا اعتبار متزلزل ہوگیا جس کوعقیدہ کے طور پر انہوں نے مذہب کا حصہ قرار دے رکھا تھا، وہ جانتے تھے کہ سائنس کا ارتقاء یہ اوراس جیسے اور بہت سے ان خودساختہ عقائد کو زمیں بوس کردے گا جن کی بنیاد پر حکمرانی کی عمارت استوارتھی، لہذا چرچ کا حکمراں طبقہ سائنسی تحقیقات کے برخلاف شمشیر بدست صف آراء ہوگیا، یہاں تک کہ صرف سائنٹسٹ، محققین اورفلاسفہ ہی نہیں بلکہ فلکیات وارضیات اورعمرانیات اور دیگر سائنسی حقائق ومتعلقات کے بارے میں واجبی سا شوق رکھنے والے شائقین اوراس حوالے سے معمولی وسطحی مطالعہ و معلومات میں دلچسپی رکھنے والے افراد پر بھی چرچ کے استبدادی قوانین نافذ ہوئے اوران کو ریاست کا باغی قرار دیکراس ظالم حکمراں طبقے نے پوپ کے حکم پر ایسی ایسی وحشتناک سزائیں نافذکیں کہ دنیا کی انسانیت سوز تاریخ ظلم وبربریت اور وحشت انگیزی میں اس کی دوسری کوئی مثال ملنی مشکل ہے بقول شخصے کہ سزا پانے والوں کونسلوں کے لیے نشان عبرت بنا کر رکھ دیا آج بھی یورپ کے عجائب خانوں میں اس زمانے میں دی جانے والی

دردناک سزاؤں کو مومی مجسموں اور اس دور کے اصل ہیبت ناک آلات ظلم وتشدد کو اسکے تاریخی وقائع کے ساتھ اس دور کی سیاہ تاریخ کے بطور محفوظ رکھا گیا ہے کیونکہ اس دور کا ظالم استبدادی طبقہ واقعیت کے اس پہلو کو جانتا تھا کہ اگر لوگوں میں دنیا کے سائنسی حقائق کا شعور بیدار ہو گیا تو توہمات کی بنیاد قائم کردہ مکر و فریب اور دجل سازی کا وہ سارا جال تار بود ہو جائے گا جس کی بنیاد پر ان کی ظالمانہ و جابرانہ حکمرانی قائم تھی، اور بہرحال یہ ایک فطری اصول ہے کہ عمل میں جو شدت ہو گی ردعمل کا دور اس سے کہیں زیادہ شدت وقوت کے ساتھ ظاہر ہو گا اور یورپ میں ایسا ہی ہوا کہ جب پوپ کلیسا اور چرچ کے خلاف خوں آشام علم بغاوت بلند ہوا تو ان کی استبدادی حکمرانی خس و خاشاک کی طرح بکھر گئی اور مذہب کی آڑ لیکر خودساختہ قوانین استحصال نافذ کرنے والے اس درندہ صفت طبقے کو روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں مل سکی اور دھائیوں پر مشتمل پر جاری اس کشمکش کے نتیجہ میں یورپ میں عام رائے مذہب کی مخالف ہو کر دوسری انتہاء پر پہونچ گئی جس کے نتیجہ میں سیاسی مقاصد کے تناظر میں اس نظریہ کو فروغ دیا گیا کہ دنیا کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ اگر کچھ ہے تو وہ مذہب ہی ہے اور یہاں سے مذہب بیزاری اور الحاد کا ایک ایسا نیا دور شروع ہوا کہ جس نے ساری حدوں کو پیچھے چھوڑ دیا، اور اسی انتہاء پسندانہ سوچ کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ نظریۂ مادیت کو الحاد اور انکار مذہب کی بنیاد بنانے میں سب سے زیادہ جس چیز کا حصہ رہا وہ تین صدیوں میں مدہش و حیرت انگیز سائنس کے نت نئے عظیم الشان انکشافات وتحقیقات کے نتائج ہیں اور دنیا کی ارتقائی راہ کو بنیادی روشنی فراہم کرنے والے دین اسلام سمیت تمام مذاہب عالم کو اس طبقے نے ایک ہی خانے میں حصر کر دیا، گویا کہ یہ دونوں نظریات اپنے انتہاء پسندانہ ردعمل کے طور پر تاریخ انسانی میں درج ہوئے، حالانکہ قرآن نے جا بجا انسان کی توجہ تدبر و تفکر اور سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ سمیت کائنات کی متعدد تخلیقات میں غور وفکر کی طرف مبذول کرائی ہے تاکہ انسان ذات حق جل مجدہ کی قوت قاہرہ اور قوت تخلیق کی بیحد و کنار عظمتوں کے تناظر میں اپنی ہمہ جہت وجودی حقارت کے علی الرغم حق تعالی کے فضل و احسان کا شعور و ادراک پا کر تسخیر

کائنات کے حوالے سے اس عظیم تر نعمت وشفقت پر اس کا شکر گزار بندہ بن سکے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح عظمت وکرامت اور خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب جلالت سے نوازا ہے، وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱) (اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور انہیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے) اور اس حوالے سے حق تعالیٰ جل مجدہ کی جانب سے وحدانیت و یکتائی کے ثبوت و دلائل پر مشتمل منقول و معقول گواہیوں سمیت کائنات کے دیدہ ونادیدہ ذرہ ذرہ میں مشہود شہادات کا ایک عظیم ترین سلسلہ جاری فرمادیا گیا اور اس میں موجود مستور ومخفی استعدادات کو براہ عقل منکشف کیے جانے کے لیے کلام الٰہی میں جابجا راہنمائی کے واضح اشارات تمثیلات ووقائع کے پیرائے میں بیان فرمائے ہیں جس کے اجمال کا ایک مختصر سا خاکہ بطور مثال ماسبق میں تحریر کیا گیا ہے تاکہ غور وخوض کی جانب انسان کو متوجہ کیا جائے، جس کو بالفاظ دیگر یوں تعبیر کیا جائے گا کہ اسلام کے دعوؤں کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری انکشافات کے حوالے سے اس کی حقانیت کے ثبوت فراہم کیے ہیں گویا کہ دعوے کی ذمہ داری علماء کے سپرد کی گئی اور اس کو عالم ظاہر میں ثابت کرانے کا کام سائنس دانوں سے لے لیا گیا، ظاہر ہے دعوی کے لیے ایمان شرط ہے لیکن ثبوت کی فراہمی کے لیے ایمان شرط نہیں ہے، اس حقیقت پر کلام کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنی تصنیف معجزہ کیا ہے کے صفحہ ۲۸۹ پر ایک اقتباس میں بایں طور رقم طراز ہیں کہ:

”اسی لیے حق تعالیٰ جل شانہ نے اس امت میں کچھ ایسے افراد پیدا کیے ہیں کہ چاہے وہ اسلام لائیں کہ نہ لائیں مگر ایسی ایجادات کریں ایسی تیاریاں کریں کہ ہر معجزے کے لیے (ہی نہیں بلکہ دین اسلام کے اعجازی دعوؤں کو بھی ثابت کرنے کے لیے) مادیات میں ایک

(۱) سورۃ الاسراء: ۷۰

مثال بن جائے، علی سبیل المثال کل تک یہ کہا جا سکتا تھا آسمانوں کی جانب عروج (چڑھنا) ناممکن اور محال ہے کیونکہ فلاسفۂ قدیم کے بقول بیچ میں کرۂ نار پڑتا ہے بھلا آدمی اس سے کیسے گذر سکتا ہے، یہی نہیں بلکہ اس کے بعد درمیان میں کرۂ ہوا ہے اور انسان ہوا کے دباؤ کو برداشت ہی نہیں کر سکتا ہے اگر وہ ہوا کے ذخیرے میں پہنچ بھی جائے تو وہ اس کو کیسے چھوڑ دے گی، غرض کہ یہ محال است وجنوں سمجھا جاتا تھا لیکن انسان نے ایسے برق رفتار طیارے اور راکٹ ایجاد کر لیے کہ جو نہ صرف اس دنیا کی فضاء میں ہی ہزار ہا ہزار فٹ کی بلندیوں میں پرواز کر سکتے ہیں بلکہ خلائے بسیط میں موجود ایسے لاکھوں اور کروڑوں میل دور تیر رہے چاند مریخ زہرہ مشتری نیپچون اور دیگر متعدد دور دراز قوی الجثہ اجسام کے ساتھ موجود ہیں جن پر انسان قابو یافتہ ہونے اور ان پر آثار حیات کی تلاش میں سرگرداں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں شامل ہے، تو اس سے کم از کم یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ سرعت سیر کے لیے کوئی مقدار معین نہیں ہے اور جلد سے جلد اور دور سے دور پہنچنے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے مہینے بھر کی مسافت انسان گھنٹوں میں بھی طے کر سکتا ہے اور یہ قدیم فلاسفہ کا بھی مذہب ہے کہ سرعت سیر کے لیے بڑی سے بڑی سیر چھوٹی سی مدت میں محصور ہو سکتی ہے اور اس قدیم نظریہ کا آج کے فلسفے نے مشاہدہ کرا دیا کہ جس چیز کو آج سے پچاس / سو برس پہلے محال سمجھا جاتا تھا وہ آج ممکن بن گئی ہے گویا کہ قدیم دور میں اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ میں نے ایک ایسی سواری ایجاد کی ہے کہ اس میں بیٹھ کر میں دنیا کا چکر لگا سکتا ہوں تو لوگ اسے دیوانہ کہتے کہ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں، لیکن آج دنیا میں ایسے سریع رفتار طیارے اور راکٹ موجود ہیں کہ چوبیس گھنٹے میں دنیا کے پچاس چکر لگا لیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہی بات جب پیغمبر اسلام نے بزبان قرآن کہی: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (۱) (پاک ہے وہ ذات جو اپنے

(۱) سورۃ الاسراء:۱

بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تا کہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں ۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے) اس کا حاصل یہ کہ وہی بات اگر بزبان کلام الٰہی پیغمبر کہے تو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں اور اگر وہی بات پیغمبروں کے منکر کہیں تو ہم ماننے کے لیے تیار ہیں، یعنی فرق اسباب اور مسبب الاسباب کا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے بات کہو تو ماننے کی بات نہیں لیکن اگر دنیا کی طرف منسوب کر کے بات کہی جائے تو ماننے کی بات ہے تو گویا جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ یہ بغیر دیکھے ماننے کو تیار نہیں تو دنیا میں ایسے اسباب مہیا کر دیے کہ وہ معنویات کے نہ ماننے والوں کے لیے مثال بن جائیں، تو حق تعالیٰ نے بواسطۂ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم علمائے امت کو مکلّف کیا کہ تم دعوی کرو اور دنیا کے موجودہ فلاسفہ کو پابند کیا کہ تم ان کے لیے دلائل فراہم کرو، اگر دعوی کرنے اور اس کے لیے دلیل فراہم کرنے کے دونوں کام علمائے امت کے ذمہ ہی ڈال دیے جاتے کہ یہی معراج کا بھی دعوی کریں اور یہی ایجاد کر کے اس کو ثابت بھی کریں تو کبھی علمی ترقی نہیں ہو سکتی تھی بلکہ یہ علماء محض صناع اور دستکار بن کر رہ جاتے تو اللہ نے اہل ایمان سے کہا کہ تم علمی دعوی کرو اور دوسری قوم کو اشیاء کی خاصیات کا علم دیکر اس سے کہا کہ تم عملی دلائل مہیا کرو، تو آج کم از کم کسی کو معراج کے انکار کرنے کا کوئی حق تو باقی نہیں رہا، (چنانچہ دنیا کی تمام تر سائنسی ترقیات کا جائزہ قرآن کریم کے دعووں کی روشنی میں کیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آئے گا) کیونکہ چاند کے بعد اب دوسرے بعید سیاروں پر کم سے کم وقت میں پہنچنے کی سعی و مساعی نتیجہ خیز ہونی شروع ہو چکی ہیں تو گویا امکان تو ثابت ہو گیا تو اصل چیز امکان کا ثابت ہونا ہے اب پہونچتے ہیں کہ نہیں پہونچتے یہ بعد کی بحث ہے کیونکہ بغیر امکان کے انسان میں کسی بھی کام کی تحریک کا داعیہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا ہے۔‘‘

تو کل تک جو لوگ سفر معراج کو ناممکن و محال ؛ اور غیر معقول قرار دیتے ہوئے ظاہری اسباب کے تناظر میں یہ کہہ کر رد کرتے تھے ایسے فضائی سفر میں پہلی رکاوٹ کشش ثقل ہے

کہ جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لیے کم از کم چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اس حصے میں سورج کی جلا دینے والی تپش ہے کہ جس حصے پر سورج کی مستقیماً روشنی پڑ رہی ہے اور اس حصے میں مار ڈالنے والی سردی ہے کہ جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ فضائے زمین سے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز Cosmic Rays الٹراوائلٹ ریز Ultra Violet Rays اور ایکس ریز X-Rays یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو نظام بدن کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں انتہائی تباہ کن ثابت ہوتی ہیں (زمین پر رہنے والوں کے لیے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تپش ختم ہو جاتی ہے) مزید براں ایک اور بڑی مشکل اس سلسلے میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اگر چہ کچھ عرصہ مشق سے تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باشندے بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل یا ناممکن ہے آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دور حاضر کے سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی شخص آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو، ہمارا مشاہدہ ہے کہ روشنی کی رفتار سے بہت کم رفتار پر زمین پر آنے والے شہاب ثاقب ہوا کی رگڑ سے جل جاتے ہیں اور فضاء ہی میں ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا طویل سفر پلک جھپکنے میں طے کر سکے۔

مندرجہ بالا اعتراضات کی وجہ سے کچھ مخلص مسلمانوں نے یہ تاویل کرنی شروع کر دی کہ معراج خواب میں ہوئی اور یہ کہ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام غنودگی کی حالت

میں تھے اور پھر آنکھ لگ گئی اور یہ تمام واقعات عالم رؤیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھے تھے کیونکہ جسم کے ساتھ اتنی زیادہ بلندیوں کے فاصلوں کو لمحوں میں طے کرنا ان کی فہم و عقل سے باہر ہے حالانکہ اسراء کے معنی خواب کے نہیں جسمانی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے ہیں سورہ بنی اسرائیل میں لفظ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سے ابتداء خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ غیر معمولی واقعہ تھا جو فطرت کے عام قوانین سے ہٹ کر واقع ہوا، اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا مقصود تھا لہٰذا رات کے ایک قلیل حصے میں یہ عظیم الشان سفر پیش آیا۔ اور یہ وقت زمان ومکان کی فطری قیود سے آزاد تھا۔ واقعہ معراج اگر خواب ہوتا تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی خواب میں اکثر انسان مافوق الفطرت اور محیر العقول باتیں دیکھتا ہی ہے، بہر حال حاصل یہ کہ کم ازکم موجودہ دور میں انسان کی قابو یافتہ سرعت رفتار نے ان کے مونہہ پر مہر تو لگائی ہے اور وہ اب بول نہیں سکتے اس لیے کہ خالق کائنات نے اپنی مشیت وحکمت سے ان کی جھو د وتلاش کے نتیجہ میں امکان کو ظاہر کر دیا ہے اور اب وہ تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر امکان کے قائل ہو چکے ہیں کیونکہ سب سے بڑی چیز تو امکان ہی ہے البتہ واقعہ کا وقوع پذیر ہونا تو امکان کے آثار میں سے ہے۔

علیٰ کل حال مختصر یہ کہ سائنس اور اسلام ایک ایسا موضوع ہے جس پر متعدد اہل علم اور اہل قلم نے اپنے اپنے زاویہء فکر ونظر سے خامہ فرسائی کی ہے اور اس موضوع پر بڑے کارآمد اور مفید مباحث معرض شہود پر آئے ہیں، آرہے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے، البتہ زیر مطالعہ تصنیف سائنس اور اسلام کو اپنی بعض امتیازی خصوصیات اور واقعاتی احوال کے تناظر میں اصحاب علم واصحاب نظر نے معقول دلائل اور موضوع کی دلنشین وقرین عقل تشریحات کے سبب منفرد مقام پر رکھا ہے، جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ کائنات کے عناصر اربعہ میں درجہ بدرجہ ضعف وقوت کا انحصار اس میں پائی جانے والی ثقالت ولطافت میں پوشیدہ ہے ثقیل کے بمقابلہ لطیف شے زیادہ قوی واقوی ہے اور سلسلہ بہ سلسلہ یہی لطیف قوت جامع العناصر انسان کی طاقت اور عناصر میں تصرفات کی علت ہے جبکہ انسان کی

طاقت وتسخیر کا راز اس کی لطیف ترین روح میں مضمر ہے اور روح انسانی کی معنوی لطافت و قوت صفات روح امر رب سے منور ہو کر حکم الہیات پر مستدل ہے جہاں پہونچ کر کائنات کی تمام لطافتیں اور قوتیں اپنے منبع اصل میں مدغم ہو جاتی ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند وبانی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی زیرنظر تصنیف سائنس اور اسلام کا انگریزی ترجمہ ہے جو کہ باقاعدہ کتابی قالب سے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کے زیر انتظام منعقدہ اجتماع میں متنوع علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے ملکی وغیر ملکی پروفیسر حضرات نیز اس وقت کے وائس چانسلر سے لیکر دیگر تعلیمی وانتظامی شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے ذمہ داران، مختلف تعلیمی شعبہ جات کے تخصصات سے وابستہ طلباء اور حاضرین جلسہ کی ایک کثیر جماعت میں کی گئی وہ فی البدیہہ اور معرکۃ الآراء تقریر ہے جس کے موضوع سائنس اور اسلام کا علم بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کو اسٹیج پر پہونچ کر ہوا کہ اس موضوع پر آپ کو بیان کرنا ہے، موضوع بھی ایسا اجنبی کہ جس سے کبھی اس سے قبل کوئی سابقہ واسطہ بھی نہیں پڑا تھا، جس کے لیے پہلے سے کوئی مطالعہ نہیں کوئی ذہنی یا عملی تیاری نہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ اس بلند معیار اجتماع کے شریک حضرات میں فن سائنس سے تعلق رکھنے والے بعض ملکی وغیر ملکی نامور حضرات کی موجودگی، گویا کہ اسباب ظاہر میں ہر طرح کے ذہنی دباؤ اور ہاتھ پیر پھلا دینے کے سبھی سامان موجود تھے، لیکن جہاں ذات حق جل مجدہ کا بیحدو کنار فضل واحسان اور نصرت حق کی سکون آمیزیاں سایہ فگن ہوں اور بتوفیق رب کریم بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی معنوی توجہات مائل بہ التفات ہوں وہاں از راہ غیب دل کو تقویت دینے والے اسباب کیسے کارفرما نہ ہوں گے، ایسا ہی کچھ اس وقت ہوا، بقول حضرت حکیم الاسلامؒ چند منٹ کے شدید ذہنی دباؤ اور طبعی خلجان کے معا بعد حق تعالی نے دستگیری فرماتے ہوئے قلب وذہن کی گرہ کھول دی اور متعلقہ موضوع کے کچھ اہم نقاط، سائنس اور اسلام کے درمیان ربط باہم کی مختلف عقلی ونقلی

توجیہات اور اس کے صحیح مفاہیم کی جانب غیبی رہنمائی کے وسیلے سے قابل شکر وعنایت نصرت ومدد فرما کر ایک بے بضاعت طالبعلم کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند اور جماعت علماء کی عظمت وآبرو کا بھرم رکھ لیا، **فللّٰہ الحمد والشکر**۔

بعدازاں اکابر علمائے دیوبند اور متعدد علمی دوائر واجتماعیات کی جانب سے پیہم اصرار وتقاضے پر اس اہم وتاریخی تقریر کو منضبط طریقے پر باقاعدہ تصنیفی شکل دی گئی جو کہ اپنے روز اول سے تاحال ہند وپاک کے متعدد کتب خانوں سے ہزارہا کی تعداد میں بار بار شائع ہو چکی ہے، علمائے دارالعلوم دیوبند کی صف اول کے ممتاز ترین عالم دین اور اپنے عہد میں حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کے شارح شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تحریر کردہ کلمات اس تصنیف کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا ہے وہ مسلمانوں کی اصلاح کی ایک خوش آیند اور درخشاں علامت ہے۔

ملک وبیرون ملک کے مختلف حلقہ ہائے علم کی جانب سے ملنے والے تقاضوں نیز اس کتاب کے وسیع تر افادہ کے نقطۂ نظر سے بھی کافی دیر سے اس کے عربی اور انگریزی ترجمہ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس کو بحمد اللہ دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی نے بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مصنفات نیز دیگر اکابر واسلاف دارالعلوم دیوبند ودارالعلوم وقف دیوبند کے عظیم ترجہود اوران کی علمی وتصنیفی خدمات نیز ان کے بلند تر علوم ومعارف سے ملک وبیرون ملک کی مقتدر شخصیات واجتماعیات کو متعارف کرانے جیسے اہم مقصد کو اردو عربی اور انگریزی سمیت متعدد زبانوں میں تراجم اور علمی وصحت مند تنقیدی دراسات کو اپنے ترجیحی اہداف میں مقدم رکھتے ہوئے پہلے عربی میں اور اب انگریزی ترجمہ پر جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم وڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کی وسیع وبلند فکر ونظر

کے زیر اثر شبانہ روز علمی وعملی جہود ومساعی اور اس حوالے سے ہمہ جہت انتظامی نگرانی کے تحت کام کرایا گیا جو کہ اکیڈمی کی جانب سے گذشتہ پانچ سالہ بلند معیار علمی ارتقاء کے تسلسل کا ایک اہم حصہ ہے، ذات حق جل مجدہ کی شان کریمی کہ کووڈ ۱۹ کی اجباری فرصت کا دوسالہ دورانیہ اکیڈمی کے مستقل وقت طلب علمی امور کی تکمیل کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا، معمول کی آن لائن تعلیمی وتدریسی مصروفیات کے ساتھ جو آف لائن وقت طلب علمی امور تکمیل کے متقاضی تھے ان کو اللہ تعالی نے بہت کم وقت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور منجملہ دیگر متعدد علمی امور کے زیر نظر تصنیف سائنس اور اسلام کا انگریزی ترجمہ بھی اکیڈمی کے ہمہ جہت امور میں شامل مقصد کا ایک اہم اور لائق ذکر حصہ ہے، جو کہ دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ انگریزی کے باصلاحیت استاذ محترم جناب مولانا جمشید عادل صاحب کی لائق سپاس و ستائش جہود وکاوش کی قابل ذکر حصہ داری کا آئینہ دار ہے جنہوں نے عرق ریز محنت ودل جمی کے ساتھ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو اولا ادارہ کے سہ ماہی انگریزی ترجمان VOICE OF DARUL ULOOM میں بالاقساط شائع ہوا بعد ازاں کتابی شکل میں پیش ہے، علاوہ ازیں ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی کی زیر نگرانی مختلف میدان علم و انتظام سے تعلق رکھنے والے ادارے کے جواں سال رفقائے کار کی لائق ستائش اجتماعی جہود و کاوشوں کی شمولیت بھی قابل ذکر و مستحق دعاء ہیں حق تعالی اپنی بارگاہ کرم میں روز وشب کی ان اجتماعی مخلصانہ جہود وکاوشوں کو شرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے جملہ شرکائے کار کو دین اور دنیا میں ترقی درجات سے سرفراز فرمائیں اور اخلاص کی مزید تر برکتوں کے ساتھ مستقبل کے علمی وعملی اور تعلیمی وتعمیری منصوبوں کی تکمیلی راہ کو آسان فرمائیں۔

آمین یارب العالمین، و ماعلینا الا البلاغ المبین

اسلام کی ناموس پہ جاں ہے مری قربان

تخلیق بنی آدم سے لیکر عہد رواں تک تاریخ بنی نوع انسانی کا کوئی عہد وقرن ایسا نہیں گذرا ہے جبکہ حق اور باطل کی آویزش اور مقابلہ آرائی نہ رہی ہو، عالم اضداد کا یہ قانون تضادات تکوینات الٰہیہ اور اسکی حکمت بالغہ کا لازمی اور ناقابل تغیر وتبدّل حصہ ہے، حق وباطل کی معرکہ آرائی کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہوا جبکہ خدائے ذوالجلال کے حکم مَا مَنَعَكَ اَنْ لَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۱) کے بالمقابل ابلیس لعین نے تمرد وسرکشی کی راہ اختیار کرتے ہوئے عَلم بغاوت بلند کیا اور اس کا یہ کبر ونخوت ہی بارگاہ رب العالمین سے اس کے ہمیشہ ہمیش کے لئے مطرود ومردود اور راندۂ درگاہ قرار دیے جانے کا سبب بنا جسکو قرآن کریم نے متفرق مقامات پر سیاق وسباق کے تناظر میں مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے، شیطان لعین کی اس بغاوت ونافرمانی کی بنیاد کیونکہ کبر وحسد پر تھی، اس لئے اس نے ذریت آدم سے اپنے جذبۂ حسد وانتقام کو تسکین بہم پہنچانے کے لئے بارگاہ قدس میں درخواست پیش کی کہ اگر اسکی زندگی کو تا قیام قیامت جاودانی بخش دی جائے تو میں اولاد آدم کی راہ قیامت تک کھوٹی کردینے کو ہی اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتے ہوئے اسکے خُلق کی مرکزی

۞ مقدمہ: انگریزی ترجمہ ''انتصار الاسلام'' از: حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

(۱) (اللہ نے کہا) جب میں نے تجھے حکم دے دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ بولا: میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ (سورۃ الاعراف: ۱۲)

کمزوری نفس کی اتباع کو ہی ہتھیار بنا کر اسکے بہر لحہ آمادۂ بغاوت نفس امارہ کو جلا بخشتے ہوئے اسکے جہنم تک پہنچا دینے کا راستہ ہموار کروں گا اور تیرے ہی عطا کردہ علم کی بنیاد پر یقین رکھتا ہوں کہ میں اپنے اس مقصود ومطلوب میں مختلف راہوں سے اولادِ بنی آدم پر کامیابی اور غلبہ حاصل کروں گا، بجز اُس ایک مقدار کے جو کہ تیرے خاص اور مخلص بندے ہوں گے جن پر تیری کبریائی وفرمانروائی اور تسلیم ورضا کا رنگ صبغۃ اللہ کی صورت میں غالب رہے گا اور کارگاہ حیات کے یہ راہوار تیری روشن وبین ہدایت کے راستے سے منزل نجاح وفلاح تک بآسانی پہونچ جائیں گے اس پر یقیناً میرا کوئی زور نہیں چل سکے گا، تاآنکہ مشیت حق جل مجدہ کے مطابق لعین ومردود کی اس درخواست کو منظوری دیدی گئی، گویا کہ حق وباطل کی آویزش اور حق کے بالمقابل باطل کی جدوجہد کا آغاز عہد اَلست سے ہوگیا تھا اور اللہ تعالیٰ کا اپنی حکمت بالغہ کے تحت تخلیق کردہ اس عالم ناپائیدار کی فطرت ومزاج اور اضداد کے درمیاں حدفصل قائم ہوگیا جو حیات بنی نوع انسانی کے ہر عہد وقرن میں ہر سطح پر تا قیام قیامت قائم رہے گا کیونکہ دوسری طرف یہ ہی قانون اضداد عالم اکبر سے لیکر عالم اصغر تک، جزئیات سے لیکر کلیات تک، معنویات سے لے کر مادیات ومحسوسات تک، افکار سے لے کر نظریات تک اور ادیان ومذاہب سے لے کر فرق حق وفرق باطلہ تک نظام حیات انسانی اور اس سے مربوط تمام انفسی وآفاقی اجزائے عالم کے ارتقا وآزمائش کی اساس وبنیاد بھی قرار پایا ہے۔ ایمان وکفر، ہدایت وضلالت، حق وباطل، ادیان ومذاہب، روح ونفس کے متضاد تقاضے، تہذیب وتمدن، افکار ونظریات، معاش ومعاد، جزا وسزا، بود وباش، خوراک وپوشاک، غرض کہ حیات انسانی کی کوئی سطح کوئی مرحلہ اور کوئی جُز یہ بھی ایسا باقی نہیں ہے جس میں قانون اضداد کے زیر اثر حق وباطل کے خطوط جلی وخفی طور پر نمایاں اور واضح انداز میں موجود نہ ہوں، یہ تو گویا وہ سطحی قسم کے مدرکات عقل ہیں جہاں تک کہ شعور اور عقل انسانی کو اللہ تعالیٰ نے رسائی کی قوت عطا فرمائی ہے، بقول کسے "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کے

مصداق ذات حق جلّ مجدہ کی عوالم میں اس تفریق حق و باطل میں پوشیدہ ومستور حکمت بالغہ کی گہرائی تک نہ صرف یہ نارسائی عقل کا لفظ ہی احاطہ کرنے سے قاصر ہے بلکہ عقل و تخیّل اور افکار وشعور کی حد ممکنات سے بھی اس ذات قدیم اور اسکی صفات کے مثل مدرکات انسانی کی استعدادات سے بھی وراء الوراء ہے، بجز اس علم وآ گہی کے جو کہ حق تعالیٰ نے بذریعہ کلام اللہ انسان کو ودیعت فرما دیا ہے:

تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر، الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا(۱)

بڑی برکت والی ہے وہ ذات جسکے قبضۂ قدرت میں سارے جہان کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت و حیات اس لئے بنائیں تا کہ تمہیں وہ آزمائے کہ کون تم میں سے بہتر عمل کرتا ہے۔

اور اس آیت کریمہ کی تفصیل میں حق و باطل کی تخلیق کی حکمتِ الٰہیہ کے بے شمار گوہر آبدار پوشیدہ ومستور ہیں، کیونکہ فلسفۂ حیات وممات ایک ہی حقیقت اور ایک ہی کلیہ کے دورخ ہیں، حیات اور اسکے اجزا کو اسکی ضد ممات کی حقیقت جانے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا ہے اور یہی صورت اسکے عکس کی بھی ہے، عربی کا ایک مقولہ جو کہ اہل علم کے درمیان ضرب المثل کے طور پر معروف ہے، **الاشیاء تعرف بأضدادها** کہ اکبر واصغر، عظیم وحقیر، مخلوقات عالم کی حقیقت وکنہ اور اسکی حکمت ومصلحت تک رسائی اس وقت تک عقل انسانی کے لئے ممکن نہیں ہے جب تک کہ اسکی ضد کی معرفت حاصل نہ ہو۔ رات کی ظلمت و تاریکی اور نظام کائنات پر اسکی اثر پذیری دن کی نورانیت کی ہی مرہون منت ہے۔ سیاہ کی پہچان کا انحصار سفید کی موجودگی کی وجہ سے ہے، علوم و معارف اور شعور وآگہی کی افادیت جہل کے عناصر کو جانے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی ہے، چنانچہ تمام اشیائے عالم کی معرفت خواہ ان کا تعلق مادیات سے ہو، محسوسات سے یا معنویات سے ہو، موالید ثلاثہ

(۱) سورۃ الملک:۱-۲

سے ہو کہ عناصر اربع سے ہو یا کسی بھی شئے کی خُلقی فطرت سے ہو اللہ تعالیٰ کے قانون تضادات کے زیر اثر رہ کر ہی وہ مدرکات وتوجہات عقل کا حصہ بن سکتے ہیں۔ گویا کسی بھی شے کی خوبی و خامی اور اسکی افادیت ومضرت کا جاننا بالمقابل ضد کی معرفت سے ہی عبارت ہے کیونکہ یہ بہر دو حقائق باہم دگر بایں طور مربوط ہیں کہ کسی بھی ایک عنصر کے خواص وخاصیات کی معرفت سے مستغنی ہو کر اس کے عکس کی حقیقت معلوم کر لینے سے انسان کی عقل قاصر و مجبور ہے، گویا کہ عناصر کی ماہیت وحقیقت تک پہنچنے کے لئے ایجابی وسلبی بہر دو پہلوؤں کی معرفت ناگزیر ہے۔ آب و نار اور خاک و باد کی متضاد فطرتوں کا گہرا مطالعہ اور موالید ثلاثہ کے متخالف مزاج خُلق وخصائل کے تجزیاتی نتائج، نیز اس کے تجربات ہی تو مادیات کے ارتقاء کی مرحلہ بہ مرحلہ بنیاد واساس بنتے ہیں، علیٰ سبیل المثال پانی کی فطرت میں برودت وسیلان ہے جس سے کہ اس کا خُلقی مزاج عبارت ہے جب کہ اس کے بالکل متضاد وبالعکس عنصر آگ کی خِلقت میں حدت واحتراق اور تعلّی کا غلبہ ہے، انسان نے اپنے جوہر عقل کی خداداد صلاحیت کی بنیاد پر دونوں عناصر کی فطرت کا گہرائی میں اتر کر مطالعہ وتجزیہ کیا اور ارتقاء کی اس بنیادی حقیقت تک پہنچ گیا کہ اگر ان دونوں متخالف ومتحارب قوتوں کے درمیان کوئی حد فصل قائم کر کے ٹکرا دیا جائے تو ایک تیسری اور نئی قوت وجود میں آسکتی ہے جس میں بہر دو عناصر کی خصوصیات ترقی کے نئے ابواب سے انسان کو روشناس کرا سکتی ہیں، چنانچہ اس تجربے نے بھاپ اور اس کی خصوصیات نیز اس کے وظائف عمل تک انسان کو فکری رہنمائی و رسائی فراہم کر کے مادیات کے ارتقاء میں نئی بلندیوں سے متعارف کرایا، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا صریح اور فطری وقدرتی قانون ہے، چنانچہ یہ جس طرح ظواہر میں کارفرما ہے اسی طرح سے معنویات میں بھی متصرف ہے چنانچہ اگر دنیا کے اندر کفر والحاد کی ظلمتیں اور ضلالتیں نہ ہوتیں تو ایمان کی نورانیت وحقانیت کا انکشاف کیسے ہوتا، اگر باطل وطاغوت کا نظام ابلیسی اس فتنہ عالم آشوب میں برسر پیکار نہ ہوتا تو ایمان وعقائد اور دین اسلام کی

حفاظت سے ہم آہنگ حقائق و تدابیر اور اسکی معنویت کا بر سر عمل آنے کا دوسرا کیا ذریعہ ہوتا؟ من و عن یہی صورت حال مادیات کے نظام ارتقاء میں بھی کارفرما ہے۔ چنانچہ جب قانون تضادات کے تناظر میں معرکۂ حق و باطل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اسکا منطقی اور لازمی نتیجہ یہی منکشف ہوکر سامنے آتا ہے کہ تاریخ بنی نوع انسانی کا کوئی بھی عہد و قرن ایسا نہیں ملے گا جو اس معرکۂ تضادات ظاہری و معنوی سے عبارت نہ ہو اور کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں کہ حق کے بالمقابل باطل صف آرا نہ ہو یا باطل کا جگر پاش کرنے کے لئے حق شناس و حق پرست رجال کار ذات حق جل مجدہ کی توفیق و رضا اور اسکے عطا کردہ یقینِ استعانت سے باطل شکن طاقت بن کر ہر سطح و مرحلے پر اپنی موجودگی درج نہ کراتے رہے ہوں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لیکر نبی آخر الزماں محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک اور اسکے بعد ہر گذرتے دور میں غلامان مصطفیٰ حق و باطل کے ہر معرکۂ کارزار میں ہر سطح پر باطل کے بالمقابل بر سر پیکار نظر آئیں گے۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی علم و فن سے ہو، رزم سے ہو کہ بزم سے ہو اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ہی سنت ہے۔ وہ ہر زمانے کے رجال کار کو مزاجی و فکری اور علمی و عملی پس و پیش کے منظر نامے کے رنگ و آہنگ سے ہم آہنگ فرماتے ہیں جن کے ذریعہ اسکے دین مبین کا طاغوتی طاقتوں سے دفاع کا فریضہ انجام دلایا جاتا ہے جو کہ اس دور کے علمی و عملی اور عقلی و فکری تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے، کیونکہ اس لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر عالم میں گذرتے وقت کے ساتھ انداز دلائل و براہین، معیار رد و قبول اور ذہنی و فکری سطح میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور تا قیامت یہ سلسلۂ تغیر و تبدل نظام کائنات میں جاری رہیں گی، تاہم مقصود کیوں کہ دفاع دین ہے، لہٰذا اس کے اصول و کلیات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف رنگ و آہنگ متغیر ہوتا ہے جو کہ انسان کی تغیر پذیر طبیعت کا لازمی تقاضہ ہے۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بنی نوع انسانی کی تاریخ میں ایسے باعظمت و باکمال افراد و شخصیات کی کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے بلا شک و شبہ دنیا کی مہلت ایام کے

ہر لحظہ و پل کو اپنی قوم و نسل کی علمی و تعلیمی، مذہبی و اخلاقی اور تہذیبی و معاشرتی فلاح و صلاح کے لیے وقف کر دیا تو کسی نے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر خوں آشام رزم گاہوں میں ظلم و جبر اور انسانیت سوز بربریت کے مقابل جرأت و شجاعت کے ایسے بے مثال کارنامے سرانجام دیئے جن سے کہ صدیوں پر محیط قوموں اور نسلوں کی تاریخ کے دھاروں کے رخ تبدیل ہو گئے اور ایسے باکمال و بلند اقبال افراد پوشیدہ و آشکارا صورت ہمیں زمان و مکان کے ہر رنگ و آہنگ میں ملیں گے، اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ اس امت وسط کا ہمہ جہت علمی و عملی ارتقاء ایسے ہی افراد کے عرفان و فیضان کا مرہون منت ہے۔

علم و عمل، جہود و اخلاص، صبر و استقامت، اور دفاع دین اسلام کے لیے ہمہ لحظہ سر بکف اپنے عہد کی منفرد نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ کا شمار دفاع اسلام اور نسلوں کی فکر صلاح و فلاح کے حوالے سے تاریخ کی باعظمت و اقبال بلندیوں پر ایسی چنیدہ شخصیات کی فہرست میں نظر آتا ہے جو زندہ جاوید کہلاتی ہیں، حضرت الامام النانوتویؒ محض ایک فرد فرید ہی نہیں تھے بلکہ علم و مشیخت، تحریک حریت دین، استخلاص وطن کی جدوجہد میں کفن بردوش مجاہد، تزکیۂ نفس، تعمیر انسانیت اور علوم و معارف کے بحر ناپیدا کنار کے غواص جیسے مختلف و متنوع عناوین سے ان کی حیات کا ہر لحظہ و پل بایں طور عبارت ہے جسکی معنوی نورانیت کی روشن راہوں میں نسلوں پر مشتمل علمائے حق کا قافلہ زائد از ڈیڑھ صدی سے سرگرم سفر ہے جنکی خالصۃً لوجہ اللہ جہود اور انکے وجہات فکر و نظر کے مؤثرات اس طویل ترین دورانیہ میں وطنی و بین الاقوامی سطح پر بہت واضح اور نمایاں انداز میں علیٰ رؤس الاشہاد محسوس بھی کیے جاسکتے ہیں اور بچشم سر دیکھے بھی جاسکتے ہیں، جس میں دفاع دین کے حوالے سے تحریک قیام مدارس کی جگ آشکارا اہمیت و افادیت اور خدمات سے ملت اسلامیہ کی تاریخ کے روشن ابواب عبارت ہیں، جس کا مظہر دارالعلوم دیوبند کا قیام اور اسی کے تاریخی، علمی، فکری و تعلیمی تسلسل دارالعلوم وقف دیوبند کی صورت کارگاہ علم و عمل میں اسی فکر و منہاج اور ارتقائے فکری کا نقیب ہے۔

زیر مطالعہ کتاب انتصار الاسلام ازمنۂ قدیم سے جاری اسی سلسلۂ حق و باطل کے رزم و بزم کے تاریخ ساز حقائق و وقائع پر مشتمل باطل کے برخلاف معرکہ حق کا ہی ایک عنوان ہے، ''انتصار الاسلام'' بانی دارالعلوم دیوبند کی باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں ہے بلکہ پنڈت دیانند نے اسلامی عقائد پر جو ۹/ عقلی اعتراضات وارد کیے تھے اور رڑکی کے عوام الناس کے برسر مجمع یہ اعلان کیا کہ ان کے جوابات مولوی قاسم سے ہی روبرو بشکل مناظرہ چاہیے ہیں، ان کے علاوہ میں کسی بھی دوسرے عالم و گیانی کو اپنا مدمقابل نہیں گردانتا ہوں جبکہ دوسری جانب کی صورت حال یہ کہ بوجہ علالت وضعف اگرچہ حضرت نانوتویؒ کے لیے اس وقت مختصر سا سفر بھی ایک دشوار گزار مرحلہ تھا لیکن مدۃ العمر کے تعامل کے زیر اثر جذبۂ دفاع اسلام تمام ہی ظاہری موانع پر غالب رہا۔ دوسری طرف فساد خلق کے نقطۂ نظر سے جماعت کے علمائے معاصر اور جاں نثار تلامذہ کی ایک بڑی تعداد کا اصرار قصد سفر کے لئے مہمیز ثابت ہوا، اور حضرتؒ نے اللہ تعالیٰ کی استعانت و نصرت کے سہارے اپنے آہنی عزم اور توانائیوں کو یکجا کر کے اسی حالت ضعف و علالت میں پاپیادہ روڑکی کے سفر کا آغاز کر دیا اور یہ شب بھر کا پُر مشقت سفر فجر کی نماز پر پورا ہوا، البتہ حضرت کے رڑکی میں سترہ روزہ قیام کے دورانیہ میں بہر طریق کوششوں کے باوجود پنڈت جی کسی صورت سامنا کرنے کو تیار نہیں ہوئے بلکہ گریز و فرار کا کھیل کھیلتے رہے کیونکہ پنڈت جی کو یہ یقین تھا کہ مولوی قاسم تو بوجہ علالت بستر پر دراز ہیں اور کسی دوسرے کو مناظرے کے لیے میں قبول نہیں کروں گا اور یہ حیلہ سازی ظاہری اعتبار سے میری اپنی قوم میں سربلندی اور ملت اسلامیہ کے لئے ہزیمت کا ذریعہ بن جائے گی، جبکہ ملت اسلامیہ میں میری جانب سے کیے گئے عقلی اعتراضات عدم جوابات کے سبب شکوک وشبہات تو بہر حال پیدا کرتے ہی رہیں گے، اور ہر کسی کے لیے خالص عقلی مستدلات کی بنیاد پر ان اعتراضات کی جوابدہی کیونکہ ایک دشوار گزار مرحلہ ہے، لہٰذا مقصدی اعتبار سے مجھے ہی فاتح تصور کیا جائے گا، **فَلَمَّا زَاغُوْا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** (۱) ۔جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیے۔

---

(۱) سورۃ الصّف: ۵

لیکن مشیت حق جل مجدہ کی توجہات بہر کیف وبہر حال غالب ہوکر رہتی ہے، وَ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا [1]۔اور کہہ دیجیے کہ حق آیا اور باطل گذر گیا اور واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے،(ترجمہ از بیان القرآن) اگر چہ بہر طریق کوششوں کے باوجود پنڈت جی بوجہ خوف بر سر عام شکست کے فرار کی راہ اختیار کرلی، لیکن انکی اس ہرزہ خیالی نے اسلام پر اعتراضات کے مبسوط و مدلل جوابات کی شکل میں علم ومعرفت کے باب میں ایک ایسا قابل قدر اضافہ ضرور کرادیا جس نے نسلوں کے لیے دفاع اسلام کے لیے استدلال کی راہ کو تقویت فراہم کردی ہے اور حضرت نانوتویؒ کی ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے اس کتاب کو گذشتہ قریب ایک صدی سے علمی دوائر اور حلقۂ اصحاب علم وفضل میں باعظمت پذیرائی کا درجہ حاصل ہے۔ جس کو حضرت بانی دارالعلوم دیوبند رحمہ اللہ کے شاگرد رشید حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ نے پہلی مرتبہ ''انتصار الاسلام'' کے عنوان سے معنون کیا تھا۔

بحمد اللہ دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور ادارے کے نائب مہتمم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب اور ان کے مخلص وفعال رفقائے کار بلاشبہ تبریک وتہنیت اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں جنہوں نے اکیڈمی کے ہمہ جہت وہمہ فکر مقاصد کو بروئے عمل لانے میں اپنی فکری وعلمی اور جواں سال جسمانی قوتوں کو ایک مقصدی ومرکزی محور فراہم کرکے ادارے کی عظمتوں اور نیک نام شہرتوں وبلندیوں میں اپنی سنجیدہ کوششیں وکاوشیں، جہود واخلاص، وسعت افکار و نظریات کے بلند آہنگ عزائم کی عملی شراکت اور گذرتے وقت کے ہر ایک لحظہ وپل کی بھرپور اہمیت وافادیت اور اس کی مطلوبہ قدردانی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے اپنے حصے کی حسن کارکردگی کو اس کارہائے پرعظمت میں شامل کرکے منجانب اللہ اپنے لیے سعادت وخوش بختی کے دروازے وا کرلیے ہیں، بارگاہ رب العزت میں ہمہ وقت دست

(۱) سورۃ بنی اسرائیل:۸۱

بہ دعاء ہوں کہ حق تعالیٰ ان کے عزائم میں بلندی اور مفوضہ امور کو سر بلندی اور ادارے کے حق میں قبولیت ومقبولیت کے نیک نام ترقیات سے سرفراز فرمائیں۔

حجۃ الاسلام اکیڈمی کی بناء وقیام کے ہمہ جہت وہمہ نوع مرکزی مقاصد میں اکابرو اسلاف کے بلند پایہ علوم ومعارف کو رائج العام اور کثیر الفہم زبانوں میں تراجم کرانے کے علاوہ عہد حاضر کے اسالیب فہم وبیان اور وقت رواں کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ تحقیقات وتشریحات اور تسہیلات اکیڈمی کے مجوزہ ہمہ جہت مقاصد کی محوریت کا ایک قابل ذکر وتحسین حصہ ہے جس میں بالخصوص بانی دارالعلوم دیوبند کی وقیع ترین تصنیفات وتالیفات کے اصل متون کی اشاعت کے ساتھ عہد رواں کے قابل فہم اسلوب وبیان اور عربی وانگریزی میں منتقل کر کے بلند معیار طباعت واشاعت کے ذریعہ مشتاق وآرزومند حلقۂ اصحاب فکر ونظر تک پہنچانے کو خاص اہمیت ومرکزیت بھی حاصل ہے، اور بایں ہمہ یہ تمام ہی کارہائے علم وفن جماعت علمائے دیوبند کی جانب سے فرض کفایہ کی باحسن ادائیگی بھی ہے، اس سمت میں اکیڈمی کی گزشتہ پانچ سالہ حسن کارکردگی کے نتیجہ میں بحمد للہ زائداز پچیس کتابیں اپنی بلند پایہ معنویت وافادیت کے علی الرغم دور حاضر کے متقاضی مزاج حسنِ مرصع سے طبع ہوکر تادم تحریر منصۂ شہود پر آکر ملکی وبین الاقوامی سطح پر علمی وفکری دوائر واجتماعیات اور عہد رواں کے معروف اصحاب علم وفضل مشاہیر ودانشوران ملت کی جانب سے تحریرا وتقریرا توصیفی اعترافات کے ذریعہ لائق شکر وافتخار سند کی حیثیت حاصل کرچکی ہیں، اسکے علاوہ متعدد علمی مصادر پر تسلسل کے ساتھ مختلف جہات سے کام زیر عمل ہے۔ واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔

اور پردۂ ظلمت چاک ہوا

تاریخ بنی نوع انسانی کے مختلف ادوار کے حوالے سے اگر ہم بات کریں تو ایسی حقیقت سے ہمارا گذر ہوتا ہے جس پر عہد رفتہ ہو کہ عصر رواں، اصحاب علم وفضل اس حقیقت پر مؤید وموثق ہیں کہ علم ہو کہ عمل ہو، فن ہو کہ ہنر ہو، منزل کمال تک پہنچنے کے لیے فکر کی وسعت وفراست بھی اگرچہ انسان کی عظمت وسربلندی کے لیے اپنے آپ میں خود بہت کافی تاثیری قوت رکھتی ہے، تاہم فکر کی عظمت کو دوام وقبولیت کردار کی اس بلندی سے ہی حاصل ہوتی ہے جس کے عمل کی بنیادیں نام ونمواور نمائش وخودنمائی جیسے عارضی جذبات سے بالکلیہ مستغنی ہوں اور دور پرے اس شائبۂ خیال سے مافوق ذات حق جل مجدہ کی خوف وخشیت اوراس کی خوشنودی کے حصول سے ہی مربوط ہوں جس کا مبنی براخلاص وللّٰہیت ایک علمی وعملی سرااس دارالعمل سے جڑاہواور بہتر اجر وجزا کی امید کا دوسرا کنارہ شفاعت مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حصول کی آس وامید پر بارگاہ رب العالمین سے مربوط ہو، واضح ہو کہ یہاں کردار کی عظمت وبلندی سے مراداس کے اپنے ہمہ جہت وہمہ اوصاف معانی ومفاہیم مراد ہیں جو کہ اپنے آپ میں بیحد دوررس نتائج سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں، آفتاب کی ضیا پاش روشنیوں سے کروڑوں لاکھوں گنا منور حقیقت، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ اور بے مثل وبے بدل عظمت کردار کے ہزارہاہزار نمونے تاریخ وسیر کے علاوہ لاکھوں صفحات پر مشتمل مختلف ومتفرق مدون

۞ تقریظ: ''گفتگوئے مذہبی'' از: حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

علوم وفنون کی صورت میں تابانی بخش کر اصحاب بصیرت و دانش اور اہل خرد کو نشان منزل کا پتہ دے رہے ہیں، اسی کردار علم و عمل کا عکس جمیل ہے جو کہ نسل در نسل عہد بہ عہد منتقل ہوتا ہوا غلامان رسول و متبعین مصطفیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثائے امت جماعت علماء صلحاء اصفیاء اور اتقیاء کی صورت میں ہمہ الوان قوس وقزاح کے مثل مختلف صور واشکال میں حیات انسانی کے ہر دور اور ہر میدان علم و عمل میں چودہ سو سال کے دورانیہ پر محیط تاریخی صفحات پر کہکشانی انداز میں جا بجا نظر آتا ہے، جس کا ہر رنگ دین اسلام کے تنوعات کی طرح ایک دوسرے سے منفرد و ممتاز ہونے کے باوجود باہم دگر عکس جمیل کی حیثیت میں مربوط نظر آتا ہے، غزالیؒ ہو کہ رازیؒ ہو، ماتریدیؒ ہو کہ شیبانیؒ ہو، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ ہو کہ محدث دہلویؒ ہو، نانوتویؒ ہو کہ تھانویؒ ہو، کشمیریؒ ہو کہ سندھیؒ ہو، یا طیبؒ وعثمانی ہو، علیٰ ھذا القیاس چودہ سو سالوں پر محیط تاریخ علم و عمل کا یہ ربط و تسلسل بھی وسعت فکر و آگہی رکھنے والوں کے لیے محافظت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے ہمہ جہت مقاصد کے تناظر میں دین اسلام کی عظمت وابدیت کی ایک دلیل ہے۔ بارگاہ قدس سے وجہ تخلیق کائنات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کو کمال علم و عمل اور کمال عظمت ورفعت کا وہ درجہ عطاء ہوا کہ تمام علوم وفنون کا مرجع اتمام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تن تنہا بلا شرکت غیرے ذات بابرکت پر ہی منتج ہے جو کہ ذات اور اوصاف علم و عمل کی رفعت اور جملہ علوم فنون اور شؤون کے مبداء و منتہی کا اتمام منجملہ دیگرے بایں طور بھی دلیل ہے کہ اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد جب علوم وفنون کے تدوین وشؤون کی ذمہ داری امت پر تقسیم ہوئی تو ایک ایک شان علم وفن کی عظمت کا درجہ اس قدر بلند ورفیع ووقیع تھا کہ اس کو سنبھالنے کے لیے ہر دور کے اندر ہزار ہا ہزار اصحابِ علم پر مشتمل ایک ایک جماعت درکار تھی، شان احادیث کو اگر محدثین کرام کی جماعت نے سنبھالا تو استخراج واستنباط احکام کو سنبھالنے کے لیے فقہائے کرام کی جماعت وجود میں آئی۔ علیٰ ہذا القیاس مفسرین، متکلمین، عارفین وغیرہم جنہوں نے اپنے دور کے تنوعات کو دین اسلام کے متفق علیہ

اصولوں پر جانچا پرکھا اور تعلیمات اسلام کے زرِ خالص کو بہ لحاظ تقاضائے عصر اپنے سے اگلی نسل کے سپرد کر کے چلے گئے تاکہ آنے والے دور کے اصحاب علم و عمل اپنے عہد کے مطلوبہ تقاضوں کو بروئے عمل لاتے ہوئے مشیت حق کے مطابق آئینۂ اسلام پر پڑنے والے گرد و غبار کو صاف کرنے کے فریضہ کو انجام دیکر بتوفیق رب جل مجدہ اسلام کی اساسات کو ہر عہد و عصر میں تحفظ فراہم کرتے رہیں، یہ سلسلہ ظہور اسلام سے لیکر تا روز قیامت حسب احوال بذریعہ جہود سیف و قلم جاری ہے اور باذن اللہ جاری رہے گا، راست فکر اور منصف مزاج اصحاب علم و دانش اس حقیقت کے بھی وضاحۃً یا کنایۃً معترف نظر آتے ہیں کہ علم و عمل کے اہداف و مقاصد کی اکائیت جب اعلائے کلمۃ اللہ پر منتج ہوتی ہے تو فکری اور نظریاتی سطح پر اپنے اپنے نظائر و براہین کی روشنی میں وجہات فکر و نظر کے اختلافات علوم و فنون کو ارتقاء کی نت نئی منازل سے روشناس کراتے ہوئے علمی ذخائر میں بے شمار اضافوں کے علی الرغم کلیدا اساس کا کردار ادا کرتے ہیں، چنانچہ قریب ساڑھے چودہ سو سال پر محیط کروڑہا کروڑ مسائل کے حل پر اپنے اپنے زاویۂ فکر و نظر سے لاکھوں لاکھ کتب کے یہ عظیم ترین ذخائر اسی اضداد و نظریات کے ہی تو مشاہد دلائل ہیں، تاہم اس حقیقت واقعہ سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عہد بہ عہد اس سعی و عمل کی جدوجہد میں ہمہ اوصاف کردار کی ایسی عظمت جس کے ظاہری و معنوی اثرات صدیوں پر منتج ہوتے ہیں اور جس میں دین اور دنیا کی بامعنی سعادتوں، خوش بختیوں اور معنوی ارتقاء و قبولیت کے سیکڑوں رموز ہائے سربستہ پنہاں ہیں از روئے مشیت حق جل مجدہ کسی کسی کو ودیعت کر دیے جاتے ہیں جو کہ نہ صرف اپنے عہد کے لیے ہی مثال کمال ہوتے ہیں بلکہ جب اللہ تعالیٰ چاہیں اس کے وجود کی برکت سے صدیوں تک کے فاصلوں کو منور کر دیا جاتا ہے، اور تاریخ اسلام کے تسلسل کا کوئی دور ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔

اس تحریر کا تعلق بھی انیسویں صدی کے اسی سلسلۃ الذہب سے تعلق رکھنے والی روشن و منور کڑی سے ہے جو کہ اپنے عہد کی نابغۂ روزگار عبقری اور محسن ملت شخصیت بانی

دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ کے کارہائے فخر ملت سے مربوط ایک گوشہ و پہلو کے تعارف سے ہے جس کی مختصر ترین فرصت حیات کا ہر لحظہ ولمحہ اپنے وسیع الفکر آفاقی نظریات سے عبارت اور علمی وعملی سطح پر اس حقیقت کا علمبردار ہے کہ ظلمت شب کتنی ہی تیرہ وتاریکیوں نہ ہو لیکن اگر ملت کے دامن امید کو دینی وفکری کوہ شکن ایقان رکھنے والی مستقبل شناس قیادت کا سہارا حاصل ہو تو شب گریزاں سپیدۂ سحر کی امید قوم وملت کی حوصلہ مندی کے عزائم کو اضمحلال بہ کنار نہیں ہونے دیتی، کیونکہ ایسی قیادت کی فکری رسائی حال کی چیرہ دستیوں سے آگے نسلوں کے مستقبل کے تحفظ پر مرکوز ہوتی ہیں اور قافلہ سالار کے ایمان کی فراست دور بین و دور رس نگاہ بلندنواز ایمانی قوت اور آفاقی افکار ونظریات کی روشنی میں اپنے کارواں کی نسلوں کے تحفظ پر محیط نشان منزل کی عملی رہنمائی حوصلوں کو حالات کی سختیوں کے نتیجہ میں شکست وریخت کی دست برد سے بچا کر عزائم میں بلندی اور حوصلوں میں پختگی کے اثر ونفوذ کا فریضہ انجام دیتی ہے، استبداد کے اس دور پرآشوب میں حضرت الامام النانوتویؒ نے جہاں ایک محاذ پر تعلیمی تحریک حکمت ریز کے زیراثر نام ونمائش، اعلانات واشتہارات کے شوروشغب سے دور اسلام کی فطری سادگی کے اصول پر صرف ایک استاذ اور ایک شاگرد پر مشتمل دو افراد کے آغاز سے چھتہ مسجد کے متبرک انار کے درخت تلے سے بتوکل رب قیام مدارس کی تحریک کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی نسلوں کو دینی تحفظات کے تاریخ ساز مواقع فراہم کیے جس کی ڈیڑھ سوسالہ مشاہداتی گواہی اور ان کے اخلاص وللّٰہیت اور قبولیت کے مظاہر دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادباد، امروہہ گلاؤٹھی مظفرنگر کے علاوہ اس ڈیڑھ سوسالہ دورانیہ میں نہ صرف برصغیر ہی بلکہ اس کی وسعتوں سے باہر عالمی سطح تک اسی فکر ومنہاج پر قائم ہونے والے مدارس کے قیام کا سلسلہ حضرت الامام النانوتویؒ کے آفاقی فکر رسا کی مشاہداتی تعبیر اور ان کے اخلاص کامل کی عنداللہ قبولیت کی بین وروشن دلیل کی حیثیت رکھتا ہے تو اسی تسلسل جہود اخلاص

کے دوسرے رخ کے پس منظر کا اختصار یہ ہے کہ:

ٹیپو سلطان رحمہ اللہ کی شہادت استبدادی قوتوں کے لیے نوید جانفزا تھی جس نے ملک پر ان کے سیاسی و عسکری قبضہ و تسلط کی راہ ہموار کردی تھی، اقتدار کیونکہ مسلمانوں کے قریب آٹھ سو سالہ دور حکومت کو ختم کر کے حاصل کیا گیا تھا اور استخلاص وطن کی جدوجہد کا مرکزی کردار بھی مسلمانوں نے ہی ادا کیا تھا اس لیے ان کے منصوبے اور عزائم عموماً ہندوستانیوں اور خصوصاً اہل اسلام کے خلاف ہی درپئے آزار تھے جن کے ثمرات کو جلد از جلد وہ ہر قیمت اور سطح پر طوعاً او کرہاً حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے، اور اس میں بھی بالخصوص علمائے اسلام اور مدارس نشانے پر تھے کیوں کہ دانا دشمن اس حقیقت پر بخوبی واقف تھا کہ عوام و علماء کا باہمی ارتباط واعتماد ہی ہے جو کہ ہندوستان میں کسی بھی تحریک کی نہ صرف کامیابی کی ضمانت تصور کیا جاتا ہے بلکہ اس رشتۂ اعتماد وارتباط کی حیثیت تحریک کی کامیابی میں جسم میں خونِ رواں اور گردش جیسی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف عام معافی کا اعلان کر کے عمومی فکر مخالفت میں نرمی لانے کی کوشش تھی تو دوسری طرف مسلم اوقاف جن کی آمدنیوں پر مدارس کا انحصار تھا بحق سرکار ضبط کر کے معاشی ناکہ بندی کے ذریعہ بند کر دینے پر مجبور کر دیا گیا اور ایک رپورٹ کے مطابق ملک کے طول و عرض میں ایک ہزار سے زائد مدارس ختم ہو گئے، عوام اور علماء کے درمیان عقیدت و محبت کے پائیدار اور مضبوط رشتوں کو قطع کرنے کی منصوبہ بندیوں اور اس سے دوررس نتائج حاصل کرنے کی غرض و غایت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس طوفان بلاخیز کا دوسرا منصوبہ تبدیلی مذہب سے تعلق رکھتا تھا جس کے لیے برطانیہ کے علاوہ دیگر مغربی ممالک سے پادریوں کی ایک بڑی جماعت کی خدمات حاصل کی گئیں جن کو عیسائیت کے تبلیغی مشن کو بروئے عمل لانے کے لیے ہمہ اقسام سہولیات اور بھاری بھر کم معاوضے ادا کیے جانے کے وعدوں پر ہندوستان لایا گیا، تاکہ کمزور طبقات ملت کو حرص و لالچ اور جبر و قوت سے تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ کیا جا سکے، مرور وقت کے ساتھ اس دور پرآشوب کے کیف و کم اور عزائم و منصوبہ بندیوں کا ایک

طائرانہ جائزہ درج ذیل اقتباسات کی روشنی میں لیا جا سکتا ہے۔

انڈیا کی سپریم کونسل کے ایک باوقار رکن سر چارلس ٹریلیپون جو کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے گورنری کے بلند اور اور نہایت ذمہ دارانہ عہدے پر فائز تھے ان کو پورے وثوق کے ساتھ اکثر یہ کہتے سنا گیا کہ ’’میں یہ مکمل یقین رکھتا ہوں جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل صلیب کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، اسی طرح ہندوستان میں بھی اہل تثلیث کی برتری کو قبول کرتے ہوئے مشنری کی محنت سے ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔‘‘ (بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:۱۴۳) ان عزائم کو بروئے کار لانے کی جدوجہد ہر سطح پر ہر طبقے کی جانب سے پورے شدومد اور منصوبہ بندیوں کے ساتھ جاری تھیں، چنانچہ ۱۸۵۷ء کے آغاز میں برطانیہ کے ممبر پارلیمنٹ مسٹر مینگلس نے اجلاس کے دوران تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ’’خداوند نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ پورے ہندوستان کی سلطنت عیسائیوں کے زیر نگیں آ چکی ہے تاکہ یسوع مسیح کا علم ہندوستان کے ایک سرے سے لیکر دوسرے کنارے تک لہرائے لہٰذا اہل تثلیث کے ہر فرد کا یہ مذہبی فریضہ اور ملی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تمام تر قوت واستعداد اور وسائل وصلاحیتوں کو ہندوستان کے عیسائی سلطنت بنانے کے عظیم الشان مشن کی تکمیل میں صرف کر دے۔‘‘ (بحوالہ حکومت اختیاری، ص:۱۳۶) جبکہ دوسری طرف کی صورت حال یہ کہ ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی تشویش کن حد تک انتشار وافتراق کا شکار، ان کے سامنے مستقبل کے حوالے سے کوئی واضح نصب العین نہیں تھا، کوئی ہدف نہیں تھا، عمومی سطح پر اس دور یاس ونومیدی کے مضر ومہلک اور منفی فکر کے حامل اثرات اور شکست خوردگی نے گویا کہ قوم کی قوم کو مثل ناقۂ بے مہار بنا دیا ہو، اس فکری درماندگی کے مہلکات نے عمومی سطح سے لے کر کس درجے تک اشخاص وافراد کو متاثر کیا ہے اس کا ایک سرسری اندازہ دارالعلوم دیوبند کے اولین صدر مدرس جناب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نوراللہ مرقدہ کے اس ایک جملے سے بھی لگایا جا سکتا جس کو قیام دارالعلوم دیوبند

سے قبل اکثر فرمایا کرتے تھے اور مکتوبات یعقوبی میں ایک مکتوب کے ذیل میں رقم بھی فرمایا ہے کہ عہد حاضر کی اسلام کے برخلاف جابرانہ وقاہرانہ تند وتیز باد مخالف سے کبھی کبھی یہ گمان قلب پر گذرتا ہے کہ خدا نہ کردہ اگر بروقت اس کے مؤثر تدارک کی کوئی صورت اختیار نہ کی گئی تو ایسا نہ ہو کہ موجودہ دور کے اصحاب علم کے اٹھ جانے کے بعد کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے کہ وضو میں فرائض کتنے ہیں اور واجبات کیا ہیں۔

ایسے پر آشوب دور اور نامساعد حالات میں بتوفیق رب کریم سرخیل جماعت حضرت الامام النانوتویؒ کی قیادت وسیادت میں مخلص رفقائے کار پر مشتمل ایک مختصر سی جماعت علماء نے جس ہمت واستقلال اور جرأت وبافکر عزم جواں کے ساتھ جو ہمہ جہت سطح پر حوصلہ مندی وپامردی کا ثبوت پیش کیا تھا اس نے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے مستقبل کا رخ طے کرنے میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے، یہ ایک تاریخی شہادت ہے کہ ایسے حوصلہ شکن احوال میں بقول شخصے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمہ جہت گمراہ کن تحریکوں سے مقابلہ، پادریوں اور آریوں سے پنجہ آزمائی جبکہ ان کو حکومت کی جانب سے کسی بھی قسم کی رسد پہونچنے میں کوئی امر مانع نہ تھا، اس کے علاوہ علمائے اسلام کے ساتھ ہر قسم کا انتہائی بہیمانہ وسفاکانہ سلوک روا، پھانسیاں، وطن عزیز سے جلاوطن کر کے کالے پانی کی وحشت انگیزیاں، گویا کہ یہ اس دور کے پس وپیش اور منظرنامے کے خدوخال کا ایک اجمالی جائزہ اور سرسری خاکہ ہے، جس میں بلاتفریق مذہب وملت عام ہندوستانیوں کو جبراً وقہراً رام کرنے کے لیے بایں طور برسر عمل لایا گیا تھا کہ آمدنیوں کے سوت بند کر کے ذرائع معاش ان پر تنگ کر دیے جائیں اور غربت وافلاس کے اندھیروں میں دھکیل دیا جائے، چنانچہ عوام کی مفلوک الحالی کو اس حال میں پہونچا دیا گیا کہ بقول جناب سرسید احمد خان صاحب رحمہ اللہ ''عوام کی غربت اس حد تک عمداً پہونچا دی گئی تھی کہ ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ایک عام ہندوستانی اپنی گردن کٹوانے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔''(۱)

(۱) بحوالہ بغاوت ہند، ص: ۴۰

موج در موج مصائب و آفات کے اس تیرہ و تار عہد میں حضرت الامام النانوتویؒ نے اپنی ایمانی فراست اور آہنی ایقان و یقین کے ساتھ مخلص و جاں نثار جماعت کے ہمراہ نصرت تکوینی اور توکل رب کا سہارا لیکر مادی اعتبار سے اپنے سے کئی گنا قوت و اختیار رکھنے والی طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہی کا فیضان روح ہے جو نسلوں اور عہدوں پر مشتمل مابعد جماعت علمائے دیوبند کے لئے خضر راہ ثابت ہوا اور آج بھی انہی کے سرچشمہ فیض کے ثمرات ہیں جو ملک کے طول و عرض سے لیکر بین الاقوامی سطح تک جماعت علمائے حق کی صورت میں برسر عمل ہے، بہر حال آمدم برسر موضوع۔۔ کیونکہ ان محاذوں میں ایک اہم ترین محاذ مشنری تبلیغی مہم کا سد باب تھا اور اس کے نتیجہ میں ملک کے طول و عرض میں شدت کے ساتھ مختلف قسم کے مذہبی فتنوں نے بشکل عذاب الٰہی سرابھارنا شروع کر دیا تھا، عیسائیت کے اس تبلیغی مشن جس کو قوت واقتدار اور سیم وزر کی پشت پناہی حاصل تھی اس کے تناظر میں ارتداد عام کے خدشات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ انہی ہمہ جہت خطرات و خدشات کے پیش نظر اس کا مؤثر انداز میں تدارک کیا جانا حضرت الامام النانوتویؒ کی اولین ترجیحات میں شامل تھا کیونکہ ملک کے کم وبیش قابل ذکر شہروں کے گلی کوچوں بازاروں اور محفلوں میں پادری صاحبان جوق در جوق جماعت در جماعت صبح و شام گردش کرتے اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ زنی کرتے ہوئے نظر آنے لگے اور اسلام و مسلمانوں کے برخلاف زہر افشانی و دل آزاری کی کوئی صورت ایسی نہیں تھی جو روا نہ رکھی ہو اور اسی جارحانہ رنگ و آہنگ میں عیسائیت کے تبلیغی مشن کی منصوبہ بندی کے زیر اثر مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو، اگر یہ اکابر بروقت اس فتنہ کا تعاقب کر کے سد باب نہ کرتے تو عوامی سطح پر اس کی ضرر رسانی کے اثرات پھیل کر نسلوں کے فکری اضمحلال پر منتج ہو سکتے تھے۔ مدارس کے قیام کی تحریک بھی دراصل ادوار کی تبدیلیوں کے ساتھ اس فتنے کی بدلتی صورتوں اور اس کے دوررس نتائج و عواقب کا سد باب تھی، تمام احوال و واقعات کا مفصل تذکرہ موضوع بھی

نہیں ہے اور گنجائش بھی نہیں ہے اس اجمال سے مقصود اس دور کے پس و پیش کے عمومی حالات کا ایک خاکہ و جائزہ پیش کرنا مقصد تھا، تاکہ اس عہد کے کیف و کم کے تناظر میں قارئین کرام زیر مطالعہ رسالہ نانوتوی گفتگوئے مذہبی بمعروف میلۂ خداشناسی کے پس منظر اور اس حوالے سے حضرت الامام النانوتویؒ کے مستقبل بین اہداف و مقاصد افکار و نظریات اور جہد و کاوش کے تعارف شناس ہو سکیں۔

بر بنائے عداوت و عناد اگر کوئی اس حقیقت ثابتہ کو نہ تسلیم کرے تو اور بات ہے ورنہ عقل و نقل کے مستحکم اور ناقابل تردید دلائل و بصائر کی بنیاد پر اہل اسلام کا یہ دعوی نور و ضیائے شمس و قمر سے زیادہ روشن تر ہے کہ بجز دین اسلام دنیا کا کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جو اپنی وسعت اور گہرائی و گیرائی، عقل و نقل کے قرین فہم مستدلات، نیز از آغاز اسلام تا صبح قیامت عہود و قرون کی ہمہ جہت فطری تبدیلیوں کے علی الرغم قدم بہ قدم ساتھ چلنے کی صلاحیت و استعداد اور اجزائے حیات انسانی کے ہر دور کے تغیر پذیر احوال و کوائف کے حل کو محیط ہونے کے ساتھ حیات بعد الممات کی نجاح و فلاح جیسے مسائل کو ٹھوس اور حقیقت پسندانہ اساس فراہم کرتا ہو، اسی سلسلۂ کلام کے حوالے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند کا بلحاظ تقابل محاسن اسلام پر مدلل و مبسوط یہ اقتباس تشریح موضوع بحث کی تفہیم میں معاون ہوگا، حضرتؒ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام کے صفحہ ۹/۸ پر بایں طور رقم طراز ہیں کہ: ’’اس پاک سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی اور قصر نبوت کی سب سے آخری خشت جس نے ابدی طور پر قصر نبوت کو مکمل کر دیا حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے احوال، اقوال، اعمال، افعال اور مقامات پر نگاہ بصیرت ڈالو تو ذات اقدس کے احوال و آثار کی ایک ایک جزئی خود شہادت ہے کہ آپ کی ہر ایک شان علم و معرفت، ادراک و بصیرت، کشف و انجلاء، اور باخبری کی کارفرمائی ہے، جو چیز سامنے لاکر رکھی علم و حکمت سے لبریز جو اصول پیش فرمائے وہ دانائیوں کا

خزینہ ہر حکم اپنی جگہ مستقل حکم ہونے کے ساتھ اور دوسرے سیکڑوں علوم و معارف تک پہنچا دینے کا راستہ جس سے علم کی کتنی ہی منزلیں دکھائی دیں، احکام کی جامعیت یہ کہ جہاں ان سے ایک طرف حاکمانہ جلال اور مربیانہ شفقت ٹپکتی ہے وہیں مدبرانہ حکمت بھی برس رہی ہے، جس حکم شرعی کو دیکھو کسی نہ کسی علت وحکمت پر مبنی، ہر نقل کے باطن میں عقل پوشیدہ اور ہر باطن کے غیب میں اسرار مکنون ہیں، ہر جزئی میں کلی مستور اور ہر کلی ہزار ہا جزئیات کا مخزن، پھر علل واحکام میں وہ ہمہ گیری کہ قیامت تک نئے سے نئے پیش آنے والے حوادث ان سے باہر نہ ہوں اور جزئیات میں وہ تشخص کہ اس کا دقیق سے دقیق پہلو بھی اس قدر ممتاز و نمایاں کہ بے تکلف دائرۂ عمل میں لایا جاسکے، جزئیات کو اصول سے ایسا ارتباط کہ ہر جزئیہ کسی عکس نوع سے منسلک، ہر نوع کسی نہ کسی جنس کے ماتحت اور ہر جنس کسی نہ کسی صفت الٰہی سے وابستہ، اور کلیات میں وہ انبساط کہ جزئیات سے لبریز ہو کر نشر جزئیات کے لیے جیسے چھلکی پڑتی ہے، غرض کہ ساری شریعت اسلام منظّم اور اس درجہ منظّم کہ اہل بصیرت کے سامنے تمام جزئیات کلیات کی طرف سمٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تمام کلیات جزئیات کی طرف پھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے اس شریعت کو اوپر سے نیچے تک علم نے گھیر کر رکھا ہے اور ساری ہی شریعت کو علم مجسم بنادیا ہے حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا اور دائمی معجزہ ہی علمی ہے جو قرآن کریم کی صورت میں ساڑھے چودہ سو برس سے ہر عہد و عصر کے ہمہ جہت چیلنجوں کے ساتھ امت کے سامنے جلوہ فرما ہے اور قیامت تک اپنی تحدیات کے ساتھ اپنا اعجاز دکھاتا رہے گا، کوئی حکمت و دانائی کی بات نہیں جو اس میں معجزانہ طریق پر موجود نہ ہو، انسانی زندگی کا کوئی جلی وخفی نہاں وافشاں ایسا شعبہ نہیں جس کے شائستہ بنانے کا نہایت مکمل اور ناقابل ترمیم دستورالعمل اس میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ قوانین سیاست، دستور ملکی، تہذیب نفس، علوم معاش ومعاد، اخبار امم، اسباب عروج و زوال اقوام، پند و مواعظ، عبر و امثال، حکم واسرار، قصص ملوک، سوانح انبیاء وغیرہ کچھ ایسے بے نظیر عناوین کے ساتھ اس

کتاب مبین میں پیش کیے گئے ہیں کہ دنیا کے عقلاء علماء اور فلاسفہ وہاں تک پہونچنے سے عاجز و قاصر ہو گئے۔ فصیحوں اور بلیغوں نے سپر ڈال دیے اور بالآخر قرآن کریم کی بلاغت بیانی نے ان ذہنیتوں کو فتح کر لیا تو دوسری جانب قرآن کی اولین مجسم تفسیر و شرح یعنی حضرت اعلم الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قولی و عملی ہدایات جو فن حدیث کے دائرہ میں مدون شدہ امت کے سامنے پیش نظر رکھو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی شان کا واضح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی و مستقبل کی مہمات پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں، آپؐ کے علم محکم نے ایک طرف تو ماضی کے وہ سربستہ راز آشکارا کر دیے جنہیں چشم تاریخ نے کبھی نہ دیکھا تھا گذشتہ اقوام کی تاریخیں اور مقبول و مردود قوموں کی عبرتناک داستانیں کچھ ایسی جامعیت اور ایجاز بیانی سے پیش فرمائیں کہ ان سے واقعات الگ منکشف ہیں، فلسفۂ تاریخ جدا کھلتا ہے، احکام اور فلسفۂ احکام پر الگ روشنی پڑتی ہے اور ماضی سے مستقبل کے متعلق عملی پروگرام مرتب ہو کر الگ سامنے آ جاتا ہے، مستقبل کے واقعات کو لو تو قیامت تک وہ اہم حوادث جن سے امت کی کسی ہدایت و ضلالت کا تعلق تھا اس تفصیل سے پیش فرما دیے کہ ایک جویائے علم ماضی کے دائرے میں رہ کر مستقبل سے باخبر اور دنیا میں رہتے ہوئے ختم دنیا تک سارے ہی حالات سے واقف ہو جائے، آنے والے فتنوں کی خبریں، فتنہ پردازوں کے اسماء اور حالات کی تفصیل، امت میں تیس دجالوں کی فساد انگیزی، گمراہ کن لیکچروں کی کثرت، خطباء کا بڑھ جانا، فقہاء کا کم ہو جانا، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی مدت بقاء، خلفائے راشدین کی شہادت کی خبریں، اسلامی سلطنت کے انقلابات، خوارج کا خروج، روافض کی تعدیاں، یاجوج و ماجوج کا پھیلنا، دجال اعظم کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور امت کے عام مذہبی اور سیاسی مدو جزر کی پیش گوئیاں ایسے کھلے الفاظ میں فرما دی گئیں گویا علماء کی نظروں میں آنے والے واقعات ابھی گذر رہے ہوں اور پوری امت اپنے سارے مستقبل کو حال بنائے بیٹھی ہو، خبر کے بعد انشاء کے میدان میں آئیے تو احکام معاش و معاد کا وہ جامع پروگرام پیش کیا

اور ایسی لطیف وخفیف عبادتوں کی تعلیم فرمائی کہ ضعیف سے ضعیف انسان کے لیے بھی خدارسی سہل ہوگئی، عادات کو عبادات کا درجہ مل گیا اور تدین ہی کے راستے سے تمدن کے فوائد حاصل ہونے لگے، خدا اور بندے کے درمیان تعلقات کی استواری کے اس قدر پہلو آشکارا ہوگئے کہ اب تک کسی امت پر واشگاف نہ ہوئے تھے، مکارم اخلاق کے وقائع کھولے، محاسن اعمال کے حقائق واضح کیے، عجائب احوال کے الوان نمایاں کیے، غرض کہ احکام دین کی جامعیت اور سہولت و برکت کے ساتھ ہی عمل کی خفت اور اجر کی کثرت کے لحاظ سے ایسے عمیق علوم کا پتہ دے رہے ہیں جن کی گہرائی و گیرائی ناشناسا و نارسیدہ تھی، غرض کہ یہ ایسے اچھوتے لطائف ومعارف کی ایک کھلی اور روشن دلیل ہیں کہ ذات حق جل مجدہ نے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک شان علم وحکمت کو ایک بیش بہا خزانہ اور عقل ودانائی کا مخزن بنا کر امت آخرالزماں پر اپنے خزائن رحمت وا کردیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر علوم ومعارف کے تمام مراتب ختم ہوگئے“۔

چنانچہ ان مستحکم و مدلل بنیاد واساس پر دین اسلام کا یہ دعویٰ ناقابل تردید ہے کہ سوائے اسلام کے مذاہب عالم میں مدمقابل کوئی بھی دوسرا مذہب ہمہ جہتی وہمہ گیریت اور کاملیت واکملیت کے لحاظ سے تبلیغی دین ہونے کا دعوی نہیں کرسکتا ہے، عقل کے شواہد وتجارب اور نقل کے مستدلات اس حقیقت ثابتہ پر شاہد عدل ہیں کہ عالمگیریت کے جملہ رموز ہائے سربستہ اسی دین حق کی تعلیمات سے وابستہ ہیں اور کائنات کے مستور حقائق کے انکشافات بھی اسی کے مرہون منت ہیں، جبکہ اس گفتگوئے مذہبی کے دیگر بہردو فریق میں ایک مذہب مافوق الفہم افسانوی اساطیر کا مجموعہ تو دوسرا عقل سلیم کے قطعاً برخلاف سہ اقانیمی فلسفہ ایک میں تین اور تین میں ایک کا مدعی ومبلغ، جبکہ دین اسلام اپنے جلو میں تمام احکام ومسائل میں عقل ونقل کی مضبوط ترین اساس پر قرین عقل وفہم دلائل وبراہین کا مجموعہ، کیونکہ عیسائیت میں خدا کی ذات تین اقانیم پر مشتمل ہے۔۱- خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں۔۲- خدا کی صفت کلام جسے بیٹا کہا جاتا ہے۔۳- خدا کی

صفت حیات ومحبت جسے روح القدس سے تعبیر کرتے ہیں، اور از روئے عقیدہ ان تینوں میں ہر ایک خدا ہے اور تینوں مل کر تین خدا نہیں بلکہ ایک ہی خدا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث تین میں ایک اور ایک میں تین جبکہ کلام اللہ نے اس عقیدۂ الوہیت کو باطل غلط اور خود ساختہ قرار دیا اور متعدد آیات میں اس کی شدت وصراحت کے ساتھ تردید کی گئی ہے جیسا کہ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ. (۱) علیٰ رؤس الاشہاد اس حقیقت واقعہ میں کسی بھی قسم کا کوئی شک وشبہ یا التباس نہیں ہے کہ عیسائیت کے نقطۂ آغاز سے لیکر آج تک عیسائی رہبان وفلاسفہ یا پادریوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں گذرا جس نے قرین فہم وعقل مستدلات کی بنیاد پر توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید جیسے فریب نظر مسئلہ کو حل کیا ہو جس کو قابل قبول قرین عقل وشعور تصریح سے تعبیر کیا جا سکے، جو مذہب مسلمات عقل کے برخلاف تصریحات کا مدعی ہو جس میں توحید وتثلیث اور وحدت و کثرت جو ایک دوسرے کے صریح نقیض وضد ہوں ان کو متحد مان لیا گیا ہو جبکہ اصحاب شعور وآگہی کے نزدیک یہ متفق علیہ مسلمۂ عقل ہے کہ اجتماع نقیضین یا اجتماع ضدین ایں خیال است ومحال است وجنوں میں شمار ہوتا ہے، بہر حال انہی سہ فریقی دین و مذاہب کے مابین گفتگوئے مذہبی کے اساسی موضوعات پر مشتمل سن ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء وسط یوپی کے معروف شہر شاہجہانپور سے چھ کلومیٹر متصل قصبہ چاندپور میں منعقد ہو کر میلۂ خدا شناسی مباحثۂ شاہجہانپور سے معنون ومعروف ہوا اور بعد از اختتام اصحاب فکر ونظر اس کی دوررس افادیت اور نافعیت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت الامام النانوتویؒ سے روداد مناظرہ کے ترتب کے لیے درخواست گزار ہوئے اور بایں طور یہ معرکۃ الآراء تصنیف کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آکر مقبول عام ہوئی، جس میں موضوع

(۱) ترجمہ: اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے، اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ان سے کہا: ہو جاؤ۔ بس وہ ہو گئے۔ (سورۃ آل عمران: ۵۹)

زیر بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مناظرہ میں فریق اہل اسلام کی جماعت حضرت نانوتویؒ کی قیادت میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا سید ابوالمنصور صاحبؒ شریک ہوئے، اہل تثلیث کی نمائندگی کے لئے برطانیہ کے معروف ولسّان پادری نولس کی سربراہی میں پادری اندرمن اسکاٹ مفسر انجیل، پادری واکر کے علاوہ دیگر کچھ مقامی عیسائی علماء نے حصہ لیا جبکہ اہل ہنود کی جانب سے داعی جلسہ رئیس قصبہ منشی پیارے لال کبیر پنتھی کے ساتھ پنڈت دیانند سرسوتی اور موتی میاں کے علاوہ مقامی وغیر مقامی پنڈتوں کی ایک جماعت نے شرکت کی، اوّل مرحلہ موضوعات مباحثہ کی تعیین کا تھا جس کے ذیل میں پانچ سوالات طے پائے:

۱- پرمیشور کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟ ۲- دنیا کو پرمیشور نے کس چیز سے بنایا، کس وقت بنایا اور کس واسطے بنایا؟ ۳- پرمیشور عادل ہے اور رحیم بھی ہے، دونوں صفات بیک وقت کس طرح؟ ۴- وید بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ ۵- نجات کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل ہوسکتی ہے اور اس کا اطلاق کس کیفیت پر ہے؟ عناوین طے ہوجانے کے بعد اب پہلا مسئلہ یہ تھا کہ تقریر بر موضوع نیز سوالات کے جوابات دینے کے لیے کس مذہب کے لوگ پہل کریں گے، پنڈت دیانند سرسوتی اس موضوع سے صاف طور پر پہلوتہی کرتے ہوئے بعد کے وقفہ کا اختیار کرنے کی بات کہتے ہوئے الگ ہوگئے، جبکہ پادری نولس بھی پہل پر آمادہ نظر نہیں آئے اور بہ وضاحت کہہ دیا کہ ہم ہرگز آغاز نہیں کریں گے اور اگر اصرار کیا گیا تو ہم جلسہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اب سب کا روئے سخن حضرت الامام النانوتویؒ کی جانب تھا چنانچہ اس تصفیہ طلب مسئلہ کا حل انہوں نے نہایت اصولی انداز میں پیش فرمایا کہ اہل ہنود اپنے دعوے کی روشنی میں اپنے مذہب کے حوالے سے دنیا کے قدیم ترین مذہب ہونے کے دعویدار ہیں جس کو وہ اپنی مذہبی کتابوں میں بھی پراچین دھرم کے لاحقے سے ظاہر کرتے ہیں، جبکہ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے جس سے کہ عیسائی قوم کا

وجود متشخص ہوا چنانچہ اس لحاظ سے اہل تثلیث بلحاظ قدامت دوسرے نمبر پر آتے ہیں، جب کہ از روئے قرآن مجید ہم آخری امت ہونے کے دعویدار ہیں اور سلسلۂ زمانی میں بھی ہم بعد میں آتے ہیں تو کیوں نہ اسی ترتیب اصولی کو مدار قرار دیکر اس پیش آمدہ الجھن کا تصفیہ کرلیا جائے، لیکن منشی پیارے لال کبیر پنتھی اور پادری نولس کسی بھی صورت میں پہلے سامنا کرنے کو تیار نہیں ہوئے اور طے پایا کہ اگرچہ آج کا دن تو ڈھل گیا ہے تاہم عصر کی نماز کے بعد کا وقت تقریر کے لئے کافی ہے، اس دورانیہ میں سب سے پہلی تقریر مولوی قاسم کریں اور کل صبح پہلی نشست میں سوالات کے جوابات کا سامنا بھی سب سے پہلے اہل اسلام ہی کریں گے۔

اطراف واکناف سے اس مناظرہ کی شہرت سن کر ہزاروں کا مجمع پنڈال میں جمع ہوچکا تھا، لہٰذا حسب طے شدہ بیان شروع ہوا، حضرت نانوتویؒ نے برسر مجمع مذکورہ اصولی ترتیب کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ قاعدے کی رو سے انصاف کا تقاضہ تو یہی تھا کہ بیان بھی ہم بعد میں کرتے اور سوالات کے جوابات بھی سب سے آخر میں دیتے، اگرچہ ہمیں آغاز کردینے میں بھی کوئی عذر لاحق نہیں ہے اور کل صبح کی پہلی نشست میں سوالات کے جوابات بھی ہم ہی دیں گے، اس کے بعد اپنے فطری وطبعی مزاج انکسار و پوشیدگی کے زیر اثر تقریر کے آغاز میں ہی بہ صراحت فرمادیا کہ میری گذارشات کو مجھ کم علم سے منسوب کرکے نہ دل پر لگائیں اور نہ یہ سمجھیں خودرا فضیحت و دیگراں را نصیحت، کیونکہ اہل حق جانتے ہیں کہ طبیب کا بدپرہیز ہونا مریض کے حق میں مضر نہیں ہوتا ہے، اگر میں خود اپنے کہے پر عمل نہ کروں اور دوسروں کو سمجھاؤں تو دوسروں کو کیا نقصان ہوگا جبکہ اپنی بدعملی کا ضرر میری ہی ذات کو اثر انداز ہوگا، علیٰ ہذا القیاس میری حیثیت تو بس ایک منادی کی ہے جس کا کام اپنے مالک کا حکم اس کی مخلوق تک پہنچانا ہے، اب اگر منادی کم حیثیت و کمتر ہو تو اس سے فرمان شاہی کی شان عظمت اور حکم کی قبولیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، غریب ہو کہ امیر، عوام ہوں کہ خواص احکام وفرمان شاہی کی منادی میں منادی

حیثیت کوئی قابل غور نہیں گردانتا بلکہ احکام شاہی سن کر سر نیاز خم کر دیتے ہیں، البتہ وہ مقرب ومحبوب شاہی جس کی وساطت سے مناد کو حکم شاہی وصول ہوا ہے بوجہ قرب ومعتمد شاہی اس کی شان عظمت وتوقیر واجب التسلیم ہے، بایں صورت حکام دنیا کے احکام کی اطاعت میں یہ حال ہے تو احکم الحاکمین خداوند رب العالمین کے احکام کے بدرجہ اولیٰ احکام کی اطاعت میں میری خستہ حالی قطعاً لائق توجہ وموجب التفات ہرگز نہیں ہونی چاہیے، اپنی فطری اور عاجزانہ وضاحت کے بعد حضرت الامام النانوتویؒ نے سب سے پہلے ذات حق جل مجدہ کے وجود بالذات اوران کی عظمت صفات پر خالص عقلی دلائل سے مقدمات قائم فرماتے ہوئے موالید ثلاثہ نباتات، جمادات، حیوانات اورانس وملک واجنہ اوران کے انواع اوراجناس وافراد نیز عناصر اربعہ خاک ونار، ماء وباد اورکل کائنات ومخلوقات کے تمام جلی وخفی اور جزو وکل، عوالم مشاہد وغیر مشاہد اوراس کے اجزائے مدرکات عقل اوراس کے مافوق حقائق ومغیبات پر ذات باری تعالیٰ کے مکمل احاطۂ قدرت پر عقلی مستدلات قائم فرماتے ہوئے بہ صراحت بتایا کہ بشمول دیگر جملہ مخلوقات انسان کے وجود بالعطاء کی تصریح وتشبیہ کے ذیل میں انسان کے دوطرفہ لاانتہاء عدموں کے درمیان محدودترین (بلکہ اگراس تناظر میں دیکھا جائے تو محدودترین کے لفظ میں بھی وجودیت کی کسی نہ کسی طور معنویت پائی جاتی ہے ورنہ حقیقت حال تو وہی ہے جس کو قرآن کریم نے هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۱) سے تعبیر کیا ہے) وجوداوراس انفصال واتصال نیز آمدوشد اورعدم کے اندھیروں سے جلوہ گاہ وجود میں قدم رکھنے جیسی کیفیات کونور زمین کی تمثیل سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ نور زمین جس کو دھوپ اور چاندنی کہتے ہیں زمین کے حق میں خانہ زاد نہیں ہے بلکہ ضیائے شمس ونور قمر کی محتاج ہے یا اسی طرح آب گرم میں پائی جانے والی حرارت آب گرم کے حق میں بالذات نہیں ہے بلکہ آب گرم کے حق میں حرارت و

(۱) ترجمہ: بیشک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے، جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا۔ (سورۃ الدھر:۱)

تمازت وصف آتش کی مرہون منت ہے اور نور زمین اور حرارت آب گرم کا سلسلہ آفتاب و ماہتاب اور آتش و نار پر ختم ہو جاتا ہے، اسی لیے کوئی شخص آفتاب و آتش کی نسبت یہ خیال نہیں کر سکتا کہ عالم اسباب میں آفتاب و آتش کے یہ اوصاف خانہ زاد ہیں اسی لیے نور و حرارت آفتاب و آتش کو لازم و ملزوم ہے اور اس کا وجود اس کے حق میں خانہ زاد ہو، حالانکہ آفتاب و آتش میں ان اوصاف کی وجودیت اپنے احوال آثار اور ناپائیداری کے سبب سے بہ آہنگ بلند اعلان کر رہی ہیں کہ ان بہر دو مخلوقات شمس و آتش میں بھی وہی عوامل کارفرما ہیں جو کہ نور زمین اور آب گرم میں ہیں اور عطائے غیر کا وہی تسلسل آفتاب و آتش میں بھی اسی طرح موجود ہے کہ ان اوصاف کی وجودیت کسی اور کا ہی فیض ہے اور فیوضات کا یہ سلسلہ جس ذات واجب الوجود پر ختم ہوتا ہے اسی کا وجود خانہ زاد بھی ہے، قدیم بھی ہے، بالذات بھی ہے، معطی وجود بھی ہے، اسی کی ذات محیط الکل اور قادر مطلق بھی ہے، چنانچہ عقل و بداہت کا تقاضہ بھی یہی ہے وہ اپنی ذات و صفات میں تنہا و یکتا ہو، اور بلا شبہ لاشریک ہے، اور ایسی ہی ذات وحدہٗ لاشریک معبود حقیقی کہلائے جانے کے لائق ہے، اسی احکم الحاکمین کے احکامات و فرامین واجب الاتباع ہو سکتے ہیں جسکی ذات باعظمت و اعلیٰ ولدیت و ابنیت اور کثرت الٰہ و معبودات جیسے علائق و عیوب سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء بھی ہو۔

اس کے بعد ایسے ہی عقلی مستدلات پر مبنی دیگر طے شدہ عناوین پر مفصل و مدلل کلام فرمایا، حضرتؒ کے اس خالص الہامی بیان سے جہاں ایک طرف ہندو گیانی اور رہبان نصاریٰ سمیت پورا مجمع ششدر و حیران اور ساکت و صامت تھا، وہیں دوسری طرف ان کو یہ فکر بھی کھائے جا رہا تھا کہ اس کے رد میں کیا بیان کریں اور کیسے بیان کریں، کیوں کہ جہاں تک فریقِ ثالث کی بات ہے اس مذہب کے متبعین خود ساختہ مافوق الفہم و عقل دیو مالائی کہانیوں اور مفروضات و توہمات کے اتاہ گرداب میں وحدانیت کے تصور کو ایسا گم کر بیٹھے ہیں کہ ان خیالی مرکبات اور عقل و شعور کے درمیان نا قابل عبور قسم کے

فاصلے قائم ہو گئے اور حقیقت ظلمات میں ایسی گم ہو کر رہ گئی کہ اندھیروں میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس کسی ایسی چیز سے ٹکرایا جس سے نقص جان وزر کا خوف وخطر ہو یا جذبات انبساط والم کی وابستگی کا کوئی پہلو وابستہ ہو اس نے مقام معبودیت میں اپنی الگ مستقل جگہ بنالی، یہی وجہ ہے کہ معبودوں کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور نباتات، جمادات، حیوانات، چرند، درند، دریا، پہاڑ، آگ، ارواح واجنہ وغیرہ میں کوئی نوع وجنس ایسی نہیں ہے جس میں الوہیت کے اوصاف فرض نہ کر لئے گئے ہوں۔ چنانچہ خیالی مرکبات کے سہارے خستہ اساس عمارت کو اسلام کے دلائل و براہین کے سامنے کیسے تحفظ فراہم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ منشی پیارے لال کبیر پنتھی ناظم جلسہ تو برہما کے وجود کو کنول کے پھول میں قیام کرانے کے بعد آگے اپنی گفتگو کو نہ بڑھا سکے اور لرزتے کانپتے اپنی جگہ آ بیٹھ رہے جبکہ جزئیات وتفصیلات کے تذکرے سے قطع نظر پادری صاحبان اپنی ہزیمت وشرمندگی کی پوٹ سنبھال کر بہ عذر اس جلسہ کو اگلے سال کی غیر معیّن تاریخوں پر ٹالتے ہوئے رخصت ہوئے، بہر کیف اطراف واکناف میں اس جلسے کے بعد زبان زد عام جملہ یہی تھا کہ نیلی لنگی والے نے تو مجمع لوٹ لیا، اور از روئے بیان بعض شرکائے جلسہ جس وقت حضرت نانوتویؒ تقریر فرمارہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کہ الفاظ و معانی دونوں کا قلب پر براہ راست القاء والہام ہو رہا ہو، واپسی پر حضرت نانوتویؒ کے رفقائے جماعت نے اصرار کیا کہ اس روداد کو تصنیفی انداز میں مدون ہونا چاہیے جس کو دوران جلسہ اقتباسات کی صورت میں رفقاء تحریر بھی درج کرتے جاتے تھے، بہر کیف حضرت الامام نانوتویؒ کی اس تصنیف کو نہ صرف یہ کہ اسی دور میں قبولیت عامہ حاصل رہی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس قبولیت کو دوام بھی بخشا اور تا حال یہ تصنیف اصحاب علم وفضل کے لیے بہ لحاظ صفحات مختصر ہونے کے باوجود مرجع علمی کی حیثیت سے مقبول عام ہے اور ہندو پاک کے مختلف مقامات سے متعدد مرتبہ اس کی اشاعت ہوئی تو جزوی طور پر متن میں کہیں کہیں اختلاف بھی پایا گیا ہے۔

لہٰذا دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر انتظام جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند و ڈائریکٹر اکیڈمی نے اپنی نگرانی میں ماشاء اللہ اپنی تدریسی و دیگر انتظامی ہمہ جہت مصروفیات کے علی الرغم اپنے مخلص وفعال اور عزم جواں سال رکھنے والے رفقائے کار کی مخلصانہ وشبانہ روز اجتماعی محنتوں سے مصنفات نانوتوی کے اکثر مطبوعہ نسخوں کو ہندو پاک سے حاصل کر کے الگ الگ ناحیوں سے پروجیکٹ تیار کئے اور اس پر کام کا آغاز کیا جس میں حضرت الامام النانوتویؒ کی مصنفات کا قدیم و جدید اشاعتوں کا بہ لحاظ فرق متون کا بالاستیعاب مطالعہ وعلمی محاسبہ کر کے حفظ متون کے حوالے سے مستقل ایک الگ منصوبہ تیار کیا گیا جو کہ بحمداللہ روبہ عمل ہے جبکہ تسہیل وتعریب اور دیگر مختلف زبانوں میں مصنفات کے تراجم ایک الگ پروجیکٹ ہے، ان ہمہ جہت علمی منصوبوں کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق منصۂ شہود پر لانے کی کامیاب جہود و کاوش کو ملکی و عالمی سطح تک علمی دوائر و اجتماعیات اور اصحاب علم وفضل نے لائق قدر و قیمت تکمیل شدہ اور زیر عمل منصوبوں کو پوری جماعت علمائے دیوبند کی جانب سے فرض کفایہ قرار دیا ہے اور اپنے تحریری وزبانی اعترافات اور مستجاب دعاؤں سے جملہ شرکائے کار کی صلاحیت عمل کو قوت و بلند حوصلگی بہم پہنچائی ہے۔ بلاشبہ ملکی و عالمی سطح سے علمائے کرام کے یہ اعترافات اور مستجاب دعائیں نہ صرف اراکین مذکورہ کے حق میں ہی بلکہ جملہ اراکین ادارہ کے لیے قابل صدفخر وافتخار سرمایہ ہے۔

وما علینا إلا البلاغ المبین

تسخیر کائنات کی تفسیر دل آویز

بانی دار العلوم دیو بند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ کی تصنیفات و تالیفات کے حوالے سے مشہور عام ہے کہ ان کا سمجھنا اور اس کی معنویت کی حقیقت تک پہنچنا ایک دشوار گزار مرحلہ ہے، اس خیال عام کی صداقت پر اگر تاویل سے کام لیا جائے تو حاصل یہ سامنے آتا ہے کہ اصحاب علم وفضل پر اپنے ذوق اور فکری رجحان کی بنیاد علوم وفنون میں سے کسی ایک فن کا غلبہ ہوتا ہے اور وہی ان کا امتیاز و اختصاص کے طور پر علمی دوائر میں معروف قرار پاتا ہے اور مستدلات کا وہی رنگ ان کی تحریرات کو بھی محیط ہوتا ہے، علی السبیل المثال اگر ہم تفسیر ابن کثیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی تصنیفات پر محدثانہ رنگ غالب ملے گا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ کی تفسیر معارف القرآن کی آب وتاب فقہی مستدلات پر قائم ہے، ان تفاسیر سے قرار واقعی استفادہ کے لیے مصطلحات الحدیث اور مصطلحات الفقہ کا جاننا ناگزیر ہے، چنانچہ ان کی تصانیف کے اسی اختصاص سے ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کی عام علمی گفتگو میں بھی یہ ذوق ورنگ صاف جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اگرچہ وہ کتنا ہی سہل انداز گفتگو کیوں نہ اختیار کریں، طبیعتوں کے فطری جھکاؤ کے سبب متعلقہ فن سے دلچسپی رکھنے والے ہم ذوق اصحاب علم کے لیے ان کے اس انداز بیان وتحریر میں حد درجہ مقناطیسی کشش و جاذبیت اور مفید مطلب جواہر آبدار حاصل کرنے کے مواقع موجود

۞ مقدمہ: ''تقریر دل پذیر'' از: حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

ہوتے ہیں اور علم وفن کے غامض مقامات کی مختلف النوع تشریحات وتوضیحات ان کے علوم کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کرتی ہیں لہٰذا فن سے متعلق مصطلحات کا ادراک رکھنے والے ہمہ صفت موصوف اصحاب علم کے لیے تحریرات کی تفہیم میں دقت پیش آتی ہے اور نہ ہی تقریرات میں کسی قسم کی اجنبیت کو وہ محسوس کرتے ہیں، البتہ کبھی کبھی غلبۂ حال کی کیفیت کے زیر اثر کلام میں اس قدر ترفع پیدا ہوجاتا ہے کہ بڑے بڑے اصحاب علم کی وہاں تک رسائی مشکل ہوجاتی ہے، اگرچہ ایسے مواقع شاذ کے درجے میں ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ مشہور ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وہ حضرت الامام النانوتویؒ کی مجلس خلوت میں حاضر ہوتے ہیں، علم کے ایک پیچیدہ مقام سے پردہ کشائی کا مسئلہ درپیش ہے، حالانکہ حضرت موصوف کا شمار اپنے عہد کی ان بلند ترین علمی شخصیات میں ہوتا جس کے نہ صرف معاصر علماء ہی قائل ہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کے باعظمت اصحاب فضل وکمال نے ان کے شرف تلمذ سے خوشہ چینی کی ہے اور ایسے محسنین امت اکابر واسلاف کی ایک طویل فہرست ہے، اپنے علمی ترفع اور معاصرین میں مختلف النوع علمی خصوصیات، اختصاصات وامتیازت کے علی الرغم علم کے بعض بیحد پیچیدہ وغامض مقامات بڑوں بڑوں کو فکری و ذہنی خلجان میں مبتلا کردیتے ہیں، یہ موقعہ بھی ایسا ہی تھا کہ حضرتؒ کو کسی مسئلہ کے مشکل مقام کی پردہ کشائی تک رسائی مطلوب تھی، صورت حال یہ کہ ان کے فکر وخیال پر درپیش مسئلہ کی پیچیدگی سوار ہے اور طبیعت ایک خلجان میں مبتلا ہے جبکہ دوسری طرف حضرت الامام النانوتویؒ پر غلبۂ حال کی کیفیت طاری ہے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مقصد آمد بتاتے ہوئے درپیش مسئلہ بیان کرتے ہیں جس کو حضرت نانوتویؒ اس قدر انہماک سے سنتے ہیں گویا کہ درون قلب سے لے کر ظواہر چشم تک ہمہ تن گوش ہیں اور ان کی تمام قوتوں کا ارتکاز مسئلہ کی تفہیم پر ہے اور اس کے جواب میں گویا ہوتے ہیں اور درپیش مسئلہ کی توضیح وتشریح فرماتے ہیں کیونکہ بیان کا ورود غلبۂ حال کے زیر اثر ہورہا

ہے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا بیانیہ ہے کہ اپنی دانست میں مخلی بالطبع ہو کر میں اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع ویکسو کردینے کے باوجود ان کے بیان کے مقام ترفع کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا اور سلسلۂ کلام میں کسی درجہ توقف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بصد ادب بس اتنا ہی عرض کرسکا کہ حضرت کچھ تنازل فرمائیے گا اور میرے اس کہنے پر حضرت نانوتویؒ نے تنازل فرمایا جو کہ ان کے اپنے مقام کے لحاظ سے تھا لیکن میرے لیے ارتفاعات علم کی بلندیاں بدستور قائم تھیں، چنانچہ تنازل کے بعد بھی جب اس مقام علم تک رسائی ممکن نظر نہیں آئی تو دوبارہ مزید تنازل کی درخواست پیش کی جس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ مولوی یعقوب! پھر کسی وقت آنا، اس وقت نہ تم کچھ سمجھ سکو گے اور نہ میں کچھ سمجھا سکوں گا، ان کے یہ فرمانے پر مجھے ادراک ہوا حضرت پر اس وقت غلبۂ حال طاری ہے، یہ یہاں پر ہیں ہی نہیں، لہٰذا حسب الحکم دوبارہ حاضری کے موقعہ پر جب حضرتؒ نے بیان فرمایا تو میں خود متعجب تھا کہ اتنی سہل تشریح کے باوجود مسئلۂ درپیش کی تفہیم میرے لیے مشکل کیوں بنی ہوئی تھی۔

غلبۂ حال کے زیر اثر اس کیفیت بیانیہ کو شاذ ونوادر کے زمرے میں رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی بداہت و صداقت میں بہرحال کوئی کلام نہیں ہے کہ علوم وفنون کی مصطلحات کی تفہیم وادراک سے الگ ہو کر اصحاب علم کے لیے بھی کسی کلام کی حقیقت اور کنہ تک پہنچنا یقیناً ایک دشوار گزار بات ہے تو عوامی فکر سے تفہیم کی توقع توبذات خود ایک نادانی کی بات ہے چنانچہ اس عدم تفہیم کا اظہار بجز ان الفاظ کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ فلاں صاحب کی تحریرات کو سمجھنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور اس پر مستزاد کہ مرور زمانہ سے ذوق ومزاج کی تبدیلیاں الگ علم وفہم کے ردوقبول کے پیمانے مختلف اور فکری تغیرات وانحطاطات کے عوامل اپنے عہد کے زیر اثر کارفرما، لہٰذا حاصل یہ سامنے آتا ہے کہ فنون کی تفہیم کے رموز ہائے سربستہ متعلقہ فن کی قدیم وجدید مصطلحات کے ادراک اور اس کی تشریحات کی تفہیم میں ہی پوشیدہ ہے، ہر ایک علم وفن کی اپنی کچھ مخصوص اور منفرد

اصطلاحات ہوتی ہیں، جیسے فقہی اصطلاحات کو جانے بغیر نہ مسائل کا استنباط ممکن ہے اور نہ ہی تطبیق کی کوئی واضح راہ مل سکتی ہے، احادیث مصطفیٰ و مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کی گہرائی معنویت اوراس کی حقیقی تفہیم وتشریحات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مخصوص مصطلحات الاحادیث اور مصطلحات الفقہ کا علم ضروری اور لازمی ہے جن کو شریعت نے لغوی مفاہیم کے علی الرغم خاص معانی اور کیفیات سے مبدل کیا ہے، علی اسبیل المثال الصلوٰۃ کے لغوی مفہوم سے صلوۃ کے مرادات شریعت کی کیفیات وحقائق متبادر نہیں ہوتی ہیں، تاوقتیکہ الصلوٰۃ کے ان مفاہیم تک علمی رسائی نہ ہو جن کو نماز کی جملہ کیفیات اوراس کی قرار واقعی حقیقت کو صرف لفظ الصلوٰۃ کی اصطلاح سے اس طرح بیان فرمادیا ہے کہ شرعی مسائل کے ذیل میں جب بھی اور جہاں بھی لفظ صلوٰۃ بولا جائے گا تو ذہن کہیں اور نہیں بلکہ صرف نماز کی ہیئت و کیفیات کی طرف ہی منتقل ہوگا۔

چنانچہ جب بھی کسی علم وفن کے حوالے سے بات ہوگی اس کی اصطلاحات کو سمجھے بغیر کلام کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہوتی ہے، جدید طب اور انجینئرنگ کی اصطلاحات کے جانے بغیر ڈاکٹری یا عمارت سازی کا علم یا کسی ملک کے اور عالمی قوانین کی اپنی مخصوص اصطلاحات کے بغیر علم الطب، علم الہندسہ یا علم القوانین کا حصول ممکن الوقوع نہیں ہے، اب اگر کوئی غیر عالم غیر ڈاکٹر غیر انجینئر اور غیر قانون داں کہے کہ یہ علوم تو ناقابل تفہیم اور مشکل ترین ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ یہ مشکل علم کے متعلقہ اصطلاحات سے عدم واقفیت کی بناء پر کہی جارہی ہے، البتہ یہ الگ بات ہے کہ علوم شریعت کی مخصوص اصطلاحات کے علاوہ دیگر علوم کی اصطلاحات پر معاصر فکر کے اثرات مرتب ہوکر کسی درجہ ترمیمات کا وقوع ممکن ہے چنانچہ تفہیم علم کے لیے براہ تشریح قدیم اصطلاحات کو معاصر مفاہیم سے مبدل کر کے پیش کرنے کا نام ہی دراصل تسہیل ہے، تاکہ وہ معاصر فکر کے لیے اقرب الی الفہم ہوسکے، حضرت الامام النانوتویؒ کی مصنفات و تحریرات پر فلسفہ ومعقولات اور علم کلام کا رنگ غالب ہے، اس میں ان کے اپنے ذوق و

مزاج کے علاوہ معاصر پیش آمدہ احوال اور میدان عمل کو بھی بڑا دخل ہے جس کی تفصیل طول لاطائل ہے، البتہ فلسفۂ یونان و ھند کی راہ سے جو خرابیاں اور شکوک وشبہات اسلامی تعلیمات میں در آئی تھیں ان کا ازالہ بھی اسی راہ سے ممکن تھا، چنانچہ ایک رائے کے مطابق امام غزالی رحمہ اللہ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اس حقیقت کا ادراک فرمایا کہ فلسفۂ یونان کے معقولی مستدلات کی راہ سے معاندین تعلیمات اسلام پر حملہ آور ہوئے ہیں اور اگر بروقت اس کا تدارک نہ کیا گیا ہوتا تو فلسفہ اور علم کلام کی سحر آفرینی سے عقیدے کے کمزور افراد کے متاثر ہو جانے کے خدشات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے علم فلسفہ علم کلام اور علم منطق کو ہی اسلام کے لئے مدافعاتی قوت بنا کر معقولی دلائل کی بنیاد پر معاندین کے اعتراضات کا ابطال کیا اور وہ اسی راہ سے ممکن بھی تھا، تاہم اس حوالے سے علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''الغزالی'' کے سیر حاصل مباحث میں فلسفہ یعنی علم کلام کے بارے میں امام غزالیؒ کے نکتۂ نظر اور اس کے مابعد فلسفۂ اسلام کے مستدلات کو بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہاں صرف اس قدر جان لینا چاہیئے کہ علم کلام میں ابتداء ہی سے دو طریقے قائم ہو گئے تھے، ایک عقلی علم کلام اور دوسرا نقلی علم کلام (نقلی علم کلام اس لئے کہتے ہیں کہ عقائد اسلامیہ کو دلائل نقلیہ یعنی قرآن و احادیث سے ثابت کیا جاتا ہے) اور علم کلام کے یہ بہر دو طریقے خود اسلامی فرقوں یعنی معتزلہ، قدریہ، جبریہ وغیرہ کے مقابلے میں ایجاد ہوئے تھے۔ علامہ ابن خلدونؒ نے مقدمۂ تاریخ میں جس کلام کا ذکر کیا ہے وہ یہی علم کلام ہے، عقلی علم کلام فلسفہ اور دوسرے مذاہب کے مقابلے کے لئے ایجاد ہوا تھا جس کا بانی اوّل ابوالھذیل علاّف تھا اور جس کو نظام جاحظ حسن بوبختی اور ابو مسلم اصفہانی نے ترقی دی تھی، اسی طرح نقلی علم کلام کی بھی متعدد شاخیں تھیں ظاہریہ، ماتریدیہ اور اشعریہ، جس کے بانی اول امام ابوالحسن اشعریؒ تھے اور یہ سب طریقے اوّل اوّل فلسفہ اور عقلیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، اشاعرہ میں سب سے پہلے باقلانی نے بعض

فلسفیانہ اصطلاحات داخل کی تھیں جس پر امام الحرمین وغیرہ نے اضافات کیئے، امام غزالی نے اس قدر ترقی دی کہ نقلی ہونے کے بجائے عقلی بن گیا اور اسی بناء پر ابن خلدون کو دھوکہ ہوا کہ امام غزالی علم کلام کے موجد ہیں، لیکن اگر بالا جمال اس بات کو کہا جائے تو علم کلام حقیقت میں دو چیزوں کا نام ہے ایک اثبات ہے اور دوسرا ابطال ہے، یعنی فلسفہ وغیرہ کا ابطال اور عقائد اسلام کا اثبات اور امام صاحب نے دونوں حصوں کو لیا ہے۔
چنانچہ اسی تسلسل کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو اٹھارہویں صدی میں عیسائی پادری فلسفۂ یونان کی بیساکھیوں پر اور ہندو دھرم کے مذہبی مقتداء فلسفۂ ہند کا سہارا لے کر اسلام کے بنیادی عقائد پر حملہ کرتے اور یورش بولتے نظر آتے ہیں، لہٰذا اس یورش و یلغار کے مسکت رد و جواب بھی اسی راہ سے مؤثر بھی تھا اور ممکن بھی تھا جس کے علمبردار حضرت الامام النانوتویؒ تھے اور اپنے معاصر عہد کا فرض کفایہ ادا کر رہے تھے۔
زیرنظر تصنیف ''تقریر دلپذیر'' فلسفیانہ یورش و یلغار کے تناظر میں معقولاتی رنگ و آہنگ کے ساتھ ایک تقریر اثبات توحید و رسالت پر مشتمل تصنیف ہے، جس میں معقولات کے دقیق مسائل ہی نہیں بلکہ علوم جدیدہ اور فطرت و سائنس کے مسائل جیسے کہ حرکت، زمانہ، تکوینات عالم، کائنات کا مبداء و معاد، طبعیات، ریاضیات، نفسیات، وجدانیات جیسے موضوعات و مباحث کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ مطالعۂ فطرت اور کائنات کی حقیقت کو معقولاتی رنگ و آہنگ میں جاننا ہی دراصل فلسفہ کی اولین اساس شمار ہوتی ہے اور یہی مطالعۂ فطرت فلسفہ کے منابع میں ایک اہم منبع ہے، چنانچہ اگر باندازِ دگر غور کیا جائے تو فلسفہ ہی کیا بلکہ تمام علوم کا منبع یہی مطالعۂ فطرت بنا ہے کیونکہ مطالعۂ فطرت کے ذیل میں وہ تمام علوم آجاتے ہیں جن کا تعلق ہمارے ماحول اور مادی احوال سے ہے۔ طبعیات، فلکیات، ارضیات، کیمیا، نفسیات، حیاتیات اور حیوانیات؛ غرض یہ کہ تمام علوم سائنس جو عصر قدیم اور عہد جدید میں مادہ اور ماحول کے حوالے سے وضع ہوئے فلسفیانہ فکر کو جنم دینے اور مادہ و ماحول کی تفہیم کے حوالے سے فلسفہ کے منابع کی

حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں، علاوہ ازیں فلسفہ کا دوسرا ایک اہم جائے صدور مذہب بھی ہے، وہ اس لحاظ سے فلسفہ کا اہم مصدر قرار پاتا ہے کہ مذہب نے بھی ان مسائل سے بحث کی ہے جو مسائل فلسفہ نے اٹھائے ہیں، مثلاً بائبل کے عہد نامہ قدیم کے باب پیدائش میں کائنات کی تخلیق کا سوال اٹھایا گیا ہے جبکہ اس سے قبل حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کہا کہ میرا خدا وہ ہے جو چاند ستارے اور سورج کا پیدا کرنے والا ہے جس سے ثابت ہوا کہ یونانیوں سے کہیں پہلے ایشیا میں انبیاء علیہم السلام کے توسط سے یہ سوالات اور ان کے جوابات موجود تھے کہ کائنات کی حقیقت اولی کیا ہے، کیا یہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے یا اس کا کوئی کارساز اور اسکو بنانے والا موجود ہے، ہر عہد کے انبیاء نے اپنی صداقت کے لیے کائنات کو حق تعالیٰ کی آیت ونشانی قرار دیا اور ذات حق جل مجدہ کو کائنات اور اور خود انسان کا پیدا کرنے والا خالق ثابت کیا ہے، جزاء وسزا، جبر وقدر، نیکی و بدی، اخلاقیات کے مسائل، افراد کے مسائل، معاشرے کے مسائل فلسفہ سے بھی پہلے مذہب کا موضوع رہے ہیں اور اس میں کسی بھی قسم کے کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مسائل مذکورہ کی تفہیم وتوضیحات میں مذہب کا کردار ہی بنیادی اور اساسی رہا ہے اور مذہب نے ہی ان مسائل پر فلسفہ کی رہنمائی کی ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ فلسفہ کا ایک تیسرا اہم منبع و مصدر دیومالائیت بھی ہے بلکہ ایک لحاظ سے کہا جائے تو اس مصدر کو اولیت کا درجہ حاصل ہے کیونکہ بعض ماہرین علوم یہ بھی دعویٰ رکھتے ہیں کہ جادو، مذہب اور سائنس کا منبع دیومالائی ادب ہے، نیز دیومالائی ادب کے بارے ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ یہ انسان کا ابتدائی سرمایۂ فکر اور مجموعۂ روایات ہے، انسان نے ابتدائی ذہن شعور کے ساتھ کائنات کی مختلف قوتوں کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کے لیے دیوتاؤں اور دیویوں کے تصورات وضع کر رکھے تھے اور وہ ان کو قوت وطاقت کا سرچشمہ تصور کرتے تھے، نیز ان کے حوالے سے ہی مظاہر فطرت اور قوانین فطرت کی تعبیر کرتے، تا آنکہ انسانی علم کے ارتقاء کے

ساتھ ساتھ ان تصورات میں پختگی اور شعور آتا گیا اور یوں وہ ظنیات کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ مظاہر فطرت کی تعبیر وتوجیہ کرنے لگے جس سے فلسفہ اور سائنس کا آغاز ہوا۔

حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی زیر مطالعہ مقبول عام تصنیف ''تقریر دلپذیر'' حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جانب سے بایں طور شرائط درخواست پر معرض شہود پر آئی تھی کہ ایک ایسی تقریر کے ضبط تحریر کی ضرورت ناگزیر ہے جس میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو معترضین کے ہی رنگ وآہنگ میں معقولاتی دلائل کے ایسے مسکت انداز میں مرتب کیا جائے جس میں کسی مذہب کی پابندی بھی نہ پائی جائے اور تنقیح طلب مسائل کا تجزیہ بھی عقل کے ایسے مسلمہ اصول وبراہین سے مدد بہم پہونچاتے ہوئے کیا جائے جس کو اقوام عالم میں اشتراک فکر کی حیثیت حاصل ہو، جس پس منظر میں اس تحریر کا ظہور ہوا اس سے قرار واقعی استفادے کے لیے علوم عقلیہ اور بالخصوص علم کلام فلسفۂ قدیم وجدید سے ذوقی مناسبت اور اس فن کی معروف قدیم وجدید مصطلحات و استعارات کی معرفت بہر کیف ناگزیر ہے، البتہ معاصر فکر وفہم اور عصر جدید کے متجسس انداز فکر کے نقطۂ نظر نیز افادۂ عام کے لیے عبارات کی تسہیل کا دیر سے تقاضہ محسوس ہو رہا تھا، کسی بھی کتاب کی تسہیل کے لیے متعلقہ فن سے فکری وعلمی مناسبت کے علاوہ مصنف کے علمی ذوق ومزاج سے طبعی مناسبت بھی اولین شرائط کا ہی حصہ شمار ہوتے ہیں، زیر مطالعہ تصنیف کی فکر حاضر سے ہم آہنگ تسہیل برادر مکرم جناب مولانا فخرالاسلام صاحب مظاہری کی متعلقہ علوم سے ذوقی مناسبت اور مصنف علیہ الرحمہ کے علمی ذوق و مزاج سے گہری وابستگی، وسعت نظر ومطالعہ اور علمی بصیرت کی بذات خود ایک مضبوط دلیل ہے جسکے لیے بجا طور پر موصوف مکرم علمی دوائر واجتماعیات کی جانب سے سپاس و ستائش اور دعاء واظہار تشکر کے مستحق قرار پاتے ہیں، حق تعالیٰ اس کوشش وکاوش کو

قبولیت ومقبولیت سے سرفراز فرمائیں۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی عزیز مکرم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند و ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی کی سربراہی وراہنمائی میں اپنے مخلص وفعال شرکائے کار کی مخلصانہ جہود کے ساتھ اپنے ہمہ جہت اہداف ومقاصد کی تکمیل کی جانب سرپرست اکابرامت کی مستجاب دعائے سحرگاہی کے زیراثر کامیابی وکامرانی کے ساتھ گرم سفر ہے، جسکے مثمرنتائج وافادیت کا اعتراف نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سے بھی بلند آہنگ وحوصلہ افزاء کلمات شکروتحسین اور بایں طوراعترافات کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں کہ محسن اکابر امت کی تصنیفی جہود کی عہد حاضر کے فکر ومزاج کے مطابق اشاعت اور بالخصوص بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مصنفات کا بالتسہیل وبالتشریح منصۂ شہود پر لایا جانا بلا شبہ پوری جماعت دیوبند کی جانب سے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، لائق تشکر یہ کلمات اکابر ادارے کی سربلند کارکردگی کے لیے سند کی حیثیت کے حامل ہیں جس کے لیے رب العزت کی بارگاہ عالی میں سربسجود جس قدر بھی شکرادا کیا جائے وہ کم ہی کم ہے جس نے اپنے بیکراں فضل واحسان کے طفیل ادارے کواس مقام قبولیت وعظمت سے سرفراز فرمایا ہے، ہم جملہ خدام ادارہ ذات حق جل مجدہ سے ہمہ اقسام شرور وفتن سے حفاظت کے ساتھ مزید ومستمر توفیق کے لیےان کی بارگاہ میں ہمہ وقت دست بہ دعاء ہیں۔ وباللہ التوفیق

فقہ اسلامی کے ارتقائی نقوش

تغیر پذیر دنیا اور انسان کی اجتماعی مزاج سازی

از روئے قرآن و احادیث اور از روئے عقل ومشاہدات ومحسوسات یہ ایک ثابت شدہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ دنیا بدیع السمٰوات والارض کے حکم ومشیت کے مطابق بہر لحہ ولحظہ تغیر پذیر ہے اور یہ تغیرات دنیا میں موجود کبیر وصغیر اور عظیم وحقیر تمام مخلوقات وموجودات عالم پر کسی نہ کسی طور پر بہرکیف اثر انداز ہیں، انسان جوکہ حق تعالیٰ کے سلسلۂ تخلیقات کا عروج ہے جس کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب جلالت سے سرفراز فرما کر کائنات میں اگر چہ محدود ہی سہی لیکن کسی نہ کسی درجے میں تصرف کے اختیار وشعور سے سرفرازی عطا فرما کر مخلوقات عالم پر جہاں ایک طرف عظمت وبرتری سے نوازا گیا ہے، وہیں دوسری جانب اس اختصاص کے باوصف یہ کیسے ممکن تھا کہ انسان قوانین قدرت کے اثرات سے خارج ہوسکتا بلکہ تغیرات احوال، گردش شام وسحر اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل وکوائف کو انسانی زندگی میں ارتقاء کی بنیاد و اساس کا درجہ حاصل ہے جوکہ زمان ومکان کے ہر رنگ وآہنگ میں بنی نوع انسانی کی فطرت وطبیعت فکر ومزاج مقتضیات وضروریات پر مرتب ہونے کے ساتھ ساتھ

۞ مقدمہ: فتاویٰ دارالعلوم وقف دیوبند (تادم تحریر فتاویٰ کی ۴ر جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، کام تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔)

علاقائی احوال وکوائف سے مل کر انسان کی اجتماعی مزاج سازی میں ایک مرکزی محرک کے طور دخیل وکارفرما ہیں۔

امت مسلمہ کی علمی عظمت

ذات حق جلّ مجدہ کے تخلیق فرمودہ انسان کی فطرت اور مزاج کے تناظر میں اگر اسلام کی چودہ سوسالہ عظمت وسرفرازی کی بلندیوں کو چھولینے والی روشن اور عظیم تر دینی وعلمی جدوجہداور تاریخ ساز ہمہ جہت وہمہ انواع اور ہمہ اقسام خدمات کے دائرہ عظمت و رفعت ،وسعت وتعمق، کثرت علوم ومعارف ،تحقیق وتدقیق اور کارہائے علم وآگہی کا ضخامت کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ امت محمدیہ اپنے کارعلوم ومعارف کے ہمہ جہت اختصاصات اور بے بدل امتیازات کی روشنی میں اس حیثیت کی حامل ہے کہ دنیا کی متمدن ومہذب اقوام وملل اپنے مستند تاریخی و مذہبی وقائع سے نہ صرف یہ کہ اسکی نظیرلانے سے ہی قاصر ہیں بلکہ طوعاً وکرہاً ہی سہی اس کار باعظمت کااعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں، البتہ یہ ایک الگ اور مستقل بحث کا موضوع ہے کہ دنیا کی ہرمتمدن ومہذب قوم میں مختلف علوم کی ترویج وتوسیع اورفکر کی وسعت اور گہرائی وگیرائی کے مختلف زاویوں اور معیارات کی مثالیں باندازِ دگر کثرت سے پائی جاتی ہیں جوکہ دنیا کی مختلف نوعیّتوں کے ارتقائی سفرمیں اپنی انفرادیت وامتیاز میں اپنا ایک الگ اورمنفرد مقام رکھتی ہیں،احکام ومسائل کے حوالے سے دین اسلام میں دنیائے علوم ومعارف کی ایک جہت یہ ہے کہ ہردور کے گذرتے وقت میں حیات انسانی کے بہرلمحہ ولحظہ پیش آنے والے مسائل ومعاملات کواسلام کے بنیادی واساسی مسلّمہ مآخذ قرآن واحادیث اوراجماع وقیاس کے تناظرمیں دین اسلام کے سلسلۂ ہدایت ورہنمائی کی روشنی میں طبقۂ فقہائے امت نے احکامات کومدلل ومبرہن کرکے حل وعقدہ کشائی کے فرض کفایہ کواپنی زندگیوں کا بایں طورمحور قرار دیا کہ مسائل کی تحقیق و تدقیق اورتدوین میں اپنی متاع حیات کے ایک ایک لحظہ وپل کوکارآمد بناتے ہوئے اپنی

زندگیاں تج کردی ہیں، خطۂ ارض کا شاید کوئی بھی ملک وشہر اور منطقہ ایسا نہ ہو جس پر بسنے والے افراد امت محمدیہ کے لئے عمل کی راہ کو آسان بناتے ہوئے ہمہ جہت واقسام مسائل کے اجزائے ترکیبی کو علیحدہ علیحدہ کر کے اسکا کوئی حل پیش نہ کیا گیا ہو۔

تدوین وترتیب فقہ کی تاریخ ان ہی حقائق ووقائع سے عبارت ہے، فقہاء کے ان ہی اجتہادات وایجادات کو ہر دور میں امت کی راہنمائی کے تناظر میں مشعل راہ کی حیثیت حاصل رہی ہے، اجتہادات وایجادات کے اس باب میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا رقم فرمودہ یہ اقتباس نفس موضوع کی تمہیدی عقدہ کشائی کرتا ہے کہ ''مؤرخین کا یہ قول ہے کہ نبی اوّل الزماں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر رسول آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کا عرصہ تخمیناً چھ ہزار سالوں یا اس کے کم وبیش کو محیط ہے، اگر مؤرخین کے اس قول کو اختیار کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ رسول اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساتویں الف کے آغاز میں مولود ومبعوث ہوئے (جس پر بعض آثار صحابہ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیات کی طرح تشریعیات کی تکمیل بھی چھ ہزار برس میں ہی ہوئی اور جس طرح تکوین وتشریع میں تدریج کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدت میں بھی اشتراک اور یکسانیت کی شان پائی جاتی ہے جس کی تکمیل کی جانب قرآن کریم بہت واضح اشارہ کر رہا ہے (کیوں کہ کسی شئے کی انتہاء کا اپنی ابتداء سے منطقی ربط کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے) اور از روئے نص قرآنی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۱) اس حقیقت کی روشن اور بین دلیل ہے جسکا حاصل ہے کہ ذات حق جل مجدہ کے چھ دن یا دنیا کے چھ ہزار برس کی مدت میں مخلوقات ومشروعات کا نظام مکمل ہو کر اس درجہ

(۱) ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا، تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کرلیا۔ (سورۃ المائدۃ:۳)

پر پہنچا دیا گیا ہے کہ اب نہ اس میں کسی کمی کی گنجائش رہی ہے اور نہ زیادتی کی، نہ ترمیم کی اور نہ تنسیخ کی اور لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ (۱) کی مہر لگا دی، یعنی جس طرح کائنات عالم کے کلّی مادے آب و خاک اور باد و نار، پھر مادوں کے کلّی موالید جمادات، نباتات، حیوانات، پھر ان کے علویات اور سفلیات، پھر موالید علوی و سفلی کی جامع انواع واجناس انسان، جن و ملک، اسد و غنم، شجر و حجر، بحر و بر، سیارات و ثوابت اور ارض و سماء وغیرہ کی مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کسی بھی قسم کی کمی بیشی کو قبول نہیں کر سکتے ہیں بالکل ٹھیک اسی طرح سے دین کے اصول وکلیات اساسی، قواعد وضوابط اور تمام منصوص عقائد و احکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں ہے، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۲)۔

تاہم جس طرح تکوینیات ان منظّم اور مرتب مادوں اور علوی و سفلی ذخیروں سے بواسطۂ فکر و تدبر نت نئے عجائبات کا انکشاف کیا جا سکتا ہے اور انکی پوشیدہ و مستور طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نت نئے اور جدید تر کارنامے دنیا کو دکھائے جا سکتے ہیں جن کی بظاہر کوئی حد دکھائی نہیں پڑتی ہے اسی طرح تشریع کے منظّم احکام و مسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم و اسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل، لطائف و ظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جا سکتے ہیں کیونکہ کلام اللہ کی شان بھی لاتنقضي عجائبہ وارد ہوئی ہے کہ کلام اللہ کے عجائب وغرائب بے حد ونہایت ہیں، چنانچہ معلوم ہوا کہ جس طرح اس تکوینی انکشاف کا نام ایجاد ہے ٹھیک اسی طرح تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی کوئی انتہاء ہے۔

البتہ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانے کی ذہنیت، فکر و مزاج ضرورت اور مقتضیات کے مطابق ہوتی ہیں اور موجدین کی فطرتیں اور طبیعتیں ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جنکی زمانے کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضروریات ختم ہو جاتی ہیں تو

(۱) سورۃ الروم: ۳۰ (۲) سورۃ الاحزاب: ۶۲

طبائع کی یہ دوڑ ومسابقت بھی ختم ہو جاتی ہے اور آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے، ایسے ہی اجتہادات کا رنگ بھی ہر گذرتے عہد کی علمی ذہنیت اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر چلتا ہے جسکی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے اور مجتہدین کے قلوب واذہان اور فکر وتدبر کے فطری رجحانات چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جسکی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ اس سمت میں بھی ضرورت کی تکمیل کے بعد وہ دور نہیں لوٹتا جو گذر چکا ہوتا ہے اور اب صرف اس سے نفع وانتفاع کا موقعہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ تکوین اور تشریع کو بروئے عمل لانے کے لیے ایک ہی اصول فطرت ہو سکتے ہیں جو کہ فاطر السمٰوات والارض کی فطرت سے ہی بایں طور مربوط ہے کہ وہی ان دونوں کا مبدأ اور منتہاء ہے، ان اصولوں کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا تو عالم مخلوقات مکمل ہوکر سامنے آگیا اور انہیں کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالم مشروعات تیار ہوکر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، چنانچہ اگر عین دین میں اجتہاد کرکے استخراج علل وکلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہوگی تو مجتہد کے فکر وتدبر کی صلاحیتیں قدرۃ اسی جانب چلیں گی، اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراج مسائل اور تدوین قانون کی ضرورت ہوگی تو مجتہد کے دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے، اور پھر ان مستخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کرکے ترجیحات وانتخابات پر فتاویٰ کی ضرورت پیش آئے گی تو اجتہادات اسی سمت بڑھیں گے، مگر یہ ضرور ہے کہ جو بھی درجہ اجتہاد کے ذریعہ پردۂ ظہور پر آجائے گا اور اسکی ضرورت پوری ہو جائے گی تو پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، لہٰذا قدرۃً بعد کے مجتہدین کے دماغ اس طرف چل ہی نہیں سکیں گے بلکہ اُس کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں مزید اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی باقی نہیں ہوگی کیونکہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی ہے اور حاصل شدہ شے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے"۔ (۱)

(۱) اجتہاد اور تقلید، حضرت حکیم الاسلامؒ، صفحہ: ۳۸۲، تحقیقات حکیم الاسلام ج: ۱

مجتہدین کے امتیازات اوران کا دائرہ کار

اس بحث کے اجزاء سے ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی امور کو دیکھ لینا نہیں ہے بلکہ حقائق کی گہرائیوں میں اتر کر اور گھس کر اسکی بنیاد واساسات کا پتہ لگانا ہے، مثلاً موجد کائنات کی اشیاء کی صورتوں سے گذر کر اس کی مخفی خاصیتوں کا پتہ چلائے گا تا کہ اسکے باطنی کلیہ اور اندرونی وسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے، یہی نوعیت ایک مجتہد کی بھی ہے جو کہ مسائل شرعیہ اور نصوص کے ظواہر اور مسائل سے گذر کر ان کے باطن میں اترے گا، تا کہ کلیہ کے علل اور اسرار ورموز اور نکات ولطائف اور کلام کی باریکیوں کا پتہ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے، خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہونچنا اور کلیات سے پھر نئے نئے جزیات نکالنا ان دونوں طبقات کا کام ہوگا نہ کہ سامنے آئی ہوئی جزئیات کا یاد کر لینا، کیوں کہ اس کیفیت کا انطباق حفظ پر تو ہوسکتا ہے مگر وہ علم نہیں ہوگا اور اگر علم ہوگا بھی تو ادنیٰ درجے کا علم کہلائے گا، اس میں علویت کی شان نہیں ہوگی۔

مثلاً تکوین کے سلسلے میں دنیا کے بے شمار جزئیات وافراد زید بکر، شجر وحجر، بحر وبر کا محض دیکھ لینا یا سن کر معلوم کر لینا کوئی قابل ذکر علم نہیں ہے کیونکہ یہ ہر ایک عامی سے عامی انسان کو میسر آسکتا ہے بلکہ اگر مزید آگے بڑھ کر کہا جائے تو یہ علم ہی نہیں بلکہ محض حس ہے، خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے، ہاں البتہ یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے اور اسکی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات وجزئیات سے ہو رہی ہے، پھر زید جزئی کا اسکی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے یہ حقیقتاً علم ہے جو حس کے مقام سے بالاتر ہے، چنانچہ یہ مثال ہے کہ زید اور زید کی طرح عالم کی تمام جزئیات منتشر اور بے ربط نہیں ہیں بلکہ ہر جزئیت میں متعدد کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں، پھر اجناس جمع ہو کر کسی جنس عالی اور جنس الاجناس کے تحت آجاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب وتنظیم کو دیکھ کر

اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔

ثابت ہوا کہ یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہ غائر وہ ایک مستقل جہان ہے جس میں ترتیب وار یہ سیکڑوں کلیات اور عمومات سمائی ہوئی ہیں اور اسکی زیدیت کی تشکیل و تکمیل کررہی ہیں، اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے جس میں زید کی طرح لاکھوں کروڑوں افراد انسان آجاتے ہیں، پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اسکے اوپر حیوان ہے جس میں انسان کی طرح کروڑوں حیوانی انواع بھری ہوئی ہیں، پھر حیوان کلی کی اصل نامیاتی ہے جس میں حیوان کی طرح نمودار نباتی انواع کھپی ہوئی ہیں، پھر نامیاتی اصل جسم سے ہے جس میں نامیات کے ساتھ لاکھوں غیر نامیاتی اور بے نمو جمادات شریک ہوگئے، پھر اس جسم مطلق سے اوپر جوہر ہے جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجردات بھی آجاتے ہیں، پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنس الاجناس ہے جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آجاتے ہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ ساری کائنات کے یہ مختلف شاخ درشاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گذرتے ہوئے وجود میں جمع ہوجاتے ہیں جو کہ ان سب کی اصل الاصول ہے اور اس طرح ایک زید کو بنانے میں کس قدر کلیات نے کام کیا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وجود نے جوہر کا لباس پہنا، جوہر نے جسم کی قبا اوڑھی، جسم نے نمو کی ردا پہنی، نامیات نے حیوانیت میں قدم رکھا، حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا، اور انسان نے ان سب تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا میں پیش کردیا، چنانچہ اس حساب سے زید مجموعہ اصول و کلیات نکلا جسکی جزئیت میں کتنے کلیات سمائے ہوئے ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متمثل ہوکر نمایاں ہورہی ہیں۔

پس ایک عام آدمی تو صرف زید کو دیکھے گا لیکن ایک مفکر و مدبر اور محقق زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ اسکی مخفی کلیات واسرار تک پہنچنے کی جستجو کرے گا، جن

سے کہ زید کا قوام بنا ہے، اور وہ بایں ہیئت کذائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا، اس لیے اس عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مبصر کہیں گے، لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا ہے اس کو صرف مبصر ہی نہیں بلکہ مبصر بھی کہیں گے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ زید کے جثہ کو دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی حقیقت کو پالینا اور پھر اس جزئی زید کا اس کی کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو کہ ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں ہے۔

عالم خلق کی اس مثال سے دراصل عالم امر کی تساوی عمل کی طرف ذہن کو مبذول کرانا مقصود ہے، کیونکہ من وعن یہی صورت حال شرعیات کی بھی ہے کہ حیات انسانی کے قدم بہ قدم چلنے والے تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ ہیئت کذائی مخفی یا سطحی اور نمائشی نہیں ہے بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتب اور منظّم ہیں کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہیں جس میں یہ سارے اصول وفروع اور جزئیات وکلیات درجہ بہ درجہ ترتیب وار پرو دیے گئے ہیں، گویا کہ شریعت کا کوئی جزئیہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو، ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہے، پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصل الاصول سے مربوط ہے اور بالآخر سارے اصول وکلیات سمٹ کر کسی ایک اصل اصیل سے جڑے ہوئے ہیں جس سے پوری شریعت ایک محیر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجرۂ واحدہ کی صورت دکھائی دیتی ہے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱) جسکی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصل واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور بہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے ثمرات سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ ان حقائق کی تہہ داری اور گہرائی تک کسی عام انسان کا ذہن منتقل نہیں ہوسکتا بلکہ علوم وعرفان کے ان پیچیدہ راہوں کے رمز شناس مجتہد کا ذہن ہی تدبرو

(۱) سورۃ ابراہیم:۲۶

تفکر کے راستے سے اس جانب منتقل ہو سکتا ہے اور وہی اس بحرِ ذخّار سے گوہر آبدار نکال کر اُمت کے لئے انتفاع کے راستوں کو سہل اور آسان بنا سکتا ہے، ان ہمہ جہت و ہمہ گیر عظیم ترین سلسلۂ اجتہادات کی ایک عظیم اور وسیع ترین جہت فقہی اجتہادات کی ہے جس کو علم اصول فقہ سے معنون کیا جاتا ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظام شریعت کے مکمل فریم ورک (Frame Work) میں اسکی ہمہ گیر اہمیت وافادیت اور ضرورت نہ صرف یہ کہ کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس جہت کو نظام اسلامی کے مرکزی محور کا عنوان بھی دیا جا سکتا ہے، جو کہ چودہ صدیوں پر مشتمل فقہائے مجتہدین کے تاریخی تسلسل کے ساتھ ان ہمہ جہت خدمات کو محیط ہیں جسکی پوری امت مرہون منت ہے جو کہ بذات خود ایک آفتاب روشن دلیل ہے۔

مذہب اسلام کے امتیازات

دراصل دین اسلام کی تکمیل اور نعمتوں کے اتمام اور اپنی رضا کے اعلان کے ساتھ ذات حق جل مجدہ نے دین اسلام کو متعدد ایسے امتیازات واختصاصات عطاء فرمائے ہیں کہ اگر ہم از آدم تا این دم تاریخ بنی نوع انسانی کا بصیرت کے ساتھ مطالعہ کریں تو یہ حقیقت منکشف ہو کر سامنے آتی ہے کہ بجز دین اسلام کے دنیا میں پائے جانے والے مختلف دیگر مذاہب واقوام کی تاریخ ان کی تہذیب وتمدن ان کے عقائد وعبادات افکار ونظریات، معاملات ورسومات، طرز معاشرت ومعیشت، بود وباش اور معاد ومعاش جیسے متعدد معاملات کے حوالے سے حل مسائل میں نہ صرف ربط باہم کا فرق وفقدان کہیں واضح تو کہیں مبہم انداز میں نظر آئے گا، جبکہ بالخصوص فرد اور جماعت کے باہمی ربط کو متوازن طریقے پر قائم رکھے جانے کی اہمیت کو ہر ایک قوم کے نزدیک بنیادی مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دائرۂ اسلام سے باہر کی اقوام وملل کے قوانین میں فرد اور جماعت کے متوازن ربط کے تعلق سے یا افراط کی طرف نکل کر عدل حقیقی کے راستے سے دور نکل گئے یا تفریط کا شکار ہو کر قانون کی مطلوبہ عادلانہ افادیت کسی نہ کسی

مقام پر پہنچ کر مجروح ہوتی نظر آتی ہے۔

بلکہ اس قول کے نقل پر مبالغہ کا الزام عائد نہیں ہوگا کہ دیگر اقوام وملل کے آئین و قوانین اور ان کے علمی وفکری ذخائر میں ترتیب قوانین کے حوالے سے نہ ہی تو اس قدر گہرائی اور وسعت ملے گی جیسا کہ بوسیلۂ اجتہادات فقہ اسلامی کو بلحاظ حکیمانہ ترتیب اور توسعات فکر ونظر کے ناحیہ سے حاصل ہے اور نہ ہی علمی وعملی سطح پر تدوین وانضباط کی یہ صورت نظر آئے گی جو کہ اسلامی آئین وقوانین کا مسلم الثبوت اختصاص شمار کیا جاتا ہے، جس کے حوالے سے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ بطن مادر میں استقرار حمل سے لیکر تدفین میت تک ہی نہیں بلکہ مابعد کے بھی ہمہ جہت حیات انسانی کے تسلسل کے ذیل میں راہنما نقوش کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے انفرادی یا اجتماعی احوال ومسائل کا کوئی اہم وغیر اہم گوشہ و پہلو اور معاملہ ایسا نہیں ہے جس کا فقہ اسلامی میں احاطہ نہ کیا گیا ہو، خواہ عبادات کے تعلق سے ہو یا معاملات سے متعلق ہو، خواہ انفرادی سطح کے مسائل ہوں یا اجتماعی طور پر اصول مذہب، نیز مقدمات عقلی ونقلی کے استفسارات کا بیانیہ ہو، معاشرت ہو کہ معیشت ہو، فرد ہو کہ اجتماع ہو، زراعت ہو کہ تجارت ہو، قوانین دیانت ہوں کہ آئین سیاست ہو، نظم ریاست ہو کہ دستور ملکی ہو، تدبیر منزل ہو کہ معاشرتی مسائل ہوں، خانگی احوال ہوں کہ تہذیب نفس کا معاملہ ہو، مسائل معاش ومعاد ہوں، یا وصیت و وراثت ہو، غرض کہ مسائل زیست کا کوئی محل وموقع ایسا نہیں ملے گا جس کے ہمہ نوع کلیات سے لیکر باریک سے باریک جزئیات تک کا احاطہ نہ کرتے ہوئے اس کے فطری حل کی جانب راہنما اصول مقرر نہ کیے گئے ہوں، ہر حکم نہ صرف یہ کہ خود اپنی جگہ پر مستقل حکم کی حیثیت ہی کا حامل ہے بلکہ اجتہاد کے راستے اور دوسرے بہت سے علوم ومعارف تک پہنچنے کا وسیع ترین ذریعہ اور وسیلہ بھی بنتا ہے جس سے کہ علم وآگہی کی کتنی ہی انواع تک رسائی کا راستہ روشن ہو کر سامنے آتا ہے۔

حل مسائل کے حوالے سے احکام کی جامعیت اور ان کی مدبرانہ حکمت پر غور کریں

تو جس حکم شرعی کو بھی اٹھا کر بنظر انصاف دیکھئے تو کسی نہ کسی علت وحکمت پر مبنی ملے گا، ہر نقل کے باطن میں قرین عقل وانصاف مصالح موجزن ملیں گی اور ہر باطن کے غیب میں اسرار مکنون پائیں گے، ہر جزئی میں کلی مستور اور ہر کلی میں ہزار ہا جزئیات کا مخزن ملے گا، غرض کہ تدبر اور تفکر کے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو کامل واکمل دین اسلام من حیث المجموع ان گنت و بے شمار محاسن وکمالات اور خوبیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا کسی مختصر سی تحریر میں من کل الجہت احاطہ کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ محض اجزائے عناوین کے تعارف کا تصور بھی محال کے درجے میں ہے لیکن اگر اسکی بے حد وشمار وکنار خوبیوں میں سے صرف دو ایسے اوصاف اور خوبیوں کی ہی اگر بات کی جائے جو خود اپنے آپ میں بہت سے مکارم ومحاسن کو متعدد جزئیات سمیت اپنے آپ میں سمیٹ لینے کی صلاحیت و استعداد کے ساتھ ہر ایک سمت و جہت سے انفرادیت وامتیازیت کی ایسی شان لیے ہوئے ہوں جو دیگر تمام ملتوں اور مذاہب عالم میں اسے یکتا اور بے مثل قرار دینے کے لیے کافی تصور کی جاسکتی ہوں اور ان دو کمالات میں دنیا کا کوئی مذہب اس کا شریک وسہیم نہ ہو وہ اسلام کے دو ہمہ گیر امتیازی پہلو ہیں، ایک ہے جامعیت اور دوسری ہے اجتماعیت، مذکورہ بہر دو پہلوؤں کے حوالے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تحریر فرمودہ یہ اقتباس نفس مضمون کی تفہیم وتسہیل میں معاون وممد ثابت ہوتا ہے کہ ”جامعیت ایک ہمہ جہت اور نہایت وسیع المعنی لفظ ہے، مسئلۂ زیر بحث کے حوالے سے اگر احکام اسلام کے تناظر میں جامعیت کی بات کی جائے تو اس لفظ کی تین شقوق سامنے آتی ہیں، جن کا اگر اجمالاً ہی بیان کیا جائے تو صورتحال اس طرح سامنے آتی ہے۔

(۱) جامعیت ہدایت: یعنی وہ بشری زندگی کے تمام لوازم، عوارض، حوائج، اور علائم کے لیے ہدایت ہے، اور زندگی کا کوئی بھی شعبہ وگوشہ اس کی ہدایت کے احاطہ سے باہر نظر نہیں آتا ہے، جلوت وخلوت، عادت وعبادت، تمدن و معاشرت، دیانت و

سیاست، صلح و جنگ، حب و بغض، پھر احوال انسانی میں غربت ہو یا امارت ہو، مرض ہو کہ صحت ہو، غنا ہو یا حاجت ہو، غم ہو کہ مسرت ہو، خوف ہو یا امن، غرض یہ کہ سب کا مکمل اور منضبط پروگرام اس طرح سے موجود ہے کہ احکام الگ ہیں اور ان سے مکمل مطابقت کے ساتھ نمونۂ عمل کی تفصیلات مستقلاً الگ سے موجود ہیں، یعنی ایک طرف نظری طور پر اصولی ہدایات کا بھی مرتب نقشہ موجود ہے تو دوسری جانب عملی طور پر نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سیرت مبارکہ کی ایک ایک جزئی کو محفوظ کر دیا گیا، گویا کہ یہ نہیں کہ بات صرف کہی اور لکھی ہی گئی بلکہ عمل کر کے بھی دکھائی گئی ہے۔

برخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان میں انسانی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے نکلے ہوئے ہیں جن کے متعلق ان مذاہب میں کسی بھی قسم کی کوئی ہدایت اور نور نہیں ملتا ہے، اور اگر ملتا بھی ہے تو کچھ دور چل کر ہی نقل کے دلائل عقل کے راستے سے جدا ہو کر دم توڑ دیتے ہیں، تفصیلات سے قطع نظر مجملاً علیٰ سبیل المثال ہندو مذہب میں معاشرت کے سیکڑوں احکام ایسے ہیں جن کے بارے میں ہندو مذہب احکام ہدایت کے حوالے سے عاجز و قاصر اور خاموش ہے، چنانچہ جب اس قسم کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے تو اس کمی کو اسمبلیوں کے ذریعہ قوانین بنوا کر پورا کرنے کی کوششیں کی جاتیں ہیں، (مقارنہ بین المذاہب کے حوالے سے موجود کتابی مواد میں اس موضوع کے تعلق سے متعدد دیگر مثالیں بھی تفصیلاً ملتی ہیں جن کا نہ یہاں موقعہ ہے اور نہ یہ زیر نظر تحریر کا موضوع ہی ہے۔)

(۲) جامعیت احکام: یعنی اس کے یہ تمام احکام خود اپنی ذات سے اتنے جامع ہیں کہ نہ خود ان میں کسی ترمیم کی گنجائش ہے نہ ہی تنسیخ کا کوئی موقعہ، گویا کہ انسانی زندگی کے ہر کھلے اور چھپے گوشے کے متعلق مفصل ہدایت کا ایک قانونی اور عملی پروگرام دینا صرف اسلام کی ہی خصوصیت ہے، چنانچہ انسانی زندگی کے اصولاً تین شعبے ہیں، ایک تعلق مع اللہ، دوسرا تعلق مع الخلق اور تیسرا تعلق مع النفس، ان کے سوا چوتھا کوئی شعبہ نہیں۔

اسلام کا یہ اختصاص ہے کہ اس نے انہی تینوں بنیادی شعبہ ہائے حیات کی تعلیم و

ہدایت دی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے ایک ایک حکم میں جمیع شقوق و جوانب کی رعایت موجود ہے اور اس کے حکم کے دائرۂ عمل میں جس قدر بھی فطری پہلو ہو سکتے ہیں ان سب کو پیش نظر رکھ کر حکم دیا گیا ہے، ایسا نہیں کہ جیسے مذاہب غیر میں احکام کی نوعیت یہ ہے کہ اگر کوئی حکم ایک جہت یا ایک ہی جانب لیے ہوئے ہے تو دوسری بہت سی سمتیں خالی ہیں جس سے ان میں یا تو افراط کا غلبہ پایا جاتا ہے یا وہ تفریط کا شکار ہیں، ظاہر ہے کہ افراط وتفریط سے مسائل سلجھنے کے بجائے مزید تر پیچیدہ ہو کر لاینحل بن جاتے ہیں اور بقول شخصے کہ انت کو زوال ہے، پس دوسرے لفظوں میں اس کے بالمقابل یہی کہا جائے گا کہ اسلام کے ہی احکام معتدل اور جامع جوانب ہیں اور اسی لیے وہ دائمی ہیں اور بقاء ہمیشہ اعتدال کو ہی ہوتی ہے۔

(۳) جامعیت کے ثمرات: اسلامی احکام بلحاظ نوعیت اور بلحاظ آثار ونتائج اس درجہ جامع اور مکمل ہیں کہ ان پر صرف اخروی یا روحانی فوائد ہی مرتب نہیں ہوتے بلکہ دنیاوی اور مادی وتمدنی ثمرات کا بھی ترتب ہوتا ہے، وہ نفع آجل بھی رکھتے ہیں اور منفعت عاجل کا بھی احاطہ کرتے ہیں، گویا اسلام ایک ایسا قانون ہے جس میں سے مادی وروحانی، تمدنی ومذہبی، اور دنیوی واخروی اور دارین کے تمام منافع کی طرف راستے نکلتے ہیں، یعنی نہ وہ اس رنگ کا دینی پروگرام ہے جس میں تقشّف مذہبی، امور دنیا سے کنارہ کشی اور خشک مزاجی سکھلا کر معاملات دنیا سے قطع تعلق اور بیگانہ کر دیا گیا ہو اور نہ ہی کوئی ایسا قانون ہے جس میں روحانیت اور خدا پرستی، خلوص وللّٰہیت سے بے تعلقی برتی گئی ہو، بلکہ اس نے انسان کو اگر دنیا میں لگایا تو ہر ہر لمحہ دین اور آخرت کے استحضار اور خوف وخشیت کے علی الرغم إن الدنیا مزرعة الآخرة کی نوید سے اس کے فکر کی وجدانی ساخت اور فطری جذبات کو حوصلہ بھی بخشا ہے۔

اگر عبادت وزہد میں لگایا تو بہر لمحہ ولحظہ طبیعت کی رعایت کو بایں طور ملحوظ رکھا جس سے کہ مادی راحتیں اور دنیاوی استراحت اور اس کے منافع بھی فوت نہ ہو، فرق اگر ہے

صرف یہ کہ دنیا کے یہ منافع مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالغیر ہے، اور منافع اخرویہ مقصود بالذات ہیں، گویا منافع آخرت تو ان احکام کی غایت ہیں اور منافع دنیا خاصیات ہیں جو بلا ارادہ مرتب ہوتی ہیں، اب دوسری جہت سے اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے اسلامی آئین وقوانین کے علل واحکام کو بنظر تدبر جائزہ لیا جائے تو ایسی نادر الوقوع ہمہ گیری ملے گی کہ روز قیامت تک نئے سے نئے پیش آنے والے مسائل وحوادث خواہ ان کا تعلق انفرادیت سے ہو کہ اجتماعیت سے ہو، بہر دو سمتیں ان سے باہر نہ ہوں اور جزئیات میں وہ تشخص کہ اس کا دقیق سے دقیق پہلو بھی اس قدر ممتاز ونمایاں کہ بے تکلف عمل کے دائرے میں لایا جاسکے"۔ (۱)

بہ نظر تحقیق مطالعہ کیا جائے تو جزئیات کو اصول سے وہ ارتباط کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر جزئیہ کسی نہ کسی نوع سے منسلک، ہر نوع کسی نہ کسی جنس کے ماتحت اور ہر جنس کسی نہ کسی صفت رب العالمین سے وابستہ ہے اور ایسے ہی کلیات میں وہ انبساط کہ جزئیات سے لبریز ہوکر نشر جزئیات کے لیے جیسے چھلکا چاہتی ہو، غرض کہ ساری شریعت اسلامی اس قدر منظّم اور اس درجہ مرتبط کہ جس نے شریعت کے ایک ایک حکم کی ایک ایک جزئی کو علم مجسم بنا کر رکھ چھوڑا ہے" اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ اپنی ترتیب وتدوین، تحقیق وتدقیق کے لحاظ سے فقہ اسلامی آج جس صورت میں ہمارے سامنے بنیادی مآخذ کے طور پر موجود ہے اسکی تنظیم وترتیب اور جمع وتالیف میں تاریخ اسلامی کے بہترین اور اعلیٰ ترین دماغوں کی بصیرت افروز علمی وفکری صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں، تعمق علم وفہم کے ساتھ بے لوث شب وروز کی انتھک محنتوں اور کاوشوں کے ثمرات ہمارے علمی ذخائر کا ایک ایسا بے بدل اور عظیم ترین سرمایہ ہے کہ دیگر اقوام وملل اس کی مثال لانے سے عاجز وقاصر ہیں۔

اسلام کے متعین کردہ بنیادی مآخذ کلام اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع وقیاس کی بنیاد

(۱) اسلام کے دو امتیازی پہلو، صفحہ ۱۶۲، تشریحات حکیم الاسلام، ج:۴

واساس اور اس کی فراہم کردہ روشنی میں استنباط مسائل میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہر بدلتے دور اور مائل بہ تبدل انفرادی واجتماعی مسائل حیات کے چیلنجز کو قبول کرنے اور اسکا علمی سطح پر مقابلہ کرنے اور معقول ومدلل جواب دینے اور حل پیش کرنے کی اگر بنی نوع انسانی کے قرین فطرت وطبیعت صلاحیت کسی دین کو حاصل ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے، اسی لیے قرآن کریم نے اسلام کو لفظ مذہب سے نہیں بلکہ دین سے تعبیر کیا ہے جو کہ اس کی ہمہ جہتی وہمہ گیری وسعت وگہرائی وگیرائی اور اسکی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ کی روشنی میں عہد بہ عہد بدلتے تمدنی مسائل حیات کے فطری حل تک رسائی حاصل کرنے اور تفریع مسائل میں فقہائے امت کی بلا انقطاع شب وروز کی تسلسل کے ساتھ اجتہادی محنتوں نے اسلامی آئین وقوانین کو ایسے عالمگیر امتیاز واختصاص سے ہمکنار کیا ہے جس سے دیگر اقوام تہی دست نظر آتی ہیں اور اس حوالے سے مزید تعمق فکر ونظر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دنیا کا ہر مذہب ایک پیچیدہ صورت حال سے دوچار نظر آتا ہے جس کا ہمہ جہت انداز میں متوازن اور قابل قبول حل تلاش کرنے میں اکثر مذاہب کو ناکامی کا ہی سامنا رہا ہے اور وہ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ عہد بہ عہد دنیا کے بدلتے احوال ومسائل، مزاج وکیفیات اور مائل بہ تبدل معیارات رد وقبول میں نیز ہر دور کے مذہبی اعتبار سے سب کے لیے سہل العمل ہونے کے حوالے سے معاملات میں عقل انسانی کی محدود رسائی اور اس کے کردار کو کس حد تک اور کہاں تک تسلیم کیا جائے۔

نیز اسی کے پہلو بہ پہلو دوسرا بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ دنیاوی معاملات میں مذہب اور اخلاق کو کس حد تک جگہ دی جائے، یہ ایک ایسا مرحلہ ہے کہ اس پر پہنچ کر اکثر مذاہب نے ٹھوکریں کھائی ہیں، بعض مذاہب واقوام نے اس کا یہ راستہ نکالا کہ مابعد الموت اخروی معاملات کو مذہب کے سپرد کر دیا اور اس دنیا میں پیش آنے والے تمام

مسائل کے حل کی اساس عقل انسانی کے حوالے کر دی، اس غیر معقول تفریق کی وجہ سے دنیا و آخرت کے معاملات میں جو معنوی تسلسل اور ربط و توازن قائم رہتا ہے جس کے حیات انسانی میں بیحد دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں، نقل ربانی اور عقل انسانی میں متوازن امتزاج کے حوالے سے اس مرحلے پر قابل غور و فکر نکتۂ معتدل یہ ہے کہ معلومات اگر حواس کے راستے سے حاصل ہوئی ہیں تو اصطلاح میں اس کو تعقل کا نام دیا جائے گا اور اسی کی روشنی میں عقل جزئیات سے کلیات کے استنباط کا فریضہ انجام دیتی ہے، لیکن اگر معلومات کا مآخذ و مصدر وحی ربانی اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوم عرفانی ہیں اور اس راہ سے عقل ان تک رسائی حاصل کر کے نتائج و نظریات اور تفریعات و جزئیات پیدا کر رہی ہے تو اب اس کا اصطلاحی نام تفقہ کہلائے گا، چنانچہ نقل و عقل کی متوازن بنیادوں پر استوار عمارت ہی اپنے ہمہ جہت حسن کے ساتھ دائم رہ سکتی، ورنہ اس کے نہ رہنے یا مابین فرق آ جانے کے سبب حل مسائل یا تو مزید تر پیچیدہ ہو کر افراط و تفریط کا شکار ہو جائیں گے جیسا کہ اس گنجلک مرحلے پر نا قابل قبول غیر فطری تاویل سے مزید الجھ جائیں جیسا کہ بعض دیگر مذاہب ایسے مقام پر غیر طبعی اور عقل صائب کے نزدیک نا قابل قبول دلیل کا سہارا لیکر آگے بڑھ گئے اور خاموشی اختیار کر لی گئی جو ظاہر ہے کہ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔

چنانچہ دیکھنے میں یہ آیا کہ اس طریقے پر انسان ذہنی اور فکری اعتبار سے دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا جس طبقے نے خود ساختہ مذہبی رسومات کو ترجیحاً مقدم جانا اس نے اپنے آپ کو دنیا کے معاملات، رسوم و رواج اور بقائے نسل کے لازمی رشتے ناطہ تک سے بھی اپنے آپ کو منقطع کر لیا وہ نہ صرف وہ مذہبی رسومات کا ہی ہو کر رہ گئے بلکہ دنیا کی زندگی کو، دنیا میں حیات انسانی سے مربوط فطری و نفسانی احوال و کوائف اور ان فطری رشتوں کو گناہ و آلائش اور موجب عذاب خداوندی جان کر ترک کا راستہ اختیار کر کے بیابانوں اور ویرانوں کو اپنی یکسوئی اور عبادات کے لیے توجہات کا محور بنا کر رہبانیت اختیار کر لی

جو کہ فطرت انسانی کے قطعاً مخالف ہے اور اس غیر فطری وخود ساختہ مذہبی تقشّف کے راستے سے رب کی رضا وخوشنودی کے حصول اور نفس کے تنزل و روحانی ترقی حاصل کرنے کے راز کو پالینے کے نقطۂ نظر سے اپنے جسم کو غیر طبعی طور پر زیادہ سے زیادہ تکلیف واذیت دینے میں تلاش کیا، کوئی مدتوں ایک ٹانگ پر کھڑا ہے، کسی نے اپنے جسم کو مٹی میں دفن کیا ہوا ہے تو کوئی شدید برفانی ماحول میں ننگ دھڑنگ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہے، ظاہر ہے یہ تمام حرکات واعمال نہ ہی تو فطرت انسانی سے میل کھا سکتے ہیں اور نہ بجز کچھ ریاضت کے نتیجے میں طبائع انسانی اس قسم کے ناقابل فہم وعقل حرکات و سکنات کی زیادہ دیر تک متحمل ہی ہو سکتے ہیں جو کہ نہ صرف یہ کہ سراسر فطرت وطبیعت کے برخلاف اور فہم وعقل سے سراسر متصادم ہی ہیں بلکہ ذات حق جل مجدہ کی حکمت و مشیت کے زیر اثر انسان کو عطاء کردہ مختلف قوات کا کفران بھی ہے جو ظاہر ہے کہ عنداللہ مقبول نہیں ہوسکتا ہے۔

اسی لیے دین اسلام نے قرب خداوندی کے حصول کے لیے اس غیر فطری طریقۂ عبادت وریاضت کو از روئے نص قرآنی واحادیث رہبانیت کے عنوان سے مسترد کرتے ہوئے اس کی مکمل طور پر نفی کی ہے، دوسری طرف جس نے دنیا کو مذہب پر فوقیت دی اس نے مذہب کو حیات انسانی کے لیے کچھ فرسودہ قسم کی رسومات کا نام دیتے ہوئے اس کے نظام عمل کی حدود وقیود کو انسان کی آزادی فکر وعمل پر براہ مذہب حملہ آور اور انسان کی آزاد فطرت پر جکڑ بندیوں سے تعبیر کیا، یا پھر اس کو توہم پرستی کا نام دیکر قوانین مذہب و اخلاق کو مسترد کرتے ہوئے اپنے آپ کو مادر پدر آزاد سمجھ لیا، یہ فکر ونظر معاشرتی تباہ کاریوں کا ایک ہلاکت خیز طوفان اپنے جلو میں ساتھ لیکر آیا جس کا منطقی نتیجہ یہ سامنے آیا کہ انسانی تہذیب وتمدن کو اخلاقی اور فکری اعتبار سے شدید ترین اختلال وتباہی کا سامنا ہوگیا جو کہ نتیجتاً ذہنی انتشار اور فکری ژولید گی اور تہذیبی تباہی وبربادی پر منتج ہوا جس کے عقلی وبصری اور تاریخی شواہد قدیم اقوام وملل کی تاریخ ووقائع سے لیکر قریبی وقت میں

یورپ کی تاریخ مذہب وکلیسا کی کشمکش اور تصادم کے واقعات سے بھری پڑی ہے جس نے دنیا کے مختلف خطوں میں تشکیل خاندان کے صالح نظام وروایات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اوراس نظریہ کے حاملین کی جانب سے برسر عام حیوانیت کے مظاہر کو مہذب و متمدن اور ترقی یافتہ روشن تہذیب کے عنوان اور سرنامے کا اعزاز بخش کر انسان کی اشرفیت اور مسخر کائنات کے منصب جلالت کے شرف عظیم کو پاؤں تلے کچل کر رکھ دیا۔

اگر انسانیت کے روبہ زوال نتائج سے دوچار ہونے کے اسباب ومحرکات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں صرف اورصرف مجرد عقل راہنما بنی ہوئی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ بلاعلم کے عقل محض عقل طبعی ہے (زیر بحث موضوع میں یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق مختلف آسمانی مذاہب میں الٰہیات سے ہے) جو کہ بلاشبہ نفس کو یہی خطوط عمل فراہم کرے گی، کیونکہ انسان کی خلقی قوتوں میں ٹکراؤ کی صورت میں اگر عقل غالب رہی تو لازماً یہ اپنی برتری کا ثبوت پیش کرنے پر مجبور ہے اوراگر ستم بالائے ستم عقل پرشہوت وغضب اورحیوانیت غالب آگئی تو یہی انسان انتہائی پستیوں میں گرا ہوانظر آئے گا اورالٰہیات سے دورانسان کی مجرد عقل طبعی قوتوں کا ساتھ دیتے ہوئے نت نئے راستے بھی بتلائے گی، بخلاف اس کے کہ ایک عالم عقل جس کی قوتوں کوعلم کے ذریعہ رہنمائے ربانی کا سہارا حاصل ہے وہ ان قوتوں کواپنی ہی راہ پر چلنے پہ مجبور کرے گا، کیونکہ انسان کی فضیلت محض عقل سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہےاور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہواور مطلقاً عقلی بھی نہ ہو بلکہ ربانی علم ہو جو بذریعہ وحی اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے بشکل قرآن اور بالہام حقانی بصورت احادیث ذات حق جل مجدہ کی طرف سے آتا ہے، دلوں کوروشن کرتا ہے، عقلوں کوجلا بخشتا ہے، ذہنوں کورسا کرتا ہےاور دماغوں کوصیقل کرتا ہے، صائب اورمتوازن عقل کا خلاصہ یہ ہے کہ طبیعت پرتو عقل کی حکومت قائم کردی جائے اورعقل پرحکمرانی شریعت اورعلم الٰہی کی قائم کردی جائے تو انسان مزکی، مصفی اورمجلی ہوجائے گا، ورنہ ایک حیوان یا

ایک شیطان یا ایک درندے کے سوا کچھ نہیں ہوگا، الٰہیات کے تابع رکھ کر ہی عقل کا متوازن کردار نتیجہ خیزی کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں عقل صائب اور متوازن فہم وشعور کی بنیاد پر علیٰ رؤس الاشہاد بلاخوف تردید یہ دعویٰ ہرگز بیجا نہیں کہلائے گا کہ اگر کوئی دین، مذہب اور دنیا کے بیچ باہمی ارتباط کے حوالے سے نہایت متوازن، قرین عقل وخرد اور انسانی فطرت وطبیعت اور اس کے طبعی وجدانی اور انسان کے پیدائشی فکر ومزاج کی ساخت سے اقرب اور مہذب ترین قابل قبول اور سہل العمل حل مسائل انسانی کی صلاحیت واستعداد کا روئے زمین پر کوئی دین دعوے دار ہوسکتا ہے تو وہ بجز دین اسلام اور اس کے مکمل نظام شریعت کے دنیا کا کوئی بھی مذہب اس امتیاز واختصاص میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے جس نے اپنے معتدل اور ہمہ گیر وہمہ جہت نظام شریعت سے ایک طرف عقل انسانی کو مطمئن کیا تو دوسری جانب اس کے ساتھ ساتھ شریعت کے دیے ہوئے اصول وضوابط یعنی وحی الٰہی کی قدم بہ قدم راہنمائی کی روشنی کو کارپرداز عمل کا امام رکھا ہے۔

اسلامی علوم کی استنادی حیثیت

چنانچہ اسلامی علوم ومعارف کے بیش بہا کوہ گراں میں بادنیٰ تأمل فکر سے یہ حقیقت روشن ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ إن الدنيا مزرعة الآخرة کے ضمن وذیل میں دین اور دنیا کے بیچ خوبصورت ترین امتزاج وتوازن کا سب سے روشن نمایاں اور بوجوہ مختلفہ اپنے آپ میں منفرد علم کے اگر کسی گوشۂ علم کا ذکر آئے گا تو اس میں علم اصول فقہ کو اپنے امتیازات واختصاصات کے سبب مرتبۂ عالی پر رکھا جائے گا، جس کے بنیادی اصول و قواعد اور اس کی مرکزی اساس کلام اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہے۔

گویا کہ مذہبی راہنمائی اور متوازن روحانی حدود وقیود کی پابندی کا مکمل موزونیت کا حامل سامان بانداز ہمہ نوع اس میں موجود ہے جس کی یہ بنیادی اور اولین شرط لازم روز اوّل سے جزو لاینفک کے طور پر جانی اور مانی جاتی ہے کہ کوئی بھی قاعدہ اور کوئی بھی قانون

صرف اور صرف وہی لائق تسلیم و عمل اور قابل قبول قرار پائے گا جس کی بنیاد و اساس اور سند براہ راست کلام اللہ اور سنت رسول اللہ کے دلائل و براہین سے مربوط و روشن ہو، اس شرط لازم کے بجز کوئی بھی اور کسی بھی قسم کی سند قابل قبول نہیں ہوگی، اگرچہ اس کے پیچھے کیسی ہی معتمد تاریخی یا واقعاتی سند کتنے ہی مضبوط انداز میں اس کو نظری دلائل فراہم کرتی ہوئی کیوں نہ نظر آ رہی ہو۔

بلا شبہ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ تاریخ خود اپنے آپ میں علم و فن کا ایک نہایت اہم ترین حصہ شمار ہوتا ہے، اور بہت سے علوم و فنون ایسے بھی ملیں گے جن میں اس کی سند کو درجۂ قبول بھی حاصل ہوتا ہے، کیونکہ فن کے ناحیہ سے غور کیا جائے تو یہی تاریخ ہے جو حکمت کا سبق پڑھاتی ہے، افراد و اشخاص اور ادوار کے فکر و مزاج سے روشناس کراتے ہوئے واقعات اور اس کے اسباب و علل سے آگاہی بخشتی ہے، لیکن اس کے مرکزی مآخذ کی بنیاد کیونکہ خالص عقل انسانی پر استوار ہے اس لیے نہ ہی تو وہ فقہ اسلامی کے لیے قابل ذکر سند کے درجہ کو حامل ہوسکتی ہے اور نہ ہی کسی فقہی حکم کی اساس اس پر استوار کی جاسکتی ہے۔

اسلامی آئین اور عقل انسانی

اب رہا یہ سوال کہ دین اسلام کے آئین و قوانین میں مرکزی اساس و بنیاد سے مربوط مذہبی رہنمائی کی مکمل گرفت کے ساتھ عقل انسانی کا تداخل اور اس کا کردار کس حد تک عامل رہا ہے؟ تو کہا جائے گا کہ دین و مذہب اور وحی و اخلاق سے اس کی روشنی میں عقل انسانی کی نہایت گہری مضبوط و مستحکم، نہایت متوازن اور قطعی وابستگی کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کے مباحث و مضامین اور اس کے ایک ایک جزئیہ میں عقل و خرد کی کارفرمائی اس حد تک ہے کہ فنی اعتبار سے پورے علم کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس علم و فن کا ایک ایک گوشہ عقلی و منطقی بنیاد پر استوار ہے، کیونکہ کلام اللہ اور سنت رسول اللہ کی بنیادی اساسات کے ذیل میں اجماع اور قیاس کے ذریعہ استنباط مسائل میں فقہائے کرام کے

کارہائے باعظمت کی کارپردازی ان کی اعلیٰ ترین عقل وخرد اور فکر ونظر میں وسعت و گہرائی کی ہی تو دلیل ہیں۔

فقہ اسلامی عہد بہ عہد

اسلام کے عہد اوّل کا اس نقطۂ نظر سے اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا اجمال چند لفظوں میں یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ میں احکام میں تفریع مسائل کی ضرورت بایں طور بھی پیش نہیں آتی تھی کہ اوّل تو خود نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک صحابۂ کرام کے درمیان میں موجود تھی اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک عمل اپنے آپ میں بذات خود ایک حکم کا درجہ رکھتا تھا، گویا کہ عملی احکام کی موجودگی میں نظری احکام کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی، دوسرے عہد نبوی میں موجود افراد کی فکری ساخت بیجا قسم کے عقلی قیل وقال سے دور بیحد سادگی کی حامل تھی، نیز اسلام کا دائرہ جزیرۃ العرب تک محدود تھا اور ان کے اس عمومی معاشرے کے مزاج کی ساخت اور قبائلی طرز کے بود وباش کی وجہ سے ارتقاء پذیر تمدن اور اس کی جلوہ افروزیوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مختلف النوع سوالات تک بر بنائے عدم علم رسائی نہیں تھی، گویا کہ اپنی ہی کھال میں مست رہنے والے لوگ تھے۔

اور اس میں بھی بالخصوص صحابۂ کرام کی معاشرت ومعیشت، طرز بود وباش اور فکر و مزاج کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نشینی اور تربیت نے اس قدر سادہ بنا دیا تھا کہ سوال ومسائل کی غیر ضروری کثرت وباریکیاں ان کے سادہ مزاجوں سے میل نہ کھاتیں تھیں اور جو سوالات پیدا ہوتے اکثر کے جواب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہی حاصل ہو جاتے تھے باقی صحبت نشینی سے فیض پا لیتے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بہ دلیل نص قرآنی اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۱) اخلاق واعمال میں کلام اللہ اور اس کے احکام کے ایک ایک جزو کی عملی تفسیر تھی، آپ خود بھی عمل فرماتے اور صحابۂ کرام

(۱) ترجمہ: اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔ (سورۃ القلم: ۴)

کو بھی اس کا حکم دیتے اور حسب موقع کسی حکم کی اطمینان بخش ضروری توضیح وتشریح لوگوں کے سوالات کی روشنی میں یا ازخود بایں طور فرما دیا کرتے تھے کہ احکام کی انجام دہی میں قلت تکلیف اور عدم حرج کی رعایت ملحوظ رہے، ایسے ہی قصص وموعظت کے ذیل میں جو آیات نازل ہوتیں ان کے احکام مستنبط کر کے فرما دیا کرتے تھے، یا ایسے ہی معاشرتی سطح پر روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات وحوادث سے پیدا ہونے والے سوالات کی تشریحات وتوضیحات کا معاملہ تھا۔

لہٰذا دور نبوت میں احکام اور مسائل و وسائل کے اختصار کے سبب اسلام کے نظام احکام کی جزئیات کو مابعد کے ادوار کے مثل باقاعدہ تدوین کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی، البتہ متفرق انداز میں جستہ جستہ کسی کسی کے پاس اپنی ضرورت و یادداشت کے طور پر کچھ احکام تحریری شکل میں اگر موجود تھے تو اگرچہ اس وقت ان کی نوعیت انفرادی حیثیت کی رہی تھی، لیکن تدوین فقہ کے حوالے سے بعد کے دور میں وہ صحت سند اور اصول تحقیق وتدقیق کی روشنی میں وہ ایک مضبوط مستدلات کا حصہ شمار کیے گئے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دنیا سے پردہ فرما لینے کے بعد دور صحابہ میں صاحبان علم وفضل اجلّ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تفریع مسائل اور استخراج احکام کے حوالے سے مختلف قسم کی صورت احوال کا سامنا تھا جس میں بالخاص اسلامی فتوحات کی وسعت کے علی الرغم دائرۂ علم وعمل کے توسعات اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والے واقعات تھے جو کہ وقت و احوال سے ہم آہنگ مسائل میں اجتہاد واستنباط کے متقاضی تھے جس کے لیے اصحاب علم صحابۂ کرام کو قرآن واحادیث کے اجمالی احکام کی تفاصیل کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

علی سبیل المثال اگر کسی سے ادائیگی نماز میں کوئی غلطی یا کوئی سہو واقع ہو گیا تو یہ بحث پیش آنا لازمی تھا کہ آیا نماز ہوگئی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اس بحث کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ تو ممکن نہیں تھا کہ بالکلیہ نماز کے ساقط ہو جانے کا حکم لگا دیا جاتا یا نماز میں جس قدر اعمال تھے لاعلی التعیین سب کو فرض قرار دے دیا جاتا، لہٰذا صحابہ کو تفریق کرنی پڑی

کہ نماز کے یہ افعال فرض و لازم ہیں جن کا ترک نماز کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے، یہ افعال واجب ہیں جن کا ترک کراہت کا تو موجب ہوسکتا ہے سقوط نماز کا نہیں، یا یہ امور مستحب ہیں جن کا ترک موجب خلل نہیں۔

علیٰ ہذا القیاس اس قسم کے اور بھی دیگر مختلف النوع مسائل تھے، کسی بھی مسئلے میں متعدد آراء کا ہونا عین قرین عقل وقیاس ہے، چنانچہ مسائل کے استنباط میں اختلاف کا پیدا ہونا بھی بہر کیف ناگزیر تھا اور صحابہ کی مختلف آراء کا قائم ہونا بھی ضروری اور لازمی تھا، اس حوالے دوسرا ایک بڑا سبب یہ بھی پیش آیا کہ بہت سے واقعات واحوال اس طرح کے بھی پیش آئے جن کا عہد نبوی ﷺ میں کوئی نام ونشان بھی نہیں تھا اور صحابہ کے لیے اس قسم کے مواقع کا سامنا کرنا ان کیلئے نئی صورت حال تھی، لہٰذا ایسی حالت پیش آجانے پر اصحاب علم کے لیے استنباط، حمل النظیر علی النظیر یعنی پیش آمدہ صورت حال میں اس کے مثل یا اس سے مطابقت رکھتی مثال پر محمول کرنا اور قیاس سے کام لینا بہر حال ناگزیر تھا اور ان میں بھی کوئی ایسا اصول نقطۂ اتفاق کا حامل نہیں تھا جس کی پہلے سے کوئی نظیر موجود ہو، بنا بریں آراء میں اختلاف کا پیدا ہونا فطری اور لازمی تھا، یہی وجہ تھی کہ اسلام کے دور اول میں قیاس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ قیاس، استحسان، استصلاح، استصحاب اور اجتہادات عہد بہ عہد کے معاشرتی وتمدنی تغیرات سے نباہ کرنے کا ایک وسیع ووقیع وسیلہ ہیں جس نے شریعت وفقہ کو وسعت دیکر تا قیامت جمود سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک عظیم تر تعمیری کردار ادا کیا ہے۔

اسی حوالے سے ہم مزید آگے بڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ خود بعض مسائل میں اہل علم صحابہ کا منصوص علم بھی مختلف تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عہد نبوی میں دین کی تکمیل تدریجاً اور رفتہ رفتہ ہوئی تھی، نیز احکام میں حسب موقع تغیر وتبدل بھی ہوا جو ایک الگ سے مستقل بحث کا موضوع ہے، اندریں صورت تمام صحابہ کو ہر امر کا علم ہونا یا یکساں پیرائے میں معلوم ہونا مشکل تھا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارکہ میں ہر

وقت سب موجود نہیں ہوتے تھے، چنانچہ جنہوں نے جیسا سنا جیسا دیکھا انہوں نے اسی کو معمول بنالیا، بایں ہمہ وجوہ بھی آراء میں اختلاف کا پایا جانا ناگزیر تھا، یہاں پر لفظ اختلاف کی مجمل وضاحت بایں طور برمحل ہوگی کہ ایک طرف خالص عام سطح کے ذہن میں لفظ اختلاف کا انتہائی محدود ترین مفہوم باہمی تنازعات، معاندت ومخالفت اور جھگڑے کے ماسوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا، دوسری جانب حرارت ایمانی اور بوسیلۂ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابۂ کرام سے سربلند عظمت پر غایت درجہ محبت وعقیدت کا تعلق یہ لفظ اختلاف عام فکری سطح کو عدم علم کی بنیاد پر الجھن وکشمکش اور انتشار میں مبتلا کرتا ہے، حالانکہ تفصیلات سے قطع نظر اختلاف کی مجمل حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک یکساں حالت، کیفیت، بات اور رویے سے الگ اور مختلف حالت وکیفیت، بات ورویے کے بالمقابل ظہور کے ہمہ جہت مفہوم کا کوئی دوسرا لفظ مطلوب مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے اور بجز لفظ اختلاف کے کوئی متبادل اس مفہوم کی ادائیگی کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا ہے، اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ بین الخلائق ظاہری ومعنوی جملہ اشیائے کائنات کی نمو اور ارتقاء کی اساس ہی اختلاف پر قائم ہے، ایسے ہی علوم اسلامی کی وحدت میں کثرت کے جملہ راز ہائے سربستہ کے انکشافات بھی اختلافات فکر ونظر سے الفاظ ومعانی کے ناقابل تفریق ربط باہم کے مثل ہی مربوط ہیں، ازروئے مثل "**الأشياء تعرف بأضدادها**" قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پر عبارت النص کے سیاق وسباق کے تناظر میں مختلف مقامات پر مختلف پیرائے میں اختلاف کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

عہد صحابہ میں اختلاف کا منہج

علیٰ کل حال عہد صحابہ وتابعین میں مسائل میں اختلاف آراء کی تلاش وجستجو کی جائے تو تین امور ہمارے سامنے آتے ہیں: ا۔ قرآن واحادیث کے الفاظ کے معانی سمجھنے میں اختلاف کا ہونا، ۲۔ جواب مسئلہ میں صحابہ کرام کے منصوص علم میں اختلاف کا پایا جانا، ۳۔ یہ کہ طریق استنباط میں نقطۂ فکر ونظر اور تصویب وتغلیط کی راہ کا جدا ہونا،

الغرض انہی اختلافات آراء کے ساتھ عہد خلافت راشدہ میں اوراس کے بعد اہل افتاء صحابہ اوران کے تلامذہ تابعین، متفرق فوجی چھاؤنیوں اور مقامات مختلف شہروں اور نوآبادیات میں رہے اور بہت سوں نے اسی مقام کو اپنی جائے سکونت بنا کر وہیں پر بود باش اختیار کرلی اورلوگوں کو دین کے مسائل بتانے لگے، ابتداءً تو یہ اختلافات آراء اس قدر گہرے نہیں تھے لیکن گذرتے وقت کے ساتھ جغرافیائی وسعت کے ساتھ مختلف فکر ونظر کی حامل اقوام وملل کا دائرہ اسلام میں دخول کی وجہ سے مسائل میں کثرت وتنوعات کے سبب قوی تر ہوگئے۔

فقہ اسلامی اور عہد تابعین

اوراب دورتابعین میں علم الفقہ کی باقاعدہ تدوین ناگزیر ہوگئی تھی کیونکہ ماقبل کے دورکا تعامل نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ وعمل اور ہدایات کی روشنی میں یہ تھا کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو اصحاب علم وفضل صحابۂ کرام کی جماعت اس پر غور فرماتے اور سب سے پہلے کلام اللہ میں اس کے حل کو تلاش فرماتے، اگرکوئی واضح حکم وہاں سے سامنے نہیں آتا تو احادیث نبوی اورتعامل رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی تفتیش وتحقیق پر کام ہوتا، لیکن اگرصورت مسئولہ یا اس سے ملتی جلتی صورت کلام اللہ اورسنت رسول اللہ میں نہیں پاتے تو پیش آمدہ صورت حال کا ہر ایک سمت وجہت سے نہایت باریک بینی اور تعمق فکر کے ساتھ جائزہ لیا جاتا، نیز تلاش کی جاتی کہ کسی کے پاس درپیش مسئلہ کے حوالے سے تحریراً یا حفظاً کوئی چیز موجود ہے کہ نہیں اوراس کے ہر ایک پہلو پر مکمل فکری وسعت کے ساتھ اجتماعی سطح پر غور وخوض اور نقد وبحث کے بعد جب کسی ایک امر پر اتفاق رائے ہوجاتا تھا اس پر حکم لگادیا جاتا اوراس طرح اجماع بھی حجت شرعی اور معمول بہ بن جاتا، البتہ اگراس تمام تر بحث وتحقیق کے باوجود بھی کوئی ایک حکم وامر متفق علیہ قرار نہیں پاتا اور اجماع نہیں ہوتا تھا تو بنا بریں صورت ھذا اہل افتاء صحابۂ کرام اپنے اپنے اجتہادات ورائے سے مسئلہ کا استنباط فرماتے اوراس میں بھی اختلاف باقی رہ جانے کی

صورت میں دلائل کی قوت کی بنیاد پر باہم متفق ہو کر کسی ایک صاحب افتاء کی تخریج پر عمل کر لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور عموماً لوگ اپنے اپنے شہر کے صاحب افتاء صحابۂ کرام اور ان کے اکابر تلامذہ کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ اس طرح سے عہد صحابہ میں ہی مسائل فقہیہ کے استخراج و استنباط کے حوالے سے چار اصولی بنیاد و اساس کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس کا تعین ہو گیا تھا، اور دور تابعین میں ائمہ مجتہدین کے پاس بایں طور علم اصول الفقہ کی باضابطہ تدوین کی مضبوط ترین بنیادیں موجود تھیں۔

فقہ اسلامی کے مصادر

علم الفقہ کے سرچشمہ مصادر اربعہ کے اجمالی تعارف کی اگر بات کی جائے تو اس کا خلاصہ بایں طور سامنے آتا ہے کہ پہلا ماخذ کلام اللہ ہے جو کہ از اوّل تا آخر تمام ہی اسلامی علوم و معارف کی خشت اساس ہے جس میں عقائد کا بیان مفصل جبکہ عبادات اور حقوق کے بیانات مجمل ہیں۔ گویا منصوص احکام اس میں موجود ہیں لیکن کلام اللہ کا یہ اعجازی پہلو ہے کہ ان منصوص اجمالی احکامات کے جلو میں اور اس کی ایک ایک جزئی کے ذیل میں لاکھوں لاکھ احکامات الٰہیہ کے کروڑوں حقائق و معارف سربستہ و پوشیدہ ہیں۔ وفائے عہد، حرمت و حلت، میراث، حدود، قصاص، محرمات جیسے ہزاروں عناوین کے ضمن میں علوم و حکم کا ایک بحر بیکراں اپنی بے حد و نہایت تابانیوں اور جلوہ افرینیوں کے ساتھ روز قیامت تک کے لیے موجزن کر دیا گیا، تاکہ غواصان علم اپنی اپنی ہمت و استعداد اور صلاحیت و مناصب کے مطابق اس کی گہرائیوں میں مستور و پوشیدہ گوہر آبدار نکال کر ہر عہد و قرن کو تابانیاں بخشتے رہیں۔

اس کی سب سے بڑی حکمت یہی ہے کہ ہر دور کے بدلتے انسانی احوال و کوائف پر نصوص کی روشنی میں عصر رواں سے ہم آہنگ تقاضوں اور مطالبات کے مطابق فیصلے کرنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہ آئے، گویا اس اجمال کا بالفاظ مختصر خلاصہ یہ ہے کہ ہر حکم کا راہنما اصول کہیں وضاحتاً تو اشارۃً و کنایۃً تو کتاب اللہ میں موجود ہے، البتہ اس کی تفصیلات و

تشریحات کا مخزن سنت اللہ ہے جبکہ اس مخزن کی بیش قیمت معدنیات کو صیقل و مصفی کر کے امت کو درپیش مسائل کو حل کرنے کا فریضہ فقہائے مجتہدین انجام دیتے آرہے ہیں۔

دوسرا ماخذ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال واعمال، احوال وتقاریر کو محیط ہیں، مثلاً قرآن نے اجمالی حکم دیا اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (۱) لیکن قیام صلوٰۃ کی تشریح وعملی تعبیر کی جانب راہنمائی فرمان رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام صلُّوا كما رأيتموني أصلّي (۲) سے حاصل ہوئی اوراس قول رسول کی جب آیت کریمہ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (۳) کی روشنی میں تحلیل کی تو بات منقیٰ اور صاف ہوکر سامنے آگئی اور حکم ربانی اور عمل رسول کے مابین امتزاج میں مستور حکم وعلل اور حقائق تک فقہائے مجتہدین نے جب رسوخ ورسائی کی تو امت کے لیے ادائیگی صلوٰۃ کا اس کے لوازمات کے علم سمیت ایک سہل العمل قاعدہ سامنے آگیا۔

تیسرا ماخذ اجماع ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ عہد وعصر کوئی بھی ہو مجتہدین کا ایک حکم پر متفق ہوجانا، کیونکہ اس کا تعلق راسخین فی العلم کے متفق علیہ فیصلے سے مربوط ہے، اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ارباب تقویٰ کا اجماع کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ہرگز منافی نہیں ہوسکتا ہے، اجماع یا قولی ہوگا یا سکوتی ہوگا، قولی سے مراد یہ کہ کسی زمانے کے فقہاء نے متفق ہوکر ایک حکم شرعی کا فیصلہ کیا جبکہ سکوتی سے منشاء یہ ہے کہ کسی حکم کے سلسلے میں کسی زمانے کے مجتہدین نے سکوت اختیار کیا یعنی نہ اس کی تائید کی اور نہ تردید ہی کی حالانکہ وہ حکم ان کے علم میں آچکا تھا لیکن ظاہر ہے کہ آخر الذکر صورت اوّل الذکر کی طرح قطعی نہیں ہوسکتی ہے، اسی لیے اس کے حجت ہونے کے حوالے سے بہت سے اختلافات وتأملات پائے جاتے ہیں، البتہ قولی اجماع کو قطعی حجت شرعی کی حیثیت

(۱) ترجمہ: نماز قائم کرو۔ (سورۃ بنی اسرائیل: ۷۸)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الاذان، باب الاذان للمسافر، ج:۲،ص:۸۷، رقم:۱۵۲۰

(۳) ترجمہ: اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔ (سورۃ النجم: ۳-۴)

حاصل ہے، اس مرحلے پر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ صحابۂ کرام کے دور میں جبکہ امت اطراف عالم میں پھیل چکی تھی مکانی اجماع کے قیام کے بارے میں جو شدید رکاوٹیں تھیں ان کے پیش نظر وقوع اجماع کی عملی دشواریاں بھی بہرحال ظاہر ہیں، چنانچہ بہت سے فقہاء کی رائے میں یہ عملاً ناممکن الصدور ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض مجتہدین کی رائے میں اجماع کا درجہ قیاس کے بعد آتا ہے، البتہ اجماع کا بحیثیت حجت شرعی کے اصول تسلیم شدہ ہے۔

چوتھا ماخذ قیاس ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم شرعی کو کسی مصلحت کی بناء پر کسی دوسرے امر کے شرعی حکم کے حصول کے لیے بنیاد بنا کر فیصلہ کرنا، عملی نقطۂ نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ تیسرے ماخذ اجماع کے تناظر میں وسیع الاثر اور آسانی کے ساتھ ممکن العمل حجت ہے اور قیاس کے اس طریقۂ عمل کو ذیل میں تحریر کردہ ابو داؤد شریف اور ترمذی شریف کی مشہور حدیث پاک جو کہ متعدد طرق واسناد سے بیان کی گئی ہے اس سے بھی قیاس کے مستند حجت شرعی قرار پانے کو تقویت بہم پہنچتی ہے، یہ موقعہ ہے جبکہ حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن میں قضاۃ کے مسائل حل کیے جانے کے حوالے سے روانہ فرماتے وقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: إنَّ رسولَ اللّٰهِ صلّى اللّٰهُ عليه وسلَّم لَمّا أرادَ أن يبعَثَ مُعاذًا إلى اليمنِ قال : كيف تَقضِي إذا عُرِض لك قضاءٌ ؟ قال: أقضِي بكتابِ اللّٰه ، قال :فإن لَم تجدْ في كتاب اللّٰه ؟ قال فبِسُنَّةِ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، قال :فإن لم تجدْ في سُنَّةِ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ولا فِي كتابِ اللّٰه ؟ قال : أَجْتهِدُ برأيى ولا آلُو، فضرَب رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم صدرَه وقال : الحمد للّٰه الذي وفَّق رسولَ رسولِ اللّٰه صلى عليه وسلم لِما يرْضٰى رسولُ اللّٰه [1] نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ

(۱) سنن أبي داؤد، کتاب القضاء ، باب اجتهاد الراء فى القضاة ، ج۲،ص۵۰۵،رقم:۱۳۲۶

کو یمن کا والی بنا کر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں (وضاحت وصراحت) نہ پاسکوتو؟ عرض کیا کہ پھر سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں بھی (دلیل) نہ پاسکوتو؟ عرض کیا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اس پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہیں جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جسے اس کا رسول پسند کرتا ہے۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ایک مکتوب فیصل خصومات ومعاملات کے حوالے سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ہے جس میں اسی نوعیت کی ہدایات ملتی ہیں، اس کا سب سے اہم توصیفی پہلو یہ کہ اس سے اصول قیاس کی بدولت فقہ اسلامی کو بڑی وسعت حاصل ہوئی اور اس میں تسلسل زمانی کا عنصر شامل ہوکر ہر ایک عہد وعصر کے مطلوب تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کی سہولت نے وسعتوں کی نت نئی جہتوں سے روشناس کرانے میں فقہائے کرام کو بڑی معاونت فراہم کی ہے، تاہم بعض فقہاء وہ بھی ہیں جو اپنے اجتہادات کی بنیاد پر اصول قیاس کو حجت تسلیم نہیں کرتے ہیں جس میں ظاہریہ سمیت ابن حزم کی پیروی کرنے والے فقہاء کے نام ملتے ہیں۔

فقہ اسلامی کے ذیلی مصادر

اسی تسلسل میں شیخ ابوزہرہ اپنی تصنیف ''مصادر الفقہ الاسلامی'' میں بحث کے ضمن و ذیل میں صفحہ ۹ پر رقم طراز ہیں کہ ''فقہ کے مسلم مآخذ قرآن وسنت اجماع وقیاس کے علی الرغم مختلف مسالک میں اس تعداد کے بارے میں ذرا سا اختلاف ہے، مثلاً ظاہریہ کے نزدیک مآخذ صرف تین ہیں قرآن وسنت اور اجماع، شوافع کے نزدیک پانچ ہیں، کتاب وسنت، اجماع وقیاس اور استصحاب (دواشیاء یا دو امور میں مطابقت تلاش کرنا)

جبکہ احناف کے یہاں مذکورہ پانچ کے علاوہ استحسان (قیاس خفی یعنی کسی فقہی مسئلے کے حل میں مد لیا جانا) اور عرف (دستور عام) بھی شامل ہے، حنابلہ مذکورہ پانچ پر المصالح اور سدالذرائع کا اضافہ کرتے ہیں، بہرحال زمانے کے تغیرات کے تناظر میں فقہ کے مسلّم مآخذ اربعہ کے علی الرغم ائمۂ فقہاء کے اجتہادات کی بنیاد پر ضمنی مآخذ کی اضافت علم اصول الفقہ کی وسعت و گہرائی اور گیرائی کی بھی ایک بین دلیل ہے۔

بحث کے تسلسل سابق کے ذیل میں گویا بایں طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم اصول فقہ کی جڑ اور بنیاد تو دور صحابہ میں ہی قائم ہو چکی تھی جس کا عہد بہ عہد ارتقاء ہوتا رہا، گویا خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور خلافت اور مابعد خلافت بنوامیہ اور بنوعباس کے ادوار میں جبکہ اسلامی سلطنت اپنے جغرافیائی حدود میں عہد بہ عہد وسعت کے ساتھ مختلف اقوام و ملل کو اسلام کا حصہ بناتی ہوئی آگے بڑھی تو ہر قوم ہر علاقے اور ہر خطے کے اپنے مسائل تھے، اپنے احوال تھے اور اپنے مزاج تھے جو وہ لوگ اپنے ساتھ لیکر آئے تھے، چنانچہ اس زمانی تسلسل کے ذیل میں پہلی صدی ہجری کے آخری دور سے ہی ترتیب و تفریع احکام کے لیے بنیادی اصولوں کی روشنی میں دیگر ذیلی معاون علمی و فنی اصول و اصطلاحات کی باقاعدہ تدوین کی ناگزیریت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا، چنانچہ اس مرحلے پر علمائے اصول کے سامنے سب سے بڑا چیلنج علاقائی احوال و مسائل سے آگے بڑھ کر دنیا کی تمام اقوام و ملل کے فکر و مزاج اور رسوم و عادات، طرز بود و باش اور معیشت و معاشرت کے اطوار کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہ اسلامی کے بنیادی اور اصولی مآخذ قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس کی روشنی میں اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے عمل لاتے ہوئے بایں طور مسائل مستنبط کیے جانے کا تھا جو کہ ہر خطہ و علاقے سے دائرۂ اسلام میں شامل ہونے والی ہر قوم و قبائل کے لوگوں کے انفرادی و اجتماعی مسائل کا قابل عمل حل پیش کر کے ان کو مطمئن کیا جا سکے۔

چنانچہ علوم اسلامیہ سے تحقیق و ریسرچ کے ساتھ نقل و عقل کے حسین اور متوازن

امتزاج کو عصر رواں کے فکر ومزاج سے ہم آہنگ مستدلات کے حوالے سے بیان کرنے والے عالم اسلام کی معروف ومحقق شخصیت جناب ڈاکٹر محمود غازی صاحبؒ کا یہ اقتباس بھی اپنی جگہ پر مستند معلوماتی طرز پر نفع بخش ہونے کے ساتھ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے ’’دین ومذہب اور وحی واخلاق سے گہری اور قطعی وابستگی کے ساتھ ساتھ علم اصول فقہ کے مباحث ومضامین میں عقل کی کارفرمائی اس حد تک ہے کہ پورے علم کی اٹھان انتہائی عقلی اور منطقی انداز میں ہوئی ہے، جیسے جیسے وقت گذرتا گیا علمائے اصول، منطق اور فلسفہ کے اصولوں اور قواعد ومطالبات کی بنیاد پر اس فن کی عمارت استوار کرتے چلے گئے، اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ دنیائے عقلیت کے بڑے سے بڑے نمائندے کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ اصول فقہ کے کسی مسلمہ قاعدہ یا ضابطہ پر انگلی رکھ کر یہ کہہ سکے کہ یہ چیز عقلیات یا منطق کے اصولوں کے خلاف ہے۔‘‘

اسی سیاق وسباق میں ڈاکٹر صاحبؒ بیان کرتے ہیں کہ ’’مسلمانوں میں عقلیات اور منطق میں مہارت بلکہ امامت کے جو بڑے بڑے نمائندے ہیں وہ علم اصول کے بھی محقق ونمائندے ہیں، اور جو منطق اور عقلیات کا جتنا بڑا ماہر ہے وہ اصول فقہ کا بھی اتنا ہی بڑا ماہر ہے، امام ابو حامد غزالیؒ اور علامہ فخر الدین رازیؒ کے نام ضرب المثل ہیں، دنیائے اسلام میں امام غزالیؒ اور امام رازیؒ کی شخصیات کو جہاں عقلیات کے ماہرین کے طور سے یاد کیا جاتا ہے وہیں اپنے دور میں ان کی فقیہانہ حیثیت بھی مسلم ومستند ہے اور یہ دونوں علم اصول کے بھی صف اوّل کے امام ہیں، نیز علم اصول کی بہترین کتابیں ان کی رشحات قلم میں شمار ہوتی ہیں، ایسی بہترین کتابیں کہ آج بھی دنیائے مغرب ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، مغرب میں علم اصول کی بہترین سے بہترین کتابیں مثلاً رسکو پاؤنڈ (Risco pound) کی تحریرات بھی اپنی انتہائی عقلی استدلال، منطقی ترتیب، فکر کی گہرائی اور مضامین کی وسعت میں امام غزالیؒ کی المستصفی اور امام فخر الدین رازیؒ کی المحصول کے پاسنگ بھی نہیں ہے، گویا کہ عقل اور نقل کے امتزاج کا انسانی تاریخ میں مکمل

ترین اور منفرد ترین نمونہ اگر دیکھنا ہو تو علم اصول فقہ کو دیکھا جائے، بعض جدید مصنّفین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں عقلی منہاجیات یعنی Intellectual Methodology جس فن میں سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ علم اصول فقہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی فکری تشکیل، ذہنی ساخت اور فکری تربیت کس انداز کی ہوئی ہے کہ بیک وقت ان کی لگامیں عقلیات پر بھی ہیں اور الٰہیات اور وحی الٰہی کی روشنی سے بھی وہ مستنیر ہیں، ان دونوں کو اس طرح سے ایک دوسرے میں سمو دیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں"۔

فقہی مصادر سے استفادہ کا طریقہ

یہ ہے علم اصول فقہ جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام اللہ و سنت رسول اللہ اور ان دونوں کی بنیاد پر فقہ اور احکام شریعت کے جو تسلیم شدہ مآخذ ہیں ان سے کیسے کام لیا جائے، ان سے تفصیلی احکام کا استنباط کیسے کیا جائے، اور وہ لامتناہی فقہی ذخیرہ، وہ بے پایاں قانونی ثروت (اور ہر ایک عہد و عصر کے مسائل اور ان کے حل کی عقدہ کشائی کرتا اور دینی راہنمائی کرتا ہوا امت مسلمہ کا یہ عظیم ترین سرمایہ جو صدیوں سے اس فکری وسعت کے ساتھ جاری ہے) آج صورت حال یہ ہے کہ ائمۂ فقہائے اسلام کو فقہ کے اصولی احکام مرتب کئے ہوئے زائد از ہزار سال ہو چکے ہیں، حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے انتقال کو ۱۲۶۳ سال گذر چکے ہیں، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی وفات پر ۱۲۵۳ کا سال عرصہ بیت چکا ہے، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۱۲۳۸ برس ہو گئے، اور حضرت امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ پر ۱۲۰۰ برس گذر چکے ہیں۔

یہ وہ بارہ صدیوں سے تسلیم شدہ ائمۂ فقہاء ہیں جن کے سیکڑوں معاصر و مماثل فقہائے مجتہدین ان کے زمانے میں موجود تھے، ان کی اجتماعی کوششوں اور کاوشوں سے یہ عظیم ترین ذخیرہ جمع کیا اور اس کے لیے انہوں نے علم اصول الفقہ سے کام لیا، یہ ذخیرہ آج تک امت کے کام آ رہا ہے، آج دنیا میں جتنے مسلمان ہیں وہ سب کے سب

بلا استثناء ان سب میں کسی نہ کسی کی پیروی کر رہے ہیں، کہیں امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادات کی پیروی ہو رہی ہے تو کہیں امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ کی جہود اجتہاد پر عمل ہو رہا ہے، تو کہیں امام جعفر صادقؒ کا نقطۂ نظر راہنمائی کر رہا ہے جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان حضرات نے وہ غیر معمولی خزینہ اور سرمایۂ علم تیار کیا تھا کہ امت مسلمہ کو اس میں اضافہ یا معاصر مسائل کی روشنی میں جزوی ردوبدل کی بہت کم ضرورت محسوس ہوئی انتہائی محدود بلکہ چند استثنائی مسائل معاملات ہیں جن میں نئے مسائل پیش آئے اور نئے اجتہاد کی ضرورت پیش آئی، ورنہ اکثر و بیشتر جو ذخیرہ فقہائے اسلام نے تیار کیا تھا اسی کی بنیاد پر مسلمانوں کے اربوں کھربوں مسائل حل ہوتے چلے آ رہے ہیں اور آج بھی دنیا میں بسنے والے ایک سو چالیس کروڑ مسلمانوں کے روز افزوں پیچیدہ مسائل انہی فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں اور انہی کے مرتب کردہ قواعد وضوابط، اصول اور اصول اجتہاد و استنباط کی مدد اور راہنمائی سے حل ہو رہے ہیں۔

ایک طرف قرآن وسنت سے نکلنے والے نت نئے احکام ہیں جو آئے دن مرتب ہو کر فقہ کے اس عظیم ترین سرمائے میں اضافہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف تغیر پذیر عہد و عصر کے مسائل اور مشکلات ہیں جن کا حل اس فن کے ذریعہ آج تک شریعت کی نصوص سے اخذ کیا جا رہا ہے، اس کا ایک اعجازی پہلو یہ بھی ہے کہ جو نصوص شریعت ہیں وہ اپنی تعداد کے لحاظ سے اگرچہ محدود ہیں، تاہم وہ لامحدود حالات وحوادث پر منطبق ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن اختلاف آراء کے باوجود بھی کبھی کسی نئی صورت حال پر قرآن وسنت کی نصوص منطبق کرنے میں کوئی دقت اور کوئی پریشانی پیش نہیں آئی ہے، اہم پیچیدہ مسائل میں ایک سے زائد آراء موجود ہیں اور آئندہ بھی آراء اور تعبیرات کا یہ تنوع موجود رہے گا، یہ اسی لیے ہے کہ شریعت نے اپنے مزاج اور نظام میں ایک وسعت بایں طور رکھی ہے کہ ہر پس منظر، ہر تمدن اور ہر ایک معاشرت و ثقافت سے آنے والے انسان کے لیے اپنے ماحول، نظام اور مزاج کے مطابق شریعت کے احکام پر عمل کرنا سہل اور آسان ہو سکے۔

اسلامی فقہ اور رومن قوانین

یہ بات دعویٰ اور دلیل کے طور پر بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ علم الفقہ کے اپنے ہمہ جہت امتیازات واختصاصات اور وسعت و گہرائی کے نقطۂ نظر سے مستقل بالذات ہیں، بعض مغربی مصنّفین کی جانب سے اپنے علم وخیال کی بنیاد پر یہ التباس پیدا کرنے اوراس کو ہوا دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ فقہ اسلامی رومن قانون سے مستعار و ماخوذ ہے، اس حوالے سے سب سے پہلی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ شریعت اسلامی جو کہ فقہ کے وسیع ترین مفہوم کو محیط ہے اپنی ماہیت وحقیقت کے اعتبار سے قرآن واحادیث کی روشنی میں ذات حق جل مجدہ کے احکامات کی تشریحات وتوضیحات کا عنوان اور سرنامہ ہے، لیکن عرف عام میں جن ضوابط کو لفظ قانون سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ انسان اور سوسائٹی کے بنائے ہوئے قواعد و دستور العمل ہیں جن کی بنیاد واساس عہد وعصر کے تغیرات کے تابع ہیں جن کا وقت ساتھ ساتھ تبدیل کیے جاتے رہنا بہرحال ناگزیر ہے کیونکہ وہ قوانین موضوعہ ہیں اس میں اذہان کی اکثریت کے سہارے ہر روز تبدیلیاں ہوتی ہیں، اور یہ دنیوی نظریۂ قانون کی سب سے بڑی کمی بھی شمار کی جاتی ہے کہ یہ بسرعت تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں ناقابل اعتماد بن جاتے ہیں۔

چنانچہ اس زاویۂ فکرونظر شریعت اسلامی کا اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں جو ایک بین حقیقت سامنے آتی وہ یہ کہ شریعت اسلامی یا قوانین الٰہیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل ہونے کی وجہ سے ابتداء سے ہی درجۂ کمال کو پہونچے ہیں جو ہر جہت و گوشہ سے جامع و مانع ہے اور کسی ایک زمانے، کسی ایک ملک یا کسی ایک خطہ وعلاقہ کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اس کی اساس آفاقیت و عالمیت اور دوامیت پر استوار ہے اور اسی وجہ سے چہار دانگ عالم میں بسنے والے ہر ایک انسان کے لیے اس کی انفرادیت و افادیت کا دائرۂ عمل یکساں ومساوی انداز میں سہل العمل ہے اور اس کے کسی بھی اصول میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے چنانچہ اس نقطۂ نظر سے فقہ اسلامی پر نظر ڈالیے تو

اس کی اصولی بنیاد کتاب اللہ وسنت رسول اللہ نا قابل تغیر ہے جس کی حرکت کا عنصر قیاس واجتہاد اور استحسان وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے، لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ[1] سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا[2] اللہ کا دستور کہ پہلے سے چلا آرہا ہے اور ہر گز تم اللہ کے دستور کو بدلتا ہوا نہ پاؤ گے، گویا کہ کمال ورفعت، گہرائی و گیرائی، آفاقیت وعالمیت اور دوامیت اس کی خصوصیات وامتیازت اور اس کے اجزائے ترکیبی ہونے کی وجہ سے نظریۂ صالحیت، نظریۂ مساوات، نظریۂ حریت، نظریۂ اخوت، نظریۂ شورائیت، اور نظریۂ تحدید اختیارات حاکم جیسے جوہری عناصر اس کے اہم ارکان ہیں چنانچہ بوجوہ دنیا کا کوئی بھی قانون اس کی ہمسری کا دعویدار نہیں ہوسکتا ہے۔

البتہ وہ قوانین جو کہ موجودہ مروّجہ معانی میں مستعمل ہیں وہ فقہ اسلامی کے وسیع ترین نظام میں ایک حصہ تصور کیا جاتا ہے جس کا تعلق معاملات وعقوبات سے ہے، یہ الگ بات ہے کہ فقہ اسلامی اور لفظ قانون کے مابین مابہ الامتیاز بنیادی اور واضح فرق کے باوجود بسا اوقات مسلسل عبارت کے سیاق وسباق کے ذیل میں فقہ اسلامی کو قانون اسلامی سے تعبیر استعمال کیا گیا ہو، ورنہ اپنے معانی ومفہوم کے اعتبار سے یہ دونوں الگ الگ اصطلاحات ہیں، اس حوالے سے ازروئے تحقیق لفظ قانون بھی بایں معنی خارجی ہے کہ یہ یونانی الاصل ہے جو کہ سریانی لغت کی راہ سے بمعنی مقیاس کل شئی عربی میں آیا ہے، البتہ سلطنت عثمانیہ میں مجموعۂ احکام کے سرنامے کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے اور وہ ان احکام سے متعلق رہا جو کہ سلاطین کے وضع کردہ تھے لیکن یہ فقہ سے بالکل ایک الگ چیز ہے کیونکہ فقہ بمعنی نظام شریعت ایک وسیع ترین اصطلاح ہے جس کا اطلاق دین اسلام کے عقائد وعبادات کے علاوہ معاملات، معاہدات، عقوبات، احکام سلطانیہ، مخاصمات، سیر اور قانون دولی کی مختلف النوع تنفیذات اور سیاسی وانتظامی نظریات، اقتصادیات، معاشیات، عمرانیات وغیرہ پر بطور مجموعہ ہوتا ہے۔

(۱) سورۃ یونس: ۶۴ (۲) سورۃ الاحزاب: ۶۲

اس کے علاوہ دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کے وضع کردہ قوانین کی غرض و غایت سوسائٹی میں عدل وانصاف کے تقاضوں کی تکمیل ہے، لیکن شریعت اسلامی میں برابر کی بنیاد پر سوسائٹی میں انصاف و دادگستری قائم کرنے کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی منظّم تدبیر اس کی ترجیحات کا سب سے بلند و بالا حصہ قرار پاتا ہے، جس کی غرض و غایت داخلی طور سے افراد کو صالح تر بنانا مقصود ومطلوب ہے کیونکہ فقہ اسلامی ذات حق جل مجدہ کی علی الاطلاق وحدانیت کے تصور پر قائم ہوکر انسان کی بنیادی اخوت و مساوات کا علمبردار ہے جبکہ رومن نظائر قانون و عدالت میں ماہرین قانون کا تقرر حکمران وقت کیا کرتا ہے جس میں بین الخلائق مطلوب متوازن مساوات واخوت کی بنیادوں کو فقہ اسلامی کے مثل استحکام کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔

البتہ اسلام کے معتدل مزاج کی روشنی میں اگر اس التباس کا تجزیہ کیا جائے تو چند استثناءات ہیں جن کی توجیہ وتعبیر میں فرق کی بنیادی وجہ دانستہ یا نادانستہ ظاہر نہ کیا جانا بھی کسی درجہ میں اس التباس کی بنیاد ہوسکتی ہے، مثلاً بعض اصطلاحات کا فقہ اسلامی اور رومن قانون میں مشابہہ ہونا مثلاً خود لفظ فقہ اور Jurisprudence لغت کے اعتبار سے ہم معنی ہیں لیکن آگے چل کر تشریحات وتوضیحات کے ضمن میں دونوں کی سمتیں مختلف ہوجاتی ہیں، یا ایسے ہی بعض اصولوں میں مفہوم کے اعتبار سے کسی درجہ میں مماثلت کا پایا جانا، علی السبیل المثال "البينة على المدعي" بارثبوت مدعی پر لازم ہے، چنانچہ اس قسم کے مستثنیات کو فقہ اسلامی اور رومن کے مماثل یا اس سے ماخوذ قرار دینے والے نظریہ کے حاملین اپنے تاریخی جائزہ میں اس قسم کے استثناءات کو بطور حجت پیش کرتے ہوئے دلیل دیتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی تشکیل کے ابتدائی دور میں کیونکہ شام کی درسگاہوں اور دانش کدوں میں رومن قانون کی تعلیم رائج تھی، اس بناء پر بھی فقہ اسلامی کا رومن قانون سے متأثر ہونا ایک مضبوط حجت قرار پاتا ہے، جبکہ عقلی اور واقعاتی سطح پر یہ دلیل بایں طور بھی ناقابل قبول ہے کہ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مادۂ فقہ کے مشتقات خود قرآن کریم میں تقریباً انہی معانی و

مفاہیم میں موجود ہیں جیسا کہ فقہ اسلامی میں مستعمل ہیں، نیز فقہ کی تشریحات وتوضیحات کی روشنی خود لفظ فقہ کا اصطلاحی مفہوم قانون سے کہیں زیادہ وسیع وعمیق ہے۔

لہٰذا اس منظر نامے میں رومن قانون کو عقلی اور واقعاتی بنیاد پر کبھی بھی فقہ کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اصطلاح اسلامی میں لفظ فقہ میں عبادات وعقائد اور اخلاقیات تک سب کچھ شامل ہے جس کا تفصیلی ذکر زیر نظر بحث کے ذیل میں آچکا ہے، لہٰذا فقہ اسلامی زندگی اور اخلاق کے ایک وسیع اور عمیق ترین بنیادوں پر قائم ہے اور بہ ہمہ وجوہ اس کے نفسیاتی، انسانیاتی اور عمرانی مشمولات رومن قانون کے بمقابلہ ایک الگ ہی جہان کا نقشہ پیش کرتے ہیں، لہٰذا چند اصولوں کے ظاہری تشابہ کو اثر اور استفادے کی دلیل بنا کر پیش کرنا محض التباس وشکوک پیدا کرنے کی مساعی کے علاوہ دوسری کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے، البتہ اس قسم کے مشابہات کو اتفاق کا عنوان تو دیا جا سکتا ہے کیونکہ انسانی معاملات میں مماثلتوں کا پایا جانا عین قرین عقل وقیاس ہے، ابتدائی دور میں شام اور اس کے اطرافی علاقوں میں رومن قانون کی درسگاہوں اور تعلیم کا ہونا اس کے اثرات قبول کرنے کی دلیل نہیں ہوسکتی، ورنہ بعد کے اسلامی ادوار میں اس کے عکس کی مثالیں بکثرت ملتیں۔

امت مسلمہ کا علمی ذخیرہ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ مسلمانوں نے جہاں کہیں جس کسی سے بھی استفادہ کیا ہے، اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے یہاں تک کہ اسلامی ادب میں ارسطو اور افلاطون کے مستفادات کا بھی موقعہ بہ موقعہ بطور اعتراف ذکر ملے گا، لہٰذا امت کی اس عمومی نفسیات کے تناظر میں اس حوالے سے اعتراف کی مثالوں کا نہ ملنا موجب حیرت ہے، لہٰذا اس بات سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ رومن قانون کے اثرات کی بات محض افسانہ یا الزام سے زیادہ کچھ نہیں ہے، البتہ زیادہ سے زیادہ توجیہ یہ ہوسکتی ہے جو کہ قرین عقل بھی ہے کہ رومیوں نے شام اور اطراف کے علاقوں پر اپنے دور حکمرانی میں عربوں کے بعض رسوم ورواج، عرف وعادات، معاشرتی امتیازات اور علاقائی طرز واطوار کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنالیا ہو اور ان کے توسط سے پائی جانے والی مشابہتوں کو ماخوذ

مماثلتوں کا عنوان دیدیا گیا ہو، کہیں کہیں جو مشابہتیں جزئیات میں نظر آتی ہیں، ان کا تعلق بھی مذکورہ احوال سے ہی ہو، علیٰ کل حال یہ ایک مفصل ومطول بحث کا ایک مستقل موضوع ہے جسکا اجمالی تذکرہ مضمون زیرنظر کے ذیل میں کیا جانا ضروری تھا۔

فتویٰ نویسی کی اہمیت

اسلام میں فتاویٰ نویسی کا شعبہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اسلامی تاریخ ہے، نیز اسلام کے ہر عہد وقرن میں اس شعبہ کی ہمہ جہت اہمیت کو مسلم جانا گیا، یہی وجہ ہے کہ اسلام کے سلسلۂ علوم ومعارف کی بات کی جائے تو افتاء وفتاویٰ کا منصب دقیق علم اور ذمہ داری کے نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ بیحد وحساب متماثل اجزائے علم وآگہی کی بنیاد پر حیات انسانی کے مختلف الانواع مسائل ومعاملات اوران سے متعلق احکامات کا بنیادی مآخذ ومصادر سے استنباط اور نظائر پر منطبق کرکے اس کے نتیجہ میں حاصل شدہ جزئیات سے کسی ایک کلیہ کی کلید تک پہنچ کر مطابق حال حکم تلاش کرنا جس قدر وسیع وعمیق مطالعہ اور دقت علم کے ساتھ وسعت نظر کا متقاضی ہے وہ بلا شبہ ہر ایک عالم کے بس کی بات نہیں ہے، اگرچہ اس کے علم وادراک اور عقل وآگہی کا معیار کتنا ہی بلند وعمیق ہی کیوں نہ ہو، تاوقتیکہ اس شعبۂ علم وفن میں اس نے ماہرین افتاء وفتاویٰ کی زیر نگرانی تعلیم وتربیت کی خصوصی مہارت حاصل نہ کرلی ہو۔

اس کی ذمہ دارانہ اہمیت بایں طور بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ صاحب افتاء کی جانب سے لگائے گئے حکم پر اعتماد کرتے ہوئے لاکھوں لوگ اس پر عامل ہوتے ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں ہمہ وقت محاسبہ کی زد پر رہتا ہے اسی لیے اصحاب افتاء ہر فتویٰ کے آخر میں واللہ اعلم بالصواب ضرور لکھتے ہیں جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ میں اپنے علم ومعلومات اور تحقیق وتدقیق کی بنیاد پر ہر ایک جزئیہ کو بروئے عمل لاتے ہوئے حکم کے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں لیکن بشری خصائل کی بنیاد پر میں اپنے صواب رائے میں خطاء کے امکان کو مسترد

نہیں کرسکتا ہوں اور اس خطاء کا امکان میرے نسیان و ذہول سے منسوب ہے جبکہ صواب کی قطعیت اللہ تعالی کی توفیق وعطاء سے مربوط ہے۔

یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے مجتہدین وائمۂ فقہ وفتاویٰ دورِ اسلامی میں اس منصب کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ایک طرف حکم حاکم ہے تو دوسری طرف اخروی جوابدہی کا معاملہ ہے، چنانچہ تاریخ کے صفحات پر اس حوالے سے جبر و اصرار اور رد و انکار کے متعدد واقعات درج ہیں جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے عظیم المرتبت ائمہ ومجتہدین نے حکمران وقت کے عتاب وعذاب کو مول لینا گوارا کیا لیکن اپنے تدین وتقویٰ اور صداقت وحق پرستی وحق گوئی کی بنیاد پر دنیاوی منصب ذو عظمت وجلالت اور مال ومتاع کی بے بہا پیشکشوں کے باوجود اس اہم ترین اور دوطرفہ جواب دہی کے عہدے کی قبولیت کو مسترد کردیا۔

دارالعلوم وقف دیوبند اور فتویٰ نویسی

چناں چہ اس منصب کی اسی اہمیت و ذمہ داری کے پیش نظر مدارس میں افتاء وفتاویٰ کے لیے مناسب شخصیت کا انتخاب ہمیشہ ایک نہایت دشوار گزار اور دقت طلب مسئلہ سمجھا گیا، لہٰذا اس حوالے سے دارالعلوم وقف دیوبند کی اگر بات کی جائے تو اسکے نشأۃ اولیٰ کی تاریخ بھی دارالافتاء کے لیے ذی علم وعمل شخصیت کے انتخاب کے نقطۂ نظر سے فکر و نظر کی ایسی ہی پیچیدگیوں سے عبارت ہے، لیکن رب ذوالکرم کے فضل و احسان اور سرخیل جماعت بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ اور اخلاص و ایثار سے سرشار ان کی جماعت رفقائے کار کی عنداللہ مقبول و مستجاب دعاؤں اور ادارہ کی عظمت ومقبولیت اور کشش وجاذبیت کے نتیجہ میں اعجاز و کمال بایں طور ظاہر ہوا کہ دارالافتاء کے اس ذمہ دارانہ منصب کے لیے مشیت حق کے زیر اثر ایک ایسی باکمال و مجموعۂ صفات شخصیت کا مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن

عثمانی نوراللہ مرقدہ کی صورت میں انتخاب عمل میں آیا جن کو جماعت علمائے دیوبند کے اصحاب افتاء میں اپنے علم وعمل اور تقویٰ وتدین کے علی الرغم باعتبار اختصاص فن میں اس دور کے اکابر واصاغر کے یکساں انداز میں سند اعتبار حاصل تھا۔

یہ قول معروف زباں زد اکابر ہے کہ یہاں کا ہر کام بالہام ربانی انجام پاتا ہے جو کہ بانی دارالعلوم دیوبند کے اخلاص کامل کی بین دلیل ہے، انہی کے دست راست اور رفیق خاص فقیہ الملت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم دیوبند کی حسب ایماء ومنشاء ادارہ کے شعبۂ افتاء کے لیے حضرت مفتی اعظم کا انتخاب سن ۱۳۰۹ ہجری کو عمل میں آیا جن کو سفر وحضر میں بغیر مراجعت محض اپنے حذاقت علم اور وسعت مطالعہ اور کمال حفظ کی استعداد پر بے تکلف فتویٰ ثبت کرنے میں امتیازی حیثیت حاصل تھی اور بیشتر اوقات نصوص فقہیہ حافظہ میں محفوظ یادداشت ہی سے نقل کردیا کرتے تھے جس میں بعد تطابق کسی قسم کا کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تھا اور ان کا ثبت شدہ افتائی حکم حشو وزوائد سے پاک اور جامع ہوتا تھا، حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کے تفصیلی احوال اور ان کے متعدد کمالات وامتیازات اور فیوض باطنی کا تفصیلی مطالعہ اکابر دارالعلوم دیوبند کے اوصاف وکمالات کے تذاکر کے ذیل میں دیگر متعدد کتب سے کیا جاسکتا ہے، بایں طور یومیہ کی بنیاد پر ملک وبیرون ملک سے موصول ہونے والے استفسارات واستفتاء کی روز افزوں تعداد کی وجہ سے چند ہی سالوں میں فتاویٰ کا ایک بے نظیر مجموعہ اور مسائل فقہیہ کا ایک بے مثال اور لاجواب ذخیرہ معرض وجود میں آ گیا اور جماعت کے اکابر کے الہامی فیصلے کے زیر اثر سن ۱۳۴۷ ہجری میں ترتیب فتاویٰ پر نفع عام کے نقطۂ نظر سے باقاعدہ کام کا آغاز ہوا اور اس ضمن وذیل میں حضرت مولانا مفتی ظفیر احمد صاحب مفتاحی رحمہ اللہ کو ان کے بلند معیار فقہی ذوق اور وسعت مطالعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب فتاویٰ میں منجانب اہتمام اہم ذمہ داریاں سپرد کی گئیں جس کو انہوں نے بڑے سلیقے اور قرینے سے سرانجام دیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اسی وقت بلکہ تسلسل کی بنیاد پر

عہد بہ عہد منصۂ شہود پر آتا رہا جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔

سن ۱۴۰۲ ہجری مطابق ۱۹۸۲ عیسوی سے دارالعلوم وقف دیوبند کی نشأۃ ثانیہ کے بعد سے امور افتاء تدریس وفتاوی نویسی ادارہ کی ترجیحات کا ایک اہم ترین حصہ رہا اور روز اول سے ہی شعبۂ دارالافتاء میر کارواں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب رحمہ اللہ سابق مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کی زیر نگرانی نیز فخرالمحد ثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم وقف کی خصوصی ترجیحات کے محور کے طور پر حضرت مولانا مفتی احمد علی سعید صاحب رحمہ اللہ سابق صدر مفتی ادارہ کے زیرانتظام مؤثر وفعال اورعوام الناس میں کثرت رجوع کی بنیاد پر مقبول رہا۔

فتاویٰ دارالعلوم وقف دیوبند کی ترتیب کا پس منظر

ادارہ کی نشأۃ ثانیہ کے ابتدائی دور کو کیونکہ مختلف النوع تحدیات کا سامنا تھا اس لیے اس کے ابتدائی عشرہ میں فتاویٰ کی ترتیب وانضباط کا وہ پیمانہ قائم نہ ہوسکا جس کا اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ اہم شعبہ متقاضی تھا، لیکن گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ بہر دوا کابر مذکور کی شبانہ روز اور تاریخ ساز جہود شاقہ اور لائق ذکر استقامت وحوصلہ اور ان کی متعاون جماعت کے اراکین کی معاونت کے نتیجہ میں بتدریج احوال میں سازگار ٹھہراؤ آنا شروع ہوگیا تا آنکہ حضرت مولانا خورشید عالم صاحب رحمہ اللہ سابق صدر مفتی ادارہ کے دورصدارت افتاء میں فتاویٰ کی تعداد میں اضافہ وافزونیت کو قابل ذکر فروغ حاصل ہوا جو کہ اضافوں کے ساتھ تا حال جاری ہے۔

۳۵/برس سے زائد مدت پر مشتمل جمع شدہ یہ عظیم تر علمی ذخیرہ مختلف جہات سے نظر ثانی اور توجہ کا متقاضی تھا کیونکہ فتاویٰ کا یہ عظیم تر علمی ذخیرہ زائد از صد خستہ حال رجسٹروں کے بطون میں محفوظ تھا جس کی متعلقہ شعبہ کے زیر نگرانی بھرپور اہتمام کے

ساتھ بایں طورنگرانی کی جارہی تھی کہ یہ ادارہ کے علمی منصوبہ جات ہائے مستقبل کا ایک بیحد اہم ترین حصہ تھا جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں باصلاحیت افرادکار کے علاوہ ایک طویل مدت بھی درکارتھی، اپنی اہمیت کے لحاظ سے ضمنی ذیلی انداز میں کیا گیا کام اس کی توقیری حیثیت کے ساتھ ناانصافی تھی۔

مشہور ہے کہ ہرشر کے پس پردہ ذات حق جل مجدہ کی جانب سے کوئی نہ کوئی خیر ضرور پوشیدہ ہوتی ہے، رواں سال سے پیوستہ برس ۲۰۲۰ عیسوی اپنے جلو میں کرونا وائرس بیماری کووڈ ۱۹ کی شکل میں عالمی سطح پر ایک طوفان بلا خیز لیکر ظاہر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ہر ملک وشہر میں لاک ڈاؤن نافذ ہوگیا، ہر چہار جانب ایک ہاہا کار کا ماحول، ہر طرف یومیہ کی بنیاد شرح اموات میں دہشت ناک حدتک تیزی کا رجحان، لمحہ بہ لمحہ اس بیماری سے نبرد آزما مریضوں کی تعداد میں تشویشناک اضافات کی الم انگیز خبریں، حرمین شریفین سے لیکر دنیا کی تمام مساجد و دیگر اقوام کی عبادت گاہیں بند، تعلیمی اداروں میں طلباء ندارد۔

غرض کہ ایک طرف اس قیامت خیز دور میں دارالعلوم وقف دیوبند کی تعلیمی سرگرمیاں دوسرے اداروں کے مثل بند تھیں تو دوسری جانب اس دور کی مثبت جہت یہ تھی کہ یہ عہد فرصت ادھورے علمی امور کی انجام دہی کے لیے ایک سنہرا موقع تھا، چنانچہ ادارہ کی انتظامیہ نے جہاں ایک طرف طلباء کے تعلیمی اور ذہنی وفکری نقصان کا ازالہ آن لائن تعلیم کی منظّم اور کامیاب منصوبہ سازی کے نفاذ سے کیا، وہیں دوسری طرف ادارہ کے جملہ اساتذۂ کرام کے لیے آن لائن تدریسی مشغولیات کے ساتھ ان کے علمی وفکری مستویٰ سے ہم آہنگ مختلف علمی و تعلیمی مصروفیات کے منصوبوں کو بروئے عمل لایا گیا، جس کے نتیجہ میں دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیرانتظام و نگرانی بانی دارالعلوم دیوبند کے علاوہ دیگر اکابرواسلاف کی مصنفات کی تعریب وتراجم کے لائق قدر امور کی انجام دہی کے ساتھ ادارہ کے لائق ذکر اور قابل قدر کاموں میں

قریب چالیس سالہ جمع شدہ ذخیرۂ فتاویٰ کی ترتیب ادارے کی سنہری تاریخ کے ایک اہم باب کا عنوان تھی۔

ترتیب فتاویٰ کا منہج

حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ڈائریکٹر ودارالعلوم وقف دیوبند کے نائب مہتمم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب کی تحریک پر جملہ اصحاب افتاء اوراس سے فنی مناسبت رکھنے والے دیگر اساتذۂ کرام کی میٹنگ طلب کرکے ان کے سامنے ترتیب فتاویٰ کی منصوبہ سازی کی تمام پہلوؤں پر مشاورت کی گئی اور اس کے عملی گوشوں کو سہل العمل بنائے جانے کا خاکہ تیار کرکے ترتیب فتاویٰ کے سلسلے میں طریقہ کار طے کیا گیا جس کے اجزائے ترکیبی کی اساسات میں مجوزہ کاموں کا مختلف سطح سے عملی جہات کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیکراہم عملی ذمہ داریوں کی تقسیم بروئے عمل لائی گئیں، چنانچہ اولین مرحلہ میں فتاویٰ کی شکستہ تحریر، املاء کی اغلاط اورمرورِوقت کے ساتھ رجسٹروں کی بوسیدگی جیسی دقتوں کا سامنا تھا جس کو متعین کردہ دواساتذہ بڑی محنت اور دقت نظر کے ساتھ ازسرنو ضبط تحریر میں لائے اور روز کے روز صاف شدہ تحریرات کو کمپیوٹر آپریٹر کے سپرد کیا جاتا رہا، متفرق عناوین مختلف اصحاب افتاء پرحسب منصوبہ منقسم کردیے گئے تھے، چنانچہ Computerised مواد کو متفرق عناوین کے ذیل میں تقسیم کرکے کتابت شدہ مسودات ساتھ کے ساتھ متعین استاذمکرم کے ڈیسک پرپہونچانا اس فرض کی انجام دہی پرمامورفرد کی ذمہ داری ہے، جہاں سے اصحاب افتاء کے فرائض کا بایں طور آغاز ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مکررات یانفس موضوع کے اعتبار سے کم وبیش مماثل فتاویٰ کو الگ کرنا، باریک بین مطالعہ کی روشنی میں ایک یا ایک سے زائد حوالہ جات کو تلاش کرکے مدلل کرنا، مبہم یاناقص سوال کو ازسرنو مرتب کرکے جواب کا جائزہ لینا اوراس کی کمی بیشی کو ترتیب نو کے تناظر میں مدلل ومبرہن کرنا، اور مندرج حوالہ جات کی تخریج کیے جانے

جیسے امور مہمہ شامل ہیں جن کو سرانجام دیکر منصۂ شہود تک لانے میں جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی، جناب مولانا مفتی محمد احسان صاحب قاسمی، جناب مولانا مفتی محمد عارف صاحب، جناب مولانا مفتی محمد امانت علی صاحب، جناب مولانا مفتی محمد عمران صاحب، جناب مولانا مفتی محمد اسعد صاحب، جناب مولانا مفتی محمد حسنین ارشد صاحب کی اجتماعی عرق ریز محنت وکاوش اور اس نتیجہ خیز کار علمی پر مکمل ذہنی وفکری ارتکاز کے ساتھ عملی جہود کا اساسی کردار لائق ذکر وستائش اور لائق سپاس ہے، اگرچہ جناب مولانا مفتی محمد عارف صاحب اپنی علالت کی بنیاد پر تحقیقی وتخریجی دقت طلب امور سے بربنائے صحت رخصت کے خواہاں تھے لیکن اس کے باوجود بھی موصوف نے تصحیح عبارات کے حوالہ سے اپنی ذمہ داری وحصہ داری کو نہایت لائق قدر انداز میں سرانجام دیا۔

بحمد اللہ سال رواں کی یہ اجتماعی اور عرق ریز محنتیں وکاوشیں بایں طور رنگ لائی ہیں کہ دو ضخیم جلدیں طے شدہ عناوین کے ضمن وذیل میں تیار ہوچکی ہیں، جبکہ تادم تحریر فتاویٰ کے موجود مواد اور روز کی بنیاد پر موصول ہونے والے جدید فتاویٰ کا اگر جائزہ لیا جائے تو امید ہے کہ یہ سلسلہ کم وبیش اٹھارہ سے بیس جلدوں تک دراز ہوسکتا ہے، سال رواں میں تعلیمی سرگرمیوں میں تعطل کے سبب جملہ اصحاب افتاء کی ہمہ وقت کی توجہات اسی کام کی تکمیل پر مرکوز رہیں تاہم دعاء وگمان ہے آئندہ سال سے ادارہ کی تعلیمی سرگرمیاں معمول آجائیں گی ایسے میں اس کام کی سال رواں جیسی تیز رفتاری تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ قدرے مشکل ہوگی، چنانچہ اسی معیار کار کو مدنظر رکھتے ہوئے قریب پانچ سالہ طویل المیعاد یہ منصوبہ برسرعمل ہے۔ **فللّٰہ الحمد والشکر**

مقام شکر

سربلند جذبۂ اخلاص کے ساتھ کی جانے والی اجتماعی جہود کو حق تعالیٰ کے یہاں درجۂ قبولیت حاصل ہوتا ہے اور اس کارگاہ عالم میں کار اخلاص کی عندالناس مقبولیت

دراصل قبول ربانی کا اعلان ہوتا ہے، بارگاہ ذو فضل واحسان کی بارگاہ عالی میں ہم جملہ خدام ادارہ سر بہ سجود شکر گزار ہیں جس کی رحمتیں بیحد و کنار برکتوں کی صورت میں روز اول سے ہی لمحہ بہ لمحہ دارالعلوم وقف دیوبند پر سایہ فگن رہی ہیں اور ادارہ کی بہمہ نوع ظاہری و معنوی ترقیات بہ وسیلۂ بصیرت قلب اور بصارت چشم مدرک و مشاہد بھی ہیں اور اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں کہ ذات حق جل مجدہ کے لائق شکر بیشمار رحم و کرم کے زیر اثر رخصت پذیر اکابر و اسلاف کی معنوی توجہات اور موجودہ اکابر امت کی مستجاب دعاؤں کی صورت میں ایک عظیم تر تکوینی سرمائے سے بحمداللہ ادارہ سرشار ہے۔

یہ حقیقت بھی لائق شکر و ذکر ہے کہ دارالعلوم وقف دیوبند کے ہمہ جہت علمی و تعلیمی ارتقائی سفر میں شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے قیام اور گذشتہ چند سنین میں اس کے اہداف کے ذیل میں انجام پانے والے بلند پایہ علمی امور کو ادارہ کی تاریخ میں نہ صرف یہ کہ سنگ میل کی ہی حیثیت حاصل ہے بلکہ ملک اور عالمی سطح پر متعارف علمی شخصیات اور دوائر و اجتماعیات کے اعترافات کی روشنی میں اکیڈمی کا قیام ملک کے ارباب علم کے نزدیک جماعت کے فرض کفایہ کا عنوان بھی ہے جو کہ بانی دارالعلوم دیوبند امام نانوتویؒ سمیت جماعت کی ممتاز علمی شخصیات کی عظیم مصنفات کی تعریب و تراجم اور تسہیلات و تشریحات کے علی الرغم عہد حاضر کے بین الاقوامی اصول تحقیق کے تناظر میں ان کی علمی وراثت کو فروغ دینے اور متعارف کرانے سمیت نئی صف کے علماء میں بلند علمی ذوق رکھنے والے رجال کار تیار کیے جانے جیسے اہم اور اساسی اہداف کی طرف تیز رفتار کامیابی کے ساتھ بایں طور گامزن ہے کہ طلبائے مدارس میں اپنی لازمی تعلیمی و نصابی صلاحیتوں میں مطلوب نکھار کے ساتھ اسلام کے ہمہ جہت علوم و معارف میں اصول تحقیق کی روشنی میں ذوق مطالعہ کو فروغ حاصل ہو سکے، تاکہ ان میں جہاں ایک طرف عصر رواں میں دین اسلام کو درپیش چیلنجز کی علمی سطح پر مناسب و مدلل جوابدہی کی صلاحیتیں بیدار ہو سکیں تو دوسری جانب معاصر مذاہب کے تحقیقی مطالعہ کی روشنی، عالمی فکری تحریکات و مناہج سے

ضروری واقفیت اور معلومات کا حصول ان کے ذوق علم کا لازمی حصہ قرار پا سکے اور اغیار کے اصل مآخذ تک ان کی ذہنی وفکری رسائی کوئی اجنبی نہج نہ رہے۔

ہمارے سامنے ہمارے اکابر واسلاف کی روشن روایات بطور راہ عمل موجود ہیں کہ جب اسلامی معاشرے میں یونانی فلسفہ نے فروغ حاصل کر کے ہمارے بنیادی عقائد کے نظام کو متأثر کرنا شروع کیا تو ہمارے اکابر امام ابوالحسن اشعریؒ، ابومنصور ماتریدیؒ، امام غزالیؒ، محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہؒ، امام محمد قاسم نانوتویؒ جیسے متعدد سلاطین علم وعمل نہ صرف یونانی فلسفہ کو اپنے عمیق مطالعہ کی روشنی میں سمجھا ہی بلکہ اس پر برتری حاصل کر کے معارضین کے ہی اسلوب وبیان اور اصطلاحات میں یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ اعتراضات و شبہات کے متوازن جوابات کے ذریعہ اسلامی عقائد اور علوم ومعارف کی حقانیت کو مدلل و مبرہن انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا، ورنہ ایک دور میں تو یونانی فلسفہ ہمارے عقائد کے نظام میں تموج کی سی کیفیت پیدا کرنے میں بظاہر کامیاب دکھائی دے رہا تھا، ہر دور میں درپیش چیلنجز کے رنگ وآہنگ تبدیل ہوتے رہے اور اللہ تعالیٰ اسی کے مطابق دفاع اسلام کے لیے رجال کار پیدا فرماتے رہے، چنانچہ اس تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں حجۃ الاسلام اکیڈمی کی خشت اساس اسی بلند پایہ منہج فکر ونظر پر قائم ہے۔

کسی بھی ادارے میں وقتی طور پر صلہ وستائش کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطمح نظر سے بلند ہوکر بہ نیت اخلاص اپنے اکابر واسلاف کی مستجاب دعاؤں کے زیر اثر جب کسی کام کا آغاز ہوتا ہے تو ذات حق جل مجدہ کی بیکراں رحمتیں وبرکتیں بظاہر اسباب مخلص وفعال افراد کار کی فراہمی کی صورت میں عنداللہ وعندالناس دلیل قبولیت کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

اس فکر ونظر کے حوالے سے اکیڈمی کی تاریخ اپنی مدت کار کے نقطۂ نظر سے بیحد مختصر لیکن عظمت کار کے اعتبار سے بیحد عظیم تر کارہائے نمایاں سے عبارت ہے جس کو جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند نیز ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی اور ان کی مخلص وفعال جماعت رفقائے کار کی جہد شب وروز

علم و آگہی

نورٌ علیٰ نور

بہر لحظہ تغیر پذیر اس عالم تغیرات میں بنی نوع انسانی کی تاریخ کے کسی دور میں یا افراد میں کوئی فرد و بشر ایسا نہیں ہے جس نے سعادت و شقاوت کے خدائی اصول سے اپنی ذات کو مستثنیٰ کر کے اپنے لئے خود سے کوئی راہ نجات تلاش کر لی ہو جو کہ صلاح و سعادت اور ناکامی شقاوت کے ایسے اصول پر مبنی ہو جو اس دنیا کے زمانی، مکانی، مزاجی، قومی اور طبقاتی ناگزیر فرق کے ساتھ تمام بنی نوع انسان کے لئے یکساں طور پر مفید اور قابل استفادہ قرار دیے جا سکیں، کیوں کہ احتمالات وابہام کی مختلف صورتوں میں مقید مجرد عقل کی بنیاد پر نہ ایسے اصول وضع کئے جا سکے ہیں اور نہ کئے جا سکتے ہیں، من جملہ اور دیگر بہت سے اسباب وعلل کے بنیادی سبب عقل کے فیصلوں میں وہم، شکوک وشبہات، احتمالات اور ابہام اور تفاوت عقل اور اس کی ہمہ نوع فاسد صورتوں کو بڑا دخل ہے۔ لہٰذا بایں طور انسانیت کی صلاح وفلاح کی بجز اس کے کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے اپنے منتخب اور برگزیدہ بندوں یعنی طبقۂ انبیاء ورسل کے ذریعہ مختلف ادوار میں عقل انسانی کی قوت متحملہ اور قوت برداشت کے مطابق آسمانی ہدایات کا نزول بشری ضروریات کا اہم ترین جزو لازم قرار دیا اور ادوار انسانیت کے بچپن سے بلوغت اور مابعد کے اس طویل سفر میں اس عالم کی فطرت میں مضمر سنت تدریج کے علی الرغم اعلان ربانی

۞ تقریظ: تفسیر نور القرآن از حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی صاحبؒ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۱) کے ساتھ حق تعالیٰ جل مجدہٗ کے آخری اور مکمل کلام اللہ قرآن کریم کو تا قیامت تمام بنی نوع انسانی کے لئے مرجع ہدایت اور منبع نجات قرار دے کر خاتمیت کی مہر لگا دی ہے اور ماسبق کی تمام شرائع کی اصل بنیاد و اساس توحید کی اکملیت اور اس کے مضمرات کو زمانی و علاقائی اور خاص اقوام و ملل سے منسوب ضروریات کی تکمیل کے لئے منزل من اللہ ہدایات کے تسلسل کو ذات حق جل مجدہٗ نے کلام اللہ کی صورت میں قیامت تک کے لئے بتمام وکمال بہر نوع انسان کی ضروریات و ہدایت اور فلاح و نجات کے لئے المصحف الجامع کو چشمہ فیض قرار دے دیا ہے اور قرآن کریم کی بہمہ صفات جامعیت ہی اس کی ارفع و اعلیٰ شان ہے جو کہ اس کے الفاظ و معانی، علوم و معارف، اسرار و حکم اور مرادات ربانی ہر ایک سمت و جہت کو بہ تمام وکمال محیط ہے۔ بقول ابن قیمؒ کلام کی جامعیت اس وقت سمجھی جاتی ہے جب کہ اس میں وابستۂ حیات و ممات اور مابعد کے تمام مضمرات کی تحلیل و حل کے ذکر کے ساتھ اس کے الفاظ و مدلولات کی بندش میں یہ وصف کے ساتھ کمال جامعیت و صلاحیت کے ساتھ موجود ہو کہ اپنے ماتحت انواع و افراد کو اتنا حاوی ہو کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو اس کا کوئی بھی فرد یا جزء اس سے باہر باقی نہ رہے، نیز اسی کے ساتھ وہ ان افراد کے حکم پر بھی دلالت کرتا ہو جو اس کے الفاظ کی قید سے خارج ہو گئے ہیں، گویا کہ کلام کی جامعیت اس وقت کمال سمجھی جاتی ہے جب کہ اس کے الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ اس میں موافق و مخالف دونوں پہلوؤں کے حکم پر دلالت کی صلاحیت ہو اور اسی نوع جامعیت پر مشتمل بہ شکل مختلف وہ دائمی علمی معجزہ ہے جو کہ ذات حق جل مجدہٗ نے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جوامع الکلم کی صورت میں عطا فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تفوق و قربت کے اعلیٰ ترین مقام و منصب

(۱) ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کر لیا۔ (سورۃ المائدۃ: ۳)

مقام محمود پر فائز فرما دیا۔ چنانچہ بایں طور بات یوں متحقق ہوتی ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن کی اس مابہ الامتیاز صفت جامعیت کا بدیہی تقاضہ ہے کہ آپ کی امت میں عہود و قرون کے فرق کے علی الرغم یہ ذوق جامعیت کا رنگ قیامت تک مستمر رہے کیوں کہ جس نبی کی جو شان غالب ہوتی ہے اسی شان کا غلبہ اس کی امت میں بھی ہوتا ہے اور جس رنگ کی ذہنیت مقتدائے اعظم کی ہوگی وہی رنگ اس کی ساری امت کی ذہنیت میں رچا بسا ہوگا، بالفاظ دیگر رسول برحق اللہ کی جس صفت سے خصوصی استفادہ کرتا ہے اسی صفت عالیہ سے وہ اپنی امت کو افادہ بھی کرتا ہے اور امت کی مجموعی ذہنیت نبی کی ذہنیت کا عکس اور پرتو ہوتی ہے۔ عَلٰی بَصِیْرَةٍ أنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ [1] آیت قرآنی کے یہ الفاظ ”أنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ“ مابعد کے وارثین علوم نبوت کے لئے اُسی جامعیت کے بنیادی تسلسل کی جانب مشیر ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ طبعی ذوق، تعبیرات اور اس کے مستدلات، انداز تشریح و تفاسیر اور قائلین و مخاطبین کے فہم و عقل اور فکری تفاوت اور اس جیسے بے شمار عناوین بحث و تمحیص اور اتفاق و اختلاف رائے کے نقطۂ نظر سے بات کئے جانے کی گنجائش کے ساتھ اپنی جگہ پر مستقل بحث طلب موضوعات ہیں جو کہ ایک طرح سے امت کے علمی ارتقاء کی اساس بھی ہے لیکن بایں ہمہ وجوہ اس سے امت کے رنگ جامعیت کے کسی رنگ و نوع میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے۔

یہ ایک مستقل تصنیف کا موضوع ہے۔ لہٰذا اجمالاً اس تمہید کا انشاء یہ ہے کہ چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود دنیا کے مختلف علاقوں، مختلف زبانوں میں تسلسل کے ساتھ من جملہ دیگر رفیع المرتبت کارہائے علوم و معارف انجام دیئے جانے کے علاوہ قرآن کریم کی تفاسیر پر جو کام ہوئے ہیں اس سے چودہ صدیوں کا کوئی عہد خالی نظر نہیں

(۱) ترجمہ: میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی۔ (سورۃ یوسف: ۱۰۸)

آتا ہے، ایک ہی کتاب کی ہزار ہا ہزار تفاسیر بھی اسی صفت جامعیت ہی کی ایک نوع ہے اور تمام تفاسیر کا رنگ انفرادیت ہی اس کے کلام اللہ ہونے کا بین ثبوت اور روشن دلیل ہے۔ تفسیر وتشریحات کے مدلولات ومستدلات سے اتفاق واختلاف کی بحث سے قطع نظر تمام ہی مفسرین نے اپنے اپنے معاصر مخاطبین کی پرواز علم وفکر اور ضرورت کو مدار انفرادیت قرار دیا ہے۔

زیر نظر تفسیر ''نور القرآن'' کا مدار انفرادیت قرآن کریم کے ہر لفظ کے الگ الگ معانی، بامحاورہ ترجمہ، جامع تشریح ووضاحت، آیت نمبر کے مطابق تفسیر وتشریح، مضامین کے جامع عناوین اور مضامین کا تعارف وخلاصہ ہے۔ مذکورہ نقطہ ہائے نظر سے زیر مطالعہ تفسیر عوام الناس کے لئے بالعموم اور طلبائے مدارس کے لئے بالخصوص وقیع تر اور مفید ہے۔ اس تفسیر کے مفسر جناب حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی رحمہ اللہ سابق مفتی اعظم ورکن تاسیسی مجلس مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند جو کہ اپنے استحضار علم وآگہی اور فکری تعمق وتدبر کے ساتھ سلیس اور سادہ انداز میں **کلموا الناس علی قدر عقولھم** کے ضابطے کے مطابق علمی موضوعات پر موصوف محترم کی دلنشیں انداز تفہیم ہی علمی دوائر واجتماعیات میں ان کی انفرادیت تصور کی جاتی ہے۔ بنابریں یقین ہے کہ ذات حق جلد مجدہٗ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو خاندانی طور پر حاصل شدہ متوارث اخلاق واخلاص اور للّٰہیت کے طفیل تفسیر نور القرآن کو قبولیت عامہ کے حوالے سے وسیلۂ نجات اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائیں۔

وما توفیقی الا باللّٰہ

وہ صاحب امانت لیل ونہار تھے

موت وحیات عالم ناپائیدار کی خاصیات کا وہ حصہ ہے جس سے ہر ذی روح کو بہرطور وبہرکیف گذرنا ہے۔ عالم ہو کہ جاہل، خاص ہو کہ عام، امیر ہو کہ غریب۔ نہ کسی کے لئے راہِ فرار اور نہ کسی کے لئے تخصیص۔ اگر معاملہ خصوصیت کا قریب مصلحت قرار پاتا تو حضرت حق جل مجدہٗ کا محبوب اقرب ترین طبقۂ انبیاء کرام اور افضل الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ لحاظ استحقاق وقربت ومحبوبیت، افضلیت وعظمت، دوام و استمرارِ حیات کی خصوصیت اس طبقہ کو حاصل ہوئی، لیکن حق تعالیٰ کا قانون اور اس کی سنت بہ لحاظ بشریت سب کے لئے عام ہے کیوں کہ خالق ارض وسما نے کائناتِ ارضی وسماوی کی تخلیق سے پہلے ہی تمام مخلوقاتِ عالم کو فنا کرنے کا فیصلہ اور وقت مقرر فرما کر لوحِ محفوظ میں لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱) کے الفاظ میں مقدر فرما دیا تھا۔ گویا کہ ایک پل کے لاکھویں حصہ کے بقدر بھی تقدم وتخلّف نہیں اور موت وحیات کے اس نظامِ معجز کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھ کر اس آمد ورفت کو سنت بنی آدم کا حکم تکوینی قرار دیا ہے۔ اسی نظام معجز کا دوسرا پہلو بہ الفاظِ قرآنی وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۲) کے مطابق یہ بھی ہے کہ بعض مقبول شخصیات کو صفاتِ عالیہ سے متصف فرماتے ہیں جو اپنی مجلّیٰ ومصفّٰی و

۞ تقریظ: دو گوہر آبدار از: مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

(۱) ترجمہ: تو وہ گھڑی بھر بھی اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتے۔ (سورۃ الاعراف: ۳۴)

(۲) ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ (سورۃ الاسراء: ۷۰)

مزکّٰی سیرت، بلند کرداری، تعمق علم، وسعتِ فکر ونظر، اعمالِ صالحہ اور خدمتِ خلق جیسی صفاتِ حمیدہ کے سبب اپنے مابعد کے لئے مثل مشعلِ راہ نقشِ جمیل کے آثار چھوڑ جاتے ہیں، اگر چہ سنت الٰہیہ کے تحت بصورت جسم آب وخاک متحرک ومتکلم شکل میں ہمارے درمیان موجود نہیں رہتے لیکن ان کی زندگی کے ہمہ جہت و ہمہ رنگ نقوش ایک حسین امتزاج کے ساتھ اپنے صالح فکر اخلاف کے قلوب واذہان میں مدت العمر تابندہ رہتے ہیں۔

بایں ہمہ صفات اور رنگ وامتزاج کی حامل خاندانِ انوری کی قابل صد فخر وافتخار شخصیات فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند اور قابلِ احترام جناب مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ سابق مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اپنے حسن وکردار وعمل، بلند اخلاق واخلاص، علم وآگہی اور جہد مسلسل کے سبب اپنے عہد کی قابل تقلید یادگار کے بطور قلوب واذہان میں مثل مشعلِ راہِ عمل زندہ وتابندہ ہیں۔ان کی حیات وخدمات کے تذکروں پر مشتمل برادرِ محترم جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کی یہ کوشش وکاوش بلا شک وشبہ لائق ستائش وتبریک ہے۔حق تعالیٰ اس کو قبولیت عامہ سے سرفراز فرمائے۔

مصائب کی علتِ اصل عمل کی کمیابی ہے

خدمت خلق کی تین منزلیں ہیں، پہلی منزل ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی بروقت مدد کر کے ان کی احتیاجات رفع کرنا۔ دوسری منزل خدمتِ خلق کی یہ ہے کہ ظالمانہ جبر واستحصال کے شکنجے میں محصور ومجبور لوگوں کو حتی المقدور مدد بہم پہنچا کر ظلم و عدوان سے نجات دلائی جائے اور خدمت خلق کے حوالے سے اس کی تیسری منزل یہ ہے تحریر، تقریر اور دعوت و تبلیغ کے ذریعہ خلق خدا کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرنا کیوں کہ خدمت خلق کی یہ نوعیت دونوں جہاں کی صلاح وفلاح کو محیط ہے تو درجہ بندی کے تناظر میں دیکھا جائے تو مقام عظمت کا مظہر یہی مرحلہ ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ ''عصر حاضر میں سیرتِ رسول کی معنویت'' جیسے مضامین کو نہایت سہل اور عام انداز میں پیش کرنے کی شدید ضرورت ہے، بالخاص اس دور خلفشار میں جب کہ صلاح وفلاح اور ذہنی وفکری مصائب سے نجات کا راز سیرت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ، عمل اور اتباع میں ہی مضمر ہے۔ اس حقیقت کا دوسرا فکری پہلو یہ ہے کہ آج روئے زمین پر علم اور اس کے مختلف شعبہ جات کے تعلق سے جتنا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اس لحاظ سے دور حاضر کو علوم وفنون کا دور کہا جا سکتا ہے مگر اس بدیہی حقیقت کے علی الرغم واقعاتی و مشاہداتی سطح پر اس منظرنامے میں عمل کمیاب ہے۔ چنانچہ معلومات کی کثرت کی نسبت

۞ تقریظ: اسلامی زندگی از: مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

عمل کی کمیابی نے موجودہ دور کے انسان کو شدید ترین ذہنی خلفشار میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے جو کہ مختلف پیرایوں میں مختلف سطحوں پر ظاہر ہو رہا ہے۔ چنانچہ اہل علم وآگہی کی سعی و کاوش کے نتیجے میں اگر دو چار افراد بھی عمل کی طرف راغب و مائل ہو جاتے ہیں تو یہ ایک کامیاب خدمت خلق کے عنوان سے معنون کی جائے گی۔

برادر محترم جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کا زیر نظر مجموعۂ مضامین اسی تسلسل کی کڑی ہے۔

نہ سہی آگ اک آواز تو پیدا ہوگی
سر کو سنگین چٹانوں سے جو مارا جائے

حق تعالیٰ موصوف کی اس مخلصانہ و دردمندانہ کوشش کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمائیں۔

عہد رفتہ کا نقش جمیل

مرحوم و مغفور جناب مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب نہ صرف نام کے جمیل تھے بلکہ اپنی ہر ادا و انداز میں ان کا یہ جمالیاتی وصف نمایاں رہتا تھا۔ چہرے پر ہمہ وقت ایک محبت آمیز زیرلب تبسم کی سی کیفیت تو گویا ان کی شناخت اور پہچان کا ایسا حصہ تھی کہ مجمع میں کسی اجنبی کو بھی یہ پہچان بتا کر بھیجا جائے تو شاید اس کو بھی تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے، بے تکلف حلقۂ احباب ہو یا کوئی سنجیدہ علمی مجلس، تعلق داری کا معاملہ ہو یا کسی سے شکررنجی کی بات ہو، طرز بود و باش ہو یا ہو بات خوراک و پوشاک کی، غرض کہ زندگی کے ہر رنگ میں ان کا جمالیاتی مزاج ان کی شخصیت کا جزو لاینفک محسوس ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ہمہ نوع جمالیاتی وصف کی فکری اساس **اللّٰہُ جمیلٌ یُحِبُّ الجمالَ** (۱) کے پُرعظمت الفاظ کا عکس جمیل ہے جو ہمہ وقت ان کی شخصیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ پرعظمت الفاظ ان کے تشخص اور فردیت کی ابتدائی ساخت و پرداخت کے علی الرغم ان کی اختیاری قوت ارادی کا بھی سب سے بنیادی اور کلیدی عنصر تھا جو کہ برنگ مختلف زندگی کے مختلف مرحلوں میں، مختلف انداز میں ظاہر ہوتا رہتا تھا، تواضع اور انکساری کی بیش بہا دولت سے مالا مال سمیت ان کا یہ مابہ الامتیاز وصف ہی حلقۂ احباب سے لے کر مجالس اغیار تک محبوبیت اور ہر دل عزیزی کا عنوان تھا۔

۞ تقریظ: ''سوانحی مجموعہ مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب قاسمی''

(۱) الصحیح لمسلم، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ، ج۱ص:۶۵، رقم:۹۱

مالک دو جہاں نے مرحوم ومغفور کو جن اوصاف حمیدہ سے سرفراز فرمایا تھا ان کو دیکھتے ہوئے یہ تعبیر شاید غلط یا مبالغہ پر مبنی نہ ہو کہ ان کی ذات کے اندر کوئی صحیح الفکر صوفی چھپا ہوا تھا یا انہوں نے اس کو چھپایا ہوا تھا جو کہ کبھی کبھی غلبۂ حال کی کیفیت میں دوران گفتگو ظاہر ہو جایا کرتا تھا۔

مفتی صاحب مرحوم اگر چہ اس عالم ناسوت سے عالم لاہوت کی طرف بہت دور جا چکے ہیں، اتنا دور کہ کوئی بھی خود سے وہاں جانے کا حوصلہ نہیں رکھتا، البتہ یہ الگ بات ہے کہ جذبۂ ایمان کی قوت اثر مومن کے لئے اس کٹھن ترین مرحلے کو وصالِ محبوب اور رفاقت حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر اثر آسان بنا دیتی ہے اور موت اس امکانی فاصلے کو سمیٹ دیتی ہے کیوں کہ فرشتۂ اجل مالک الملک کی طرف سے اسی کام پر متعین ہے اور اپنا فریضہ قدرت لایزال ولایزل کی طرف سے بنائے گئے اصول وضوابط کے مطابق سرانجام دے رہا ہے، لیکن مرحوم ومغفور کے اخلاق حسنہ، اوصافِ حمیدہ اور زندگی کے نقش جمیل نے ہمارے ذہن وقلوب میں ان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرمائے، وہاں کی ابدی نعمتوں سے مالا مال فرمائیں اور ان کے اخلاف کو ان کے نقش علم واخلاق پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

مرحوم ومغفور کے صاحبزادے عزیزم مفتی ضیاء الرحمٰن صاحب اور دیگر برادران کی یہ کوشش وکاوش کہ مفتی صاحب مرحوم کی حیات وخدمات کو مرتب کر کے مطبوعہ انداز میں محفوظ کیا جائے حلقۂ احباب کے لئے قابل قدر اور عزیزان سلمہم کے لئے موجب سعادت ہے، اس فرض کفایہ کی تکمیل پر میں بصمیم قلب جملہ شرکائے کار کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

سخنِ ولی

دل کی منزل کا ہے آغاز وہاں سے کہ جہاں
نہ زمیں ہے نہ زماں ہے نہ مکیں ہے نہ مکاں

واردات ِقلبی اور تاثراتِ لسانی کی ترجمانی کا نام شعر ہے۔ زبان، لہجے اور الفاظ کی تہذیب وترتیب کا نام شعر ہے۔ اسی طرح غزل ایک ذریعہ ہے انسانی تگ ودو کا، خواہ وہ روحانی ہو یا مادّی، لیکن خیال کی عظمت کا اظہار اس مختصر نویسی کے ذریعہ بہترین طور پر کیا جاسکتا ہے۔

روحانیت کی نسبت سے فارسی زبان وادب میں شعرائے کرام حافظی، روحی، سنائی اور عطار نے بڑے بڑے عقدے واکئے ہیں اور بظاہر وہ زمین کی بات کہتے ہیں لیکن اشارہ ان کا آسمانی حقائق کے انکشاف کی طرف ہوتا ہے۔

بہرحال یہ مبارک ترین جذبہ ہے کہ انسان کی روحانی تشنگی، نیز انسانی جذبۂ محبت و اخوت اور خدائے بزرگ وبرتر کی معرفت کو غزل کے اشعار سے واضح کیا جائے۔

مولانا ولی اللہ ولیؔ قاسمی بستوی استاذ مظاہر علوم وقف سہارنپور ایک شائستہ، مہذب

۞ تقریظ: شعری مجموعہ ''گلدستۂ ولی'' از: مولانا ولی اللہ ولیؔ قاسمی بستویؒ

اور وضع دار شخص ہیں، ان کا مجموعہ کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے غالب و میر اور اقبالؒ کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

موصوف کے نتیجہ فکر کو ''گلدستۂ ولی'' کے عنوان سے مولوی محمود الرحمٰن بستوی نے ترتیب دے کر ادبی محفلوں میں سخن ولی کی نئی فصل بو دی ہے۔

حق تعالیٰ اخلاق و اخلاص کے اس مجموعہ کلام کو امت مسلمہ کے لئے نفع بخش بنائے اور جامع کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

اسلامی تمدن کے گوہر آبدار

اصحابِ علم و دانش کے نزدیک یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عہد حاضر کی مادی اور تمدنی چمک دمک اور ظاہری کرشمہ سازیوں کی سراب انگیزی نے آج کے انسان کی نگاہوں اوراس کے فکر ونظر کو فریب خوردہ بنا دیا ہے اوراصل حقیقت کی روشنی نہ صرف یہ کہ نگاہوں سے اوجھل ہی ہوگئی ہے بلکہ اگر حقیقت پسندانہ زاویۂ فکر ونظر سے تجزیہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ عمومی سطح پر بے حسی کی حد تک اس حقیقت سے استغناء اور بے فکری عمومی مزاجوں کا حصہ بن چکی ہے۔اغیار کی بات تو کیا کیجئے خود مسلمان جنہوں نے اپنے دینی تمدن اور مذہبی تشخص سے تہذیب عالم کی عارضی چمک دمک کو کبھی ماند کیا تھا آج ان کی نگاہیں بھی تمدنی ارتقاء سے اس درجہ خیرہ ہوچکی ہیں کہ اپنی صبح صادق کی ضوفشانیوں کی جانب آنکھ اٹھانے کی صلاحیتوں میں بھی خاصی کمی کا رجحان پیدا ہو چلا ہے اوراسباب کو وسیلہ کے بجائے مقصود کا درجہ دیدیا گیا ہے، حالاں کہ ہمہ جہت ارتقاء کی بنیاد واساس سے انسان کو روشناس کرانے والی کتاب کلام اللہ ہی ہے، جس کے بے شمار اعجازی پہلوؤں پر اصحابِ علم وفضل نے لاتعداد مصنفات لکھ ڈالی ہیں، گویا کہ عہود و قرون ختم ہوگئے اور ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ بنی نوع انسانی ختم ہوجائے گی لیکن قرآن کریم کے اعجازات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اگلے جہانوں تک بھی اسی طرح دائم

۞ تقریظ: ''معارفِ تکرارِ ربانیہ'' از: محترمہ حافظہ امۃ الحق صاحبہ

رہے گا۔ چنانچہ تاریخ اقوامِ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے تو تمام مذاہب واقوام میں امت مسلمہ کو یہ ناقابل تردید امتیاز واختصاص حاصل ہے کہ اس امت کے اصحابِ علم وفضل کے علاوہ عام افرادامت نے بھی اپنے دینی مزاج وتمسک کے سبب حسب صلاحیت و استعداد اس بحر زرخیز سے گوہر آبدار کی تلاش کے ذریعہ کو اپنے لئے اسبابِ سعادت بنائے جانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ غور کیا جائے تو امت کے اس فکر ومزاج کی اساس اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لحٰفِظُوْن[1] (بے شک ہم نے ہی قرآن کریم نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کی تشریح وتفسیر میں مضمر ہے۔

اس حوالے سے زیر نظر کتاب معارف تکرارِ ربانیہ کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ لائق استفادہ ثابت ہوگا، جس کو کتاب کی مؤلفہ محترمہ حافظہ امت الحق صاحبہ نے عرق ریز محنت کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ راقم السطور بارگاہِ ذوالکرم میں دست بہ دعاء ہے کہ حق تعالیٰ موصوفہ کی اس لائق قدر کوشش کو ان کے لئے نیز اس کتاب کے ناشر برادر مکرم جناب عبداللہ راہی عثمانی صاحب، مالک عظیم بک ڈپو، دیوبند اور جملہ معاونین و مستفیدین کے لئے وسیلۂ نجات بناتے ہوئے قبولیتِ عامہ سے سرفراز فرمائیں۔ آمین

(۱) سورۃ الحجر: ۹

دھاک ہر دل پر بٹھانی ہے رسول اللہ ﷺ کی

جہالت کی ظلمت و تاریکی میں سرگرداں انسانیت کو نورِ علم و عمل سے منور کرنے اور منور رکھنے کے لیے اپنے اپنے عہد، فکر و مزاج، اقدار و روایات کے نبض شناس عارفین، شئونِ علم کے مختلف النوع اختصاصات و امتیازات کے ساتھ امت کی رہنمائی کے لیے ذاتِ حق جل مجدہ کی طرف سے اس کی سنت و مشیت کے عین مطابق دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں، اور اپنے اپنے عہد کے فکری تغیرات اور ذوق و مزاج کے علی الرغم صدیوں پر محیط یہ سلسلۂ علم و ہدایت تا قیامِ قیامت مستمر رہے گا۔ کلام اللہ کے ابدی اصول "فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" (۱) کے مطابق زبان و بیان اور تفہیمِ معارف کے تکوینی تفاوت و خصوص کے نقطۂ نظر سے اثر اور کارگاہِ عمل میں امتدادِ وقت بھی دراصل سنت اللہ اور اس کی مشیت کا ہی ایک حصہ ہے۔

اس قرارِ واقعی تمہید کے تناظر میں بانیٔ دارالعلوم دیوبند، حجۃ الاسلام، حضرت الامام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کی اثر انگیز، نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیت، وسعتِ فکر و عمل اور مرتبۂ علم و فضل کے لحاظ سے من جانب ذاتِ حق جل مجدہ اخص الخاص مقام رفعت پر نظر آتی ہے۔ ڈیڑھ سو سالہ عہد رفتہ کے تاریخی شواہد میں "میلۂ خدا شناسی" کے نام سے معروف مباحثۂ شاہ جہاں پور، جہاں ایک طرف حضرت الامامؒ کی علویت فکر، قوتِ استدلال اور شانِ عزیمت کے ساتھ تعمقِ علم کی ایک بیّن شہادت ہے، تو وہیں

۞ تقریظ: "مباحثۂ شاہ جہاں پور" از: حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ، مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی

(۱) ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے۔ (سورۃ النساء: ۳۴)

دوسری طرف علمی دوائر واجتماعیات میں آج بھی امتدادِ زمانہ کے باوجود استدلالی نقطۂ نظر سے حجت اور مالہٗ وماعلیہ کے لحاظ سے مسلّم الثبوت دستاویزی شہادت کی حامل تحریر شمار کی جاتی ہے۔

برصغیر ہند وپاک کے مختلف اداروں اور اہل علم کی جانب سے اس کی اشاعت کا اہتمام بذاتِ خود اس تحریر کی مقبولیت واثر انگیزی کی دلیل ہے۔ تاہم کثرتِ اشاعت کے سبب اس کے متن وعبارات میں پایا جانے والا فرق، اہل علم کے لیے ذہنی خلجان کا باعث تھا۔ چناں چہ عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی سلّمہٗ کی زیر نگرانی دار العلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق: حجۃ الاسلام اکیڈمی کے شامل اہداف ومقاصد کے تحت حتی المقدور کوشش وکاوش کر کے مباحثۂ شاہ جہاں پور کے ہند وپاک میں شائع شدہ تمام دستیاب نسخوں کو جمع کیا گیا اور اس میں قدیم ترین نسخہ کو معیار قرار دے کر اصلاحِ اغلاط کا کام کیا گیا۔ علاوہ ازیں سنجیدہ علمی دوائر کے فکر ومزاج کے مطابق تخریج وتحقیق بھی اس راہ کا ایک بڑا مرحلہ تھا، جس کو بحمد اللہ! دقتِ نظر اور تعمقِ فکر کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیر نظر کتاب تحقیق وتخریج کے علی الرغم اپنے متن کے لحاظ سے اقرب الی الاصل ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ زیر نظر کتاب حجۃ الاسلام اکیڈمی کے اہداف ومقاصد کی دوسری کاوش ہے، جب کہ اس سے قبل بانیٔ دار العلومؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''تحذیر الناس'' مذکورہ مراحل سے گزر کر زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔

حجۃ الاسلام اکیڈمی سے ''تحذیر الناس'' اور ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' کی اشاعت دراصل اکیڈمی کے اپنے علمی اہداف کی سمت ایک لائق تحسین وستائش قدم ہے۔ دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ تمام شرکائے کار کی محنتوں کو شرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے اپنے اکابر واسلاف کی عظیم الشان علمی تراث کو دورِ حاضر کے تحقیقی ذوق ومزاج کے مطابق منصۂ شہود پر لاتے رہنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ وباللہ التوفیق

امام ابو یوسف اوران کی حدیثی خدمات

یہ ایک امر واقعہ ہے اور اہل علم حضرات کے درمیان اک مسلمہ اصول کے طور پر تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال اپنے ماضی سے منفصل ہوکر زیادہ دیر تک ترقی وارتقا کی منازل طے نہیں کرسکتا ہے اور وہ کچھ ہی وقت کے بعد اضمحلال واغلاط کا شکار ہوکر اپنی منزل سے بھٹک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے، اقوام عالم کے قومی مزاجوں جسکی نشونما میں علاقوں کی آب وہوا بود وباش اور خوراک وپوشاک جیسے بہت سے حقائق کو بڑا دخل ہوتا ہے، اس تناظر میں اگر انکی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو بادی النظر میں دو حیثیتیں نمایاں طور پر ابھر کے سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ اس کارگہ عالم میں دو طرح کی زاویۂ فکر رکھنے والی قومیں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جس نے اپنے حال کو اپنے ماضی سے مربوط رکھنے کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اپنے فکری اثاثے کو اپنے حال پر مرکوز رکھا اور اسی راہ سے ترقی وارتقا کی تلاش میں سرگرداں ہوئے، جبکہ دوسرا زاویہ فکر ونظر اسکے بالکل برعکس یہ ہے کہ ماضی کی حیثیت قوموں کی علمی زندگی میں خشت اساس کی سی ہے، اس کو نظرانداز کرکے یا اس سے انحراف کرکے کسی بھی قوم کا کوئی حال اپنے ماضی سے منفصل ہوکر نہ ترقی وارتقا کی صراط مستقیم پا سکتا ہے اور نہ ہی تعمیر پذیر ہوسکتا ہے، کیونکہ کسی بھی عمارت کا استحکام اسکی خشت اساس کی مضبوطی کا ہی مرہون منت ہوتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ سنگ درسنگ کی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت وافادیت کا علم وادراک

۞ تقریظ: امام ابو یوسف اوران کی حدیثی خدمات از: مولانا محمد فرقان پالن پوری

ہی عمارت کو دوام بخشنے کے علاوہ مستقبل کے منصوبوں کی تقویت کا محرک ثابت ہوتا ہے، امت مسلمہ کا شمار بھی نہ صرف یہ کہ ثانی الذکر زاویہ فکر ونظر رکھنے والی قوم میں ہوتا ہے بلکہ علمی دنیا میں اقوام عالم کے بیچ منفرد اختصاصات کی حامل قوم کی منفرد حیثیت کی حامل قوم کا سہرا بھی اگر کسی کے سر ہے تو وہ امت مسلمہ ہی ہے جس کے مختلف افراد وطبقات نے ماضی سے مربوط، مضبوط و مستحکم بنیادوں پر نہ صرف مختلف علوم وفنون کو اپنے اپنے عہد میں حیرت انگیز ارتقا کی نت نئی بلندیاں ہی فراہم کیں ہیں بلکہ اسی اساس و بنیاد پر اقوام عالم کو ورطہ حیرت واستعجاب میں ڈال دینے والے ہزاروں علوم وفنون کی تخلیق کاری بذات خود اسکی علمی عظمت کی بین شہادت کے لئے کافی ہے۔ اسلامی علوم وفنون کے ایک ایک جزیہ کو کلیہ قرار دیکر اس سے ہزاروں علمی انواع واقسام کا اخذ واستنباط اور پھر اس راہ سے نئے کلیات کو جنم دینا اور پھر اس کو سیکڑوں جزئیات پر منقسم کرنا، چودہ صدیوں پر محیط امت اسلامیہ کے یہ وہ کارہائے نمایاں ہیں جنہیں دوسری قوموں کے علمی دوائر میں آج بھی حیرت واستعجاب کا استعارہ اور امت مسلمہ کے علمی تفوق کی علامت کے طور پر متعارف ہونے کے اعزاز کیساتھ دنیا کے تمام انصاف پسند علمی طبقات میں باعزت پذیرائی کا درجہ ومقام بھی حاصل ہے، جن کے محض عناوین کے تعارف کی وسعت کو ہی مختصر ترین صفحات میں سمودینے کی محض کوشش کرنا بھی عقلاً وعملاً ناممکنات میں سے ہے، منجملہ دیگر تمام علوم میں عظمت و بلندیاں چھو لینے کے علی الرغم محدثین کرام کا فن اسماء الرجال کا عظیم تر ایجادی کارنامہ جس میں زائد از پچاس ہزار محدثین کے احوال وکوائف کو حیرت انگیز ترتیب وتفصیل کے ساتھ مرتب کر کے فن حدیث اور اس کے متعلقہ علوم و فنون کے گرد صحت وثقاہت کو جانچنے پرکھنے کا ایسا مستعجب ولاثانی دفاعی حصار قائم کر کے تحفظ فراہم کیا گیا ہے جسکی اقوام عالم کی قریب وبعید تاریخ میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی ہے اور انتہائی تعصب زدہ مستشرقین بھی اس مرحلے پر آکر توصیفی کلمات لکھنے پر مجبور و لاچار نظر آتے ہیں۔

امت مسلمہ کے ان تاریخ ساز کارہائے عظمت کی قبولیت ومقبولیت میں دوسرا عامل ومحرک چودہ صدیوں پر محیط کام کا تسلسل ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ تدوین حدیث کے اس کارہائے پُرعظمت کو اسلام کے مصدر اول سے لیکر تیسری صدی کے اوائل تک مختلف وجہات نظر سے، مختلف حیثیتوں سے اور مختلف مقاصد سے علمی طبقات ودوائر میں خوب سے خوب تر فروغ کے رجحان کا غلبہ رہا، تا آنکہ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ حضرات محدثین کی مختلف النوع عظیم المرتبت مساعی جمیلہ وجلیلہ اس مقام ومرتبے کی بلندیوں کو چھوتی محسوس ہونے لگیں کہ فن حدیث اور اسکے متعلقہ علوم وفنون کے لحاظ سے کسی نئے زاویہ فکر کے ساتھ تصنیف وتالیف کے عناوین کا تخیل بھی ذہن میں لانا دشوار محسوس ہونے لگا، لیکن اسکے باوجود یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ کام رک گیا ہو یا روک دیا گیا ہو، بلکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی احادیث کو ذات حق جل مجدہ نے ایسی عظیم ترین وسعتوں، بلندیوں اور گہرائیوں سے سرفراز فرمایا ہے جیسے جیسے ہر عہد وقرن نئے تقاضے نئی ضروریات لیکر آیا ویسے ویسے ہی حق تعالیٰ رجال کار پیدا فرماتے رہے، نہ کام کے تسلسل میں کوئی فرق واقع ہوا اور نہ کوئی انقطاع درمیان میں حائل ہوا بلکہ ہر دور کے پس وپیش میں زمانے کو تقاضوں کے مطابق تالیف وتصانیف اور ترتیب وتدوین کی نت نئی جہتیں اور ضرورتیں سامنے آتی رہیں اور کام کا تسلسل جاری رہا، حضرات اہل علم اس کی ایک توجیہ یہ بھی کرتے ہیں کہ دور صحابہ سے لیکر تیسری صدی کے آخر تک کا دور بالخاص خلافت اسلامیہ کی تیز رفتار فتوحات اور وسعت پذیری سے عبارت ہے جس میں مختلف ممالک مختلف خطوں اور مختلف مزاجوں کے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہورہے ہیں اور اسی تناسب سے علاقائی ذوق ومزاج اور ضروریات واحتیاجات بھی وسعت پذیر ہیں، لاکھوں افراد کے سینوں میں ارشادات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات کا ذخیرہ زمانے سے ہم آہنگ تقاضوں مطالبوں اور جہتوں سے سامنے آرہا ہے اور قیامت تک آتا رہے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر اس علم وفن کو دوام بخش دیا ہے جو کہ اسلام کی بنیاد و

اساس سے مربوط ہے، چنانچہ محدثین کے احوال وخدمات کا تعارف وتذکرہ بھی دراصل اسی کی ایک علمی وفنی جہت ہے، بلاشبہ خوش نصیب وخوش بخت ہیں ایسے افراد جن کوحق تعالیٰ نے ان موضوعات میں کسی پر خامہ فرسائی کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم جیسے متبحر عالم دین کی زیر نگرانی المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے ایک ہونہار طالبعلم عزیزم مولوی محمد فرقان پالنپوری سلّمہٗ کوحق تعالیٰ نے یہ شرف عطا فرمایا کہ انہوں نے حضرت الامام ابو یوسف رحمہ اللہ کے محدثانہ مقام ومرتبہ پر مدلل وسیر حاصل بحث تحریر کی جو کہ اب ایک باضابطہ تالیف کی صورت میں آپ کے زیر نظر ہے، مسودے کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے پر احساس ہوا کہ عزیز موصوف سلمہ نے ذمہ دارانہ نگرانی کے زیر اثر عرق ریز محنت کی ہے اور حتی الامکان موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ایک کامیاب کوشش کا حق ادا کیا ہے۔

بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ عزیز موصوف سلّمہٗ کی اس علمی کاوش کو اپنی بارگاہ شرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے عوام الناس کے لیے استفادہ کا ذریعہ بنائیں۔ آمین

حجۃ الاسلام کا شعری سرمایہ

بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی علمی، فکری، تعلیمی، تحریکی، اور تصنیفی و تحقیقی حیات کا دورانیہ زمانی لحاظ سے اگرچہ نصف صدی سے کم عرصہ کو محیط ہے لیکن ذات حق جل مجدہ جب کسی شخصیت کو کسی خاص کام یا مختلف الجہات کارہائے باعظمت کی تکمیل کے لئے منتخب فرماتے ہیں تو عرصۂ حیات کے اختصار میں ہی ایسی برکات ربانی کو ودیعت فرمادیتے ہیں جو نسلوں کی صلاح واصلاح کے لیے افادہ واستفادہ کے نقطۂ نظر سے منزل مقصود کی راہنمائی کے حوالے سے صدیوں پر محیط ادوار کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہیں، مختلف الجہات میدانوں میں اسلام کی چودہ سو سالہ قرطاس تاریخ ایسی عبقری اور مجموعۂ صفات شخصیات کے تذکروں اوران کے عدیم المثال کارناموں اوران کے تذکروں کے نقوش سے روشن ہے جن کا عرصۂ حیات کے تناظر میں جب جائزہ لیا جاتا ہے تو انسان پر ورطۂ حیرت کی کیفیت طاری ہوجانے کے ساتھ اس کے معنوی اثرات جذبۂ تحریک کو بھی جلاء بخشتے ہیں اور یہ ہی جذبۂ تحریک ہے جو آنے والی نسلوں میں مقاومت آموز قوت فکر وعمل کو بیدار رکھنے میں مہمیز دیتا ہے، علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میدان عمل کوئی بھی ہو اس میں بدلتے ادوار کے تقاضوں

۞ پیش لفظ: ''قصائد قاسمی'' شعری مجموعہ: حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ

کو مدنظر رکھتے ہوئے ارتقائی نتیجہ خیزی کے لیے اپنی فکری اساس سے مضبوط ارتباط بھی بہرحال ضروری ہے، بالخصوص اسلامی علوم و معارف اور فکر و فن کے تنوعات میں اس ارتباط کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

برصغیر میں بالخصوص اور عالمی سطح پر بالعموم دوائر علمیہ و اجتماعیہ سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم و فضل نے ایسی ہی عبقری شخصیات کے سلسلۃ الذہب میں حضرت الامام النانوتویؒ کا ان کے ہمہ جہت امتیازات و اختصاصات کے ساتھ مجموعۂ صفات اور ہشت پہلو شخصیت کی حیثیت سے تعارف کرایا ہے جنھوں نے اپنی نصف صدی سے بھی کم محض ۴۹؍ سالہ مختصر ترین حیات عمل میں اسلامی وقومی خدمات کے سلسلہ میں جو عظیم تر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اپنے وسیع تر مؤثرات کے حوالے سے صدیوں کی وسعت کے حامل تھے جنھیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے، حضرت الامامؒ اپنے نور معرفت اور ایمانی فراست سے نہ صرف اپنے عہد میں ملت اسلامیہ کے حوصلہ شکن ہمہ جہت احوال کی دینی و معاشرتی اصلاح کو ہی پیش نظر رکھتے ہوئے مدۃ العمر ساعی رہے، بلکہ ملک پر قابض غیر ملکی استبدادی قوتوں کے اسلام اور ملت اسلامیہ کے تئیں مستقبل کے حوالے سے ظالمانہ و جابرانہ عزائم کا بروقت ادراک فرماتے ہوئے جہاں ایک طرف باشارات غیبی عیسائی مشنری کے مذموم مقاصد کو اپنی مناظرانہ قوت استدلال سے ناکام و نامراد بنایا، وہیں دوسری جانب ملت اسلامیہ کے ایمان و عقائد کے دوررس نتائج کے حامل تحفظ کے نقطۂ نظر سے حریت وطن کے لیے اپنی ہمہ جہت تحریکی مصروفیات نیز اپنی علمی و تعلیمی، تصنیفی و تحقیقی اور اصلاحی مشغولیات کے علی الرغم دارالعلوم دیوبند کے قیام کے انقلاب آفریں فکر انگیز منصوبہ کو للّٰہیت سے سرشار اپنی مخلص جماعت رفقائے کار کے تعاون سے منصۂ شہود پر لائے جس میں پائی جانے والی للّٰہیت و اخلاص کامل کی عطر بیزیوں کی مہکار سے آج ڈیڑھ سو سال گذر جانے کے باوجود بھی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ برصغیر میں بالخصوص اور عالمی سطح پر بالعموم اسلامی

معاشرہ مدارس ومکاتیب کی صورت میں منور ومعطراور دین وعقائد کی حفاظت کے حوالے سے قائدانہ کردار کا حامل ہے، اور اسی ضمن وذیل میں بحمداللہ وبفضلہ اپنے بانی کی فکری اساس اور راہنما اصولوں سے ہمہ جہت معنوی ارتباط کے ساتھ عہد بہ عہد وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر دارالعلوم وقف دیوبندان کی عظیم تر روحانی وباطنی میراث کے محافظ کے بطور قدم بہ قدم اپنی ارتقائی منازل واہداف کی جانب گامزن ہے جس کے علمی منصوبوں میں دارالعلوم دیوبند کے اسلاف واکابر کی بلند پایہ تصنیفات وتالیفات سے بالعموم اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت الامام النانوتویؒ کے آفاقی فکر ومنہج سے عصر حاضر میں نوجوان نسل کی فکری پرواز ومستوی کے تناظر میں آج کے بین الاقوامی اصول تحقیق و ریسرچ کی اساس پر عربی انگریزی اور اردو ہندی زبانوں میں بلند پایہ تراجم کے ذریعہ متعارف کرانا ادارہ کے ترجیحی منصوبہ سازی کا ایک کلیدی حصہ ہے جس کو عہد رواں کے اصحاب علم وفضل نے جماعت کی جانب سے ادارہ کے اس کارہائے باعظمت کو فرض کفایہ قرار دیا ہے جو کہ ادارہ کے نائب مہتمم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب اوران کی جواں سال جماعت رفقائے کار کی مخلصانہ وشبانہ روز جہود کے زیرانتظام دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ذریعہ سے برسرعمل ہے۔

اسی علمی وتحقیقی سلسلۂ ذہب کے حوالے سے بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ادبی نگارشارات پر مشتمل ''قصائد قاسمیہ'' ہے جسکو اصول تحقیق کے مروجہ معیار پر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن کے جواں سال ڈائریکٹر محترم جناب ندیم احمد انصاری صاحب نے عرق ریز محنت وکاوش کے ساتھ مرتب ومدون کیا ہے، فارسی کے مقولہ ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق حضرت نانوتویؒ کے ہمہ جہت کمال علم کا دائرہ اشاعت علوم اسلامیہ کے علاوہ ذوق ادبیات کو بھی محیط تھا اور ذات حق جل مجدہ نے عربی، فارسی اور اردو زبان وادب پر بھی مہارت تامہ سے سرفراز فرمایا تھا، آپ کا یہ وجدانی ذوق نعتیہ اشعار در مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرائے میں

ڈھل کر جہاں ایک طرف نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سحر انگیز و معنی آفریں والہانہ عشق ومحبت اور آپ کے درون قلب سوز وگداز کا عکاس ہے وہیں دوسری جانب اپنے اسلاف واکابر سے حقیقت افروز اساس پر بصیرت مندانہ تعلق وعقیدت کا بھی مظہر ہے جس کو محض توفیق حق سے ہی معنون کیا جاسکتا ہے۔

حق تعالیٰ جل مجدہ کی بارگاہ ذوالکرم میں دعاء گو ہوں کہ مرتب مکرم کی جانفشاں محنتوں کاوشوں کو حسن نیت اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کے حسن کارکردگی کی بنیاد پر عنداللہ قبولیت اور عندالناس مقبولیت سے بہرہ ورفرمائیں۔آمین

حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند

اسلام نے اپنی تاریخ میں ہر آن اور ہر لمحہ یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ اس کا چمن ہر موسم میں نئے نئے پھول کھلا سکتا ہے۔ عقل وادراک کے کارواں نے سے نقل ووحی کی روشنی میں سفر شروع کیا ہے، اس کے سامنے علم وحکمت، فکر وبصیرت اور فضل وکمال کی ایک وسیع الآفاق کائنات بے نقاب ہوتی چلی گئی۔ عقل ونقل کے اس حیرت زدہ ارتباط، اور روایت ودرایت کے اس محیر العقول اتفاق نے ابتدائے اسلام میں رجالِ دین کا ایک کہکشانی افق دریافت کیا، جس کو کرۂ ارضی پر ''اصحابِ رسول'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے جانا گیا، اور اس پاکیزہ گروہِ انسانی کے پایۂ استناد کو الم نشرح کرنے کے لیے ربِّ کائنات نے ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کی شہادتِ افتخار اور سندِ اعزاز سے سرفراز فرمایا۔

اسلام کے اس عہدِ زریں کے بعد پھر ہر دور میں سیدنا الامام الاعظم ابوحنیفہؒ، سیدنا الامام مالک بن انسؒ، سیدنا الاما الشافعیؒ اور امام غزالیؒ جیسی شخصیات وجود میں آئیں۔ تیرہویں صدی کے موسم اور دینی احوال کے مناسب حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی علیہ الرحمہ کو وجود بخشا۔ حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ اس بزم میں گو آخر میں آئے؛ لیکن پیچھے نہیں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور حیرت انگیز علم وحکمت کی بلندیوں سے ہر دور کے اساطینِ علم اور رجالِ معرفت کی تصویر پیش کی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے انقلابی کارنامے اور برِّصغیر میں دین کی وقیع اور رفیع خدمات کے حوالے سے وہ کون شخص ہے، جو ان کے بارِ احسان سے زیر بار، اور ان کے دینی وتعلیمی کارناموں کا منت کش نہیں ہے۔ ضرورت تھی کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علوم ومعارف اور افکار کو سہل زبان میں پیش کیا جائے، ان کی شخصیت اور انقلابی کارناموں سے دنیا کو متعارف کرایا جائے۔ یہ ایک ایسا اہم اور گراں قدر کام تھا کہ جس کی انجام دہی حلقۂ دارالعلوم دیوبند، قاسمی برادری اور فکرِ دیوبند کے ہر علمبردار کے کاندھوں پر فرض اور قرض کے درجے سے کم نہ تھی۔

حجۃ الاسلام اکیڈمی کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے، حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند کو اس قلیل مدت کے اندر اربابِ علم ودانش کے حلقوں میں جو مقام حاصل ہوا ہے وہ خالص نصرتِ الٰہی ہی ہے، خدا تعالیٰ کے فضلِ عمیم اور احسانِ عظیم کا نتیجہ ہے۔

إحياء تراث السلف
مجمع حجة الإسلام
- للبحث والتحقيق -

Ḥujjat al-Islām Academy
Al-jamia al-Islamia Darululoom Waqf, Deoband
Eidgah Road, P.O. Deoband-247554, Distt: Saharanpur U.P. India
Tel : + 91-1336-222352, Mob: + 91-9897076726
Website: www.dud.edu.in, www.darululoomwaqf.com
Email: hujjatulislamacademy@dud.edu.in, hujjatulislamacademy2013@gmail.com

www.dud.edu.in ₹500/-
9 789384 775230
ḤUJJAT AL-ISLĀM ACADEMY